خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماھنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

اکتوبر 2022

قیمت 150 روپے

بانی

معراج رسول

سسپنس

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
یمنی احمد

نائب مدیر
اطہر حسین

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3265269

جلد 51 • شمارہ 09 اکتوبر 2022 • زرِ سالانہ 2000 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 150 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون (021)35895313 E-mail: jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول مقامِ اشاعت: 63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

سنہری یادوں کا

یادیں سدا انسان کے ساتھ رہتی ہیں چاہے وہ خوشگوار ہوں یا

ناخوشگوار...... کبھی یہ دل میں کسک جگاتی ہیں تو کبھی امید کی کرنیں

پھیلاتی ہیں...... ایسی ہی خوب صورت باتوں اور حسین یادوں کا

ایک سفر آج سے تقریباً پچاس سال پہلے

گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

کی صورت شروع ہوا۔ پاپولر ادب کی دنیا میں ایک قندیل روشن ہوئی جو دست بدست چلتی نکھرے اور معطر

اجالوں کی پیامبر بنی...... بقول حبیب جالب

ایسے بُجھا نہ سکے گی ہوا زمانے کی
جلا چلے ہیں لہو سے جو ہم چراغ سحر

الحمدللہ اب ہم گولڈن جوبلی کے دور سے گزر رہے ہیں

ان سنہری یادوں میں آپ کا بھی روپہلا اور سنہرا خوب صورت ساتھ شامل ہے؟

ہمیں بھی بتائیں...... یہ سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین ہی کے لیے تو ہے۔

1...... ماہنامہ پاکیزہ سے پہلا تعارف......؟

2...... پاکیزہ تحریروں سے کوئی تین ایسی باتیں کیا سیکھیں جو آج بھی زندگی کا حصہ ہیں......؟

3...... سینئر یا دور حاضر کے پسندیدہ قلم کار کہ جن کی تحریریں پڑھنے کو آج بھی بے چین رہتی ہیں......؟

4...... کوئی فرمائشی سلسلہ ہے تو ضرور بتائیں۔

انشائیہ

کسی بھی طرح

جون ایلیا

کہ جی ہی بہلے۔ جانے کیا ہو گیا ہے کہ جی نہیں لگ رہا۔
کیوں یہ میری پیٹھ سے لگا کیا سوچ رہا ہے؟ سامنے آ کے بیٹھ...... ہیں یا اپنے آپ میں محبوس ہونے اور اپنے آپ
ہاں بھائی بڑی وحشت ہے۔ بڑی بیزاری ہے۔ ہم اپنے آپ میں بُری طرح آن پھنسے
سے تنگ آ جانے کا آزار بڑا ہی جان لیوا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ اپنی ہڈیاں پسلیاں ایک کر دوں، اپنا مُنھ چبا جاؤں۔ اپنی ذات کے حبس میں
سانس لینا تو ایسا ہے جیسے جانکنی میں زندہ رہنا۔ او آزادی! آخر تو کس سوچ میں ہے۔ تو بھی تو کچھ بول! ایسی کہ اس طرح آخر کیسے گزرے گی؟
یہی تو میں بھی سوچتا ہوں، چاہے ہمارے اندر جنت کی ہوائیں ہی کیوں نہ چل رہی ہوتیں اور ہمارے وجود میں جنت کے چشمے ہی کیوں نہ
بہہ رہے ہوتے پھر بھی اپنی ذات کی قید دوزخ سے کم نہ ہوتی۔ جبکہ ہمارا اندرون تو خود سب سے بڑا دوزخ ہے۔ آخر وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو
اپنی ذات میں بند رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے باہر سے بھلا کیا سروکار...... اور یہ بڑے جانے ہوئے اور مانے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔
ان سے زیادہ یہ بات جاننے والے کم ہی ہوں گے کہ نفس کی سب سے اچھی حالت کون سی ہے اور سب سے بُری حالت کون سی ہے؟
یہ تو کیا بڑبڑانے لگا اور یہ تو نے کن بکواسیوں کی باتیں شروع کر دی جو اپنی ذات میں بند رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھلا ہمیں اپنے باہر سے کیا
سروکار۔ بدذات، یہ اپنے اندر ہوتے ہی کب ہیں جو باہر نکلیں۔ کھوکھلے، تو ان بے حسوں اور بے حیاؤں کی باتیں کر کے میرا جی نہ جلایا کر۔ خبردار
جواب ان بدروحوں کا نام لیا۔ یہ زندگی کے گورستانوں میں منڈلاتے پھرتے ہیں کہ بدی کی کوئی لاش کھود کے نکالیں اور اسے اپنے اوپر منڈھ کر
بستیوں میں آئیں اور روگ پھیلائیں۔ یہ تو نے اچھی کہی کہ یہ لوگ اپنی ذات میں رہتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ بدذاتی...... بدذات ہوتی ہے۔
ہاں یہ ہے کہ یہ باہر سے بھاگتے ہیں اور لاشوں میں اپنے لیے ٹھکانے ڈھونڈتے ہیں۔ ذات میں رہنا بھی کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ کیا یہ کوئی
آسائش ہے؟ اس سے کڑی آزمائش اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنی پسلیوں میں پھنسا سسک رہا ہو۔ اگر انسانوں میں سے کچھ انسان اس آزمائش
میں پڑ گئے ہوں تو کیا انہیں اس پر خوش ہونا چاہیے؟
جب تو یہ کہتا ہے کہ میں اپنی پسلیوں میں پھنسا ہوا ہوں یا اپنی اوجھڑی میں گٹھری بنا پڑا ہوں تو کیا اپنے آپ کو یا کسی اور کو کوئی خوش خبری
سناتا ہے؟ کیا بہت دم گھٹ رہا ہے؟ ہاں، سچ مچ جان پر بنی ہوئی ہے۔ بس یہی میرا بھی حال ہے۔ یہ کیسا ہوتا ہے، یہ تو بہت ہی عذاب ناک ہوتا
ہے۔ نہ ہونے کا آرام شاید بہت بڑا آرام ہوتا ہوگا۔ ہاں شاید...... اتنا نشہ کہ ہوش ہی نہ رہے۔ خون کے گھونٹ پی اور جی۔
نہیں بھائی، نہیں۔ اب زبان اور محاورے کی چاشنی کچھ مزہ نہیں دیتی۔ میں تو کہتا ہوں کہ بول ہی مت، بس چپکا ہی رہ۔ ہاں تو نے ٹھیک
کہا۔ اب تو اپنی کوئی بات بھی اچھی نہیں لگتی۔ جب اپنا آپ ہی بُرا لگنے لگے تو پھر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ بھلا تو اپنے آپ کو کیسا لگتا ہے؟
میں اپنی صورت تک سے بیزار ہوں۔ میں اپنے اس گمان تک سے اکتا چکا ہوں کہ میں ہوں جو نہ ہونے کی طرح ہے، وہ آخر ہے بھی
کیوں ہے؟
تو نے میرا جی خوش کر دیا۔ اگر جاں گنی، جاں کنی کا جی خوش کر سکتی ہو۔ دمسازی اور غمگساری اسے کہتے ہیں۔ بس یہی کچھ میرا بھی عالم ہے۔
بُرے مارے گئے، ہاں بُرے مارے گئے۔
باہر کی ہوا اب کیسی ہوگی؟
ویسی ہی ہوگی جیسی تھی۔ جیسی چھوڑ کر ہم اپنے اندر بھاگ آئے تھے۔ بھاگ آئے تھے یا کھدیڑے گئے تھے۔
ہاں یوں کہہ لے، ہوا بھی یہی تھا۔ پر ایک بات اور ہے اور وہ یہ ہے کہ باہر کی ہوا کا کیا کہنا۔
ہاں بھئی! باہر کی ہوا کا بھلا کیا کہنا۔ باہر کی فضا کا بھلا کیا کہنا۔ اندر تو رائگانی ہی رائگانی ہے۔ ندامت ہی ندامت ہے۔ ہم جو تھے، ہم میں
سے بھلا کون کون رائگاں گیا ہوگا۔ جنہیں رائگاں نہ جانا چاہیے تھا، وہی بری طرح رائگاں گئے ہوں گے اور انہی کو اپنے رائگاں جانے کا دکھ بھی
ہوگا۔ کیسے کیسے لوگ رائگاں گئے۔ رائگانی کے ان شہروں میں کیسی کیسی امنگیں پچھتاووں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ ایک بات ہے۔
کیا بات؟
باہر کی ہوا تھی بھی کچھ ایسی کہ ایسا نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟ باہر کی گھٹن بھی اندر کی گھٹن سے کچھ کم تو نہ تھی اور یہ کہ فضا میں قہر تھا اور ہوا میں زہر۔ ہوا
کا وہ زہر اور فضا کا وہ قہر ضمیر کی ہلاکت اور ذہن کی ہزیمت تھا۔ ہم نے حکمت کو ہوس ناکی بنتے دیکھا اور دلیل کو دلالی۔ قیادت نے قزاقی کا پیشہ
اختیار کیا اور قانون نے نقب زنی شعار کی۔ پھر ہو کیا؟ کیا ہم اپنے اندر اسی طرح کراہتے رہیں؟ میں تو کہتا ہوں کہ اندر کی ہلاکت سے باہر کی
ہلاکت ہزار گنا بہتر ہے۔ اندر کی زندگی بھی موت ہے اور باہر کی موت بھی زندگی۔ کسی بھی طرح اپنے آپ سے باہر نکلنا چاہیے، کسی بھی طرح۔

آپ کا خط

عزیزانِ من!
السلام علیکم!

اکتوبر 2022ء کا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ گزشتہ دنوں تواتر سے بارشوں کے سلسلے نے پاکستان کے کئی مقامات پر جو تباہی مچائی اور سیلابی ریلوں کی زد میں لاتعداد لوگ گھر سے بے گھر ہوئے...... اس سارے منظر سے دل بہت بوجھل ہے...... آفات کا غم تو اپنی جگہ مگر اپنوں کے رویے اور حکام کی بے پروائی نے پوری قوم کو خون کے آنسو رلا دیا ہے۔ معصوم بچوں کی آہ و بکا...... ماں کی گود کا اجڑنا اور باپ کی بے بسی بہت سے ذمے داروں کی بے حسی کو بے نقاب کر گئی...... اکثر ایسا ہی ہوتا ہے...... جب بھی کوئی مصیبت کا وقت آیا، قوم نے تو بھرپور ساتھ دیا مگر ذمے داران اور حکام کی محض زبانی کلامی ہمدردی کے کھوکھلے نعروں سے ہی فضا گونجتی رہی۔ اللہ اللہ کر کے اب سیلابی ریلوں کی سرکشی نے تو کچھ دم توڑا ہے مگر اس کے گزر جانے کے بعد لوگوں کی بے سروسامانی کا جو حال ہے...... وبائی امراض کے خطرات اور خالی ہاتھ رہ جانے والے وہ لوگ جن کا زمینی راستہ بند ہو چکا ہے، ان کے لیے دوبارہ سے جی اٹھنا یقیناً کسی معجزے سے کم نہیں...... جب جب قوم پر مصیبت آئی، چمکانے والوں نے اپنی قسمت چمکالی...... امدادی کارروائیوں میں تعطل...... باہر سے آنے والی امداد مستحقین کی رسائی سے دور...... مصیبت زدہ لوگوں کے لیے امدادی کارروائیوں میں تاخیر...... اور اتنی دیر کہ لوگ موت کے منہ میں چلے گئے...... افسوس صد افسوس...... ہم صرف اپنوں کی بے بسی اور...... کسی کی بے حسی پر آنسو بہا سکتے ہیں مگر سلام ہے اپنے ہم وطنوں کے جذبات کو کہ جنہوں نے دل کھول کر ان سیلاب زدگان کی مدد کی۔ نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونِ ملک رہنے والوں نے بھی اپنی محبت کا حق ادا کر دیا...... یہ اور بات کہ حق داروں تک حق پہنچا یا نہیں...... پہنچا تو کتنا...... بہرحال ظلمتوں کا یہ سورج بھی ڈھل ہی جائے گا۔ اللہ تعالیٰ آئندہ وقت میں ہمارے وطن کو ایسی ناگہانی آفات سے محفوظ رکھے اور ذمے داروں کو حق اور سلامتی کی راہ پر چلنے کی توفیق دے (الٰہی آمین) افسردہ دل کے ساتھ ہی سہی، محفل کے دروازے پر دستک تو دینا پڑے گی...... تو پیشِ خدمت ہے۔

✠ مینا راجپوت کی اسلام آباد سے پہلی بار شرکت۔ ”خطوط کی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ ”موت کے سوداگر“ اور ”دیوتا“ کے ختم ہونے کے بعد صرف ”اناڑی“ کے لیے ڈائجسٹ باقاعدگی سے خریدا پھر آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔ اس مہینے کئی سالوں کے بریک کے بعد شمارہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جہاں فہرست میں کئی نئے نام شامل تھے، وہیں کچھ پرانے سلسلے جوں کے توں موجود تھے۔ جیسے انشائیہ اور جون ایلیا شاید لازم و ملزوم ہیں۔ میں بچی سے سنجیدہ ہو گئی مگر جون ایلیا اپنے قلم پارے کے ساتھ آج بھی زندہ و جاوید سسپنس کے ابتدائی صفحے پر براجمان تھے۔ اسی طرح ملک صفدر حیات کی تحقیقات بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود تھیں۔ یقیناً مرزا امجد بیگ والا سلسلہ بھی جاری ہوگا۔ خیر سرورق عمدہ تھا۔ سادہ سی لڑکی کانچ جیسی آنکھوں میں اداسی لیے گہری سوچوں میں گم محسوس ہوئی۔ خطوط کی محفل میں مدیرہ صاحبہ نے ملک میں سیلاب کی تباہ کاریوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایک پاکستانی ہونے کے ناتے ملک و قوم کی زبوں حالی پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہے سب ہی لوگ اپنے مجبور بہن بھائیوں کے لیے کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں مگر خسارہ اتنا بڑا ہے کہ سنبھلنے میں بہت وقت لگ جائے گا۔ اندرونی و بیرونی امداد تو آ بھی ہو رہی ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ مستحقین تک وہ امداد پہنچی بھی۔ محمد آذین رضوان کو بہترین تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت کی مبارک باد۔ شمارے کا مختصر مگر بہت خوب تجزیہ لکھا۔ باقی خطوط بھی عمدہ تھے۔ ابتدائی صفحات پر زویا جی ”عقاب آب“ کے ساتھ نظر آئیں۔ تاریخ کے نامور اور با اختیار و بے اختیار لوگوں کی روداد لکھنے میں زویا جی کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ تاریخی واقعات کو اس عمدہ اور دلچسپ پیرائے کی صورت احاطۂ تحریر میں لاتی ہیں کہ قاری پڑھتے ہوئے ماضی میں کھو جاتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ سمندری عقابوں کی اس داستان کے پہلے حصے نہیں پڑھ پائی۔ عائشہ نصیر کی ”بعد از مرگ“ انگریزی ادب سے جرم کی مختصر سی کہانی پلاٹ کے لحاظ سے عمدہ تھی مگر اردو ترجمہ کچھ خاص
[illegible]

تھی جو یقیناً اس کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے کافی ہوگا۔ شاہ ستان کی ”جانباز“ چھ ستمبر کے حوالے سے تھی۔ بے شک انسان اپنے ملک و قوم کی خاطر قربانی دینا چاہے تو اس کے لیے فوجی وردی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خلیل نے اپنی جان پر کھیل کر سیکڑوں بچوں کو دہشت گردوں کے حملے سے بچایا اور اسکول کا ایک معمولی چوکیدار ہوتے ہوئے بھی وطن عزیز کے غازیوں میں اپنا نام لکھوا لیا۔ ملک صفدر حیات کی ڈائری سے ”گمشدہ“ ہمیشہ کی طرح بہترین تھی۔ محرم رشتوں کی قبر پر جب ناجائز رشتے پلنے لگیں تو یہی انجام ہوتا ہے جو شاداں اور اس کے دیور عظیم کا ہوا۔ جاوید بسام کی انگریزی ادب سے درآمد شدہ ماورائی کہانی ”سرنگ میں“ قدرے بوریت بھری تھی۔ اردو ترجمے کے ساتھ انصاف کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ عتیق بخاری کی ”انگوٹھی“ کافی مزیدار کہانی تھی۔ ایک معمولی انگوٹھی جو البرٹ کے لیے وبالِ جان بن گئی تھی، بالآخر وہی اس کی جان بچانے کا سبب بھی بنی۔ عمران قریشی کی ”انہونی“ پاکستان بننے اور ہجرت کرنے والوں کی ایک انوکھی کہانی تھی۔ عائشہ نے اپنے شوہر کے ساتھ بے وفائی کی اور امبر سنگھ کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس دھوکا دہی کا ہرجانہ اسے اپنی جان دے کر بھرنا پڑا۔ باقی ڈائجسٹ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اگلی بار بشرط زندگی پوری کوشش ہوگی کہ مکمل ڈائجسٹ پڑھ کے بھرپور تبصرہ کیا جائے۔“

✠ شاہانہ سلطان، گلشن ظہور کراچی سے حاضری دے رہی ہیں۔ ”ستمبر کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے اور اس کے اوراق پر پرنٹ شدہ تمام کہانیاں میرے ذہن میں ہیں کیونکہ...... کیونکہ میں نے تقریباً تمام ہی رسالہ پڑھ ڈالا ہے۔ اس بار آخری صفحات کی کہانی ”مجھے چاند نی نواز دو“ کاوش صدیقی کی یہ کاوش ہمارے دل کو چھو گئی۔ بہت پرانے موضوع پر لکھنے کے لیے اب تو شاید رائٹر حضرات کو خوب سوچنا پڑتا ہوگا کہ کس طرح اسے نیا انداز دیا جائے۔ عشق و محبت تو ویسے بھی صدیوں پرانا ٹاپک ہے۔ بہرحال، دریا کی روانی کی طرح یہ کہانی سبک سبک چلتے ہوئے بالآخر اپنے انجام کو پہنچی اور جانے کیوں آخر میں ایک تشنگی کا احساس دل کو رلا گیا۔ اس کے بعد عائشہ نصیر نے بہت کم وقت میں سسپنس کے صفحات پر اپنی منفرد جگہ بنالی ہے۔ مختصر مگر دلچسپ کہانیاں لے کر حاضر ہوتی ہیں۔ اس بار ”بعد از مرگ“ لے کر آئیں اور چھا گئیں۔ مغربی انداز میں لکھی یہ کہانی بھی متاثر کر گئی۔ عاطر شاہین کی ”رونگ نمبر“ کہانی نے بھی لطف دیا۔ حیرت ہے، اتنا اچھا لکھنے والے اتنا کم کیوں لکھتے ہیں۔ شاہ ستان ہمارے لیے بالکل نیا اور منفرد نام ہے۔ بہرحال ان کی تحریر ”جانباز“ نے بھی دلوں کے تاروں کو چھو لیا۔ محب وطن ہونے کا احساس دلاتی اس تحریر نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جب ایک معمولی حیثیت کا انسان بھی اپنے حصے کا کام کر رہا ہے تو طاقتور طبقہ جانے کیوں نیند کی گولیاں کھا کر سویا پڑا رہتا ہے۔ ستمبر کے حوالے سے بہت خوبصورت کہانی تھی۔ ”انگوٹھی“ بھی عتیق بخاری نے دلچسپ پیرائے میں بیان کی۔ البرٹ کے ہاتھ میں موجود انگوٹھی نے اسے پھنسوا دیا۔ کچھ جرائم پیشہ افراد اس کے پیچھے لگ گئے۔ مگر اسی انگوٹھی نے آخر میں اس کی جان مجرموں سے چھڑائی۔ تصوف میں ضیاء تسنیم بلگرامی کی ”دو صوفی“ کو پڑھا۔ ایک دیوانہ اور دوسرا فرزانہ...... بہت خوبصورتی سے لکھے گئے کردار۔ اللہ کے نیک بندوں کا زندگی نامہ پڑھا۔ بہت اچھا لگا۔ ”عقاب آب“ نے تاریخی صفحات پر جلوہ گر ہو کر ہمارے علم میں بہت زیادہ اضافہ کیا۔ تاریخ کے یہ پوشیدہ گوشے جن پر اتنے بھرپور انداز میں روشنی ڈالی گئی کہ مزہ آ گیا۔ شکریہ زویا صفوان صاحب۔ کہانی ”انہونی“ عمران قریشی نے بھی خوب لکھی۔ ہجرت کے وقت کے واقعات اور بیوی کی شوہر سے بے وفائی...... انجام آخرکار برا ہوا۔ شاعری نے بھی خوب لطف دیا۔ ہر شعر بامعنی اور خوبصورت تھا۔“

✠ ناہید یوسف، اسلام آباد سے تبصرہ کر رہی ہیں۔ ”ستمبر 22ء کا ٹائٹل اچھا لگا۔ سب سے پہلے بات ہو جائے ملک میں حالیہ تباہ کاریوں کی جس پر دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ ماحولیاتی تبدیلی کے باعث ہونے والی شدید بارشوں نے ملک میں تباہی مچا دی۔ جانی و مالی بہت نقصان ہوا۔ بلوچستان، پنجاب اور سندھ میں بھی سیلابی ریلوں نے متعدد جانیں لے لیں اور لوگ گھروں اور اپنے مال مویشیوں سے بھی محروم ہو گئے۔ ایسے میں سیاست دانوں نے اپنی خوب سیاست چمکائی۔ عوام بے چارے ایک وقت کے کھانے کے لیے ترستے رہے اور ان سے آئندہ الیکشن میں ووٹ کی یقین دہانی کے بغیر امداد نہیں دی گئی۔ کیسی بے حسی ہے، کیسی سفاکیت ہے۔ خدارا! اب بھی وقت ہے۔ اگر ہم نہیں سنبھلے تو شاید اس سے بھی بڑا نقصان اٹھالیں۔ بہرحال، جہاں برائی ہوتی ہے وہاں اچھائی بھی ہوتی ہے۔ ہماری افواج نے امدادی کام خوب کیے اور بے آسرا لوگوں کو خوراک کی فراہمی یقینی بنائی۔ دیگر فلاحی اداروں اور میڈیا نے بھی اپنے فرائض نبھائے اور لوگوں کی آواز بیرونِ ملک تک پہنچائی۔ دنیا بھر سے امدادی سامان کی آمد شروع ہو گئی ہے۔ بس امید

ہے کہ جن کا حق ہے، ان تک ایمانداری سے پہنچا دیا جائے گا۔ اللہ پاک اس ملک پر اپنا رحم فرمائے، آمین۔ زویا صفوان کی ''عقابِ آب'' کا اختتام خوب رہا۔ تاریخ سے آگاہی ہوئی۔ کہانی دلچسپ تھی۔ ''شہ زور'' بہت تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ معاذ دشمنوں سے نبرد آزما ہے اور ہمت جوان ہے۔ امید ہے کہ جلد معاذ اور سونیا تنظیم کو بہت بڑے نقصان سے دوچار کر دیں گے۔ کہانی اچھی جا رہی ہے، ویلڈن اسامہ جی! عاطر شاہین کی ''رونگ نمبر'' بہترین کہانی تھی۔ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ تک نے رونگ کال آنے پر بات کی اور کارلا کے جال میں پھنس گیا۔ کارلا نے تک کو چونا لگایا اور رفوچکر ہو گئی۔ شاہ ستان کا نام نیا ہے مگر کام بہت شاندار۔ ''جانباز'' وطن پرستی پر مبنی بہترین تحریر تھی، ویلڈن۔ ملک صفدر حیات کی ''گمشدہ'' اچھی کہانی تھی۔ سگے رشتے بھی بعض دفعہ ایسی داستان رقم کر جاتے ہیں کہ رشتوں پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ سگے بھائی اور حنیف کی بیوی نے مل کر حنیف کو قتل کر دیا اور دونوں دیور بھابی منہ کالا کرتے رہے۔ نہایت ہی شرمناک۔ انجام بھی بُرا ہی ہوا۔ جاوید بسام کی ''سرنگ میں'' بس ٹھیک لگی۔ ناہید سلطانہ کی ''تماشا گاہ عالم'' اچھی کہانی تھی۔ شیخ وارث جیسے سیاست دانوں کی شاہ خرچیاں اور اسی آبادی میں رہنے والے متوسط لوگوں کی قناعت پسندی۔ بے چارے خود تو صبر کے ساتھ گزار سکتے ہیں مگر بچوں نے جو دیکھا وہ پانے کی خواہش کی، ویلڈن ناہید جی! آپ کی کہانیاں معاشرتی عکاس ہوتی ہیں۔ ''جنگ باز'' میں سہراب کی جدوجہد چل رہی ہے۔ نادو اس کا بھرپور ساتھ دے رہی ہے۔ کہانی ہمیں اتنی خاص نہیں لگی۔ کہانی میں کچھ انوکھا نہیں، معذرت کے ساتھ۔ عیوق بخاری کی ''انگوٹھی'' بہترین کہانی تھی۔ مغالطے میں جان کے دشمن بننے والوں کو البرٹ نے اپنی حاضر دماغی سے گرفتار کروا دیا۔ بہت خوب۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ''دو صوفی'' ایمان افروز تحریر ہے۔ عمران قریشی کی ''انہونی'' بھی تقسیم کے وقت پر مبنی بہترین کہانی تھی، مزہ آ گیا۔ کاوش صدیقی کی کہانی ''مجھے چاندنی نواز دو'' اس ماہ کی سب سے اچھی اور بہترین کہانی رہی۔ گاؤں کے پس منظر میں لکھی تحریر نے موڈ ہشاش بشاش کر دیا۔ محفل شعر و سخن بھی خوب رہی۔''

⊕ انجم فاروق ساحلی کی لاہور سے آمد۔ ''امید ہے آپ اور ادارے کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ اس مرتبہ سسپنس کا ٹائٹل منفرد مگر رنگ شوخ استعمال نہیں ہوئے۔ انشائیہ حسبِ روایت فکر انگیز اور معاشرتی محرومیوں کا آئینہ دار تھا۔ خطوط بھی اچھے تھے البتہ ریاض بٹ صاحب کی کمی محسوس ہوئی۔ کہانیوں میں عقابِ آب، جانباز، رونگ نمبر، انگوٹھی، دو صوفی، گمشدہ اچھی کاوشیں تھیں۔ باقی کچھ تحریریں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ قیمت کے اضافے کے ساتھ صفحات بڑھا دیے جائیں۔ کم صفحات میں تشنگی محسوس ہوتی ہے (آپ کی بات اپنی جگہ مگر مہنگائی سے مقابلہ بہت مشکل ہو گیا ہے)۔ ملک میں سیاسی اور معاشی بحران کے نتیجے میں مہنگائی اپنے عروج پر ہے اور عوام مشکلات کا شکار تو تھے ہی، اوپر سے سیلاب اور بارشوں کی تباہ کاری نے سندھ، بلوچستان اور کچھ دیگر علاقوں کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے اور ان مشکلات سے نکلنے کی توفیق عطا فرمائے۔''

⊕ روبینہ اشعر، کراچی سے چلی آ رہی ہیں۔ ''گزشتہ ماہ معمول سے زیادہ بارشوں نے ملک کا نظام درہم برہم کر دیا تھا اور اب ملک بھر میں آئے سیلاب نے جو تباہی مچائی ہے اس پر دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ مایوس کن صورت حال یہ ہے کہ اربوں کھربوں روپے کی امداد ملنے کے باوجود عملاً سیلاب زدگان کے آنسو پونچھنے والا کوئی نظر نہیں آ رہا اور سیلاب کے متاثرین کھلے آسمان تلے بے یار و مددگار بیٹھے ہیں۔ صرف کچھ فلاحی تنظیمیں تو سرگرم نظر آ رہی ہیں مگر وہ بھی آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ المیہ تو یہ ہے کہ 2010ء میں آئے سیلاب کی تباہی کے بعد مستقبل میں ایسے سانحات کی روک تھام کے لیے کوئی پیش بندی نہیں کی گئی اور نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ اللہ پاک سیلاب زدگان کی مدد فرمائے اور ہمارے اربابِ اختیار کو عقلِ سلیم عطا فرمائے، آمین۔ ماہ ستمبر کا شمارہ حسبِ توقع جلد ہی مل گیا۔ سرورق کچھ خاص نہیں لگا۔ سرورق اور فہرست پر سرسری نظر ڈال کر جون ایلیا کے انشائیے سے مستفید ہوتے ہوئے سب سے پہلے زویا صفوان کی ''عقابِ آب'' پڑھی لیکن یہ کیا اتنی جلدی اتنی بہترین تاریخی کہانی کا اختتام کر دیا گیا۔ اختتام تو شاندار رہا لیکن اس نے اداس کر دیا۔ بہت عرصے بعد اتنی شاندار کہانی پڑھنے کو مل رہی تھی بہرحال ویل ڈن زویا جی! عبدالرب بھٹی کی ''جنگ باز'' اپنے تمام تر سسپنس اور کہانی میں ہر لمحہ نئے موڑ کے ساتھ جاری ہے۔ کہانی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ امید ہے آگے بھی سسپنس سے بھرپور ثابت ہو گی۔ عائشہ نصیر کی کہانی ''بعد از مرگ'' اچھی رہی۔ واقعی کبھی کبھی انسان محبت کے رستے پر چلتے چلتے اچانک سمت بدل کر نفرت کی راہ پر قدم رکھ دیتا ہے۔ عاطر شاہین کی ''رونگ نمبر'' دلچسپ

رہی۔ ''رونگ نمبر'' کو ''رائٹ نمبر'' سمجھ لینا سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ جدید دور کی ایجادات اور استعمال کے بارے میں ایک پُرفکر تحریر تھی۔ ماہ ستمبر کے حوالے سے شاہ ستان کی تحریر ''جانباز'' پُراثر تحریر تھی۔ واقعی مخلص اور بہادر لوگ ہر دور میں اور ہر روپ میں اپنا کردار بہترین طریقے سے ادا کرتے چلے آئے ہیں۔ ملک صفدر حیات کی ''گمشدہ'' بھی اچھی رہی۔ مجرموں کی چالاکیوں اور ملک صاحب کی کڑی تفتیش نے دفن شدہ رشتوں کی قبر پر خوشیوں کا تاج محل بنانے والوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔ ''سرنگ میں'' جاوید بسام کی کہانی میں ماورائی مخلوق کے پوشیدہ وجود کی حرکات و سکنات کا ماجرا پڑھنے کو ملا۔ اچھی تحریر تھی۔ ''تماشا گاہ عالم'' ناہید سلطانہ اختر کی زبردست کہانی تھی۔ معاشرتی ناہمواریوں کو اجاگر کرتی ہوئی ایک بہترین تخلیق، ویل ڈن۔ عیوق بخاری کی ''انگوٹھی'' بھی شاندار کہانی تھی۔ کاوش صدیقی کی ''مجھے چاندنی نواز دو'' نے متاثر کیا۔ بہترین کہانی، ویل ڈن۔ عمران قریشی کی ''انہونی'' بھی زبردست رہی۔ دیکھا جائے تو ماہ ستمبر کا پورا پرچہ ہی زبردست رہا۔ تصوف میں ضیا تسنیم بلگرامی کی ''دو صوفی'' بھی ایمان افروز تحریر رہی۔ پڑھ کر لطف آیا۔ محفل شعر و سخن میں اشعار کا انتخاب بہترین رہا۔

⊕ محمد اسحاق انجم، کنگن پور (قصور) سے خط لکھ رہے ہیں۔ ''بارشوں کے سلسلے ایسے چل نکلے ہیں کہ تھم ہی نہیں رہے۔ اللہ خیر کرے۔ ستمبر کا شمارہ تو بروقت مل گیا۔ ہم خط کچھ دیر سے ارسال کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ڈاک کا نظام بھی متاثر ہو رہا ہے۔ سرورق پر نظر پڑی تو عقاب اور مہتاب چہرہ ایک ساتھ دیکھا۔ مہتاب چہرہ، آنکھوں میں اداسی لیے پریشان کیونکہ کوئی بھونرا ''مہتاب چہرہ'' کو اداس کر کے نہ جانے کتنی داستانیں چھوڑ گیا۔ خطوط کی محفل میں محمد آذین رضوان کی آمد اچھی لگی۔ تبصرہ بھی خوب تھا۔ کاشف عبادی کی تعریف بھی، انہوں نے احسان کیا۔ سعید شاہ ندیم کی آمد لاہور سے۔ روبینہ اشعر، انجم فاروق ساحلی، محمد خواجہ صاحب حسبِ سابق محفل میں شاملِ اشاعت۔ ''عقابِ آب'' آخری حصے کے ساتھ پڑھنے کو ملی۔ دیگر کہانیوں میں بعد از مرگ، رونگ نمبر، جانباز، گمشدہ، جنگ باز اچھی رہیں۔ اسما قادری صاحبہ کچھ نازک پہلو شو نہ کریں۔ سلسلہ کئی جگہ پر توڑ پھوڑ کا شکار ہے خیال کریں۔ (بہت شکریہ جناب! تبصرہ مختصر مگر اچھا تھا)۔''

⊕ ملک وصی کی امید کراچی سے۔ ''ماہ ستمبر کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ سرورق کو سراہتے ہوئے فہرست پر سرسری نگاہ ڈالی اور پھر جون ایلیا کے انشائیے کو سر دھنتے ہوئے پڑھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے عبدالرب بھٹی کی ''جنگ باز'' پڑھی۔ کہانی میں دلچسپ موڑ آ رہے ہیں اور سسپنس پیدا ہو رہا ہے۔ زویا صفوان کی ''عقابِ آب'' کا اختتام بہترین رہا۔ امید ہے آئندہ بھی ایسی تاریخی اور دلچسپ تحریر پڑھنے کو ملے گی۔ عائشہ نصیر کی ''بعد از مرگ'' بہترین کہانی تھی۔ ''رونگ نمبر'' عاطر شاہین کی اچھی کاوش رہی۔ ''جانباز'' شاہ ستان کی تحریر کردہ اچھی کہانی لگی۔ ''گمشدہ'' ملک صفدر حیات کی کہانی بہترین رہی۔ ملک صاحب کی تفتیش کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ جب تک مجرم قانون کی گرفت میں نہیں آتا قارئین دل تھام کر کہانی پڑھتے ہیں۔ جاوید بسام کی ''سرنگ میں'' کچھ خاص نہیں تھی۔ ''تماشا گاہ عالم'' ناہید سلطانہ اختر کی بہترین کہانی ثابت ہوئی۔ عیوق بخاری کی ''انگوٹھی'' کچھ خاص نہیں لگی۔ ''دو صوفی'' ضیا تسنیم بلگرامی کی صوفیانہ تحریر اچھی رہی۔ عمران قریشی کی ''انہونی'' نے دل پر اثر کیا۔ اچھی تحریر تھی۔ ''مجھے چاندنی نواز دو'' کاوش صدیقی کی بہترین کاوش ثابت ہوئی۔ محفل شعر و سخن میں اشعار کا انتخاب خوب رہا۔''

⊕ یوسفی کا مختصر تبصرہ اسلام آباد سے۔ ''اگست 2022ء کا سسپنس پڑھا۔ جون ایلیا کا انشائیہ سلامتی کی راہ پڑھا۔ متاثر کن تھا۔ آپ کے خطوط کی نوک جھونک بھی دلچسپ تھی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے محبوب رائٹر مرزا امجد بیگ کی کہانی ''قصہ مختصر'' پڑھی جس نے سبق دیا کہ عقل بادام کھانے سے نہیں، دھوکا کھانے سے آتی ہے (آپ کی تحریر ملی۔ ایک چھوٹی سی درخواست ہے کہ آپ جس پرچے کے لیے کہانی لکھنا چاہتے ہیں، پہلے اسے پڑھ لیجیے...... اور یہ سمجھیے کہ اس کا انداز کیسا ہے۔ معذرت کہ آپ کی یہ تحریر سسپنس کے لیے مناسب نہیں ہے۔ البتہ آپ کوشش جاری رکھیے اور کوئی اچھی تحریر ارسال کیجیے۔ ان شاء اللہ ضرور جگہ ملے گی)۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے خطوط محفل میں شائع نہیں ہو سکے۔

صائمہ قمر، فیصل آباد۔ شبیر حسین چانڈیو، شہداد پور۔ محمد اکرم، جہلم۔ خاور اختر، ملتان۔ ثمینہ خالد، کراچی۔ حسنین میمن، حیدر آباد۔ میاں قمر شہزاد، لاہور۔ محمد ریاض انصاری، تلکوال (رکن)۔

عشق و سناں

اے آر راجپوت

جہاں تاریخ کے اوراق جنگ و جدل اور تخت و تاج کی رسا کشی کے واقعات سے بھرے ہیں وہاں تخت تاج پر بیٹھنے والے انہی شاہوں کے عشق کی خوشبو جگہ جگہ بکھری پڑی ہے... ان کے دل کا گداز اور محبوب کے آگے ان کی بے بسی دل میں عجیب سا سوز پیدا کر دیتی ہے... جبکہ دنیا میں ان کی سرکشی اور بہادری کے قصے زبان زد عام ہوتے ہیں... بس اسی کو زندگی کے نشیب و فراز کہتے ہیں... کہیں ہریالی اور کہیں ویرانی ڈیرا ڈالے ہوتی ہے... مگر تخت و تاج کا سفر کبھی نہیں رکتا۔ چنگیزی دور میں عشق کی دلگداز داستان اور بادشاہت ایک قوم سے دوسری قوم میں منتقل ہونے کے دہشت انگیز واقعات۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

خوارزم کے دارالحکومت خیوا کے شاہی دربار میں امیر تیمور کے ایلچی کی آمد کا اعلان ہوا تو خوارزم کے بادشاہ یوسف صوفی کے چہرے پر عجیب سا اضطراب پھیل گیا۔

اس نے بے چینی سے شاہی دربار کے بڑے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ امیر تیمور نے اس کے بھیجے ہوئے تحائف منظور کیے یا نہیں۔ اس نے بے قراری سے پہلو بدلا تھا۔

اسی لمحے امیر تیمور کا ایلچی اندر داخل ہوا۔ اگرچہ وہ مروجہ آداب شاہی بجالایا مگر اس کی حرکات و سکنات چغلی کھا رہی تھیں۔

''اس روئے زمین پر امیر تیمور سے بڑھ کر کوئی عظیم الشان شہنشاہ نہیں ہے۔''

ترکمان بادشاہ یوسف صوفی کے ماتھے پر بل پڑ گئے لیکن اس نے کمال ضبط سے کام لیا۔ ایلچی نے آگے بڑھ کر امیر تیمور کے بھیجے ہوئے قیمتی تحائف پیش کیے۔

''امیر تیمور نے شہنشاہ خوارزم کے بھیجے ہوئے تحائف قبول کر لیے ہیں اور بے حد مشکور ہے۔'' ایلچی نے دست بستہ ہو کر کہا۔ ''امیر نے درخواست کی ہے کہ بادشاہ کی دختر نیک اختر شہزادی خان زادی کا رشتہ امیر کے بڑے لڑکے جہانگیر سے طے کر دیا جائے۔''

یوسف صوفی تلملا اٹھا۔ اس کے ذہن میں خدشے نے سر اٹھایا کہ اس طرح امیر تیمور اسے اپنا باج گزار بنانا چاہتا ہے۔

''اس بادیہ پیما کی یہ جرأت کہ وہ ہماری بیٹی کا رشتہ طلب کرے۔'' یوسف صوفی کے لہجے میں تلخی اور تمکنت تھی۔

بوڑھے وزیر احمد نے زمانے کے خاصے سرد و گرم دیکھ رکھے تھے۔ وہ ٹھنڈے ذہن کا مالک تھا۔ اپنے آقا کا تند لہجہ دیکھا تو فوراً اپنے بادشاہ کے سامنے دوزانو ہو گیا۔

''حضور! اس پیغام پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں۔ ایسا کرنے سے ماوراء النہر کے امیر سے ہمارے تعلقات مضبوط ہو جائیں گے۔''

یوسف صوفی نے خاصی پُرطیش اور جلالی نظروں سے احمد کی طرف دیکھا پھر ایلچی سے مخاطب ہو کے اسی لہجے میں بولا۔

''میں نے خوارزم کو تلوار سے اور نوکِ سناں پر جیتا ہے اور اب بھی تلوار ہی اسے مجھ سے لے سکتی ہے۔''

☆☆☆

ایلچی واپس آ گیا۔

جواب سن کر امیر تیمور کی رگوں میں دوڑنے والا چنگیزی خون [illegible] و غضب کی آگ سلگ اٹھی۔ اب امیر تیمور کا رکنا مشکل تھا۔

یوں آناً فاناً امیروں اور سرداروں کو پیغامات بھیجے گئے۔ اس صحرا کے سینے پر اس کے قدموں کے نقوش ایک بار پہلے بھی پڑ چکے تھے۔ ایک ماہ کے اندر اندر اس کا لشکر خیوا کا محاصرہ کر رہا تھا۔

خیوا کو سر کرنے کے بعد تیمور ''اورگنج'' پہنچا۔ صوفی اب وہیں قلعہ بند ہو چکا تھا۔ یہاں منجنیقوں اور دوسرے محاصرہ شکن ہتھیاروں کی ضرورت تھی اور ان کے تیار کرنے کے انتظامات شروع کر دیے گئے۔

یہ انتظامات جاری تھے کہ صوفی کی طرف سے پیغام آ گیا۔

''ہم اپنے ساتھیوں کا خون کیوں بہائیں؟ کیوں نہ تم اور میں آپس میں فیصلہ کر لیں۔ جس کے ہاتھ دوسرے کے خون سے رنگے جائیں، وہی فاتح تصور کیا جائے۔''

یوسف صوفی کے پیغام رساں نے شہر کے صدر دروازے کے سامنے والا میدان اس مبارزت کے لیے منتخب کیا اور وقت کا تعین بھی کر لیا گیا۔

تیمور کے سرداروں نے یہ تجویز پسند نہیں کی۔ انہوں نے زوردار لہجے میں اصرار کیا۔

''امیر! لڑنا ہمارا کام ہے۔ آپ کا مقام تخت اور چتر شاہی سے حکم صادر کرنا ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ آپ اپنا مقام چھوڑیں۔''

ہر ایک نے اس مبارزت میں اس کی جگہ لینے کی درخواست کی مگر اس نے انہیں خوارزم کے بادشاہ کے پیغامات کی طرف متوجہ کیا کہ اس نے اسے للکارا ہے۔ اس کے افسروں کو نہیں۔

چنانچہ امیر نے پیغام رساں سے کہا کہ وہ ضرور صدر دروازے کے سامنے آئے گا اور اکیلا۔

☆☆☆

جب مبارزت کے لیے جانے کا وقت قریب ہوا تو تیمور کے افسروں کے چہروں پر گھبراہٹ تھی مگر ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر وہ اپنی تیاری میں مشغول تھا۔ ہلکی کڑی دار زرہ بازو پر ڈھالی، کمر بند تیغ اور سر پر سنہری کلغی دار آہنی خود سجائے جب وہ لنگڑا کر گھوڑے کی طرف بڑھا تو اس کے چہرے پر دلفریب مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

بہت کم لوگ یہ جانکاری رکھتے ہوں گے کہ امیر تیمور کا ہی یہ خاصہ تھا کہ وہ میدانِ محاذ میں بیک وقت دونوں ہاتھوں [illegible]

ہاتھ میں تلوار ہوتی اور دوسرے ہاتھ میں کلہاڑا۔ ایک ہی وقت میں وہ دونوں کو بہ خوبی چلانا جانتا تھا۔

بہرکیف، گھوڑے پر سوار ہو کر اس سے پہلے کہ وہ اگ میں ڈھیلی چھوڑتا، بوڑھے امیر العلماء زین الدین اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور افسروں کی صف سے نکل کر انہوں نے تیمور کے گھوڑے کی رکاب تھام لی اور درخواست کی کہ امیر ایک عام سپاہی کی حالت میں لڑنے نہ جائیں مگر امیر نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ تلوار نکال کر چپٹی طرف سے وار کیا۔ زین الدین وار بچانے کی غرض سے پیچھے ہٹے اور گر پڑے۔

وہ تن تنہا اپنے لشکر سے روانہ ہوا۔ منجنیقوں کی قطاروں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا ہزاروں سپاہیوں کی خاموش نگاہوں کے سامنے سے گزر کر درمیانی میدان میں صدر دروازے کے سامنے پہنچا۔

صدر دروازے پر خیوا والوں کا جو ہجوم تھا، انہیں مخاطب کر کے تیمور نے کہا۔

''اپنے بادشاہ یوسف صوفی سے کہو کہ امیر تمہارا منتظر ہے۔''

یوسف صوفی باہر نہ نکلا۔ تیمور تنگ آ گیا اور للکار کر کہا۔ ''جو اپنے عہد کا ایفا نہیں کرتا اس کی سزا موت ہے۔''

اس نے گھوڑے کی باگ موڑ دی اور آہستہ سے اپنے لشکر کو چلا۔ وہ غصے اور طیش میں بھرا ہوا تھا مگر اس کے تمام امیر، سردار اور افسر اس کے استقبال کو آگے بڑھے۔ ہزاروں نے لشکر سے نعرے بلند ہوئے۔ نقارے پر ضرب پڑی اور ہزاروں گھوڑے ہنہنائے۔

امیر تیمور کے الفاظ کو شاید تائید غیبی میسر تھی۔ یوسف صوفی جلد ہی بیمار پڑ گیا۔ اس واقعے کے چند دنوں بعد وہ اورگنج کے شاہی محل کے ایک آراستہ کمرے میں بسترِ مرگ پر پڑا ہوا زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا تھا۔

اس کے پلنگ کی پائینتی پر اس کی بیٹی خان زادی بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔ وہ قدرت کا ایک حسین شاہکار تھی۔

یوسف صوفی نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور چند لمحے کے لیے خان زادی کو خاموشی سے دیکھتا رہا پھر اچانک اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بولا۔

''ہمیں بہت افسوس ہے کہ ہم اپنی پھول سی بچی کو بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے۔'' وہ رکا اور ایک لمحے کے لیے متوقف ہونے کے بعد دوبارہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''بیٹی! ترکمان قبیلے کا خاص خیال رکھنا۔ اسے ہر [illegible]''

یہ کہتے ہوئے اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ خان زادی نے دلدوز چیخ ماری اور سسکیاں لیتی ہوئی اپنے باپ کی لاش سے لپٹ گئی۔

یوسف صوفی کے مرنے پر شہر کے دروازے کھول دیے گئے۔ فاتح فوج نقارے بجاتی ہوئی شہر میں داخل ہوئی اور شاہی محل کا محاصرہ کر لیا گیا۔

بوڑھا وزیر احمد، خان زادی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اس وقت مغموم کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔

''شہزادی صاحبہ! اگر اجازت ہو تو شاہی محل کی چابیاں تیمور کے افسروں کے حوالے کر دی جائیں؟'' احمد نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

خان زادی جیسے خیالوں سے چونکی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں چمک دکھائی دی جو جلد ہی معدوم ہو گئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

بوڑھے وزیر احمد نے اپنے قدم دروازے کی جانب بڑھائے مگر دروازے پر جا کر رک گیا اور مڑ کر خان زادی کی طرف دیکھنے لگا جو اب دبی دبی سسکیاں لے رہی تھی۔

یہ دیکھ کر احمد کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ وہ واپس لوٹ گیا اور شہزادی کے سر پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

''شہزادی صاحبہ! اب رونے سے کام نہیں بنے گا۔ آپ کو ہمت نہیں ہارنا چاہیے اور صبر سے کام لینا چاہیے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

امیر تیمور اور یوسف صوفی کے وزیروں کے درمیان طے ہوا کہ خان زادی کو جہانگیر کی دلہن کے طور پر روانہ کیا جائے اور خوارزم کو ایک صوبہ بنا کر جہانگیر کو وہیں کا حاکم بنا دیا جائے۔

☆☆☆

اہلِ سمرقند نے خان زادی کی آمد کو برسوں یاد رکھا۔ اورگنج کے ترکمان بادشاہ کی لڑکی کی پذیرائی انتہائی شان و شوکت سے کی گئی۔ مغربی دروازے کا خیابان قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا اور تیمور کے منقش فرش پر کمخواب اور اطلس کے تھان بچھے ہوئے تھے۔

ان کے استقبال کو مملکت کے وزیر، تواچی اور علمبردار علم اور چتر شاہی کھولے سجے ہوئے تھے۔ گھوڑوں پر سوار ایک طویل قطار میں کھڑے تھے۔ وہ شام اتنی حسین تھی کہ وقت کی گردش صدیوں اس کی یاد دل سے محو نہ کر سکی۔

غروب آفتاب کے وقت ہوا شامیانوں کو لوریاں دیتی ہوئی معلوم دیتی تھی۔ درختوں میں رنگین چراغ رنگ [illegible]

خیموں کے قریب اڑ کر چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

تیمور مہمانوں کی قطاروں کے درمیان پھر رہا تھا اور اس کے غلام مہمانوں کی دستاروں میں موتی اور جواہرات بکھیر رہے تھے۔

یوں گویا ہر شے مسحور کن تھی۔ وہاں غم واندوہ کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ بڑے شامیانے کی چھت آسمان کی صورت نیلے رنگ کی بنائی گئی تھی جس میں ہیروں کی چمک ستاروں کے ٹمٹمانے کا نقشہ پیش کرتی تھی۔

دلہن کا کمرا کمخواب اور زربفت کے پردوں سے آراستہ کیا گیا تھا اور اس کا پلنگ عہدِ قدیم کی شہزادی قدسیہ کے پلنگ کی طرح خوب صورت تھا۔

جہیز اور تحائف جو خان زادی اپنے ساتھ سسرال لائی تھی، وہ حسبِ دستور دکھائے گئے۔ تیمور نے ساتھ کے کمرے میں وہ تحائف سجا کر رکھوائے جو جہانگیر کی طرف سے دلہن کو پیش کیے گئے تھے۔

ان میں زریں کمر بند، زر و جواہر، لعل و گوہر، مشک نافہ، کمخواب، اطلس اور ململ کے تھان، قیمتی لبادے، بہترین گھوڑے اور حسین و چنچل کنیزیں شامل تھیں۔

رات گئے جب جہانگیر دلہن کے کمرے میں داخل ہوا تو خان زادی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ خوارزم کا چاند سمرقند کی زمین پر اتر آیا ہے اور اس وقت میری نظروں کے سامنے ہے۔" کہتے ہوئے جہانگیر نے خان زادی کا گھونگھٹ اٹھایا۔ وہ کسمسا سی گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

جہانگیر نے خان زادی کی خوب صورت ٹھوڑی کو اوپر اٹھایا۔ اس کے چاند سے چہرے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ بار حیا سے گھنیری پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ چند لمحے وہ اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

خان زادی نے جھجکتے جھجکتے اپنی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ اس کے سامنے اس کے خوابوں کا شہزادہ مسکرا رہا تھا۔ جہانگیر کا جی چاہا کہ وہ ان جھیل سی آنکھوں میں ڈوب جائے۔ یوں دونوں کی نظریں ٹکرائیں اور دھیرے سے جھک گئیں۔ دونوں زیر لب مسکرائے اور ایک دوسرے میں کھو گئے۔

☆☆☆

دوسرے دن شام ڈھلے تیمور نے جب جہانگیر اور خوارزم کی سیاہ زلفوں والی حسین شہزادی کو دیکھا تو اس کے ذہن میں الجائی کی آمد کا نقشہ گھوم گیا جب اس کی تمکنت [illegible]

پاس پہلی بار آئی تھی۔ اسے وہ وقت بھی یاد آیا جب ایک روز تمسخراً اس نے مسکرا کر کہا تھا:

"میرے سرتاج! اس سے زیادہ بدبختی کیا ہو سکتی ہے کہ اب آپ پیدل چل رہے ہیں۔"

الجائی کا خیال کیا آیا کہ اپنی کتابِ ماضی کا ایک ابتدائی باب امیر تیمور کی چشمِ تصور میں گھوم گیا۔

وہ اپنے کوسوں دور ماضی کے بانکپن اور لڑکپن میں چلا گیا۔ اس بات سے بے خبر کہ اب خان زادی کی صورت میں آگے کیا پیش آنے والا تھا۔ اگرچہ جہانگیر نے بھی اپنے باپ کی طرح خان زادی سے طوفانی عشق کیا تھا۔ نیز یہ کہ کن حالات میں تیمور اور الجائی، جہانگیر اور خان زادی کا یہ عشق پروان چڑھا تھا۔

☆☆☆

اب ہم خود بھی چشمِ تصور سے ماضی میں ایشیا کی اس عظیم شاہراہ کو دیکھ رہے ہیں جو سرزمین آفتاب (خراسان) کو جاتی ہے پھر سمرقند کی جانب روانہ ہو جائیں اور اپنے ذہن کو ساڑھے پانچ صدی پیچھے لے جا کر 1335ء پر مرکوز کر دیں۔

یہ ایک حسین، تابناک اور خوش باش ہے۔ دور افق کے پس منظر پر، پہاڑوں کے سلسلے بلند ہوتے ہوئے تختِ سلیمان کی چوٹی تک پہنچ رہے ہیں۔ دامنِ کوہسار کی پست و بلند پہاڑیاں ہری ہری گھاس سے ڈھکی ہوئی ہیں اور ان کے درمیان صاف شفاف اور ٹھنڈے پانی کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔

اس سرسبز پہاڑی خطے میں چرواہے بھیڑیں چراتے پھرتے ہیں اور اس سے ذرا نیچے دیہات کے قریب جہاں گھاس زیادہ گھنی ہے، مویشیوں کے ریوڑ چر رہے ہیں۔

دریا چونے کی چٹان میں بل کھاتا ہوا تیزی سے بہہ رہا ہے۔ اس دریا کو دریائے آمو کہتے ہیں۔ یہ صدیوں سے ایران اور توران یعنی شمال اور جنوب کے درمیان حدِ فاصل ہے۔

دریا پار شمال کی طرف توران ہے جس کی [illegible] گہرائیوں سے گھوڑے اور مویشی پالنے اور خود نما ٹولیاں والے خانہ بدوش ابھرے تھے۔

یوں اس دریا کے سوا اور کوئی حدِ فاصل نہیں ہے۔ اسی لیے اس سے شمال کی طرف واقع سرزمین کو ماوراء النہر یعنی دریا پار کا علاقہ کہتے ہیں۔

دریائے آمو کے اس پار شمال میں جب موسمِ بہار آتا تو پوری وادی سبزے سے روپوش ہو جاتی۔ کچے پکے اور لکڑی اور کچی اینٹوں کے مکانوں کو مختلف قسم کی بیلیں اپنی [illegible]

کے لوگوں نے اس دریا سے چھوٹی چھوٹی نہریں نکال لی تھیں جن سے وہ اپنی ہر قسم کی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ اس خوب صورت جگہ کو "سبزہ زار" کا نام دیا گیا لیکن امتدادِ زمانہ نے سبزہ کا "ہ" اور آگے کا "زار" محو کر دیا اور "سبز" زندہ رکھا۔ بعد میں یہ جگہ سبز کہلائی جانے لگی۔ تاریخ کا عظیم فاتح "تیمور" یہیں پیدا ہوا تھا۔

شہر سبز میں بلند و بالا میناروں کی بھی کثرت تھی اور ان پر جو عملہ تعینات تھا، اس کی یہ ذمے داری تھی کہ وہ چاروں طرف سے آنے والے قافلوں پر نظر رکھے اور اگر ان میں کوئی مخدوش قافلہ نظر آ جائے تو وہ اس سے تیمور کے باپ ترغائی کو مطلع کرتے۔ یوں سمرقند جانے کے لیے مسافروں کو بھی دریا عبور کرنا پڑتا تھا۔

دریا کے اس طرف پہلے شاہ بلوط کے گھنے جنگل سے گزرنا پڑتا پھر بھربھرے [illegible] اونچے پہاڑوں کی تنگ گھاٹی کا درہ آتا تھا جس میں آواز کی بازگشت آواز نکالنے والے کا مضحکہ اڑاتی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا نام دربند آہنیں (باب الحدید) تھا کیونکہ اس کے تنگ و تاریک راستے سے دو سے زیادہ اونٹ ساتھ ساتھ نہیں گزر سکتے تھے۔ یہاں دو مہیب چہرے دار کھڑے رہتے تھے جو مسافروں کے چہروں کو بغور دیکھتے تھے۔

یہ پہرے دار قوی الجثہ ہوتے تھے۔ آہستگی سے بولتے اور الفاظ کو طول دے کر ادا کرتے جیسے ہر لفظ سوچ سوچ کر بولا جا رہا ہو۔ ان کے جسم پر باریک کڑیوں دار زرہ اور سر پر خود اور خود پر گھوڑے کی دم کا طرہ ہوتا تھا۔ یہ ماوراء النہر کے سرحدی محافظ تھے۔

ترغائی کو اس علاقے کے چغتائی خان نے سبز اور نخشب کی حکومت دے رکھی تھی۔ اس حکومت کے عوض ترغائی، منگول خان کو سارا حساب بے باق کیا کرتا تھا۔

تیمور کا باپ ترغائی ایک دین دار آدمی تھا۔ اسے جنگ جوئی سے نفرت تھی لیکن اگر کبھی بدرجہ مجبوری لڑنا ہی پڑتا تو جنگ سے منہ موڑنا بڑی شرمناک بات سمجھتا تھا۔

جوانی پر پیری نے کمند ڈالی تو ترغائی اداس رہنے لگا۔ صوفیوں کی صحبت نے اسے تصوف پر مائل کر دیا۔ اس کے سامنے اس کا بیٹا تیمور تھا جس کی جفاکشی، دلیری اور بے چینی اسے کسی بات پر قانع نہیں رہنے دیتی تھی۔ ترغائی، تیمور کی فطرت کے اس پہلو سے کبھی خوش ہوتا اور کبھی ناخوش ہو جاتا۔ چنانچہ جب تصوف غالب آتا تو وہ ایک خاص لب و لہجے میں تیمور کو سمجھانے لگتا۔

"بیٹے! تو نہیں جانتا۔ یہ دنیا سونے کے اس پیالے کی طرح ہے جس میں سانپ اور بچھو بھر دیے گئے ہوں۔ میں خود تو اس دنیا سے تنگ آ چکا ہوں، تیرا پتا نہیں کیا حال ہے۔"

تیمور پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن کچھ ہی دیر یا دنوں بعد ترغائی پر ایک دوسری کیفیت طاری ہو جاتی۔ اس کیفیت میں ایک روز اس نے بڑے ولولے سے تیمور سے کہا۔

"بیٹے! شاید تجھے نہیں معلوم کہ چنگیز خان کے جدِ اعلیٰ میں سے ایک کا نام تومنین خان تھا۔ یہ اس وقت کی داستان ہے جب خانِ اعظم چنگیز خان ابھی پیدا نہ ہوا تھا۔"

سترہ اٹھارہ سالہ تیمور کی آنکھوں میں یکا یک چمک پیدا ہوئی اور اب وہ اپنے باپ کی باتوں میں غیر معمولی دلچسپی لے رہا تھا۔

ترغائی گردن جھکائے بڑی دلچسپی سے کہہ رہا تھا۔

"تومنین خان کے دو جڑواں بچے پیدا ہوئے۔ اس نے ان میں سے ایک کا نام کبل خان اور دوسرے کا جولی خان رکھ دیا۔ جب کبل خان اور جولی خان جوان ہو گئے تو ان دونوں نے ایک ہی رات ایک ہی جیسا خواب دیکھا۔

"کبل خان نے دیکھا کہ زمین اور آسمان کے درمیان ایک روشن ستارہ طلوع ہوا۔ اس کی روشنی بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے دوسرے تمام ستاروں کو مدھم کر دیا اور اپنی روشنی سے تمام روئے زمین کو بھر دیا۔ دوسرے بھائی جولی خان نے بھی یہی خواب دیکھا تھا مگر اس کا ستارہ نسبتاً چھوٹا تھا اور اس کی چمک بھی بڑے ستارے سے کم تھی۔ جب نجومیوں اور تعبیر بتانے والوں سے اس کی تعبیر پوچھی گئی تو انہوں نے متفقہ طور پر تعبیر دی کہ کبل خان کی نسل سے ایک عظیم بادشاہ پیدا ہوگا جو پوری دنیا فتح کر کے اپنی حکومت قائم کرے گا اور جولی خان کی اولاد وزیرِ اعظم بن کر نظم و نسق سنبھالے گی۔"

ترغائی اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ کئی لمحے کے لیے دم بخود سکوت طاری رہا۔ یہ سکوت درحقیقت ایک ٹھہراؤ کی سی کیفیت تھی۔ ایسی کیفیت جو سوچ اور گمان کو جنم دیتی ہے۔

دور قریب صحراؤں اور خیالی پہاڑیوں میں ہوا کے سنگ بادِ سموم چل رہی تھی۔ آسمان بظاہر خاموش تھا۔ زمین ریت اور بھربھری مٹی سے اٹی پڑی تھی۔ کون جانتا تھا کہ یہ گھڑی ایک عظیم فاتح کی نوید سناتی گھڑی ہے۔

اسی طرح ترغائی کی یہ لمحوں بھری خاموشی بھی معنی سے خالی نہ تھی۔ وہ دراصل یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کہانی میں [illegible]

تیمور کتنی دلچسپی لے رہا ہے۔ تیمور نے بے چینی سے پوچھا۔
"پھر کیا ہوا......؟"

ترغائی نے سر اٹھا کر جواب دیا۔ "بیٹے! یہ وہ باتیں ہیں جو میرے باپ نے مجھے بتائی تھیں اور میرے باپ کو اس کے باپ نے اور اس طرح سینہ بہ سینہ کبل خان اور جولی خان سے یہاں تک پہنچی ہیں۔ ان دونوں نے آپس میں یہ معاہدہ کیا کہ اگر ایسا ہوا تو اس معاہدے کی رو سے حکومت کبل خان کی اولاد میں رہے گی اور وزارت جولی خان کی اولاد کو ملے گی۔

"یوں اس عہد نامے کو کسی دھات پر کندہ کر کے محفوظ کر لیا گیا۔ بعد میں کبل خان کی نسل سے چنگیز خان پیدا ہوا جو جولی خان کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ میں زندہ رہوں یا مر جاؤں، اگر کبھی تو بڑے خان کے دربار میں جائے تو، تو اس معاہدے کی رو سے وزارت کا منصب طلب کر سکتا ہے۔" وہ پھر کچھ لمحہ خاموش رہ کر آگے بولنا شروع ہوا۔

"بیٹے......! میں نے تیرا نام تیمور رکھا تھا۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں نے یہ نام یونہی رکھ دیا تھا؟ ایسا نہیں ہے۔ میں نے کسی توقع پر تیرا نام رکھا تھا۔ تیمور، فولاد کو کہتے ہیں۔ تصوف اور طبیعت کی افسردگی نے مجھے موم بنا کے رکھ دیا تو میں نے اپنے بیٹے کو "فولاد" دیکھنے کی خواہش کی۔ تیرے جد امجد میں سے کسی نے بھی کبل خان جیسا کوئی خواب نہیں دیکھا۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تو کسی خواب کے بغیر ہی دنیا کا عظیم فاتح بن کر دکھا دے......؟ مرد کے لیے ایسا مشکل نہیں ہے۔ تو قبیلہ برلاس کی اس شاخ سے تعلق رکھتا ہے جسے قرادکین کہتے ہیں۔ قرادکین کا مطلب ہے خوب صورت! دنیا کی تسخیر بھی ایک خوب صورت کام ہے۔ یہ خوب صورتی خان اعظم چنگیز خان کے حصے میں آئی یا پھر اب پتا نہیں کس کے حصے میں آئے۔"

ترغائی نے بے چین تیمور کو ایک مقصد دے دیا...... اس کی فطرت کے مطابق مقصد۔ وہ سبز کے کوہساروں میں گھوم پھر کر یہ سوچتا رہا کہ وہ اپنے کام کی ابتدا کس طرح کرے؟

شہر سبز کے رہنے والوں میں گھڑ سواری عام تھی۔ قبیلے کے جوان کوئی مشغلہ نہ ہونے کی صورت میں سیر و شکار کو نکل جاتے۔ تیمور بھی ان کا ساتھ دیتا اور جب وہ اپنے شکار کا تعاقب کرتا تو یہ بات بالکل بھول جاتا کہ وہ کسی جانور کا پیچھا کر رہا ہے۔ اس وقت اس کے ذہن میں شکار کے بجائے کوئی طاقتور دشمن ہوتا اور جب وہ شکار کو مار گرا دیتا تو وہ اس خوشی سے سرشار ہوتا جو وہ اپنے کسی طاقتور دشمن کو زیر کر کے حاصل کر سکتا تھا۔

اس میں کوئی ایسی خاص بات ضرور پائی جاتی تھی کہ لوگ اسے غیر معمولی سمجھتے تھے۔ لڑکیاں اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتیں لیکن وہ اپنے دل میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ مسخر کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے، مسخر ہونے کے لیے نہیں۔

یوں ادھر ادھر سے آنے والے تجارتی قافلے جب سبز کی سرائے میں ٹھہرتے تو تیمور قافلے والوں میں بیٹھا گھنٹوں باتیں کرتا رہتا۔ وہ یہ فقرہ اکثر سنا کرتا تھا۔ ادیں سور یکین بو! (مرد کے سامنے ایک ہی راستہ ہوا کرتا ہے)۔

ان سے وہ کابل، خراسان، ایران، ہندوستان، چین اور ختا کے حالات معلوم کرتا رہتا۔ وہاں کے لوگ کیسے ہیں؟ لڑاکو یا امن پسند؟ تاجر یا کاشت کار؟ وہ محنتی ہیں یا تن آسان؟ کہاں کے لوگ بہادر ہیں اور کہاں کے بزدل؟ مال و دولت کن ملکوں میں پائی جاتی ہے؟ کاریگر اور ہنرمند کہاں زیادہ ہیں؟ ذہانت اور فراست کن کے حصے میں آئی ہے؟

اس کا باپ ترغائی جب لوگوں سے یہ سنتا کہ تیمور تاجروں سے باتیں کر رہا ہے تو اسے غصہ بھی آتا اور افسوس بھی ہوتا کیونکہ وہ اپنے خاندان میں کسی کا تاجر ہونا سخت ناپسند کرتا تھا۔

ان دنوں شہر سبز میں جمود طاری تھا۔ سرکش نوجوانوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں اور کون سی راہ اختیار کریں؟ انہوں نے تیمور میں قیادت کی صلاحیت محسوس کی تو اس کے ساتھ اپنا وقت گزارنے لگے۔

تیمور انہیں لے کر سیکڑوں میل کے دھاوے مار کر واپس آتا۔ ان دھاوں کے پیچھے تیمور کا ایک ہی مقصد کارفرما ہوتا تھا۔ وہ یہ کہ صلاحیتوں کو زنگ نہ لگنے دیا جائے۔

یوں تو شمال اور جنوب، مشرق اور مغرب میں تعلق تیمور کی حکومت تھی اور اس کا تعلق چغتائی خاندان سے تھا لیکن چند سالوں سے سمرقند اور اس کے گرد و نواح پر کازغان کی حکومت تھی۔

کازغان، چنگیز خان کا ہم نسب نہیں تھا لیکن اس نے خان اعظم کے خاندان کے حق میں چند ایسی گراں قدر خدمات انجام دی تھیں کہ بعد میں خانوں نے اس کو بڑی رعایتیں دیں۔ یہاں تک کہ کازغان نے بغاوت کی اور اپنے پورے علاقے کا خود مختار حکمراں بن گیا۔

سبز، سمرقند اور نخشب کے لوگ شمال سے آنے والے ازبک حملہ آوروں سے یوں ہی بہت تنگ رہتے تھے۔ جب

طاقتور کازغان نے انہیں منگولوں کے خوف سے بے نیاز کر دیا تو ادھر ادھر کے بہادروں اور منگولوں نے اس کے دربار کا رخ کرنا شروع کر دیا۔

درحقیقت تیمور سے کوئی صد سال پہلے سمرقند اور اس کے اطراف کے، بشمول سرائے سالی، تمام علاقے میں چنگیز خان کے منجھلے بیٹے چغتائی خان کی حکومت تھی۔ چغتائی کے قبضے میں جنوب افغانوں کا ملک اور تخت سلیمان کی پشت کے کوہستانی علاقے بھی تھے لیکن چغتائی کی اولاد زیادہ اہل ثابت نہ ہوئی اور صرف شراب و شکار سے دل لگا بیٹھی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تاتاری صوبیدار یکے بعد دیگرے خودمختار ہوتے چلے گئے اور چغتائی خوانین پسپا ہو کر شمال میں جا بسے۔

بہرکیف، تیمور بھی کازغان کے چرچے سنتا رہتا تھا لیکن وہ اس کے دربار میں بن بلائے مہمان کی حیثیت سے نہیں جانا چاہتا تھا۔

اثنائے راہ تیمور دوستوں کے ساتھ سیر و شکار میں مشغول رہا۔ ایک دن جب وہ سستانے کے لیے ایک پہاڑی چٹان پر بیٹھا تو اس نے چند سواروں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ تیمور سنبھل کر بیٹھ گیا اور اپنے خادم عبداللہ سے کہا۔

"ذرا دیکھنا تو، یہ کس قسم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ دوست یا دشمن؟"

عبداللہ نے انہیں دیکھ کر جواب دیا۔ "مجھے تو یہ نہ دوست معلوم ہوتے ہیں نہ دشمن۔ کھوجی ہیں اور کسی کی تلاش میں آئے ہیں۔"

آنے والے کُل پانچ تھے اور یہ سیدھے تیمور کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ تیمور اطمینان سے بیٹھا رہا لیکن دراصل وہ چوکنا ہو چکا تھا اور ہر خطرے سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ آنے والوں میں سے ایک نے قریب آ کر پوچھا۔

"ہم ترغائی کے بیٹے تیمور سے ملنا چاہتے ہیں۔"

تیمور نے نظریں بچا کر عبداللہ کو اشارہ کیا کہ وہ کچھ بتانے سے گریز کرے۔ عبداللہ نے پوچھا۔

"تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو؟"

ایک سوار نے جواب میں کہا۔ "امیر کازغان کے پاس سے۔"

اب تیمور خود مخاطب ہوا۔ پوچھا۔ "ترغائی یا اس کے بیٹے تیمور کے نام امیر کازغان کا کوئی پیغام؟"

سوار نے جواب دیا۔ "امیر کازغان نے بہادروں کی فوج جو تیار کی ہے اس میں مزید بہادروں کو بھی شامل کیا جا رہا ہے اور امیر کازغان کا خیال ہے کہ تیمور کی خاص شہرت اسے بہادروں میں شامل ہو جانے کا مستحق قرار دیتی ہے۔"

تیمور نے کہا۔ "تب پھر دوستو! تیمور تمہیں خوش آمدید کہتا ہے۔ ترغائی کا سفید محل تمہاری مہمان نوازی کا شرف حاصل کرے گا۔"

جب ان قاصدوں کو اچانک یہ معلوم ہوا کہ وہ تیمور ہی سے مخاطب ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے تیمور کے مضبوط اعضا، چمک دار سحر انگیز آنکھوں اور پُررعب چہرے کا جائزہ لے کر اپنے اپنے دلوں میں اس کی پُرشکوہ اور کشش انگیز شخصیت کا اعتراف کیا۔

قاصد امیر کازغان کے دو ہزار بہادروں سے اچھی طرح واقف تھے اور اب وہ تیمور کو ایک نظر دیکھ کر غیر مبہم لفظوں میں کہہ سکتے تھے کہ ترغائی کا بیٹا تیمور ان سب میں منفرد اور یکتا ہے۔

انہیں شہر سبز کے باہر سفید محل میں ٹھہرایا گیا اور کئی شاندار دعوتوں کے بعد یہ کہہ کر رخصت کر دیا گیا کہ امیر کازغان سے کہہ دو، ترغائی کا بیٹا تیمور امیر کی خدمت میں بہت جلد حاضر ہونے والا ہے۔

قاصد چلا گیا اور تیمور اپنے باپ کے بالا خانے کے حجرے میں داخل ہوا۔ اس وقت حجرے میں ترغائی کے پاس کوئی اور بزرگ بھی موجود تھے۔ یہ بزرگ ایک نیلے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ترغائی بزرگ کے قدموں میں بیٹھا تھا۔

تیمور کے قدموں کی آہٹ نے ترغائی کو چونکا دیا اور اس نے دروازے میں تیمور کو کھڑا دیکھ کر جلدی جلدی کہا۔ "تیمور! یہ میرے پیر و مرشد سید برکی ہیں۔ ان کے ہاتھوں کو بوسہ دے اور اگر مناسب سمجھو تو ان کی متابعت اختیار کر۔"

تیمور والہانہ انداز میں آگے بڑھا اور سید برکی کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ سید برکی نے پوچھا۔ "ترغائی! تو نے اس کا کیا نام لیا تھا ابھی؟"

ترغائی نے جواب دیا۔ "تیمور۔"

سید برکی نے کہا۔ "خوب! تو، تو تیمور ہے، فولاد! کیا تو جانتا ہے فولاد کب بنتا ہے؟ پہلے اسے آگ پر تپاتے ہیں اور جب یہ خوب سرخ ہو جاتا ہے تو اس پر چوٹیں لگائی جاتی ہیں۔ بہت سی مشکلات اور مصائب جھیل کر جب اس کی تلوار بنتی ہے تو یہ بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیتی ہے۔ تیرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوگا۔ تو فولاد بننے کی پہلی منزل پر قدم رکھ رہا ہے۔

—جا، وہی کر جس کا امیر کازغان تجھے حکم دے۔"

تیمور ہکا بکا رہ گیا اور سید برکی کو ولی مان لیا۔ اگر وہ ولی نہیں تھے تو امیر کازغان کے بلاوے کا علم انہیں کس طرح ہوا؟

سید برکی نے مزید کہا۔ "تیمور! یہ بھی یاد رکھ کہ جب تک تو اسلام کا تحفظ کرے گا، خدا بھی تیری حفاظت کرتا رہے گا۔"

اس کے بعد سید برکی نے خلافِ توقع کھڑے ہو کر تیمور کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے اپنی شال، ٹوپی اور ایک انگوٹھی تحفتاً پیش کی۔ انگوٹھی کا نگینہ عقیق کا تھا۔

اس کے بعد تیمور نے اپنے باپ کے کان میں کہا۔ "مجھے امیر کازغان نے بلایا ہے۔ وہ مجھے اپنے دو ہزار بہادروں میں شامل کرنا چاہتا ہے۔"

ترغائی نے خوشی سے جواب دیا۔ "جب پیرومرشد نے جانے کی اجازت دے دی تو میں کس طرح روک سکتا ہوں پھر یہ کہ بہادروں کے سامنے ایک ہی راستہ ہوتا ہے اور یہ راستہ ہمیشہ میدانِ جنگ کی طرف جاتا ہے۔ تو بھی بہادر ہے اور تجھے اپنے راستے کا اچھی طرح علم ہے۔"

☆☆☆

تیمور نے گھوڑوں کی قطار اور عبداللہ کو ساتھ لیا اور جنوب میں خراسان کی طرف روانہ ہو گیا۔ تیمور اور عبداللہ بس دو آدمی اور گھوڑوں کی ایک قطار۔

امیر کازغان والیِ ہرات کے خلاف فوج کشی کیے ہوئے تھا اور تیمور کو اسی محاذ پر پہنچنا تھا۔ وہ اونچے نیچے ہموار اور ناہموار راستوں کو طے کرتا ہوا خیموں کے شہر کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت تیمور گھٹنوں تک نرم چمڑے کا جوتا، نوک دار سفید ٹوپی اور باریک اعلیٰ قسم کے چمڑے کا جبہ پہنے ہوئے تھا۔ عبداللہ نے جنگل میں خیموں کا شہر دیکھ کر کہا۔

"آقا زادے! کہیں ہم دشمنوں کے قریب تو نہیں پہنچ رہے ہیں؟"

تیمور نے جواب دیا۔ "کیا والیِ ہرات میں اتنی ہمت ہے کہ وہ امیر کازغان کے خلاف اس طرح کھلے جنگل میں خیمہ زن ہو؟ ہرگز نہیں۔ وضع قطع ہر اعتبار سے تاتاری۔ دیکھو، وہ کتنی بے خوفی سے ہمیں آتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔"

اس نے خیموں کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں کہا۔ "اے میرے ہم قومو! میں شہر سبز اور نخشب کے صوبے دار ترغائی کا بیٹا تیمور ہوں اور امیر کازغان کی طلبی پر حاضر ہوا ہوں۔"

وحشی تاتاریوں نے اس عجیب و غریب نوجوان کو حیرت سے دیکھا جس کے جلو میں ایک نوجوان اور گھوڑوں کی قطار تھی۔ انہیں تیمور کی جرأت اور شجاعت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔ انہوں نے اسے عزت و احترام سے امیر کازغان کے خیمے میں پہنچا دیا۔ امیر کازغان نے اپنی جگہ سے اٹھے بغیر ہی مسکرا کر تیمور کا استقبال کیا اور کہا۔

"تیمور! تیرے خاندان کے بیشتر لوگ مسلمان ہو چکے ہیں جبکہ میں اور میرے بہت سے ساتھی اب بھی خانِ اعظم ہی کے طریقوں پر زندہ ہیں۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ مذہب بالائے طاق اور خون اور نسل کی وجہ سے ہم سب ایک ہیں تو یہ بات مذہب سے زیادہ وضع اور قابلِ اعتبار ہو گی یا نہیں؟"

تیمور نے جواب میں کہا۔ "خون اور نسل پر میں خود بھی فخر کرتا ہوں لیکن والی ہرات کا میرا ہم مذہب ہونا امیر کازغان کے لیے کوئی اندیشے کی بات نہیں ہے کیونکہ میدانِ جنگ میں حریفوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہاں دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں اور بس۔ اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔"

امیر کازغان اس جواب سے بہت خوش ہوا۔ اس نے تیمور کو ایک خاص خیمہ دیا جو اس کے خیمے کے ساتھ نصب تھا۔ یوں تیمور پوری خود اعتمادی سے اس خیمے میں فروکش ہو گیا۔ دو ہزار بہادر تاتاری ترغائی کے بیٹے میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔

حقیقت یہی تھی کہ وہ سب تیمور میں کوئی خاص کشش محسوس کر رہے تھے۔ امیر کازغان کے خاندان والے بھی اس نووارد کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

ان کی عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ بغیر آستینوں کا لمبا سا ریشمی جبہ، سر پر شوکلی (اونچی ٹوپی)، شوکلی کے اوپر کالر سا بنا ہوتا تھا اور اس کالر میں سفید لمبے لمبے پر لگے ہوتے تھے جب وہ چلتی تھیں تو ان کی شوکلی کے پر ہوا سے ہلنے لگتے تھے۔

یوں جب یہ خواتین تیمور کے سامنے سے گزرتیں تو وہ انہیں دیکھ کر اتنا خوش نہ ہوتا جتنا کوئی عام نوجوان ہو سکتا تھا۔ امیر کازغان بھی تیمور کی اس عادت کو بہ نظرِ غائر دیکھ اور محسوس کر رہا تھا۔

راتوں کو الاؤ روشن کیے جاتے اور بہادر تاتاری ان کے چاروں طرف بیٹھ کر داستان سرائی کیا کرتے یا دو تارے بجاتے۔ جب کوئی داستان سرا خانِ اعظم کے بڑے بننے کی داستان سناتا تو تیمور بڑی دلچسپی سے سنتا۔ اسی داستان سے اسے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ خانِ اعظم نے

اپنی بیوی بورتہ کو نوعمری میں پسند کر لیا تھا۔ وہ بورتہ جس نے جوجی، چغتائی، اوغدائی اور تولیا جیسے جیالے فرزند پیدا کیے اور جن کی نسل اس وقت بھی حکومت کر رہی تھی۔

ایسے موقعوں پر تیمور کچھ بے صبرا سا نظر آنے لگتا اور یہ کہہ کر اٹھ جاتا۔ "دوستو! ماضی کے خانِ اعظم کی داستان سرائی کب تک؟ کیا ہم میں ایک بھی ایسا نہیں جو خانِ اعظم جیسے کارنامے انجام دے کر داستان سراؤں کو نئی داستانوں سے روشناس کرائے؟"

الاؤ کے گرد موجود تاتاری سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ جاتے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ تیمور نے کیا کہا اور اس کا اصل مفہوم کیا ہے؟

دراصل ان کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ خانِ اعظم کے بعد کوئی اور بھی ایسے بڑے کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ خانِ اعظم تو [illegible] تھا۔ [illegible] دیوتاؤں کا بھیجا ہوا فاتح جس میں جاوداں [illegible] آسمان کی ساری قوتیں جمع کر دی گئی تھیں۔ کیا دوسرا ایسا ہو بھی سکتا ہے؟

والیِ ہرات کے خلاف جنگ جاری تھی۔ تیمور نے اس میں کچھ ایسے کارنامے انجام دیے کہ امیر کازغان اور تاتاریوں کے علاوہ خواتین میں بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔

ایک دن جبکہ تیمور امیر کازغان کے پاس بیٹھا باتوں میں مشغول تھا کہ کسی شخص نے اطلاع دی کہ چند ایرانی تاتاریوں کے گھوڑے اور سامان لوٹ کر فرار ہو گئے ہیں۔

امیر کازغان نے تیمور کی طرف دیکھا اور تیمور کی مدد کے لیے چند تاتاری مزید روانہ کر دیے۔

تیمور ان ایرانی لٹیروں کے تعاقب میں راستے کی اونچ نیچ کی پروا نہیں کر رہا تھا۔ ایک جگہ راہ میں خندق حائل ہو گئی۔ تیمور نے گھوڑے کی لگام کھینچ کر رانوں کا دباؤ سخت کرتے ہوئے جونہی ڈھیل دی، گھوڑے نے خندق پر چھلانگ لگا دی لیکن ناکام رہا۔

اس کے دونوں اگلے پیر خندق کے دوسرے کنارے پر گرے مگر بقیہ دھڑ اور پچھلی ٹانگیں خندق کے اندر گر گئیں۔ تیمور نے خطرے کا اندازہ لگا کر گھوڑے کے گرنے سے پہلے ہی چھلانگ لگاتے ہوئے گھوڑے کو چھوڑ دیا اور خندق کے دوسرے کنارے پر چڑھ گیا۔

اس کا اپنا گھوڑا نیم جان ہو کر خندق میں ڈھیر ہو گیا لیکن تیمور نے اس کی پروا کیے بغیر ایک سوار سے اس کا گھوڑا چھین لیا اور لٹیروں کے تعاقب کو جاری رکھا۔

اب اسے وہ لٹیرے صاف نظر آ رہے تھے۔ تیمور نے انہیں للکارا۔

"لٹیرو! اگر ذرا بھی غیرت ہے تو ٹھہرو، میں تمہاری سرکوبی کے لیے آ گیا ہوں اور اگر بے غیرت ہو تو بھاگتے رہو۔ بہرحال میں تمہیں تمہارے گھوڑوں سے کھینچ کر نکال لوں گا۔"

لٹیروں نے پیچھے مڑ کر تنہا تعاقب کنندہ کو دیکھا تو خوب ہنسے اور اپنے گھوڑوں کی رفتار سست کر دی۔ اتنی دیر تک تیمور ان کے سر پر پہنچ گیا اور تلوار کا بھرپور وار اس ایرانی کی گردن پر کیا جو ان میں سب سے زیادہ ہوشیار اور دلیر نظر آتا تھا۔ اس کا سر زمین پر گر گیا اور تقریباً سر کے ساتھ ہی لاشہ بھی گھوڑے کی پشت سے پھسل گیا۔

ایرانی بدحواس ہو گئے اور انہوں نے بے سوچے سمجھے تیمور پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ تیمور اب بھی اپنے حواس میں تھا اور خوب جانتا تھا کہ کس ایرانی کو کس جگہ زخمی کرنا چاہیے۔ اس کی برق خاطف نے آناً فاناً پانچ ایرانیوں کو خاک و خون میں لٹا دیا۔

ابھی یہ جنگ جاری ہی تھی کہ امیر کازغان کے بھیجے ہوئے دوسرے تاتاری بھی تیمور کی مدد کو پہنچ گئے۔ ایرانی بالکل بدحواس ہو گئے۔ انہوں نے لوٹ مار کے سامان سے لدے ہوئے گھوڑوں کو وہیں چھوڑا اور جس کا جدھر کو منہ اٹھا، فرار ہو گیا۔

تیمور نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

"خبردار! جوان گھوڑوں کو اِدھر اُدھر جانے دیا گیا۔ میں لٹیروں کے ان خالی گھوڑوں کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا جو ایرانیوں نے قتل ہو کر ہمارے حوالے کر دیے ہیں۔"

کچھ دیر بعد تیمور نے لوٹ کے سامان سے لدے ہوئے اپنے گھوڑے اور مقتول ایرانیوں کے خالی گھوڑے ساتھ لے کر سرائے کا رخ کیا جہاں امیر کازغان بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

یوں آج ان تاتاریوں کے دل تیمور نے پوری طرح قابو میں کر لیے تھے جنہوں نے اس کی شجاعت اور شہامت کا ایک غیر معمولی نظارہ اپنی آنکھوں سے کر لیا تھا۔

جب یہ لوگ واپس آ رہے تھے تو اپنے خیموں کے شہر سے کئی فرسخ پہلے جنگل میں ایک لڑکی نظر آئی۔ یہ لڑکی بھی گھوڑے پر سوار تھی اور اس کی سیاہ زلفیں دونوں کاندھوں پر بکھر رہی تھیں۔

وہ گھوڑے کو دوڑاتی بھگاتی تیمور کے قریب لے آئی اور مترنم آواز میں پوچھا۔

"اے صوبے دار ترغائی کے بیٹے! کیا کر رہا ہے؟"

تیمور اس پندرہ سولہ سالہ حسین و جمیل لڑکی کو نہیں پہچانتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں تیمور کو ایسا لگا گویا اس کی بورتہ اس کے سامنے کھڑی دعوتِ نظارہ دے رہی ہے۔

تیمور نے اپنے پیچھے اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے آخرکار لٹیروں کو پکڑ لیا اور ان کے سردار سمیت چھ آدمیوں کو خاک و خون میں لٹا دیا۔'' پھر ذرا دم لے کر آگے بولا۔ ''قصہ دراصل یہ ہے کہ میں خوامخواہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ میرے اس معمولی کارنامے کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جائے۔ میں نے چند لٹیروں سے اپنا مال واپس لیا ہے، کوئی شہر تو نہیں فتح کرلیا۔''

لڑکی کو تیمور کا انکسار اچھا لگا۔ بولی۔ ''بہرکیف، یہ کارنامہ تو ہے۔ تو خود اسے کوئی اہمیت دے یا نہ دے۔''

تیمور لڑکی سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے، کہاں رہتی ہے اور نام کیا ہے؟ لیکن یہ تکلف مانع تھا کہ کہیں لوگ یہ نہ کہنے لگیں، تیمور ایک لڑکی پر ریجھ گیا۔ بھلا یہ کیا بڑا آدمی بنے گا۔

لیکن باوصف اس کے لڑکی کا پتا معلوم کرنے کی خواہش اس کے تکلف اور جھجک پر غالب آ ہی گئی۔ اس نے بے اختیار پوچھ لیا۔

''لڑکی! تیرا نام؟ تو کہاں رہتی ہے اور اس ویرانے میں کیا لینے آئی ہے؟''

لڑکی ہونٹ بھینچ کر ہنسنے لگی، بولی۔ ''ایک سانس میں تین سوال۔ اگر میں تیرے سوالوں کے جواب نہ دوں تو؟''

تیمور نے جواب میں کہا۔ ''تب پھر میں صبر کرلوں گا اور جواب لیے بغیر ہی امیر کازغان کی خدمت میں چلا جاؤں گا۔''

لڑکی نے کہا۔ ''جب امیر کازغان تجھے لٹیروں کے تعاقب میں روانہ کررہا تھا، میں وہیں قریب ہی موجود تھی اور یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ تو اس مہم کو کس طرح سر کرتا ہے۔''

تیمور نے جواب میں کہا۔ ''میں نے اپنا کام بہت اچھی طرح انجام دیا ہے۔ میرا خیال ہے امیر کازغان بھی اسے سراہے گا۔''

لڑکی کی آنکھوں میں تیمور نے اپنائیت سی محسوس کی۔ وہ حیران تھا کہ آخر وہ کیا بات تھی جس نے لڑکی کے دل میں یہ خواہش پیدا کردی کہ وہ تیمور کو سونپی جانے والی مہم کا انجام معلوم کرے۔

بہرکیف، لڑکی نے مزید کوئی بات کہے بغیر تیمور پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور ''خدا حافظ'' کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگادی۔ لڑکی کے بڑے بڑے بال ہوا میں لہرانے لگے۔

تیمور اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ اس طرف گئی تھی جدھر امیر کازغان خیمے لگائے ہوئے تھا۔

تیمور چاہتا تو اس لڑکی کا پیچھا کرسکتا تھا لیکن اس نے ایسا قصداً نہیں کیا۔ وہ یا تو لٹیروں کا پیچھا کرسکتا تھا یا پھر دشمنوں کا۔ کسی لڑکی کا تعاقب کرتا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ یوں وہ اسی جگہ کھڑا رہ کر اپنے تاتاری ساتھیوں کا انتظار کرنے لگا جو اس کے پیچھے پیچھے چلے آرہے تھے۔ جب وہ لوگ آگئے تو تیمور انہیں ساتھ لے کر امیر کازغان کی خدمت میں چل پڑا۔

امیر کازغان نے اس کارنامے کو بہت سراہا اور تیروں سے بھرا ہوا ترکش انعام میں پیش کیا۔ بہادر تاتاری بھی بہت متاثر ہوگئے تھے۔ انہوں نے تیمور کے مقابلے میں خود کو کچھ اس طرح پیش کیا جیسے کوئی مداح اپنے ممدوح سے پیش آتا ہے۔ اسی مخصوص نشست میں امیر کازغان نے اعلان کیا۔

''میں ترغائی کے بیٹے تیمور کو سنگ باشی (یک ہزاری) مقرر کرتا ہوں۔''

تاتاریوں نے نعرۂ تحسین بلند کیا۔ تیمور نے شورِ تحسین پر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کردیا۔ امیر کازغان اور تاتاری یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید تیمور نعرۂ تحسین بلند کرنے والوں کو دیکھنے کی کوشش کررہا ہے مگر خود تیمور اپنے آس پاس اس لڑکی کو تلاش کررہا تھا جس نے آج ہی اسے بتایا تھا کہ جب امیر کازغان نے تیمور کو لٹیروں کے تعاقب میں بھیجا تھا تو وہ وہیں آس پاس موجود تھی۔ تیمور نے بڑی کوشش کی کہ وہ لڑکی نظر آجائے لیکن اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔

رات کو الاؤ روشن ہوئے تو داستان سرا نے اپنی جگہ سنبھالی اور سامعین نے اپنی اپنی جگہوں پر قبضہ کیا۔ وہیں تیمور بھی پہنچ گیا اور تاتاریوں نے اسے دیکھتے ہی احتراماً اپنی جگہیں پیش کیں لیکن تیمور داستان سرا کے مقابل جا بیٹھا۔

اس سے تیمور اس غرض سے آیا تھا کہ شاید ان محفلوں میں کسی طرح کوئی ایسا ذکر آجائے جس کی مدد سے وہ اس لڑکی کا پتا چلالے لیکن داستان سرا نے ایسی کوئی داستان سنائی ہی نہیں جس سے تیمور کی راہبری ہوتی۔ آخر تیمور نے حاضرین سے خواہش کی۔ بولا۔

''دوستو! کیا داستانیں سنتے سنتے تم لوگ تھک نہیں جاتے؟ کیا تم میں ایک بھی مطرب نہیں جو اپنے گیت اور آواز سے اداس دلوں میں زندگی کی حرارت پیدا کردے؟''

ایک پینتیس چھتیس سالہ مرد کھڑا ہوگیا۔ بولا۔

''ترغائی کے بیٹے! تیری خاطر کام میں کرسکتا ہوں۔ پہلے یہ بتا کہ تو مجھ سے کس قسم کا کلام سننا چاہتا ہے؟ طربیہ یا حزنیہ؟ میں دونوں سے لطف اندوز کرسکتا ہوں۔''

کچھ دیر بعد مطرب نے ایک ایسا گیت گانا شروع کردیا۔ اس گیت میں اس معشوق کی تعریف و توصیف کی گئی تھی جو اپنے ماحول میں جکڑی ہوئی تھی لیکن جب اس کے عاشق نے آواز دی تو اس نے رسم و رواج اور خاندانی روایات کو توڑ کر اپنے عاشق کی آغوش میں پناہ لی۔

تیمور حالتِ وجد میں یہ گیت سنتا رہا اور جب گیت ختم ہوگیا تو اس سے تیمور بے خبر ہی رہا۔ اب اس کے سینے میں ایک بھٹی جلنے لگی تھی۔ ایک لڑکی اسے یوں بے کل کردے گی، تیمور نے ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

وہ تاتاریوں کی محفل سے کچھ کہے بغیر ہی اٹھ آیا اور امیر کازغان کے خیموں کے آس پاس گھومنے پھرنے لگا۔ وہ اس وقت بھی اس لڑکی کو تلاش کررہا تھا۔ اس فکر میں چار دن اور چار راتیں گزر گئیں مگر وہ لڑکی کہیں دوبارہ نہیں نظر آئی۔

اسی دوران والیِ ہرات کو قید کرلیا گیا اور اس کے قلعے پر امیر کازغان کا قبضہ ہوگیا۔ قلعے کی تسخیر اور والیِ ہرات کی گرفتاری میں تیمور کی تدبیر اور کوششوں کا پورا پورا ہاتھ تھا۔ امیر کازغان اس سے اتنا خوش تھا کہ اس وقت تیمور اس سے جو کچھ بھی مانگتا، وہ تیمور کے حوالے کردیتا۔ امیر کازغان نے تیمور کے اعزاز میں بزمِ طرب جمائی اور اعلیٰ شراب کے مٹکے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے رکھوا دیے گئے۔

ان کے پاس بڑی بڑی صراحیاں رکھوا دی گئیں۔ ان صراحیوں میں شراب بھری ہوئی تھی۔ صراحیوں کے پاس ہی پیالے رکھ دیے گئے۔ خاص خاص تاتاریوں اور دوسرے معززین کے سواگت کا انتظام قریب کے ایک میدان میں کردیا گیا۔

والیِ ہرات اس وقت امیر کازغان کے پاس ہی موجود تھا۔ وہ بہت سہما ہوا تھا۔ جب تیمور اس کے پاس سے گزرا تو والیِ ہرات نے اسے آواز دی۔

''تیمور! اے ترغائی کے بیٹے! ذرا میری تو سنتا۔''

تیمور ٹھٹک کر والیِ ہرات کو دیکھنے لگا۔ والیِ ہرات نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ تیمور اس کے پاس چلا گیا۔ والیِ ہرات نے دھیرے سے پوچھا۔

''تیمور! کیا میں بزدل ہوں؟''

تیمور نے جواب میں کہا۔ ''نہیں تو، میں نے تو تجھے میدانِ جنگ میں شیر پایا ہے۔''

والیِ ہرات نے کہا۔ ''تب پھر تو اپنے امیر سے کہہ دے کہ وہ مجھ سے بہادروں جیسا سلوک کرے کیونکہ میں اس کا مستحق ہوں۔''

تیمور کو سفارش لینے اور کرنے سے یکساں نفرت تھی لیکن یہ والیِ ہرات کی خوش قسمتی تھی کہ امیر کازغان بھی اس کی بات سن رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے کہا۔

''ہرات کے مفتوح! تُو نے غلط آدمی کا سہارا لیا لیکن چونکہ میں خود تیرا اور تیمور کا احترام کرتا ہوں، اس لیے تیمور تیری سفارش کرے یا نہ کرے، میں تیرے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو ایک بہادر دوسرے بہادر سے کرتا ہے۔''

چند تاتاریوں کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ ان میں سے ایک نے تلخی سے کہا۔ ''امیر ہرات کا قلعہ تنہا تیمور نے سر نہیں کیا تھا۔ اس میں ہماری کوششیں بھی شامل تھیں۔ والیِ ہرات کو کوئی رعایت دینے سے پہلے ہم سے مشورہ ضرور کرلینا۔''

تیمور نے غصے سے کہا۔ ''تم سب امیر کازغان کے ملازم ہو اور امیر جو بھی فیصلہ کرے گا، ہم سب کو اسے خندہ پیشانی سے قبول کرلینا چاہیے ورنہ ہم سب انتشار اور نفاق کا شکار ہوجائیں گے۔''

ایک تاتاری نے تیمور کو خشمگیں نظروں سے دیکھا اور واشگاف لفظوں میں کہہ دیا۔

''والیِ ہرات ہمارا قیدی ہے اور ہم نے ابھی تک اس کے سازوسامان کا جائزہ نہیں لیا۔ امیر! کیا دشمنوں کو ان کے سازوسامان سے بے دخل کردینا اور اسے اپنوں میں تقسیم کرلینا ہم منگولوں اور تاتاریوں میں رائج نہیں ہے؟''

تیمور نے سخت لہجے میں کہا۔ ''رائج ہے اور یہ بھی رائج ہے کہ ہمارا خان جس کے بارے میں جو حکم بھی دے دے، اسے حیل و حجت کے بغیر مان لینا چاہیے۔''

امیر کازغان نے حکم دیا۔ ''تم سب چپ ہوجاؤ اور میرا فیصلہ سنو۔''

تیمور اور تاتاری خاموش ہوگئے۔ امیر کازغان نے مضبوط اور مستحکم آواز میں اعلان کیا۔ ''میں نے والیِ ہرات کو معاف کیا۔ اپنے دستور اور اصول کے مطابق میں نے والیِ ہرات کے سازوسامان کو خود پر حرام کرلیا ہے۔ کوئی بھی تاتاری یا میرا کوئی آدمی والیِ ہرات کے سامان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔''

ایک تاتاری نے احتجاج کیا۔ ''لیکن امیر! یہ کس طرح ممکن ہے؟''

امیر کازغان نے جواب دیا۔ ''میں نے جو فیصلہ

کر دیا، سو کر دیا۔ اب رہی یہ بات کہ یہ کس طرح ممکن ہے تو سن لو، یہ اس طرح ممکن ہے کہ یہ فیصلہ میں نے کیا ہے۔"

ایک تاتاری بدستور اڑا رہا۔ بولا۔ "والی ہرات کے ساز و سامان میں سے جو شخص بھی اپنا حصہ چھوڑنا چاہے چھوڑ دے لیکن جو اپنا حصہ نہیں چھوڑنا چاہتا وہ میرے پاس آجائے۔ جب میں اپنا حق چھینوں گا تو وہ بھی اپنا حق چھین سکتا ہے۔"

امیر کازغان نے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اگر ذرا سے مال کے لیے ہم لوگ یوں لڑنے جھگڑنے لگیں تو ہمارا اتحاد پارہ پارہ ہوجائے گا اور ہم اس لائق بھی نہیں رہیں گے کہ اپنا علیحدہ وجود قائم کرسکیں۔"

لیکن جھگڑالو تاتاریوں پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان میں سے ایک بولا۔ "امیر! میرا فیصلہ بھی سن لو۔ میں اپنا حق نہیں چھوڑ سکتا۔ اس دنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا حق ناخن بھر بھی چھوڑ دے تو اسے اپنا بہت بڑا حق چھنوانے کا انتظار کرنا چاہیے۔ امیر! سن لو، میں اپنا حق نہیں چھوڑ سکتا۔ کسی قیمت پر کسی طرح بھی نہیں۔"

دوسرے تاتاری نے کہا۔ "دوست! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جو بھی کہو گے، اس پر عمل کروں گا۔"

تیمور نے ان دونوں کو ڈانٹا۔ "میرے ہم قومو! تم کتنے لالچی ہو۔ ایک ذرا سے مال کے لیے تم امیر کازغان کو ناراض کیے دے رہے ہو۔ واللہ اگر تم دونوں نے سرکشی اختیار کی تو میں تنہا تمہیں ٹھیک کردوں گا۔"

دونوں تاتاریوں نے گھور کر تیمور کو دیکھا اور وہاں سے چلے گئے۔

امیر کازغان نے تیمور کو سمجھایا۔ "تیمور! ان دونوں سے ہوشیار رہنا کیونکہ انہیں چھپ کر وار کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔"

تیمور نے جواب میں کہا۔ "خطرہ مجھ سے زیادہ امیر کو ہے کیونکہ میں یہاں عارضی مہمان ہوں۔ ان کا واسطہ امیر کازغان ہی سے رہے گا اور پھر یہ کہ والی ہرات کی رہائی اور اس کے مال و اسباب کو ہاتھ نہ لگانے کا فیصلہ امیر نے کیا ہے، میں نے نہیں۔ میں نے تو امیر کی تائید کی ہے۔"

امیر کازغان نے بے پروائی سے کہا۔ "اس قسم کی رنجشیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ان سرکش قبائل کو ایک رکھنا خان اعظم ہی کا کام تھا۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ ان کے دلوں سے کدورت نکال دوں۔"

تیمور نے پوچھا۔ "میرا کام ختم ہوگیا یا ابھی باقی ہے؟"

امیر کازغان نے حیرت سے سوال کیا۔ "کیوں؟ کیا تو واپس جانا چاہتا ہے؟ آخر کیوں؟ شہر سبز میں کیا کرے گا واپس جا کر؟"

تیمور نے صاف صاف خواہش بیان کردی۔ بولا۔ "امیر! میں برلاسوں کی سرداری چاہتا ہوں۔ امیر کازغان کی طرف سے اگر یہ اعلان کردیا جائے کہ اس نے ترغائی کے بیٹے تیمور کو برلاسوں کا سردار بنا دیا ہے تو کوئی اس اعلان کے خلاف دم بھی نہیں مارے گا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ میں برلاسوں کی سرداری کا اہل بھی ہوں یا نہیں تو امیر کو میری صلاحیتوں اور اہلیت کا خوب اچھا اندازہ ہوچکا ہے۔"

امیر کازغان کو تیمور کی یہ بات اچھی نہیں لگی کیونکہ اس کو تیمور کی اس خواہش میں بھی جھگڑالو تاتاریوں کی خوبو محسوس ہو رہی تھی۔ اس کو اپنے تجربے سے یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ جو لوگ بہت جلد امیر یا سردار بننے کا خواب دیکھنے لگتے ہیں وہ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔

ابھی تیمور کی عمر ہی کیا تھی؟ یہی کوئی بیس اکیس سال۔ اس نوعمری میں برلاسوں کی سرداری کا خواب دیکھنا بڑی خطرناک بات تھی۔ اس نے ٹالنے کے لیے جواب دیا۔

"تو اپنے باپ ترغائی کی موجودگی میں برلاسوں کا سردار کس طرح بن سکتا ہے؟"

تیمور نے کہا۔ "میرے باپ میں امارت کی کوئی بات ہی نہیں۔ وہ ایک صلح جو، امن پسند صوفی ہے۔ وہ جو کچھ بننا چاہتا تھا بن چکا۔ اس لیے اب میں جو کچھ بننا چاہتا ہوں، امیر کازغان کو اس میں میری مدد کرنا چاہیے۔"

امیر کازغان نے دوسرا عذر پیش کردیا۔ "برلاسوں کی سرداری کا دوسرا امیدوار حاجی سیف الدین برلاسی ہے۔ وہ ایک پُرجوش اور سرپھرا جنگجو ہے۔ اگر میں نے تیری سرداری کا اعلان کردیا تو سارے برلاس، حاجی برلاس کے جھنڈے تلے کھڑے ہوکر تیری سرداری کا مذاق اڑائیں گے۔ اس لیے میرا ایک نکتہ یاد رکھ! سرداری کسی سے مانگی نہیں جاتی، زبردستی حاصل کی جاتی ہے۔ خان اعظم نے بھی اسی طرح حاصل کی تھی اور میں بھی اسی طرح امیر بنا ہوں۔ جن کی سرداری کسی اور کی مرہونِ منت ہوتی ہے وہ عارضی اور ناپائیدار ہوتی ہے۔"

امیر کازغان کی باتیں تیمور کے دل میں اتر گئیں لیکن وہ ان مفید مشوروں کے پیچھے موجود رشک و حسد کو بھی اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔

بہرکیف اس کے بعد اس نے امیر کازغان سے کچھ بھی نہیں مانگا۔ اس نے قطعی فیصلہ کرلیا تھا کہ اسے جو کچھ بھی

حاصل کرنا ہوگا، اپنی فکر و تدبیر اور قوتِ عمل سے حاصل کرے گا۔

وہ علی الصباح اٹھ کر دریائے آمو کے ساحل پر چلا گیا۔ اس نے جنوب میں نظریں گاڑ دیں کیونکہ اسے معلوم تھا کہ حدِ نظر ادھر ایران تھا جہاں کی شاعری، قالین سازی اور برتنوں پر خوب صورت نقش و نگار، حسین باغات اور پھولوں کی بڑی شہرت تھی۔

وہ ایران کے بارے میں سوچتے سوچتے جب زور زور سے سانسیں لیتا تو اسے یوں محسوس ہوتا گویا ایرانی باغات اور پھولوں کی ملی جلی خوشبوئیں اس کی لپٹیں ہوا کے دوش پر اڑی چلی آرہی ہیں۔

اس نے ایران کے [illegible] فاتح سائرس اعظم کی حکایات بھی سنی تھیں۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ خان اعظم اور سائرس اعظم [illegible] بڑے کارنامے انجام دینے کی کوشش کرے گا۔

آمو میں چند کشتیاں متضاد سمتوں سے آجا رہی تھیں۔ دریا کے دونوں کناروں پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ آنے کے لیے بھی اور جانے کے لیے بھی۔ اچانک ایک گھوڑا اس کے قریب آکر رک گیا۔ اس پر سے سوار کود کر تیمور کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ پوچھا۔

"یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟"

تیمور گھبرا گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کو وہ کئی دن سے تلاش کر رہا تھا اور بالآخر مایوس ہوگیا تھا۔

تیمور نے محبت بھری نظروں سے لڑکی کو دیکھا اور پُرشوق لہجے میں کہا۔ "آخر تو تھی کہاں؟ میں نے تو امیر کازغان کے آس پاس بھی تجھے تلاش کیا مگر تو کہیں نظر ہی نہ آئی۔"

لڑکی نے شوخ لہجے میں جواب دیا۔ "حالانکہ میں وہیں تمہارے قریب ہی موجود تھی۔ کیا ان جھگڑالو تاتاریوں نے امیر کازغان کا یہ فیصلہ ماننے سے انکار نہیں کردیا تھا کہ والی ہرات کو رہا کرکے اس کے سامان کو ہاتھ بھی نہ لگایا جائے۔"

تیمور اس کی بات سن کر دنگ رہ گیا۔ اسی لہجے میں بولا۔ "بخدا تو انسان تو ہرگز نہیں۔ کہیں تو کوئی نوری مخلوق کی انسانی تجسیم تو نہیں؟ کیا وجہ ہے کہ تو، تو سب دیکھ اور سن لیتی ہے لیکن میں نہ تو تجھے دیکھ سکتا ہوں اور نہ سن سکتا ہوں؟"

لڑکی نے شوخی سے کہا۔ "اور یہ بھی سنو، تم نے امیر کازغان سے برلاسوں کی سرداری بھی مانگی تھی لیکن ترغائی اور حاجی برلاس کی موجودگی میں امیر کازغان ایک بیس [illegible]

سکتا ہے؟ پھر یہ کہ سرداری کوئی مانگنے کی چیز ہے؟ یہ تو زبردستی حاصل کرنے کی چیز ہے۔ تمہیں امیر کازغان کا یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنا ہوگا۔"

اب تو تیمور نے اپنا سر پکڑ لیا اور بڑے ہی جذباتی لہجے میں بولا۔ "لڑکی! اگر تو یہ نہیں بتائے گی کہ تو کون ہے اور کہاں رہتی ہے تو میں پاگل ہوجاؤں گا۔"

لڑکی نے ہنس کر جواب میں کہا۔ "آؤ، ہم دونوں درختوں کے کنج میں بیٹھ کر کچھ باتیں کریں۔"

تیمور شرمندہ ہوا کہ یہ پیشکش اسے کرنا چاہیے تھی نہ کہ لڑکی کو۔

بہرکیف دونوں نے اپنے اپنے گھوڑوں کی لگامیں پکڑلیں اور درختوں کے ایک باغ کی طرف چل پڑے۔ باغ کے گرد چھوٹی سی دیوار کھڑی کردی گئی تھی۔ دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ کر دیوار کو پھلانگ گئے۔ باغ کے اندر زمین سبزے میں دبی ہوئی تھی اور اخروٹ کے درختوں کے علاوہ شہتوت اور انگور کی بیلوں نے جگہ جگہ سائبان سے تان رکھے تھے۔ پورے باغ میں بیلوں کا جال بچھا ہوا تھا اور بڑے بڑے درختوں کے چاروں طرف گول گول تھالے پانی سے لبریز تھے۔

وہ دونوں گھوڑوں سے اتر کر سبزے پر بیٹھ گئے اور گھوڑوں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ جہاں بیٹھے تھے وہ جگہ شہتوت اور انگور کی بیلوں کے سائبان تلے تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

تیمور نے کہا۔ "لڑکی! پتا نہیں میں کب واپس چلا جاؤں۔ شہر سبز میں میرا بوڑھا باپ ترغائی میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ یوں بھی وہ دنیا سے بہت بیزار ہے۔ جب وہ اپنے آس پاس مجھے نہ دیکھتا ہوگا تو بہت پریشان ہوجاتا ہوگا۔"

لڑکی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "تمہارا کام تو غالباً ختم ہوچکا پھر تم خوامخواہ کیوں ٹھہرے ہوئے ہو؟ اپنے بوڑھے باپ کے پاس واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟"

تیمور نے بڑی بے بسی سے کہا۔ "کیا میں واپس چلا جاؤں؟ تیرے بارے میں جانے بغیر ہی واپس چلا جاؤں؟"

لڑکی نے کہا۔ "تم میرے بارے میں کچھ جان کر کرو گے بھی کیا؟"

اس کی بات پر تیمور پہلو بدلنے لگا۔ بولا۔ "میں تیرے بارے میں کچھ جان کر کیا کروں گا؟ یہ تو نے کیا کہہ دیا لڑکی؟ کیا تو نے میری آنکھوں میں اپنے لیے کچھ محسوس نہیں کیا؟"

لڑکی نے تیمور کی آنکھوں میں [illegible] کہا۔

''تیری آنکھوں میں تو میں نظر آ رہی ہوں۔''

تب ہی تیمور نے فوراً کہا۔ ''بے شک، میری آنکھوں میں تیرے سوا کوئی بھی نہیں۔ لڑکی! مجھے تکلف نہیں آتا اور نہ ہی میں شاعروں کی طرح اشاروں کنایوں میں بات کر سکتا ہوں۔ میں صاف صاف اور سیدھے سبھاؤ یہی کہوں گا کہ تو مجھے بڑی اچھی لگتی ہے، بہت اچھی اور جب ایک مجھ جیسا جنگجو اور کم گو کسی لڑکی سے یہ کہہ دے کہ وہ اسے بہت اچھی لگتی ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہوگا۔ وہ یہ کہ اسے لڑکی پسند آ گئی ہے اور وہ اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے۔''

لڑکی نے شرم سے سر جھکا لیا اور مسکرا کر دھیرے سے اسی لہجے میں بولی۔ ''تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو؟''

اس پر تیمور نے بڑی بے صبری سے کہا۔ ''ہاں، میں تجھ سے محبت کرنے لگا ہوں۔ بالکل چنگیز خان کی طرح۔ اس نے بھی بورتہ کو اس وقت پسند کر لیا تھا جب کہ وہ صرف بارہ سال کی تھی۔''

لڑکی نے کہا۔ ''لیکن وہ خان اعظم چنگیز خان تھا۔''

تیمور نے فوراً جواب میں کہا۔ ''نہیں، اس وقت وہ خان اعظم نہیں تھا۔ اس وقت وہ صرف تموجن تھا اور بورتہ کے خیمے میں اس کا باپ بھی ساتھ تھا۔ یعنی اس وقت تک تموجن کو اپنے قبیلے کی سرداری بھی نہیں ملی تھی۔''

لڑکی نے پوچھا۔ ''کیا تم بھی تموجن ہی جتنا نام پیدا کر سکتے ہو؟''

تیمور نے فوراً جواب دیا۔ ''اگر میں یہ کہوں کہ ہاں، تو میری اس بات پر یقین کون کرے گا حالانکہ تیرے اس سوال کا میرے پاس ایک ہی جواب ہے کہ ہاں، میں بھی تموجن جتنا نام پیدا کروں گا، ضرور پیدا کروں گا لیکن میں خان، بادشاہ یا شہنشاہ ہرگز نہیں بنوں گا کیونکہ خان، بادشاہ یا شہنشاہ، فاتح عالم سے بڑے نہیں ہو سکتے۔''

لڑکی نے بڑی بے چینی سے سر اٹھا کر تیمور کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''فاتح عالم؟ تم فاتح عالم بننا چاہتے ہو؟ سچ؟''

تیمور نے جواب میں کہا۔ ''لڑکی! میں اتنی ہی بات کرتا ہوں جتنی کر سکتا ہوں یا جتنی میرے بس میں ہوتی ہے۔''

لڑکی کو تیمور کی باتوں پر کچھ کچھ یقین ہو چلا تھا۔ اس نے پھر تشکیک سے کہا۔ ''لیکن جب تک خان اعظم کی اولاد حکومت کر رہی ہے، کوئی دوسرا شخص کس طرح فاتح عالم بن سکتا ہے؟''

تیمور نے جواب دیا۔ ''لڑکی! تیرے اندیشے وہی ہیں جو اس گفتگو [illegible]

معلوم ہونا چاہیے کہ چنگیز خان نے کوہستان الطائی کے مشرق اور شمال مشرق کے جن قبائل کو یکجا کیا تھا، ان ہی میں جھیل بیکال کے جنوب میں بسنے والے تاتاری بھی شامل تھے اور چنگیز خان سے پہلے تاتاریوں میں بھی تو کوئی نہ کوئی سردار موجود ہوگا پھر یہ تاتاری، تومن خان ہی کی اولاد تو ہیں۔ تومن خان کے بڑے بیٹے کبل خان کی نسل سے تموجن تھا اور تومن خان کے چھوٹے بیٹے جونی کی نسل سے میں ہوں۔ اگر تموجن، چنگیز خان بن سکتا ہے تو میں بھی فاتح عالم بن سکتا ہوں۔''

لڑکی نے جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں اور چھیڑنے کی نیت سے بولی۔

''شاید......''

تیمور برا مان گیا۔ غصے میں کھڑا ہو گیا۔ اسی لہجے میں بولا۔ ''شاید نہیں لڑکی، یقیناً۔ تو نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے۔ میں نے تجھ سے اظہار عشق کیا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تو مجھے کوئی معمولی آدمی سمجھنے لگے۔'' پھر اپنے سر کو پکڑ کر شان سے بولا۔

''میرا یہ سر، جو یوں بھی بہت بڑا ہے، اس میں خدا نے غیر معمولی عقل رکھ دی ہے اور میں اپنی نوعمری کے باوجود یہ جانتا ہوں کہ اس بڑے سر کو زیادہ بڑا کس طرح کیا جا سکتا ہے۔''

لڑکی نے کہا۔ ''ارے تم تو میرے مذاق کا برا مان گئے۔ بیٹھو تو۔ اگر تمہارا سر بڑا ہے اور اس بڑے سر میں خدا نے غیر معمولی عقل بھی رکھ دی ہے تو اس غیر معمولی عقل کو غصے اور اشتعال سے بچائے رکھو۔ غصے اور اشتعال کو تحمل اور برداشت کے پانی سے بجھاتے رہو۔''

اس کی بات سن کر تیمور دوبارہ بیٹھ گیا۔ بولا۔ ''خبردار! جو تو نے میرے عزائم کا مذاق اڑایا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ تو کون ہے اور میں تجھے اپنی بیوی بنا سکوں گا تو میں تجھے ایک بڑے مزے کی بات بھی بتاتا۔''

لڑکی نے کہا۔ ''واہ، یہ خوب رہی کہ تم فاتح عالم تو بن سکتے ہو مگر مجھے اپنی بیوی نہیں بنا سکتے۔ یہ کیا بات ہوئی؟''

تیمور نے جواب دیا۔ ''جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ تو کون ہے، تجھے اپنی بیوی بنانے کا خیال کس طرح اپنے دل میں لا سکتا ہوں؟''

لڑکی نے کہا۔ ''اچھا وہ مزے کی بات تو بتا ہی دو اب۔''

تیمور نے جواب دیا۔ ''نہیں، وہ بات میں کسی اور کو نہیں بتا سکتا کیونکہ وہ بات اتنی بڑی اور بھاری ہے کہ کوئی [illegible]

اس لیے اٹھا سکے گی کہ وہ میری بیوی ہوگی۔ تیمور کی بیوی، فاتح عالم کی بیوی، مستقبل کے فاتح عالم کی بیوی۔''

لڑکی نے ناگواری سے منہ بنایا، بولی۔ ''اگر وہ ایسی ہی کوئی بات ہے تو اس کا مجھ سے ذکر بھی نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

ادھر تو یہ دونوں اسی قسم کی گفتگو کرتے رہے اور دوسری طرف ان کے گھوڑوں نے باغ میں تباہی مچا دی۔ باغ والا اپنے دو آدمیوں کی مدد سے گھوڑوں کو پکڑ کر ان کے مالکوں کو تلاش کرتا ہوا ان دونوں کے سر پر آ پہنچا۔ تیمور نے انہیں بے نیازی سے دیکھا اور پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

باغ کے مالک نے پوچھا۔ ''یہ تم دونوں کے گھوڑے ہیں؟''

تیمور نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ ہمارے گھوڑے ہیں۔ اپنے آدمیوں سے کہہ دے انہیں چھوڑ دیں۔''

باغ کا مالک مرعوب ہو گیا، بولا۔ ''لیکن ان گھوڑوں نے ہمارے باغ کی ایسی تیسی کر دی ہے۔''

تیمور نے جواب دیا۔ ''کوئی بات نہیں، ہم نے اپنے گھوڑوں کو چرنے ہی کے لیے تو چھوڑا تھا یہاں۔''

باغ کا مالک روہانسا ہو گیا۔ بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تمہارا تعلق امیر کازغان کی فوج سے ہے لیکن مجھ پر رحم کرو۔''

تیمور نے جواب دیا۔ ''تیرا نقصان پورا کر دیا جائے گا۔ گھوڑوں کو چھوڑ دے اور واپس جا۔ میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ میں زیادہ باتیں پسند نہیں کرتا۔ تیرا نقصان پورا کر دیا جائے گا۔''

باغ کے مالک کا خوف سے برا حال تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ گھوڑے چھوڑ دیں۔ آدمیوں نے گھوڑے چھوڑ دیے اور جدھر سے آئے تھے، اسی طرف واپس چلے گئے۔

لڑکی نے پوچھا۔ ''تو تم وہ مزے کی بات مجھے نہیں بتاؤ گے؟''

تیمور نے جواب دیا۔ ''نہیں، کم از کم ابھی نہیں۔ پہلے میں یہ تو معلوم کر لوں کہ آخر تو ہے کون اور مجھے وہ بات تجھے بتانا بھی چاہیے یا نہیں؟''

لڑکی نے چڑ کر کہا۔ ''اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اس طرح شوق تجسس پیدا کر کے تم میری بابت معلومات حاصل کر لو گے تو یہ بہت مشکل ہے۔ میں اپنی بابت یوں تو تمہیں سب کچھ بتا سکتی تھی لیکن اگر تم یہ چاہو کہ تمہاری اس مزے کی بات کے عوض میں کچھ بتا دوں گی تو ایسا نہیں ہو سکتا۔''

تیمور نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں [illegible]

تجھے ضرور بتاؤں گا لیکن ابھی نہیں پھر کبھی۔''

لڑکی نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن تم تو اپنے بوڑھے باپ ترغائی کے پاس چلے جاؤ گے پھر کہاں ملو گے جو مجھے وہ بات بتاؤ گے۔''

تیمور نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔ ''میں جانے سے پہلے تیرے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لوں گا اور اگر وہ معلومات کسی طور میری محبت میں مانع نہیں آئیں تو میں تجھے اپنی بیوی بنا کے رہوں گا کیونکہ میں جو کہتا ہوں، کرتا ضرور ہوں۔''

لڑکی نے پوچھا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے میری بابت اب تک کیا اندازہ قائم کیا ہے؟''

تیمور نے جواب میں کہا۔ ''یہ کہ تو کسی نہ کسی طرح امیر کازغان کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔''

لڑکی نے تیمور کے اس جواب کا کوئی خاص اثر نہیں لیا۔ بولی۔ ''تم نے کس طرح سمجھا؟''

تیمور نے جواب دیا۔ ''اس طرح کہ میں نے تخلیے میں امیر کازغان سے جو بات بھی کی، اس کا علم تجھے ضرور ہو گیا۔ اگر تیرا امیر کازغان سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو یہ بات ناممکن ہوتی۔''

اچانک باغ میں بے ہنگم سا شور و غل ہونے لگا۔ بہت سے لوگوں میں زور زور سے باتیں ہو رہی تھیں۔ یہی نہیں، گھوڑوں کی ٹاپیں بھی زور و شور سے ان کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھیں۔

لڑکی نے گھبرا کر کہا۔ ''میرا خیال ہے باغ والے نے بہت سے آدمی بلوا لیے ہیں اور وہ ہمارے خلاف فساد پر مائل ہے۔''

تیمور کھڑا ہو گیا، بولا۔ ''شاید یہ بات نہیں ہے کیونکہ باغ کا مالک امیر کازغان اور اس کے لشکریوں کے خلاف کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کر سکتا۔ یہ کوئی اور ہی بات ہے۔''

اب گھوڑے اپنے سواروں سمیت اخروٹ کے درختوں کی آڑ سے نکل کر تیمور کے سامنے آ چکے تھے اور ان میں امیر کازغان کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ وہ تیمور اور لڑکی کو ایک جگہ دیکھ کر ذرا بھی جزبز نہ ہوا۔ اس نے مسکراتے ہوئے لڑکی سے کہا۔

''الجائی خاتون! تو یہاں ہے۔ میں تجھے معلوم نہیں کہاں کہاں ڈھونڈ آیا۔''

لڑکی امیر کازغان کو دیکھتے ہی ادب سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تیمور گھبرا گیا۔

امیر کازغان، تیمور کی طرف مڑا تو اس کے چہرے کی مسکراہٹ یکلخت کافور ہوگئی۔ اس نے تیمور سے کہا۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو گھر جانے کے لیے بے چین ہو رہا ہے۔ بہرکیف، اگر تو گھر جانا ہی چاہتا ہے تو آج ہی جاسکتا ہے۔ میں تجھے روکنا نہیں چاہتا۔ تو جاسکتا ہے۔ آج ہی اور اسی وقت تو جاسکتا ہے۔''

تیمور قدرے شرمندہ تھا لیکن وہ اپنی شرمندگی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بولا۔

''امیر! میں گھر جانا تو چاہتا ہوں لیکن دو چار دن ٹھہر کے۔ میں کیوں رک رہا ہوں؟ مجھے خود نہیں معلوم لیکن میں دو چار دن کے لیے رکنا ضرور چاہتا ہوں۔''

امیر کازغان نے لڑکی سے کہا۔ ''تو اپنے گھوڑے پر بیٹھ اور میرے ساتھ چل۔'' پھر تیمور سے بولا۔ ''اور تو بھی۔''

امیر کازغان کے تاتاری بالکل خاموش تھے۔ گویا انہیں زبان کھولنے سے منع کر دیا گیا تھا۔

لڑکی اور تیمور نے اپنے اپنے گھوڑوں کی رکاب میں پاؤں رکھا اور ان کی پشت پر پہنچ گئے۔ اس وقت تیمور کی نظر باغ کے مالک پر پڑی جو تاتاری سپاہیوں کے پیچھے یاس زدہ چہرہ لیے کھڑا ہوا تھا۔ تیمور، تاتاریوں کو ادھر ادھر ہٹاتا ہوا سیدھا باغ کے مالک کے پاس پہنچا اور کہا۔

''دیکھ، تو مایوس نہ ہو۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل بھی ہوگا لیکن چند دن تجھے صبر کرنا ہوگا۔''

امیر کازغان نے پوچھا۔ ''تو نے اس سے کیا کہا ہے تیمور؟''

تیمور نے جواب دیا۔ ''اس کو شکایت تھی کہ ہم دونوں کے گھوڑوں نے اس کے باغ کو نقصان پہنچایا ہے چنانچہ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں تیرا نقصان پورا کردوں گا۔ بس یہی وعدہ پورا کرنے کی بات کر رہا تھا۔''

امیر کازغان نے باغ کے مالک سے کہا۔ ''تو اپنے نقصان کا تخمینہ لگا کر کسی روز میرے پاس چلا آ، تیرا نقصان پورا کردوں گا۔''

باغ کا مالک منہ بنا کر رہ گیا۔

اب امیر کازغان کا گھوڑا سب سے آگے تھا، اس سے ذرا پیچھے لڑکی کا گھوڑا تھا۔ تیمور تاتاری سپاہیوں میں سب سے آگے تھا۔ جب یہ لوگ اپنے خیموں سے نکل کر یہ دلچسپ تماشا دیکھنے لگے، تیمور کو ایسا لگ رہا تھا گویا امیر کازغان اس سے ناراض ہے۔

امیر کازغان نے بے مروتی سے کہا۔ ''تیمور! تو اپنے خیمے میں جا کر آرام کر۔ ان کا تجھ سے بات کرنا ... جب تک الجائی خاتون سے بات نہ کرلوں، تجھ سے کوئی بات کس طرح کرسکتا ہوں۔''

تیمور اپنے خیمے میں چلا گیا اور امیر کازغان، الجائی خاتون کے ساتھ اپنے خیمے میں داخل ہوگیا۔ تاتاری سپاہی ادھر ادھر منتشر ہوگئے۔ اس دن تیموریوں زیادہ پریشان رہا کہ امیر کازغان نے اس کی چوری پکڑ لی تھی۔ حالانکہ تیمور اسے چوری نہیں سمجھتا تھا۔

اسی دن تیمور کے چند مداح تاتاریوں نے اسے یہ بات بتائی کہ اس کی محبوبہ الجائی، امیر کازغان کی نواسی ہے اور الجائی کا بھائی حسین کابل کا حکمران ہے۔ اس انکشاف نے تیمور کو بڑی مسرت بخشی۔ اس نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کا انتخاب معمولی ہرگز نہیں لیکن پھر یہ سوچ کر ملول بھی ہوا کہ شاید امیر کازغان اس رشتے پر تیار نہ ہو کیونکہ الجائی کا نانا امیر کازغان ماوراءالنہر کا حقیقی حکمران تھا اور الجائی کا بھائی حسین کابل میں حکومت کر رہا تھا جبکہ خود تیمور کا یہ حال تھا کہ وہ امیر کازغان کا ملازم تھا پھر بھلا! امیر کازغان اپنی نواسی کو تیمور کے حوالے کیوں کرنے لگا؟

اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ امیر کازغان کی خوشامد بالکل نہیں کرے گا۔ بات صاف صاف کرے گا۔ اگر الجائی مل گئی تو خیر، ورنہ صبر کرلے گا پھر اچانک اس کا ارادہ بدل گیا اور اس نے یہ قطعی فیصلہ کرلیا کہ کچھ بھی ہو، وہ الجائی کو حاصل کرکے رہے گا۔ امیر کازغان انکار نہیں کرسکتا۔ اگر کرے گا تو وہ خود اس انکار کو رد کردے گا اور الجائی کو زبردستی حاصل کرلے گا۔

☆☆☆

امیر کازغان، الجائی کو اندر لے گیا۔ اس وقت تو وہ خاموش رہا اور خیمے کی عورتوں کو یہ نہیں معلوم ہونے دیا کہ وہ الجائی کو تیمور کے پاس سے اٹھا کر لایا ہے لیکن شام کو جب عورتیں کھانا پکانے میں مشغول ہوگئیں تو امیر کازغان نے الجائی کو اپنے خیمے میں بلا لیا۔

یہاں بھی ایک حقیقت ہی تھی کہ الجائی کی ... لڑکی تھی۔ وہ تنی اکڑی اپنے نانا کے خیمے میں داخل ہوئی اور پوچھا۔

''نانا! کیا آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا؟''

امیر کازغان نے ذرا خشک لہجے میں جواب دیا۔

''ہاں، میں نے ہی تجھے یاد کیا تھا کیونکہ میں تجھ سے بہت ضروری باتیں کرنے والا ہوں۔''

الجائی نے کہا۔ ''میں خود بھی یہی چاہتی ہوں۔''

امیر کازغان نے پوچھا۔ ''تیرا تیمور سے ربط ضبط کس طرح جوڑ لیا؟''

الجائی نے نظریں نیچی کرکے جواب دیا۔ ''میں نوجوان تیمور کی جرأت، شجاعت اور عقل کے چرچے سنتی رہی ہوں لیکن اس سے میری ملاقات اس دن ہوئی تھی جب وہ ایرانی لٹیروں کو ٹھکانے لگا کر ہمارا مال واپس لا رہا تھا۔ اس دن میں نے اس سے چند باتیں کی تھیں۔ ان باتوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی اور میں اس کی گرویدہ ہوگئی۔''

امیر کازغان نے کہا۔ ''لیکن بیٹی! تو نے یہ تو سوچا ہوتا کہ تیمور کا مستقبل اتنا روشن نہیں ہے۔ ابھی اس کا باپ ترغائی زندہ ہے۔ جب تک وہ زندہ ہے، تیمور برلاسوں کا سردار نہیں بن سکتا اور جب ترغائی مر جائے گا تو اس کی جگہ پُر کرنے کے لیے حاجی برلاس پہلے ہی سے موجود ہے۔ ابھی تیمور کی سرداری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

الجائی نے جواب میں کہا۔ ''نانا جان! میں دو اور چار کی طرح ریاضی نہیں جانتی۔ میں تو صرف ایک بات جانتی ہوں، وہ یہ کہ میں نوجوان تیمور کو پسند کرتی ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

امیر کازغان نے بے دلی سے کہا۔ ''اگر تو تیمور سے شادی کرنا ہی چاہتی ہے تو تجھے کون روک سکتا ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ تو اگر ریاضی نہیں جانتی تو اسے جاننے کی کوشش تو ضرور کرلے کیونکہ معاملاتِ زندگی اور کاروبارِ حیات کو جانوروں کی طرح نہیں چلایا جاسکتا۔''

الجائی نے کہا۔ ''اگر تیمور کو برلاسوں کی سرداری نہیں ملی تو نہ سہی لیکن ایسا تو نہیں ہے کہ تیمور مجھے کھلا پلا نہیں سکے گا۔ وہ مجھے فاقوں نہیں مارے گا۔''

امیر کازغان نے جواب دیا۔ ''ہاں، وہ تجھے فاقوں نہیں مارے گا، اس بات کی ضمانت تو میں خود بھی لے سکتا ہوں۔'' پھر موضوع کو بدلتا ہوا آگے بولا۔

''اب میں تیمور سے مل کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کروں گا کہ وہ تیری ذات میں کتنی دلچسپی رکھتا ہے۔''

الجائی نے کہا۔ ''آپ شوق سے پتا لگائیے۔''

بات ختم ہوگئی۔ الجائی چلی گئی لیکن امیر کازغان پہلے سے زیادہ فکرمند ہوگیا۔

دوسرے دن صبح اس نے تیمور کو طلب کیا اور اسے اپنے سامنے بٹھا کر تقریباً وہی باتیں کیں جو وہ الجائی سے کرچکا تھا۔ اس نے تیمور سے پوچھا۔

''تو الجائی کو کب سے جانتا ہے؟''

تیمور نے وہی جواب دیا جو اس سے پہلے الجائی دے چکی تھی۔

امیر کازغان نے پوچھا۔ ''تیمور! کیا تو نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ الجائی میری نواسی اور والیٔ کابل، حسین کی بہن ہے۔ کیا تو اس سرکش لڑکی کو قابو میں رکھ سکے گا؟''

تیمور نے جواب دیا۔ ''اول تو یہ کہ میں الجائی کو اس کے نام اور خاندان سے بالکل نہیں جانتا۔ یہ بات تو مجھے اب معلوم ہوئی ہے کہ اس کا نام الجائی ہے اور وہ امیر کازغان کی نواسی اور والیٔ کابل، حسین کی بہن ہے۔''

امیر کازغان نے کہا۔ ''یہی سہی، اب تو یہ بتا کہ تو کیا چاہتا ہے؟''

تیمور نے بلاتامل جواب دیا۔ ''میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میرے خیال میں الجائی کو بھی مجھ سے بہتر شوہر نہیں مل سکتا۔''

امیر کازغان نے اس خوش فہم نوجوان کو چونک کر دیکھا۔ بولا۔ ''اور... میں خود بھی یہ سوچ کر الجائی کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دوں گا کہ الجائی بھی یہی چاہتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تو اسے خوش نہیں رکھ سکے گا۔''

تیمور نے جواب دیا۔ ''امیر کازغان! میں الجائی کو خوش رکھ سکوں گا یا نہیں، یہ بعد کی بات ہے لیکن اس شادی سے امیر کو ایک وفادار، وفادار اور بہادر حلیف ضرور مل جائے گا۔ دن رات برابر نہیں رہتے۔ کبھی نہ کبھی تمہیں میری ضرورت محسوس ہوگی اور اس وقت میں بہتوں سے زیادہ کارآمد ثابت ہوں گا۔''

امیر کازغان نے بے دلی سے کہا۔ ''مجھے اپنی فکر و تدبیر پر بھروسا ہے۔ اس لیے میں کسی اور طرف دیکھتا ہی نہیں ہوں۔''

تیمور نے کہا۔ ''شہر سبز کے باہر سفید محل الجائی کا انتظار کر رہا ہے۔ جو کچھ ہونا ہے، جلد از جلد ہوجائے کیونکہ اب میں زیادہ دن تک نہیں ٹھہر سکتا۔''

امیر کازغان نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ الجائی کی زندگی، پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ اس لیے میں عجلت میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔''

تیمور نے کہا۔ ''تمہاری مرضی، میں پرسوں تک چلا جاؤں گا۔''

امیر کازغان نے اسے اپنے خیمے سے رخصت کردیا۔

☆☆☆

تیمور اپنے خیمے میں گیا اور سامانِ سفر درست کرنے لگا۔ وہ الجائی سے محبت کرنے لگا تھا لیکن اس بارے میں وہ الجائی کے نانا امیر کازغان کی خوشامد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ

چپ چاپ اپنے خیمے میں بند رہا۔ اس کے مداح اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر منڈلاتے رہے لیکن جب وہ نہیں کہیں نہ ملا تو وہ اس کے خیمے میں پہنچ گئے اور جب انہوں نے تیمور کو چپ چاپ لیٹے دیکھا تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے اپنے مداحوں سے کہا۔

"میں عنقریب گھر واپس جا رہا ہوں۔"

مداحوں کو الجائی کا "قصہ" معلوم تھا، پوچھا۔ "امیر کازغان نے کیا کہا؟ کیا وہ شادی سے انکار کر رہا ہے؟"

تیمور نے جواب میں کہا۔ "کچھ پتا نہیں، ہوسکتا ہے وہ انکار ہی کر دے۔ اگر وہ انکار کر دے گا تو میں یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رکوں گا۔ تم میں جو جرأت مند ہے، اسے امیر کازغان کے پاس جا کر سمجھانا چاہیے۔ اسے بتانا چاہیے کہ الجائی کو تیمور سے اچھا شوہر نہیں مل سکتا۔ امیر کازغان کو جتاؤ کہ اس کا آفتاب اقبال کسی وقت بھی غروب ہو جائے گا۔ یہ میرا عہد ہے۔ میرا درخشاں مستقبل پردۂ غیب میں ہے اور وہ جب سامنے آئے گا تو سب کو ماند کر دے گا۔ مستقبل میرا ہے، صرف میرا۔ امیر کازغان سے کہو، وہ الجائی کو درخشاں مستقبل کے حوالے کر دے۔"

لیکن افسوس، ان میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جو امیر کازغان سے اس قسم کی بات کہہ سکتا۔

☆☆☆

تیمور کو امیر کازغان کے فیصلے کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اسی دن شام کو امیر کازغان نے اسے مطلع کر دیا کہ وہ جلائر قبیلے کے سردار کی بیٹی اور اپنی نواسی الجائی خاتون آغا کی شادی تیمور سے کرنے کو تیار ہے اور یہ بھی کہا کہ شادی کے دوطرفہ اخراجات بھی امیر کازغان ہی برداشت کرے گا۔ تیمور چونکہ اسے اپنا حق سمجھتا تھا اس لیے اس نے امیر کازغان کا نہ تو شکریہ ادا کیا اور نہ ہی کسی قسم کی احسان مندی کا اظہار کیا۔ دوطرفہ شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

اتفاق کی بات کہ اس دوران تیمور کو تاتاریوں کی جمعیت لے کر ایک محاذ پر جانا پڑ گیا۔ امیر کازغان اس مہم کو التوا میں ڈالنا چاہتا تھا لیکن تیمور نے یہ کہہ کر امیر کی بات رد کر دی کہ کامیابی ہمیشہ اس کے حصے میں آتی ہے جو دشمن کو اس کی توقع سے بہت پہلے جا لیتا ہے۔

یوں تیمور ہوائی طوفان کی طرح گیا اور اپنے دشمن کو اڑا کر واپس آ گیا۔ اس کے واپس آتے ہی امیر کازغان نے شادی کا اعلان کر دیا۔

جب تیمور اپنے تاتاری رفیقوں کے ساتھ واپس آیا تو بہت سی عورتوں کے ساتھ الجائی بھی تیمور کی واپسی کا منظر دیکھ رہی تھی۔

تیمور نے اپنے باپ ترغائی کو شہر سبز سے بلوا لیا۔ انہیں یہ پیغام بھیجا کہ مولانا زین الدین کو اپنے ساتھ ضرور لائیں۔ میدان میں بچھے ہوئے قالین مہمانوں کے لیے کم پڑ گئے۔ دوسرا فرش بچھایا گیا۔ امیر سمرقند کی دعوت سے کون انکار کر سکتا تھا۔

تیمور نے لباس بدلا اور اس کے ساتھی بھی جلدی جلدی لباس تبدیل کر کے شادی کی تقریب میں شامل ہو گئے۔ قاضی نے نکاح پڑھایا۔ جب تیمور سے ایجاب و قبول کے فقرے ادا کرائے جا رہے تھے، اس وقت الجائی کو اس کے خیمے میں دلہن بنایا جا رہا تھا۔ مشاطائیں اسے سنوار رہی تھیں۔ سہیلیاں اور کنیزیں پروانہ وار صدقے ہوئے جا رہی تھیں۔ سنہری اور روپہلی کام والا سرخ عروسی جوڑا پہنایا گیا۔ بالوں کو شانوں پر بکھیر دیا گیا۔ روایتی زیورات پہنا کر سر پر طلائی ٹوپی رکھ دی گئی جس میں ریشمی پھول لگے ہوئے تھے۔ بھڑکیلے چمک دار عروسی جوڑے پر الجائی کو ایک گز کا جس کا لمبا جبہ سا پہنایا گیا۔ الجائی کے شانوں پر بکھرے ہوئے ریشمی بال ان کے درمیان چمکتا دمکتا مکھڑا یوں جیسے کالی کالی بدلیوں سے چاند آنکھ مچولی کھیل رہا ہو۔ کانوں میں آویزے ڈالے گئے تھے اور گلے میں زمرد کا گلوبند تھا۔

الجائی کوئی کم حسین نہ تھی۔ بہت ہی دیدہ زیب اور جاذب نظر لڑکی تھی۔ یوں اس کا حسن یکتائے زمانہ تھا۔ چھریرا بدن، درمیانہ قد، موٹی موٹی غلافی آنکھیں، گلاب کی لرزیدہ شاخ کی طرح ہنستی تو پھول برستے۔ ستارہ شناس اس کے درخشندہ مستقبل کی پہلے ہی پیشن گوئی کر چکے تھے۔ آج وہ اس ہستی کی دلہن بننے جا رہی تھی جو تاریخ میں فاتح اعظم کے نام سے مشہور ہوا۔ سکندر کی فتوحات اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

دلہن بنا کر الجائی کو مہمانوں میں لایا گیا۔ تاتاری شہسوار بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ہر ایک کی نگاہ الجائی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ نکاح کا خطبہ ختم ہوتے ہی اسے کچھ دیر بعد مہمانوں میں روک کر واپس لے جایا گیا کیونکہ عروسی جوڑے میں مہمانوں کے درمیان چپ چاپ کھڑے رہ کر واپس جانے کا مطلب تھا کہ اس نے تیمور کو اپنے شوہر کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

یہاں تیمور کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ ایجاب و قبول کے بعد فوراً اٹھ کر چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد الجائی کو مہمانوں میں

دوبارہ لایا گیا۔ اب اس پر دوسری بہار تھی۔ اب کے اسے دوسرا جوڑا پہنایا گیا تھا۔ مرمریں بدن پر عروسی جوڑے کے بجائے صرف شب خوابی کی عبا اور اوڑھنی تھا۔

یوں جب دلہن الجائی شرماتی، لجاتی اور گھبرائی ہوئی مہمانوں کے درمیان سے گزری تو امیر کازغان نے مٹھی بھر بھر کے دلہن پر سے موتی نچھاور کیے اور حکم دیا کہ نقاروں پر ضرب لگائی جائے۔ تاتاری جشن اور جنگ دونوں موقعوں پر نقارے ضرور بجواتے تھے۔

محفل میں جگہ جگہ شراب کے مٹکے رکھ دیے گئے تھے۔ امیر کازغان موتیوں کے ڈھیر کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے مہمانوں کو اشارے سے شراب نوشی کی اجازت دے دی۔

اچانک کسی طرف سے ایک درویش نمودار ہوا اور اس نے الجائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مستقبل قریب کے بادشاہ گر کی بیوی کو شادی مبارک ہو!"

امیر کازغان نے درویش کے پاس جا کر کہا۔ "قلندر! بادشاہ گر تو میں کہلاتا ہوں۔ یہ تو کس بادشاہ گر کی بات کر رہا ہے؟"

درویش نے کہا۔ "بادشاہ گر تو نہیں، الجائی کا شوہر ہے۔ تو نے تو تیمور خاں کو بادشاہ بنایا تھا لیکن الجائی کا شوہر جس کو چاہے گا بادشاہ بنا دے گا اور جس کو نہیں چاہے گا تخت و تاج سے محروم کر دے گا۔"

درویش کی باتیں امیر کازغان کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ اس نے اس دیوانے سے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ اس نے واپس اپنی جگہ جا کر ہر ایک کو اس کے مرتبے کے مطابق انعام و اکرام سے نوازا۔ کسی کو خلعت دی، کسی کو تلوار عطا کی، کسی کو خنجر اور کسی کو کوئی نہ کوئی ہتھیار دیا۔

جب لوگ کھانے میں مشغول تھے، الجائی ایک بار پھر ایک خیمے سے نمودار ہوئی۔ وہ مہمانوں کے بیچ سے گزرتی ہوئی اس جگہ پر پہنچ گئی جہاں خیمے کی حد ختم ہوتی تھی۔ کچھ دیر بعد دوسری طرف تیمور نمودار ہوا۔

تیمور پیدل نہیں تھا۔ عربی النسل گھوڑے کی زین سے ریشمی اور اونی جھالریں فرش تک لٹک رہی تھیں۔ وہ اپنا گھوڑا الجائی کے قریب لے گیا۔ الجائی کو لانے والی عورتیں تیمور کو دیکھتے ہی ایک طرف ہٹ گئیں۔

تیمور نے گھوڑے کی پشت سے جھک کر الجائی کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھا لیا اور اپنے آگے بٹھا کر حاضرین کو سلام کیا۔ لوگوں نے نعرۂ تحسین بلند کیے اور تیمور فاتحانہ شان سے الجائی کو لے کر اپنے خیمے کی طرف روانہ ہو گیا۔

تیمور اسے اپنے خیمے میں چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے باہر چلا گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں الجائی خاتون کے خاندان کی بڑی بوڑھیاں الجائی کو خاندانی رسم و رواج کی باتیں بتا کر اس وقت واپس چلی گئیں جب تیمور دوبارہ خیمے میں داخل ہوا۔

اس نے الجائی میں ایسا حسن دیکھا جو پہلی دو ملاقاتوں میں نظر نہیں آیا تھا۔ وہ الجائی کے قریب آ کر بیٹھا تو الجائی ذرا کھسک کر دور ہٹ گئی۔

تیمور نے ہنس کر کہا۔

"جب میں نے تجھے حاصل نہیں کیا تھا تو، تو بالکل میرے قریب بیٹھ گئی تھی لیکن اب جبکہ تو میری ہو چکی ہے، مجھ سے دور ہٹ رہی ہے؟"

الجائی نے شرمیلی نگاہوں سے دیکھ کر جواب میں کہا۔

"اب تو میں تمہاری بیوی بن چکی ہوں اور جب تک وہ مزے کی بات مجھے نہیں بتاؤ گے تو میں تم سے دور دور رہوں گی۔"

تیمور نے اسے پکڑ کر اپنی آغوش میں گرا لیا۔ بولا۔

"اب تو وہ مزے کی بات مجھے بتانا ہی پڑے گی۔"

الجائی نے کہا۔ "تب پھر بتاؤ نا، انتظار کس بات کا؟"

تیمور نے کہا۔ "اچھا تو سن...... لیکن خبردار جو تو نے یہ بات کسی اور کو بتائی۔"

الجائی، تیمور کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ تیمور نے اس کی گھنیری اور خوشبودار زلفوں کی ایک لٹ اپنے نتھنوں سے لگائی اور اپنی سانس کو زور سے اوپر کھینچا۔ الجائی نے سرور آگیں انداز میں اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

تیمور نے اس کے رخسار کا بوسہ لے کر کہنا شروع کیا۔

"الجائی! میں جو کچھ کہوں گا، اس کی بیشتر باتیں شاید تیری سمجھ میں نہ آئیں لیکن اس کا لب لباب تو ضرور سمجھ لے گی۔" کہتے ہوئے تیمور نے دو تین لمحے کا توقف کیا پھر آگے کہنا شروع ہوا۔

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب تموجن پیدا ہو چکا تھا۔ کوہستان التائی اور کوہستان خنجان کے اوپر شمال میں جھیل بیکال کے علاقے میں کئی قبائل آباد تھے۔ دریائے کیرولا کے جنوبی کنارے پر تاتاری آباد تھے اور شمال میں منگول آباد تھے۔ منگول آبادی کے شمال میں دریائے انگوڈا تھا اور انگوڈا کے شمال میں قبیلہ تائی جوت رہتا تھا۔

"تائی جوت کے جنوب مغرب میں بھی ویرات بستے

تھے لیکن تائی جوت اور ویرات کے درمیان جھیل بیکال حائل تھی۔ تاتاریوں سے متصل جنوب میں کنگرات قبیلہ آباد تھا۔

"ان تمام قبائل میں بڑی رکاوٹ رہتی تھی لیکن جب ان میں تموجن پیدا ہوا تو بڑے ہو کر اس نے انہیں اتحاد کی عظمت سے آگاہ کیا۔ اس نے ان قبائل کو بتایا کہ وہ سب متمدن دنیا کو زیرِ فرمان لانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ وہ سب خوش قسمتی سے تموجن کے یاک کی دموں والے پرچم کے تلے متحد اور جمع ہو گئے۔

وہ تموجن، خان اعظم چنگیز خاں بن گیا اور ستر سال کی عمر میں جب چنگیز خاں نے انتقال کیا تو وہ دنیا کے بہت بڑے حصے پر قابض ہو چکا تھا۔ کہتے ہیں تاتاریوں اور منگولوں کے جدِ اعلیٰ نے آپس میں یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ حکومت منگولوں میں رہے گی اور وزارت تاتاریوں میں۔ مجھ سے پہلے اس معاہدے کا احترام کیا جا رہا ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ معاہدہ اپنی عمر پوری کر چکا۔ اب اسے منسوخ کر دینا چاہیے۔ اب بساطِ عالم پر تاتاریوں کا قبضہ ہو جانا چاہیے اور میں ہی وہ تاتاری ہوں جو خان اعظم کے اقبال کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دے گا۔ میں منگولوں کی حکومت کو صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتا ہوں۔"

یوں تیمور نے اپنی بات ختم کی۔

الجائی نے پوچھا۔ "کیا تمہیں یہ یقین ہے کہ تم منگولوں کی حکومت ختم کر دو گے؟"

تیمور نے جواب دیا۔ "یہ کام بڑا بھی ہے اور چھوٹا بھی مگر بلند حوصلوں کی موجودگی میں یہ کام بالکل معمولی اور حقیر سا نظر آتا ہے۔"

الجائی نے کہا۔ "میں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتی کہ تمہیں یہ کام ہر قیمت پر انجام دینا ہوگا۔"

تیمور نے خوش ہو کر کہا۔ "اگر تو نے اسی طرح میری ہمت افزائی کی تو میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔"

الجائی نے پوچھا۔ "اس میں مزے کی بات کون سی تھی؟"

"ارے...... کیا یہ بات مزے کی نہیں کہ میں منگولوں کو ان کے آبائی حق کے باوجود نکال باہر کرنے والا ہوں۔ بعد میں کیا ہوگا؟ میں نہیں جانتا۔"

یہاں ان دونوں کی گفتگو ختم ہو گئی اور دونوں ایک دوسرے کے پیار میں ڈوبتے چلے گئے۔ شب زفاف بیتی چلی جا رہی تھی اور تیمور کا ستارۂ تقدیر اس کے خیمے پر فروزاں تھا۔

☆☆☆

کچھ دنوں تک تو وہ امیر کازغان کے قریب ہی رہا۔ اس کے بعد اسے اپنا بوڑھا باپ ترغائی بہت یاد آنے لگا۔ اس نے امیر کازغان سے کہا۔

"امیر! اب میں اپنی بیوی کو لے کر گھر جانا چاہتا ہوں۔"

امیر کازغان نے کہا۔ "ضرور جا لیکن یاد رہے کہ اب تو منگ باشی (شاہی زمانے کا ایک سرکاری عہدہ) ہو چکا ہے۔ تیرے ساتھ تیرے جوان بھی جائیں گے اور تو ان کا ہر طرح خیال رکھے گا۔"

تیمور نے کہا۔ "مجھے اپنی ذمے داریوں کا احساس ہے۔ میں جو کچھ خود کھاؤں گا وہی اپنے رفیقوں کو بھی کھلاؤں گا۔"

امیر کازغان نے آگے مزید کہا۔ "اور یہ کہ تو میری آواز پر میرے پاس آئے گا۔"

تیمور نے جواب دیا۔ "مجھے یہ بھی منظور ہے۔"

امیر کازغان نے کہا۔ "اب تو جا سکتا ہے۔"

اس کے بعد امیر کازغان اور اس کے گھر والوں نے تیمور اور الجائی کو تحفے تحائف دے کر رخصت کر دیا۔

☆☆☆

تیمور جب شہر سبز سے امیر کازغان کی طلبی پر نکلا تھا تو اس کے ساتھ گھوڑوں کی ایک قطار کے علاوہ عبداللہ نامی ایک خادم بھی تھا لیکن اب جب وہ اپنے شہر واپس جا رہا تھا تو اس کی بیوی الجائی کے علاوہ اس کے جلو میں ایک ہزار جنگجو تاتاری بھی تھے۔

تیمور کا باپ ترغائی اپنے بیٹے کو اس شان سے آتا ہوا دیکھ کر نہایت خوش ہوا اور اپنی بہو کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر درازیٔ عمر کی دعا دی۔ اس نے ایک ہزار تاتاریوں کو دیکھ کر بیٹے کو نصیحت کی۔

"بیٹے! جس طرح کوئی مقام حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے، اسی طرح اس مقام کو برقرار رکھنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اب تو منگ باشی ہے۔ کوشش کر کہ تو اس کا اہل ثابت ہو۔"

تیمور نے جواب میں کہا۔ "پدر بزرگوار! میں تمان باشی کا مستحق تھا لیکن مجھے منگ باشی کا منصب ملا اور چونکہ میں نے جو کچھ پایا ہے، اپنی صلاحیت، اہلیت اور حیثیت سے کم پایا ہے۔ اس لیے اس مقام کو برقرار رکھنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے اور میں اس پر زیادہ عرصے تک قانع نہیں رہ سکتا۔"

صوفی باپ نے پھر بیٹے کو نصیحت کی۔ "لیکن بیٹے قناعت اور توکل کے فضائل بے حد وحساب ہیں۔"

تیمور نے جواب دیا۔ "ہوں گے، لیکن میں صوفی نہیں ہوں۔ اگر میں کبھی فاتح عالم بن سکا تو شاید اس وقت بھی آپ کو قانع نہیں ملوں گا۔ میں دراصل سمندر کی اس سرکش موج کی طرح ہوں جو بار بار ساحل پر سر پٹخ کر واپس چلی جاتی ہے۔ اگر مجھے بھی اس سرکش موج کی طرح بار بار زندگی ملتی رہے تو میں ہر بار دنیا کو مسخر کرنے کی کوشش کرتا رہوں۔"

صوفی باپ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "تجھ میں ایمان کی کمی محسوس ہوتی ہے کیونکہ اہل ایمان طامع اور حریص نہیں ہوتے۔"

تیمور جانتا تھا کہ گوشہ نشینی نے اسے کم حوصلہ کر دیا ہے اور وہ اپنی کم ہمتی اور بے بضاعتی کو قناعت اور توکل کا نام دے رہا ہے۔ اس لیے حوصلہ مند بیٹا، کم ہمت باپ کے ساتھ کس طرح رہ سکتا تھا۔

اس نے سبز کے باہر سفید محل کو صاف کرایا اور اپنے ساتھ لائے ہوئے ساز و سامان سے اسے آراستہ کر دیا۔ بہترین قالین سے کمروں کو مزین بنا دیا گیا۔ جب سفید محل دلہن کی طرح سج گیا تو تیمور اپنی دلہن الجائی کے ساتھ اس میں منتقل ہو گیا۔ اس کے ہزار تاتاری رفیق بھی ادھر ادھر بسا دیے گئے۔

کچھ دنوں تک تو ایسا لگا گویا تیمور نے الجائی کے سوا سب کچھ بھلا دیا ہے۔ وہ ہر وقت اس کی ناز برداریوں میں لگا رہتا لیکن اس کے باوصف اس کے تاتاری رفیق اس پر بے مروتی، غفلت اور بھلا دینے کا الزام نہیں لگا سکتے تھے۔ چالاک اور عقل مند امیر کازغان خوب جانتا تھا کہ کسی بیس اکیس سالہ نوجوان کو اگر اس کی پسند کی حسین و جمیل بیوی مل جائے تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟

وہ تیمور کو برباد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے تیمور کو اور اس کے ایک ہزار تاتاریوں کو مقدمۃ الجیش (ہراول دستہ) کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یوں اب تیمور شمالی مہم پر ہوتا تو کبھی کسی جنوب کی جنگ میں الجھا ہوتا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ جس مہم میں شامل ہوتا، ناکام کبھی نہ ہوتا۔ اگر اسے کسی مہم میں امید سے زیادہ وقت دینا پڑتا تو پریشان ہو جاتا۔ اسے الجائی کی یاد بری طرح ستانے لگتی اور وہ جیسے تیسے مہم سے فراغت حاصل کر کے سفید محل کی طرف واپس چل پڑتا۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق کی بات تھی کہ وہ جب بھی گھر واپس آیا، الجائی کو اپنا منتظر پایا۔

ایسے وقت پر گھر میں ایک ننھا مہمان آ گیا۔ تیمور نے

کر والی لیکن اس دعوت میں دو آدمی شریک نہیں تھے۔ ایک تو چچا حاجی برلاس اور دوسرا اس کی بیوی کا باپ بایزید جلائر۔ اس دعوت میں جو دریا دلی دکھائی گئی تھی اس کی دور دور تک مثال نہیں مل سکتی تھی۔

یوں ابھی وہ بچے (جہانگیر) کی پیدائش کی خوشی منا رہا تھا کہ امیر کازغان کے آدمی آ گئے اور اس نے یک ہزاری سردار کو بتایا کہ اس کو امیر کازغان نے یاد فرمایا ہے۔

تیمور اندر گیا اور الجائی کو مطلع کیا۔ "تیرے نانا امیر کازغان کا بلاوا آ گیا ہے۔ میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔ میری عدم موجودگی میں جو بھی جہانگیر کو مبارک باد دینے آئے، اس کو کھلائے پلائے بغیر نہ جانے دینا۔"

اس کے بعد وہ جہانگیر کے پنگوڑے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے جہانگیر کی پیشانی کو بوسہ دے کر الجائی سے کہا۔

"الجائی! اس کی پیشانی تو دیکھ، بالکل تیرے جیسی ہے۔"

الجائی نے جواب دیا۔ "اور آنکھیں اور کان بالکل تمہاری طرح ہیں۔ یہ تمہارے برلاس سردار بننے کی نوید لے کر آیا ہے۔"

"یقیناً، تو صحیح کہتی ہے جان عزیزی الجائی! میں ایک دن برلاسیوں کا سردار ضرور بنوں گا۔"

دونوں محبوب میاں بیوی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور پھر اس کے بعد تیمور نے اپنے جسم پر ہتھیار سجائے اور ہاتھ میں لی ہوئی کمان کو شانے میں پھنسا دیا۔ تیروں سے بھری ہوئی ترکش بائیں طرف پشت پر لگی ہوئی تھی۔ اس نے الجائی پر الوداعی نظر ڈالی پھر باہر نکل کر ایک ہزار رفیقوں کو ساتھ لیا اور امیر کازغان کے پاس روانہ ہو گیا۔

امیر کازغان اسے اتنی جلدی اپنے روبرو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ بولا۔ "میرا خیال تھا تو پرسوں تک ضرور آ جائے گا لیکن تو، تو میری توقع سے دو دن پہلے ہی آ گیا۔"

تیمور نے جواب دیا۔ "امیر! میں تو اس کا قائل ہوں کہ دوست ہو یا دشمن، اس کے پاس اس کی توقع سے پہلے پہنچ کر حیرت زدہ کر دینا چاہیے۔"

امیر کازغان اسے ایک طرف لے گیا اور سمجھاتے ہوئے بولا۔ "جیسا کہ تو جانتا ہے کہ میں والی ہرات کو معاف کر چکا ہوں اور اس کے محل کو لوٹ مار سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے ابھی تک اسے مہمان رکھا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے میرے وہ امراء جو والی ہرات کو قتل اور اس کے محل کو لوٹ

پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ تو اسے خاموشی سے ہرات کے قلعے تک پہنچا دے کیونکہ میں اس سے یہ وعدہ کر چکا ہوں کہ اسے اس کے قلعے تک بہ حفاظت پہنچا دوں گا۔"

تیمور نے چون و چرا کیے بغیر امیر کازغان کے حکم کی تعمیل کی اور والی ہرات کو لے کر نہایت خاموشی سے ہرات کی طرف روانہ ہو گیا۔

والی ہرات کے مخالف امراء کو اس کا پتا چل گیا اور وہ یک دم مشتعل ہو گئے۔ اس دن امیر کازغان بھی دریائے آمو کے کنارے شکار میں مشغول تھا۔ مخالف امراء اسے تلاش کرتے ہوئے دریا کے کنارے جا پہنچے اور اسے پا ہی لیا۔ ان میں سوال و جواب کا تبادلہ ہوا اور تب ہی ایک تاتاری نے طنزاً سوال کیا۔

"امیر! والی ہرات کہاں ہے؟"

امیر کازغان نے جواب دیا۔ "وہ قید میں ہے۔ اس سے کوئی کام؟"

تاتاری سردار نے جواب دیا۔ "امیر! جھوٹ نہ بول۔ جس بات کو تو چھپانا چاہتا ہے، وہ ہمیں معلوم ہو چکی۔ تیمور کی پراسرار آمد اور روانگی کا والی ہرات سے گہرا تعلق لگتا ہے۔"

امیر کازغان نے غصے میں کہا۔ "تم لوگ مجھے جھوٹا سمجھتے ہو حالانکہ میں تمہارا امیر ہوں۔ تم لوگ مجھ سے معافی مانگو ورنہ اس کا انجام بہت بُرا نکلے گا۔"

باغی تاتاری سردار نے جواب میں کہا۔ "امیر! ہم بچے نہیں ہیں جنہیں تم جب چاہو بہلا دو۔"

امیر کازغان بدستور غصے سے بولا۔ "میں کہتا ہوں تم لوگ اپنا لب و لہجہ درست رکھو ورنہ میں تم سب کا محاسبہ کروں گا اور اس میں بہتوں کا صفایا کر دوں گا۔"

باغی تاتاری نے کہا۔ "امیر! وہ دن گئے۔ تیرا یوم حساب آ چکا ہے۔ میں اور میرے ساتھی والی ہرات کے سلسلے میں اس وقت تجھ سے حساب کتاب کرنے آئے ہیں۔"

امیر کازغان نے تلوار کھینچ لی۔ بولا۔ "میں اس گفتگو کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

تاتاری امراء نے امیر کازغان سے پہلے ہی اپنے تیر سے اس پر حملہ کر دیا۔ یہ تیر ایک ساتھ دونوں شانوں اور گردن پر پڑے۔ اس کی تلوار چھوٹ کر دور جا گری اور امیر کازغان کسی بوسیدہ درخت کی طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

تاتاری امراء امیر کازغان کو زخمی کر کے فرار ہو گئے لیکن امیر کازغان کے آدمیوں نے انہیں فرار ہوتے دیکھ لیا
[illegible]

بڑی کوشش کی کہ اسے بچا لیں لیکن ناکام رہے اور امیر کازغان کچھ کہے سنے بغیر ہی مر گیا۔

فوراً ہی چند آدمی تیمور کے پاس روانہ کر دیے گئے اور انہوں نے یہ منحوس خبر ہرات کے قلعے کے قریب پہنچ کر تیمور کو سنا دی۔ پہلے تو تیمور کو اس خبر پر یقین نہیں آیا لیکن یقین آ گیا تو وہ والی ہرات کو اس کے قلعے کے پاس چھوڑ کر واپس ہوا۔

تاتاری نے اس سے پوچھا۔ "تیمور! اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

تیمور نے جواب میں کہا۔ "میں قاتلوں کا پیچھا کروں گا اور اگر میں انہیں جہنم واصل نہ کر سکا تو پاگل ہو جاؤں گا۔"

ایک تاتاری نے کہا۔ "وہ معلوم نہیں کہاں پہنچ گئے ہوں گے اب تک۔"

تیمور نے جواب دیا۔ "بہرکیف، کچھ بھی ہو، میں ان کا اس وقت تک پیچھا کروں گا جب تک انہیں کیفر کردار کو نہ پہنچا دوں۔"

تاتاری نے پوچھا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ تم ان سب کو تنہا کیفر کردار تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاؤ گے؟"

تیمور نے جواب دیا۔ "بات یہ نہیں ہے کہ میں کامیاب رہوں گا یا ناکام، بلکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں امیر کازغان کے قاتلوں کے ساتھ ایک ہی آسمان کے نیچے نہیں رہ سکتا۔ اس لیے میرا یہ فرض ہے کہ میں امیر کازغان کے قاتلوں کا پیچھا کر کے انہیں اپنی تلوار سے ہلاک کر دوں۔"

☆☆☆

یوں تیمور اسی وقت قاتلوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس نے جنوب مغرب میں دریائے آمو کے ساحل پر موجود چند آدمیوں سے پوچھا۔

"تم لوگوں نے دو چار دنوں میں چند بدحواس آدمیوں کو کسی طرح بھاگتے تو نہیں دیکھا؟"

ان لوگوں نے جواب میں کہا۔ "ہاں! ہم نے چند بدحواسوں کو دریائے آمو کے دوسرے کنارے پر بھاگتے دیکھا ہے۔"

تیمور نے کشتی کا انتظار کیے بغیر اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا اور بخیریت دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ اس نے ساحل کے ساتھ ساتھ کئی گھوڑوں کی ٹاپوں کے نشانات دیکھے۔

ان نشانات کی راہنمائی میں وہ اپنا گھوڑا دوڑاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ شام سے ذرا پہلے ایک سرائے تک پہنچ گیا۔
[illegible] پوچھا۔

"تیری سرائے میں چند بدحواس تاتاری تو نہیں ٹھہرے تھے؟"

سرائے کے مالک نے جواب دیا۔ "ہاں، تین دن پہلے اس سرائے میں چار تاتاری آئے تھے۔ ان میں سے دو تو بہت مطمئن تھے لیکن دو بہت پریشان نظر آتے تھے۔"

تیمور نے پوچھا۔ "وہ چاروں کدھر چلے گئے؟"

سرائے کے مالک نے جواب دیا۔ "شاید وہ بلخ جائیں گے اور بلخ کے بعد بدخشاں کا رخ کریں گے۔"

تیمور نے سرائے کے مالک سے پوچھا۔ "سچ سچ بتا، کہیں تو مجھ سے جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے؟"

سرائے کے مالک نے جواب دیا۔ "مجھے جو کچھ معلوم تھا تجھے بتا دیا لیکن تو یہ تو بتا کہ تو ان کا پیچھا کیوں کر رہا ہے؟"

تیمور نے کہا۔ "تو، تو صبح سے رات گئے تک سرائے میں پھنسا رہتا ہے۔ تجھے کیا معلوم ... کہ آتش انتقام کسے کہتے ہیں؟ ان بدبختوں نے امیر کازغان کو قتل کر دیا ہے اور میں ان چاروں سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔"

سرائے کے مالک نے حیرت سے پوچھا۔ "ان چاروں سے تو تنہا انتقام لے لے گا؟"

تیمور نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔ "کیوں نہیں، میں ان چاروں کے لیے تنہا ہی کافی ہوں۔"

تیمور شب بسری کی خاطر سرائے میں ٹھہر گیا۔ وہ نصف رات تک آہٹوں پر کان لگائے بیٹھا رہا۔ پھر جماہیاں آنے لگیں۔ تیمور نے پوری کوشش کی کہ اسے نیند نہ آنے پائے اور وہ اسے مختلف حیلوں سے بھگاتا رہا مگر کامیاب نہ ہو سکا لیکن رات کے پچھلے پہر تیمور نے اپنے بستر کی چادر کے نیچے کچھ ایسی چیزیں رکھ دیں جس سے دیکھنے والے اس کو بستر پر سوتا ہوا سمجھیں۔

وہ خود اٹھ کر کباڑ خانے میں بیٹھ گیا اور وہاں بیٹھ کر اپنے بستر کے پاس کسی آنے والے کا انتظار کرنے لگا۔

رات کے پچھلے پہر تیمور کے کمرے میں کوئی شخص داخل ہوا۔ سرائے کا مالک بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے ہاتھ میں مشعل تھی جس کی روشنی میں اسے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

یہ بھگوڑے تاتاریوں میں سے ایک تھا۔ ذرا دیر بعد ہی اس نے بقیہ تین کو بھی پہچان لیا۔ ان سب کے ہاتھوں میں تیر تھے۔ سرائے کے مالک نے تیمور کی طرف اشارہ کیا۔ چار تیر ایک ساتھ چلے اور تیمور کے بستر میں پیوست ہو گئے۔ اب تیمور کے لیے کھیل ناقابل برداشت ہو گیا
تھا۔ اس نے اپنی تلوار کو بلند کیا اور بھگوڑے تاتاریوں کے مقابلے پر اچانک پہنچ گیا۔

سرائے کا مالک تو بھاگنے لگا لیکن تیمور نے تلوار کا ایک چرکا اسے بھی لگا دیا اور کہا۔

"اگر تو یہاں سے بھاگ بھی گیا تب بھی میں تجھ سے تیرے جھوٹ کا حساب کتاب تو کروں گا ہی۔"

تیمور نے تاتاریوں کو سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اس نے اپنے پہلے ہی وار میں دو تاتاریوں کو مار گرایا۔ بقیہ دو بھاگنے لگے لیکن تیمور نے انہیں بھی جا لیا اور بھاگتے میں ان کی ٹانگوں کو زخمی کر دیا۔ وہ دونوں اوندھے منہ گر گئے۔

اب تیمور نے زخمی سرائے کے مالک سے مخاطب ہو کر غیظ و غضب سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"او ذلیل انسان! اب بتا کہ تو نے ان چاروں کو سرائے میں چھپا کر مجھے دھوکا کیوں دیا تھا؟"

سرائے کا مالک تیمور کے قدموں میں گر گیا۔ عاجزی سے بولا۔ "تاتاری نوجوان! ان چاروں نے تجھے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور مجھے لالچ دیا کہ اگر میں ان کی موجودگی کو راز میں رکھوں گا تو وہ مجھے خاصا انعام و اکرام دیں گے۔ میں نے ان کو چھپا دیا۔ یہ تجھے دھوکے سے قتل کر دینا چاہتے تھے۔"

تیمور نے کہا۔ "میں تجھے بھی قتل کر سکتا ہوں لیکن معاف کرتا ہوں۔ میں نے امیر کازغان کا بدلہ لے لیا اس لیے اب واپس جا رہا ہوں۔ تیرے پاؤں کا زخم تجھے میری یاد دلاتا رہے گا۔"

سرائے کا مالک خوفزدہ ہو کر تیمور کی باتیں سنتا رہا۔ فجر سے ذرا پہلے تیمور مقتول تاتاریوں کی لاشوں کو خالی گھوڑوں پر ڈال کر امیر کازغان کے خیموں کی طرف چل پڑا۔

امیر کازغان کے عزیزوں نے جب مقتول تاتاریوں کی لاشیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو انہیں قدرے سکون ملا۔

☆☆☆

اب امیر کازغان کے دارالخلافہ سمرقند میں کوئی ایسا نہیں تھا جو حکومت کو سنبھال سکتا۔ ایسے میں حاجی برلاس سمرقند میں داخل ہوا اور اپنی امارت کا اعلان کر دیا۔

تیمور اس جھگڑے سے دور رہنا چاہتا تھا۔ وہ سمرقند ہی میں تھا لیکن عملاً وہ کسی کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ ابھی امیر کازغان کا زخم ہرا ہی تھا کہ شہر سبز سے خبر آئی کہ بوڑھا

ترغائی اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔

تیمور کو صدمہ تو ہوا لیکن وہ اسے کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ سمرقند سے شہر سبز چلا گیا۔ سفید محل میں الجائی اس کا انتظار کر رہی تھی لیکن جب اس بار ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو دونوں کے دل دکھ سے بوجھل تھے۔ بے اختیار ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گئے اور الجائی سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ خود تیمور اس طرح نہیں رو سکتا تھا۔ اس لیے وہ الجائی کو تسلیاں دینے لگا اور اپنے دامن سے اس کے آنسو پونچھتا رہا۔

☆☆☆

شمال کی پہاڑیوں میں خان اعظم تغلق تیمور سمرقند کے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب اس کو خوب اچھی طرح یہ یقین ہو گیا کہ امیر کازغان جیسی صلاحیتوں والا دوسرا شخص موجود نہیں ہے تو اس نے اس کا نظم و نسق کسی اپنے آدمی کے حوالے کر دینے کا ارادہ کر لیا۔

اس نے ایک عظیم الشان لشکر تیار کیا اور اس کے ساتھ پہاڑ کی بلندیوں سے نیچے اتر کر سمرقند کی طرف بڑھنے لگا۔

اس دہشت ناک خبر نے سرداروں کے حوصلے پست کر دیے۔ جلائر سردار اپنے شہر خوجند چلا گیا کیونکہ خوجند خان اعظم کی راہ میں پڑتا تھا لہٰذا اس نے خان اعظم کی اطاعت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ رہا حاجی برلاس، اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خان اعظم کا مقابلہ کر سکتا۔ شہر سبز کے نامور افراد حاجی برلاس کے ساتھ پہلے ہی سمرقند پہنچ چکے تھے۔ حاجی برلاس نے شہر سبز اپنے قاصد بھیجے اور تیمور سمیت ہر ایک کو خان اعظم کے خطرے سے آگاہ کیا اور اپنی تجویز پیش کی کہ جملہ برلاس کو خان اعظم کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لیے اس کی سرکردگی میں ہرات نکل چلیں لیکن تیمور کو حاجی برلاس کا ساتھ دینے میں تامل تھا۔ اس نے حاجی برلاس کو مطلع کر دیا کہ وہ ہرات نہیں جائے گا۔ وہ اگر کبھی سبز کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تو سمرقند چلا جائے گا اور سمرقند کا رخ بھی اس وقت کرے گا جب خان اعظم سبز کے باہر خیموں کا شہر آباد کر چکا ہو گا۔

تیمور کا یہ فیصلہ حاجی برلاس کی سمجھ میں نہ آیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید تیمور کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔

تاہم ان غیر یقینی حالات میں تیمور نے الجائی اور ننھے جہانگیر کو شہر سبز سے ہٹا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ان دونوں کو اپنے سالے اور والیٔ کابل، حسین کے پاس بھیج دینا چاہتا تھا لیکن جب الجائی کو تیمور کے ارادوں کی خبر ہوئی تو اس نے تیمور کو مجبور کرنا چاہا کہ وہ بھی کابل چلا چلے لیکن تیمور نے کہا۔

"الجائی! تیرا بھائی حسین جب یہ دیکھے گا کہ خان اعظم کے خوف سے میں منہ چھپاتا پھر رہا ہوں تو وہ میرے بارے میں اپنے دل میں کیا سوچے گا؟"

الجائی نے جواب دیا۔ "خان اعظم کے خوف سے بھاگنے والے تم تنہا تو نہیں۔ تقریباً سب ہی برلاس بھاگ چکے ہیں۔"

تیمور نے کہا۔ "تُو بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے لیکن میں حاجی برلاس نہیں ہوں۔"

الجائی نے پوچھا۔ "پھر ہم دونوں کب ملیں گے؟"

تیمور نے جواب دیا۔ "میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں لیکن خیال یہی ہے کہ زیادہ دن نہیں لگیں گے۔"

اس کے بعد الجائی جہانگیر کو لے کر کابل چلی گئی۔

وہ جاتے سے جن حسرت ناک نگاہوں سے تیمور کو دیکھ رہی تھی وہ تیمور کو زندگی بھر یاد رہیں۔

تیمور سیدھا سید برکی کے پاس پہنچا اور واقعات کو نہایت صراحت سے سنا کر ان سے مشورہ طلب کیا۔

"پیر و مرشد! ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

سید برکی نے جواب دیا۔ "تیمور! تو یہ سمجھ لے کہ اس وقت آسمان تیرے لیے کمان بن چکا ہے اور زمین کمان کا چلہ۔ حوادث اس کمان کے تیر ہیں اور ان تیروں کا رخ تیری طرف ہے۔ خدائے عزوجل تیر انداز ہے۔ اب تُو خود ہی بتا کمان سے بھاگ کر تو کہاں جا سکتا ہے؟"

تیمور نے کہا۔ "میں خدا کی طرف تو بھاگ سکتا ہوں۔"

سید برکی نے کہا۔ "بے شک، تجھے اپنے رب کی طرف بھاگنا چاہیے۔"

تیمور نے کہا۔ "ویسے بھی پیر و مرشد، میں خراسان کی سمت بھاگ سکتا ہوں مگر اس میں فائدہ ایک ہے اور نقصان دو..... فائدہ یہ ہے کہ میں اپنی جان بچا سکتا ہوں اور دو نقصان یہ ہیں کہ میں ہمیشہ کے لیے ماوراالنہر سے دور ہو جاؤں گا اور شاید پھر بھی بڑا بننے کے خواب نہیں دیکھ سکوں گا۔ اسی طرح اگر میں خان اعظم کے دربار کا رخ کروں تو اس میں فائدے دو ہیں اور نقصان ایک۔ نقصان یہ ہے کہ میں جان سے مارا جا سکتا ہوں اور دو فائدے یہ ہیں کہ اگر میں بچ جاؤں گا تو میں اپنے شہر میں رہ سکتا ہوں اور تغلق تیمور سے کچھ حاصل بھی کر سکتا ہوں۔"

سید برکی نے ہمت بندھائی۔ فرمایا۔ "خوفزدہ نہ ہو اور اس کا انتظار کر جو پردۂ غیب سے ظاہر ہونے والا ہے۔"

حاجی برلاس، برلاسوں کو لے کر جنوب میں ہرات کی طرف فرار ہو گیا لیکن تیمور شہر سبز ہی میں ڈٹا رہا۔ اس نے

اپنے گھوڑوں، اونٹوں، زیورات، جواہرات اور دوسری قیمتی چیزوں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ اس میں سید برکی نے اس سے بہت تعاون کیا اور انہوں نے بھی اپنی بیش قیمت چیزیں تیمور کے حوالے کر دیں۔

شہر سبز اور اس کے آس پاس کے وہ لوگ جو ابھی وہیں موجود تھے، تیمور کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ورنہ ان دنوں سمرقند، شہر سبز، نخشب اور دوسرے شہروں سے بھاگنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ بھاگنے والوں کا منظر اتنا بھیانک تھا کہ جو لوگ کسی وجہ سے بھاگ نہیں سکتے تھے، وہ یہ منظر دیکھ کر خوفزدہ ہوئے جا رہے تھے۔

تیمور نے اپنے کچھ آدمی شمال کی ان راہوں پر چھوڑ دیے تھے جدھر سے خان اعظم کے ہراول دستے نمودار ہو سکتے تھے۔

آخر ایک دن یاک کی دموں والے پرچم لیے منگولوں کا ایک دستہ نظر آ گیا۔ تیمور کو اس دستے کی جونہی خبر ملی، وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اس دستے کے سردار کے پاس روانہ ہو گیا۔ اس نے ہراول دستے کا استقبال کیا اور ہراول دستے کے سردار سے کہا۔

"شہر سبز کا صوبے دار خان اعظم کے ہراول کو خوش آمدید کہتا ہوں اور ہراول کے سردار کے اعزاز میں شاندار ضیافت کا اعلان کرنے آیا ہوں۔"

ہراول کا سردار تیمور کی طرف بڑھا۔ پوچھا۔

"تیرا نام؟"

تیمور نے جواب میں کہا۔ "سردار! میں ترغائی مرحوم کا بیٹا تیمور ہوں۔ مرحوم صوبے دار نے اپنے آخری لمحوں میں مجھے یہ ہدایت کی تھی کہ یہاں جو کچھ ہے، خان اعظم کا ہے۔ اس لیے جب میں نے یہ سنا کہ خان اعظم ہم میں تشریف لا رہے ہیں تو میں نے ان کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔"

ہراول دستے کا سردار مخمصے میں پڑ گیا۔ وہ اپنے مقابل ہتھیار بند لوگوں کا تو مقابلہ کر سکتا تھا لیکن خوش آمدید کہنے والوں کا کس طرح مقابلہ کیا جائے؟ یہ بڑا مشکل مسئلہ تھا۔

بہرکیف، اس نے اسی خوش اخلاقی سے تیمور کی ضیافت قبول کر لی جس خوش اخلاقی سے یہ دعوت دی گئی تھی۔ تیمور انہیں سفید محل میں لے آیا اور بہت سے جانور ذبح کر کے ان کی دعوت کا سامان کرنے لگا۔ اس نے لوٹ کے سامان سے لدے ہوئے ہراول دستے کو جی بھر کے لذیذ کھانے، شراب اور آرام کرنے کا موقع دیا۔ ہراول اور اس کا سردار تیمور سے بہت خوش تھے۔

اقوال زریں

☆ بلند انسان کے ہاتھوں میں مٹی بھی آ کر سونا بن جاتی ہے۔

☆ بہترین انسان وہ ہے جو اپنی کامیابی کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہو اور مصیبت کے وقت صبر اختیار کرے۔

☆ زندگی ایک ہیرا ہے جسے تراشنا انسان کا کام ہے۔

☆ عظیم انسان صرف اس کو کہا جاتا ہے جس کا کردار پاک اور عظیم ہو۔

☆ وہ انسان ہی کیا جس کا کوئی مخالف نہ ہو۔

☆ قوموں کا دفاع بے شمار اسلحہ، قوت اور بے پناہ افرادی طاقت سے نہیں بلکہ جذبۂ ایمانی سے ہوتا ہے۔

☆ سب کو دینے والا وہی ایک خدا ہے جو شاہوں کا بادشاہ، مالکوں کا مالک اور داتاؤں کا داتا ہے۔

☆ بری عادت ایک زور آور دشمن ہے۔

☆ میں نے بے شمار چور اور جواریوں کو توبہ کرتے دیکھا ہے لیکن کسی جھوٹے کو سچ بولتے نہیں دیکھا۔

☆ چوری اور خیانت سے بچو۔ یہ افلاس پیدا کرتی ہے۔

(مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال)

سردار نے سفید محل میں گھوم پھر کر اس سامان کو دیکھا جو اس مقصد سے جمع کیا گیا تھا کہ ہراول دستے کے سردار کو للچایا جائے۔ سردار حرص و طمع کی نظروں سے سفید محل کی دولت اور ساز و سامان کو دیکھ رہا تھا لیکن زبردستی لے نہیں سکتا تھا۔ اس نے تیمور کا نمک کھایا تھا اور اس نمک کا خیال تو کر رہا ہی تھا۔ آخر تیمور نے خود ہی کوشش کی اور بولا۔

"یہاں جو کچھ ہے، مہمان سردار پسند کر کے بطور تحفہ لے سکتا ہے۔"

سردار نے فی الفور اپنی پسند کی چیزیں لیں اور تیمور کو شکر گزار نظروں سے دیکھا۔

جب ہراول رخصت ہونے لگا تو تیمور نے سردار سے کہا۔ "سردار! میں خان اعظم کی خدمت میں حاضری دینا

چاہتا ہوں۔ مجھے کہاں پہنچنا چاہیے؟"

سردار نے جواب دیا۔ "خان اعظم سمرقند کے باہر ٹھہرا ہوا ہے۔ فوراً روانہ ہو جا لیکن جانے سے پہلے ایک بات کا خیال رہے۔ خان اعظم کے لیے تحفے تحائف لے جانا نہ بھولنا۔"

تیمور نے جواب دیا۔ "میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہاں جو کچھ ہے، وہ خان اعظم کا ہے۔ میں خان اعظم کے لیے بہترین گھوڑے، اونٹ اور دوسرے مویشیوں کے ریوڑ لے جاؤں گا اور ساتھ ہی سونا، چاندی اور جواہرات بھی۔"

اس پر ہراول سردار نے ہنس کر کہا۔ "اور کچھ میرے جیسوں کے لیے بھی، کیونکہ سمرقند کی راہ میں کئی اور ہراول بھی ملیں گے۔ ان کے سردار تجھ سے اپنا حق ضرور مانگیں گے۔"

تیمور نے جواب دیا۔ "میں حق داروں کا حق دیے بغیر آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے جو جس کا حق ہے اسے ضرور ملے گا۔"

القصہ تیمور نے سمرقند جانے کی تیاری شروع کر دی اور جب وہ مویشیوں کا ریوڑ اور دوسری قیمتی اشیا لے کر سمرقند کی طرف بڑھا تو واقعی راستے میں دو ہراول اور ملے۔ تیمور نے انہیں مطلع کیا کہ میں خان اعظم کے پاس جا رہا ہوں لیکن حق داروں کا حق ضرور ملے گا اور ان دونوں سرداروں کو بھی "دے دلا" کر راضی کر لیا گیا۔

☆☆☆

سمرقند کے مضافات میں ہزاروں خیموں کا جنگل اُگا ہوا تھا اور اس کا نظارہ خاصا دہشت ناک تھا۔ لمبے لمبے نیزوں کو اٹھائے اور دوسرے ہتھیاروں کی نمائش کرتے ہوئے خان اعظم کے اجڈ اور وحشی مغل اِدھر اُدھر آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ جب ان کی نظر تیمور کے ساز و سامان پر پڑی تو وہ اپنی جگہ تھم کر کھڑے ہو گئے۔ پہلے وہ یہ سمجھے کہ کوئی ہراول لوٹ کا سامان لے کر خان اعظم کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے لیکن انہیں حیرت تھی کہ اس سامان کے ساتھ مغل نہیں تھے۔ ذرا سی دیر میں یہ خبر خان اعظم کے پورے لشکر میں پھیل گئی اور مغل اپنے اپنے خیموں سے نکل کر اس انوکھی آمد کو بڑے اشتیاق سے دیکھنے لگے۔

خان اعظم کے ہرکارے پہلے ہی صورت حال جاننے کے لیے تیمور کی طرف گھوڑے دوڑائے چلے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب خان اعظم کو یہ معلوم ہوا کہ شہر سبز اور نخشب کے مرحوم صوبے دار ترغائی کا بیٹا تیمور اس کی خدمت میں تحفے تحائف اور نذرانے لے کر حاضر ہو رہا ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنے خاص خدمت گاروں کو حکم دیا کہ وہ صوبے دار ترغائی کے بیٹے تیمور کو عزت و احترام سے حاضر کریں۔

جب خان اعظم کے آدمی تیمور کو اپنے بیچ میں لے کر خان اعظم کی طرف بڑھے تو اس نے خان اعظم کو یاک کے نو دموں والے پرچم کے زیرِ سایہ بیٹھے دیکھا۔

خان اعظم کے سامنے جگہ خالی تھی مگر اس کے دائیں بائیں قطاروں میں اس کے مختلف عہدے دار بیٹھے تھے۔ تیمور خان اعظم کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور عرض کیا۔

"معزز خان! میں مرحوم ترغائی کا بیٹا اور برلاس قبیلے کا سردار تیمور ہوں۔"

خان اعظم نے تیمور کو بڑے غور سے دیکھا کیونکہ خان کے آدمی اسے پہلے مطلع کر چکے تھے کہ ترغائی کا بیٹا تحفے تحائف کا بہت بڑا انبار لے کر حاضر ہوا ہے۔

خان نے کہا۔ "تو برلاس کا سردار کس طرح ہو گیا؟ کیا حاجی برلاس سردار نہیں ہے؟"

تیمور نے جواب دیا۔ "اگر وہ برلاس کا سردار ہوتا تو یہاں میری جگہ وہ خان اعظم کی خدمت میں آیا ہوتا لیکن وہ ہرات چلا گیا اور خان اعظم کی خدمت میں، میں نے حاضری دی۔"

خان اعظم کو اس نوجوان کی باتوں میں بڑا وزن محسوس ہوا۔ اس نے کہا۔

"اگر تو اس پر مصر ہی ہے کہ میں تجھ ہی کو برلاس کا سردار مان لوں تو ٹھیک ہے اور پھر تو نے تحفے تحائف بھی بہت زیادہ پیش کیے ہیں۔ میرا خیال ہے تو نے اپنے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔"

تیمور نے جواب دیا۔ "خان اعظم! میں تو اس سے بھی زیادہ تحفے تحائف لے کر چلا تھا لیکن میں یہاں تک آیا تو تیرے تین بے وفا کتوں نے ان تحفوں میں سے بہت اپنے لیے الگ کر لیا۔"

خان اعظم نے کہا۔ "تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف بات کر۔"

تیمور نے جواب میں کہا۔ "خان! جب میں تحفے تحائف لے کر یہاں آ رہا تھا تو تیرے تین ہراول سرداروں نے اپنا اپنا حصہ الگ کر لیا۔"

خان اعظم نے غصے میں اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے سرداروں سے کہا۔ "ان تینوں ہراول سرداروں کو تحائف کے ساتھ

میرے پاس حاضر کیا جائے۔"

اس فرمان کی تعمیل کے لیے تین سردار اٹھے اور سو سو سپاہیوں کے دستے لے کر ہراول کی گرفتاری کے لیے روانہ ہو گئے۔

ان کے جاتے ہی خان اعظم نے ترغائی کے بیٹے تیمور سے کہا۔ "تو فکر نہ کر، میرے تینوں سردار تینوں کتوں کو باندھ کر لے آئیں گے۔"

تیمور نے جواب دیا۔ "خان اعظم! میرا اپنا خیال مختلف ہے۔ تیرے تینوں کتے بے وفا ہیں۔ وہ مزاحمت کریں گے اور بالکل ممکن ہے کہ وہ چھینے ہوئے تحائف کے ساتھ ہی اپنے زیرِ کمان منگولوں کو بھی لے کر بھاگ جائیں گے۔ وہ خان اعظم کے باغی بھی ہو سکتے ہیں۔"

خان اعظم نے پہلو بدلا اور گردن کو اکڑا کر اعلان کیا۔ "اگر انہوں نے بغاوت کی تو وہ زمین و آسمان کی حدوں سے باہر تو نہیں جائیں گے۔ اس طرح وہ ایک سنگین جرم کریں گے اور اسا (چنگیز خان کے مرتب کیے ہوئے قوانین کی کتاب) نے اس جرم کی سزا موت رکھی ہے۔"

المختصر خان اعظم کو تیمور پسند آیا تھا۔ اس کے خیال میں اس نوجوان میں ایک ہی خرابی تھی اور وہ یہ کہ خان اعظم سے وہ خوفزدہ نہیں تھا۔ وہ تیمور سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد اسے مہمانوں کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔

اس نے منگولوں کے چہروں میں اپنے آبا و اجداد کی شباہت محسوس کی۔ اس مانوس شباہت نے اس کے دل سے خان اعظم اور اس کے سپاہیوں کا خوف بالکل زائل کر دیا تھا۔ وہ اپنے خیمے میں معلوم نہیں کیا کیا کچھ سوچتا رہا۔

دوسرے دن دوپہر میں خان اعظم نے تیمور کو طلب کیا اور اسے تخلیے میں لے جا کر نرمی سے کہا۔ "ترغائی کے بیٹے! تو ایک عقلمند نوجوان ہے۔ اگر میں تجھ سے مشورہ چاہوں تو کیا تو خلوص اور دیانت داری سے مشورہ دے سکتا ہے؟"

تیمور نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں، کیوں نہیں خان اعظم! کبل خان اور جوچی خان کے مابین ہونے والے معاہدے کا تو اچھی طرح علم ہو گا۔ میں اس معاہدے کی رو سے خود کو خان اعظم کا وزیر سمجھتا ہوں۔"

خان اعظم نے تیمور کی پشت تھپتھپائی اور کہا۔ "میں تیری خاندانی وزارت سے کس طرح منکر ہو سکتا ہوں۔ وہ تو لوحِ پر لکھا ہوا ہے۔ اگر میں اس سے منہ موڑوں گا تو جاودانی نیلا آسمان مجھے اس کی سزا دے گا۔"

تیمور نے پوچھا۔ "مجھے خان اعظم نے کیوں یاد فرمایا ہے؟"

خان اعظم نے جواب دیا۔ "تینوں ہراولی کتے باغی ہو چکے ہیں اور اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ جو تین سردار تین سو سپاہیوں کے ساتھ انہیں پکڑنے گئے تھے، معلوم ہوا ہے کہ وہ بھی ان سے مل گئے ہیں اور اب یہ چھ سردار اپنی افواج سمیت میرے اور میری فوج کے خلاف گوریلا لڑائی شروع کریں گے۔"

تیمور نے افسوس کیا اور بولا۔ "ہراول دستوں کے سردار خان اعظم کے وفادار نہیں تھے۔ اس لیے ان کا الگ ہو جانا ہی بہتر ہوا۔"

خان اعظم نے پوچھا۔ "ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

تیمور نے جواب دیا۔ "خان اعظم کی حکومت جتنی وسیع ہے، اتنی ہی بڑی خان اعظم کی عقل ہے۔ سبز اور نخشب کے سردار ترغائی کے بیٹے کا مشورہ ہی کیا۔"

ایک سردار نے کہا۔ "خان اعظم کو یہ بات بطور خاص اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے کہ باقی سرداروں کا رخ خان اعظم کا کوہستانی مسکن المالیق تھا اور خیال ہے کہ وہ المالیق میں کوئی گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

خان اعظم نے تشویش سے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو ہمیں فوراً واپس جانا ہو گا لیکن دوسرا خیال یہ ہے کہ مجھے اس جگہ رک کر حاجی برلاس کی گوشمالی کا بندوبست کرنا چاہیے۔"

تیمور نے کہا۔ "خان اعظم کے معاملات کو خان اعظم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے لیکن میری ذاتی رائے بھی یہی ہے کہ خان اعظم کو المالیق واپس چلے جانا چاہیے کیونکہ المالیق میں خان اعظم کا صرف ایک دشمن ہے جبکہ سمرقند میں رکنے سے خان اعظم کو دو دشمنوں کا خطرہ رہے گا۔"

خان اعظم نے کہا۔ "تو بالکل صحیح کہتا ہے نوجوان! میں اپنے کوہستانی مسکن واپس جاؤں گا اور تو چونکہ وفادار بھی ہے اور عقلمند بھی، اس لیے میں سمرقند تیرے حوالے کر جاؤں گا۔"

تیمور نے جواب دیا۔ "خان اعظم کی نوازشوں کا شکریہ لیکن جن حالات میں خان اعظم سمرقند میرے حوالے کریں گے، میں باقی منگول سرداروں اور حاجی برلاس جیسے دو دشمنوں میں گھر جاؤں گا۔ اس لیے اگر خان اعظم یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کی شاندار اور پُررعب نیابت کروں تو مجھے خان اعظم کی نسبت سے مضبوط اور توانا بھی ہونا چاہیے۔"

اس پر خان اعظم نے جواب دیا۔ "میں نے تجھے تمان باشی (اعلیٰ شاہی عہدہ) مقرر کیا۔ میرا خیال ہے یہ منصب تیرے شایانِ شان ہے بھی۔"

تیمور نے کہا۔ "اب میں دو دشمنوں کا مقابلہ شاندار

طریقے سے کرسکوں گا۔"

خان اعظم اسے "تمان باشی" کا پروانہ دے کر واپس چلا گیا۔ تیمور اب کسی حد تک مطمئن تھا۔ اس نے نہایت ہوشیاری، عقل وفراست سے نہ صرف اپنی وادی کو منگولوں کی تاخت وتاراجی سے بچالیا تھا بلکہ اس نے اپنی ذہانت وسیاست سے کام لے کر خان اعظم کی فوج میں انتشار اور نفاق کا بھی بیج بو دیا تھا۔ یہ سب کچھ ان حالات میں ہوا تھا جبکہ وادی کے جہاندیدہ، گرگ باراں دیدہ اور تجربے کار سردار راہ فرار اختیار کرچکے تھے۔

حاجی برلاس اور جلائر سردار خان اعظم کی واپسی کا انتظار کرتے رہے چنانچہ اس کے جاتے ہی یہ لوگ سمرقند واپس آگئے لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ نوجوان تیمور خان اعظم سے تمان باشی کی سند حاصل کرچکا ہے تو رشک وحسد نے انہیں جلا کر رکھ دیا۔

وہ اپنی موجودگی میں تیمور کو تمان باشی یا اپنا سردار ماننے کو تیار نہیں تھے۔ وہ سب سر جوڑ کر بیٹھے اور دیر تک صلاح ومشورے کرتے رہے۔ آخر طے پایا کہ وہ سر دست تیمور کے اعزاز میں ایک دعوت کریں گے اور اسے مبارک باد دیتے ہوئے دھوکے سے جہنم واصل کردیں گے۔

اس خطرناک سازش کی تیاری کے بعد انہوں نے تیمور کے اعزاز میں دعوت کردی۔ وقت مقررہ پر تیمور، حاجی برلاس اور جلائر سردار کے مشترکہ خیمے میں پہنچ گیا لیکن اس نے خیمے میں داخلے سے پہلے ان مسلح سپاہیوں کو دیکھ لیا جن کی آنکھوں میں دغابازی کی چمک تھی۔

تیمور کچھ دیر خیمے میں رکا تو حاجی برلاس نے کہا۔

"بھتیجے! اپنے چچا کی موجودگی میں تو نے تمان باشی کا منصب قبول کرلیا...... جب یہ بات عام ہوگی تو لوگ کیا کہیں گے؟"

تیمور نے جواب دیا۔ "چچا حاجی! اس وقت لوگوں نے کیا کہا تھا جب خان اعظم کی آمد پر برلاس قبیلے کے جملہ سردار تو بھاگ گئے تھے مگر حاجی برلاس کا نوجوان، بے یارومددگار بھتیجا تیمور آخر وقت تک خان اعظم کے آس پاس موجود رہا اور اس کا یہ صلہ پایا کہ خان اعظم نے اسے تمان باشی کی سند دی۔ اس وقت حاجی برلاس یا دوسرے سردار کہاں تھے؟"

تیمور کے تیکھے اور شرمندہ کردینے والے لفظوں نے حاجی برلاس کو مشتعل کردیا۔ وہ کوئی حکم دینے ہی والا تھا کہ تیمور نے اپنے نتھنوں پر رومال رکھ لیا۔ اسی عالم میں خیمے سے باہر نکل گیا اور جاتے جاتے کہا۔

"[illegible]"

وہ باہر نکلتا چلا گیا۔ پہلے تو کچھ دیر تک وہ اپنے نتھنے صاف کرتا رہا پھر اچانک اٹھا اور اپنے گھوڑے کی پچھاڑی کاٹ کر اس پر سوار ہوگیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر کے جاتے ہوئے بولا۔

"لوگو! حاجی برلاس اور دوسرے سرداروں سے کہہ دینا کہ تیمور نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ وہ اب خان اعظم کا تمان باشی ہے۔ اس لیے تم سب تیمور کا کہنا مانو ورنہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر تم نے میرا کہنا نہ مانا تو میں تمہارے سر پرغرور کو کس طرح جھکا سکتا ہوں۔"

حاجی برلاس اور دوسرے سردار تیمور کے نکل جانے کی وجہ سے بہت شرمندہ تھے۔ تیمور نے اسی وقت مقابلے کی تیاری شروع کردی لیکن بزرگ سرداروں نے لڑے بغیر ہی مفاہمت کرلی اور بہ جبر وکراہ اس کی تمان باشی کو گوارا کرلیا۔ یوں تیمور کا ایک ابتدائی بڑا خواب پورا ہوا۔

☆☆☆

اپنی فتوحات کے ایک باب ماضی کو یاد کرنے کے بعد تیمور کے خیالات کا سورج حال میں طلوع ہوا اور وہ اپنے لاڈلے بیٹے جہانگیر کی دلہن کو پُرشفیق نظروں سے دیکھتا رہا۔

یوں دیکھا جاتا تو خان زادی کا بخت مختلف تھا۔ وہ ایک عظیم فاتح کے ولی عہد بیٹے کی بیوی تھی۔ جس کا اپنا علیحدہ دربار تھا۔ وہ حسین اور خوبرو تھی اور اسی لیے شاید اسے اس قسم کی مراعات حاصل تھیں کہ وہ بے دھڑک تیمور کے سامنے جو چاہتی کہہ سکتی تھی۔ خواہ تیمور کو غصہ ہی کیوں نہ آجائے۔

"اے شاہ معظم!" اس نے کہا۔ "فاتح وہ ہے جو شاہ وگدا کو یکساں طور پر بخش دیتا ہے۔ جب وہ غلطی کے مرتکب ہوں تو عفو سے کام لیتا ہے۔ اس لیے کہ جب دشمن معافی کا خواستگار ہوجاتا ہے تو وہ دشمن نہیں رہتا۔ جب فاتح کوئی شے دیتا ہے تو اس کا بدلہ نہیں چاہتا۔ وہ کسی ایک آدمی کی دوستی کا سہارا نہیں لیتا اور نہ ہی وہ اپنے غصے کا بوجھ صرف ایک دشمن پر ڈالتا ہے۔ اس لیے کہ سبھی اس کے زیر نگیں ہیں اور وہ ان سب سے بلند وبالا ہے۔"

"نہیں، دختر نیک اختر! یہ بات نہیں۔" تیمور نے جواب میں کہا۔ "امیر، وزیر، سردار اور شہزادے میرے حضور میں دست بستہ کھڑے رہتے ہیں مگر درویشوں سے میں خوف کھاتا ہوں۔"

تیمور کو خان زادی کی عقل مندانہ گفتگو پسند آئی۔ وہ جانتا تھا کہ شہزادی اپنے ہم قبیلہ ترکمان کی برات کی کوشش [illegible]

پہلی اولاد نرینہ ہو اور اس کی یہ خواہش جلد ہی پوری ہوگئی۔ جہانگیر کے دو بیٹے شہزادہ محمد اور پیر محمد خان زادی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اس دوران تیمور نے اپنے برادر نسبتی امیر حسین کی بیوہ سرائے خانم سے شادی کرلی تھی۔

یہ ایک پرانی مغل رسم تھی کہ جب سردار قتل ہوجائے تو اس کی بیوی (بیوہ) فاتح بادشاہ کے حرم میں داخل ہوجائے اور سرائے خانم کی رگوں میں تو چنگیز خان کا خون بھی تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں اس کی بیگم تھی۔

خیموں کی دیواروں کے اندر کی ملکہ...... جب تیمور میدان جنگ میں ہوتا، دربار اسی کے سامنے دو زانو ہوا کرتا۔ وہ سپاہیوں کے خاندان سے تھی اور اکثر شکار میں شامل ہوا کرتی تھی۔

تیمور کی ذات سے اس کی وفاداری مسلّم تھی اور اس کی وفاداری سے تیموری خاندان کے بیٹوں اور پوتوں کے تعلقات وابستہ تھے۔

تیمور نے سمرقند جہانگیر کے حوالے کیا اور شمالی مہم پر روانہ ہوا۔ اس دفعہ اس نے جاٹ مغلوں کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے ختم کردینے کا فیصلہ کیا۔ اس لیے کافی عرصے ان کی سرکوبی میں مصروف رہا حتیٰ کہ وہ صحرائے گوبی تک جا پہنچا۔

قمرالدین وہ آخری مغل تھا جسے تیمور کے مقابل رزم آراء ہونے کی ہمت ہوئی۔ اس کی بھی طاقت تہس نہس ہوگئی۔ حتیٰ کہ اس کا گھوڑا بھی پکڑ لیا گیا تھا اور اسے تن تنہا جان بچا کر بھاگنا پڑا۔

تیمور نے جہانگیر کو کہلا بھیجا۔ "پہلی بار ہم نے صرف چنگاریاں بجھائی تھیں، اس بار ہم نے پوری آگ کو سرد کردیا ہے۔"

☆☆☆

جب وہ خطا کی ایک ہزار میل لمبی مسافت طے کرکے لوٹا تو اہل سمرقند نے باغوں کے باہر اس کا استقبال کیا۔ وہ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے اور فضا میں خاموشی طاری تھی۔

سیف الدین، امراء کا سردار، دوسرے سرداروں کے آگے آگے تیمور کی طرف بڑھا۔ سب نے اپنے لبادوں پر خاک ڈال رکھی تھی۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر تیمور نے باگ کھینچی۔

سیف الدین گھوڑے سے اتر کر سر جھکائے تیمور کی طرف پاپیادہ بڑھا اور اس کی رکاب تھام لی۔

"کیا تم خوفزدہ ہو؟" تیمور نے پوچھا پھر ایک لمحے کے بعد آگے بولا۔ "بولو سیف الدین!"

سیف الدین نے دبی زبان میں کہا۔ "میرے دل میں خوف تو کوئی نہیں۔ نوجوان شہزادہ ابھی اپنے شباب عروج پر تھا کہ اس کو نازک پھول کی طرح آپ سے چھین لیا گیا ہے جو باد تند کے جھونکوں سے اپنی ٹہنی سے جدا ہوجاتا ہے۔"

جہانگیر کی بیماری کی خبر تیمور کو نہ دی گئی تھی اور وہ باپ کے آنے سے چند روز قبل راہی عدم ہوچکا تھا۔

سیف الدین شہزادے کا مشیر بھی تھا۔ اسی کی ہمت تھی کہ امیر تیمور کو اس صدمے سے مطلع کرے۔

"سوار ہوجاؤ اور اپنا مقام لے لو۔" تیمور نے یک لخت رک کر کہا۔

جب پیرانہ سال امیر سیف الدین اپنی جگہ پر جاچکا تو روانگی کا اشارہ دیا گیا اور آہستہ آہستہ لشکر آگے بڑھا۔

یہ خبر پورے لشکر میں آناً فاناً پھیل گئی اور دارالسلطنت میں فاتح فوج کی واپسی غم کے سائے میں ہوئی۔

جہانگیر کے طبل اور نقارے امیر نے اپنے سامنے منگوا کر ٹکڑے ٹکڑے کرادیے۔ وہ کسی اور سردار کے علم کے سائے میں کس طرح بجائے جاسکتے تھے۔

ایک لمحے کے لیے تیمور کے دل میں درد وغم کی لہر اٹھی اور اس کے فولادی ہونٹ بھنچ گئے۔ دنیا میں اسے جہانگیر سے زیادہ کوئی عزیز نہیں تھا۔ جہانگیر جو بہترین دوست اور ساتھی تھا، جو الجائی کا بڑا لڑکا تھا، جو عین اس وقت داغ مفارقت دے گیا جب اسے صحیح معنوں میں اس کی ضرورت تھی۔

عمر شیخ، تیمور کا دوسرا لڑکا کوہ قاف میں تیر کا شکار ہوچکا تھا۔ موت...... وہی موت...... جو اس عظیم الشان فاتح کے سائے سے بھاگتی تھی، اب اس کے دوسرے لڑکے کو بھی اپنی آغوش میں لے چکی تھی۔

اس کا تیسرا بیٹا میراں شاہ شروع ہی سے خودسر اور شراب کا دلدادہ تھا۔ یہ درست ہے کہ وقت پڑنے پر دلیر بھی تھا مگر حد درجہ ظالم اور سفاک بھی تھا۔ اس کا رویہ صرف اس وقت درست رہتا جب وہ تیمور کے ہمراہ کسی مہم میں شریک کار ہوتا۔ کوہ قاف کے علاقے کی حکومت کا انتظام اسی کے سپرد تھا۔

خان زادی کے لیے بھی یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ پہروں خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ وہ دن اس کی زندگی کے تاریک دن تھے۔ اس کی خواہشات مردہ ہوچکی تھیں۔

جہانگیر کے مرنے کے بعد اس کے لیے زندگی میں کوئی کشش باقی نہ رہی تھی۔ وہ مکمل طور پر گوشہ نشین ہوچکی تھی۔ گوشہ نشینی کے باوصف وہ خود کو محلاتی سازشوں سے محفوظ نہ رکھ سکی۔

اس کی سب سے بڑی دشمن ملکہ سرائے خانم تھیں کیونکہ

خان زادی کا دربار میں اثر رسوخ اس سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ سرائے خانم اس کی عزت کو اپنی حق تلفی محسوس کرتی اور پھر اس کی ایما پر اس طرح کے واقعات ظہور پذیر ہونے لگے کہ خان زادی کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

یوں اس نے اپنے ترکمان حاجب داؤد کو طلب کیا۔

"سفر کے لیے تیاری کرو۔ ہم سلطانیہ جا رہے ہیں۔"

خان زادی نے داؤد کو حکم دیا۔ بوڑھے حاجب نے ایک ذرا تعجب سے شہزادی کی طرف دیکھا۔

"تم کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟ سنا نہیں کہ ہم سلطانیہ جا رہے ہیں۔" خان زادی نے تیزی سے کہا۔ "ساتھ ہی میراں شاہ کو ہماری آمد سے مطلع کرا دو۔ ہم کچھ عرصہ وہاں قیام کریں گے۔"

داؤد منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ان دنوں امیر تیمور ہندوستان کی مہم پر گیا ہوا تھا۔ ملکہ سرائے خانم نے خان زادی کو سلطانیہ جانے کی بخوبی اجازت دے دی۔ وہ اپنے حریف کی پسپائی پر دل ہی دل میں بے حد خوش تھی۔

جب میراں شاہ کو خان زادی کی آمد کی اطلاع ملی تو اس وقت وہ تبریز میں تھا۔ وہ بڑے بھائی کی بیوہ کے استقبال کے لیے اپنے دارالحکومت سلطانیہ پہنچا اور اس کے لیے شاہی محل کا ایک حصہ خالی کرا دیا۔

☆☆☆

بہار کی ایک دلفریب شام کو خان زادی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ سلطانیہ میں داخل ہوئی۔ میراں شاہ نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ کئی برسوں کے بعد وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

میراں شاہ نے محسوس کیا کہ خان زادی پر ماہ و سال کی گردشوں نے کچھ زیادہ اثر نہیں کیا ہے۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح دلکش تھی۔ اس کی آواز میں وہی مٹھاس اور شیرینی تھی۔

خان زادی کے بے پناہ معصوم حسن نے میراں شاہ کے دل میں جیسے آگ ہی لگا دی تھی۔ اس کے سامنے ترکمانوں کی حسین ترین شہزادی، بھرپور رعنائیوں کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"کیسے ہو میراں شاہ؟ کوہ قاف کی آب و ہوا پسند آئی تمہیں؟" خان زادی نے مہرِ سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ "میں تو سمرقند کے گھٹن آمیز ماحول سے اکتا کر ادھر آئی ہوں۔"

میراں شاہ کے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا اور اس نے جلدی سے جواب دیا۔

"چھوٹی خانم صاحبہ! دارالسلطنت کے سازشی ماحول کی بہ نسبت یہ علاقہ ہزار درجے بہتر ہے۔ امید ہے کہ آپ کا وقت اچھی طرح کٹے گا۔"

☆☆☆

خان زادی کی آمد کے چند دنوں بعد ایک رات میراں شاہ اپنی آراستہ خواب گاہ میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک خوب صورت رقاصہ ناچ رہی تھی۔ چند ثانیے وہ رقاصہ کو دیکھتا رہا پھر اچانک ہی اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ زور سے دہاڑا۔

"بند کرو یہ رقص اور یہاں سے چلی جاؤ۔"

رقاصہ کے قدم اچانک تھم گئے۔ اس نے حیرت سے میراں شاہ کی طرف دیکھا اور سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ دروازے کے ہلتے ہوئے پردے کی طرف دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں پر اسرار بھری سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ باہر نکل گیا۔

خان زادی نے کنیز کو جانے کا حکم دیا اور سونے کی تیاری کرنے لگی۔ اچانک باہر سے شور و غل کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ خان زادی نے پلنگ سے چھلانگ لگائی اور باہر کی طرف دوڑی۔ تب ہی اس نے دیکھا کہ میراں شاہ اس کے بوڑھے حاجب داؤد کو دھکے دے رہا تھا۔ خان زادی نے چلا کر کہا۔

"اسے چھوڑ دو میراں شاہ! بھلا اس غریب نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" میراں شاہ نے اسے دیکھا اور زور سے قہقہہ لگایا۔ اس نے داؤد کو ایک زوردار لات رسید کی اور خان زادی کی طرف بڑھا۔ اس سے قبل کہ وہ کہیں بھاگ جاتی، دو مضبوط بازوؤں نے اسے گرفت میں لے لیا تھا۔

"مجھے چھوڑ دو۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔

میراں شاہ نے چیختی چلاتی خان زادی کو اپنے کاندھے پر ڈالا اور اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ خان زادی کے غلاموں نے اسے چھڑانے کی ایک اور کوشش کی تھی مگر میراں شاہ کے اشارے پر اس کے سپاہیوں نے ان کی مشکیں کس لیں۔

میراں شاہ نے اپنی خواب گاہ میں خان زادی کو پلنگ پر ڈالا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ وہ قہقہے لگاتا ہوا خان زادی کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پر شیطانی

مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"میراں شاہ! خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔" خان زادی اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر داد و فریاد کرنے لگی۔ میراں شاہ پر اس وقت شراب اور ہوس طاری تھی اور سب سے بڑا نشہ خان زادی کے ملکوت ساز حسن کا چڑھا ہوا تھا۔ ہوس اور طاقت کے نشے سے چُور اور ہوش و حواس سے اس قدر بیگانہ ہو گیا تھا کہ اسے یہ بھی دھیان نہ رہا تھا کہ وہ اس کے مرحوم بڑے بھائی کی بیوہ ہے۔ اس کا ایک تقدس ہے۔

"کیسے چھوڑ دوں تجھے؟ تو تو رانی ہے۔ مالِ غنیمت ہے میرے لیے اور پھر میں کون سا غیر ہوں تیرے لیے۔"

وہ بادہ گوئی بکتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ خان زادی تڑپ کر پلنگ کی دوسری جانب سے نیچے اتر گئی۔ وہ مدد کے لیے پکارنے لگی لیکن اس کی آواز میں میراں شاہ کے شیطانی اور ہوس انگیز قہقہے بھی شامل ہونے لگے۔

"ہاہا..... ہاہا..... خان زادی! یہاں میرا راج ہے۔ میری راجدھانی ہے۔ کوئی قاعدہ نہیں چیخنے چلانے کا، ماسوائے اپنا دہن حسین تھکانے کے۔ آؤ میرے قریب آ جاؤ۔"

کہتے ہوئے میراں شاہ اپنے دونوں بازو پھیلائے اس کی جانب بڑھتا رہا۔ خان زادی ادھر ادھر سر ٹکراتی رہی۔ اسے خدا اور بڑے بھائی کا واسطہ دیتی رہی لیکن میراں شاہ پر اس وقت ہوس طاری تھی۔ اس نے کسی شکاری کی طرح خان زادی کو دبوچ لیا۔

ذرا ہی دیر بعد خواب گاہ میں خان زادی کی سسکیاں گونجنے لگیں اور میراں شاہ کی پُر ہوس کراہیں۔

☆☆☆

بوڑھا حاجب خان زادی کے قدموں میں بیٹھا اپنے سر پر روتے ہوئے خاک ڈال رہا تھا۔ خان زادی اپنی خواب گاہ میں پلنگ پر کسی اجڑے دیار کی طرح بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر ملال، افسردگی، دکھ اور غم کی پرچھائیوں نے جیسے مستقل ڈیرے ڈال لیے تھے۔

اس کی آنکھیں ابھی تک پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں یوں جیسے وہ ابھی تک شب گزشتہ کی ان قیامت خیز گھڑیوں کا وہ گھناؤنا اور بھیانک منظر دیکھ رہی ہوں جس نے اس کے وجود، اس کی روح تک کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"میں پہلے ہی کہتا تھا ادھر کا رخ نہ کرو۔ پتھر اپنی جگہ بھاری ہوتا ہے۔ لڑھکتا ہے تو پھر دنیا کی ٹھوکروں میں آ جاتا ہے۔" بوڑھا حاجب داؤد روتے ہوئے کہتا جا رہا تھا۔

خان زادی چپ تھی۔ ایک سکتے کی سی کیفیت تھی جو اس پر طاری ہو گئی تھی۔ وہ سن بھی رہی تھی، دیکھ بھی رہی تھی مگر اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، ہم بھی امیر تیمور سے اس کے بیٹے کی شکایت کرنے سے نہیں چوکیں گے۔" داؤد نے یک دم پُرعزم لہجے میں کہا۔ "دیکھتے ہیں وہ کیا انصاف کرتا ہے ہمارے ساتھ۔ ایک طرف اس کے بڑے بیٹے کی بیوہ ہے اور دوسری طرف بھی اس کا اپنا ہی بیٹا ہے۔"

پھر ایک دم بھڑک کر داؤد عجیب سے جوش کے ساتھ بڑبڑایا۔ "امیر تیمور! تو نے اب تک بہت جنگ بازیاں جیتی ہیں۔ آج تجھے نئی جنگ کا سامنا ہے۔ آج تیری اصل آزمائش ہے۔ آج تیری اصل جنگ ہے۔"

"چپ ہو جاؤ داؤد! خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔" خان زادی دلگیر آواز میں چلا اٹھی۔ "اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے ہی اس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔" داؤد جیسے فیصلہ کن لہجے میں بڑبڑایا اور اٹھ کر چلا گیا۔

خان زادی کے دکھوں اور آلام کی ابتدا تو جیسے اسی دن سے شروع ہو گئی تھی جب جہانگیر نے داغِ مفارقت دی تھی پھر یہاں آ کر اس کے غموں میں زخمِ روح کا بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ابھی اس کی آزمائشوں کی ابتدا تھی یہ۔ ابھی تو انسانیت کی گراوٹ کی مزید مکروہ جھلکیاں اس نے دیکھنا تھیں۔

یہی ہوا..... بوڑھے حاجب داؤد نے جیسے ہی ایک فرستادے کو امیر تیمور کی طرف فریاد کی صورت روانہ کیا، میراں شاہ نے الٹا الزام خان زادی پر لگا دیا جسے سن کر خان زادی کو یوں لگا جیسے ایک بار پھر اسے چیر ڈالا گیا ہو۔ اس کے تنِ وجود کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہو۔ یہ تو اس قیامت سے بھی بڑی قیامت تھی جو شب گزشتہ اس پر بیتی تھی۔

میراں شاہ نے اپنے ہی گواہوں کا سہارا لے کر خان زادی پر یہ جھوٹا اور گھناؤنا الزام لگا دیا کہ اس نے ہی مجھے بہکایا تھا۔ وہی اپنے احساسِ محرومی کے جذبات کی غلام ہو کے اس کی خواب گاہ میں داخل ہوئی تھی۔ اسے بہلاتے ہوئے شراب پلائی اور پھر وہ کچھ ہوا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔

نہایت مکاری اور چالاکی سے خود کو مظلومیت کی تصویر بنا کر اس طرح پیش کیا کہ جو اصل حقیقت سے نہیں بھی واقف تھے، انہیں بھی یقین آنے لگا۔ خان زادی کو وہ لوگ ایک خوب صورت اور شباب آور بیوہ کے روپ میں ہی دیکھ رہے تھے اور ایسے میں کئی معنی خیز سوالات و خیالات آیوں آئے پراگندہ اذہان کی پیداوار بن کے قواطر ازی

کی خود ساختہ فصل اگا رہے تھے۔
وہ چار دا ود کے ہی ایما پر بالآخر خان زادی کو انصاف کے لیے امیر تیمور کے قدموں کا رخ کرنا پڑا۔ وہ اس کے پاؤں پر گر پڑی۔
”اے امیروں کے امیر!“ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے بیٹے میراں شاہ کے شہر سے آئی ہوں۔“
خان زادی نے دنیا کے فاتح کے سامنے نہایت دلیری سے اپنی آپ بیتی پیش کی۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے ملازموں اور درباریوں کے ساتھ میراں شاہ کے دارالحکومت میں رہتی تھی۔ جب میراں شاہ کا دماغ خراب ہونے لگا، شیطنت اس پر غالب آنے لگی اور وہ تخریب اور برائی کی طرف مائل ہوا تو میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کے ملازموں کے روکنے کے باوصف وہ اسے زبردستی اپنے محل میں لے گیا۔ اس کے حسن سے اپنی نفسانیت کی بھوک کو مٹایا پھر اسی کو مورد الزام بھی ٹھہرا دیا۔ اس سے زیادہ ظلم کی انتہا اور کیا ہوگی۔ یا امیروں کے امیر! مجھے انصاف چاہیے۔
”امیر تیمور!“ اس نے دوبارہ رو کر کہا۔ ”میں تم سے پناہ کی درخواست کرتی ہوں اور شاہوں کے عدل کی بھیک مانگتی ہوں۔“
صورت حال ہی ایسی تھی۔ خان زادی اس شخص کی بیوہ تھی جو تیمور کا چہیتا بیٹا تھا اور جسے اس نے ہمیشہ اپنا جانشین سمجھا تھا۔ تاتاری رسم کے مطابق اب تاج و تخت کا مالک میراں شاہ تھا۔ زندہ بیٹوں میں اب سب سے بڑا وہی تھا۔ صحرا میں بسنے والے لوگوں کے زمانے سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ بادشاہ کے پہلے چار بیٹے اس کے وارث ہو سکتے تھے۔ جہانگیر اور عمر شیخ قبر میں جا چکے تھے۔ اب میراں شاہ اور سب سے چھوٹا شاہ رخ ہی زندہ تھے۔
شاہ رخ ملکہ سرائے خانم کا بیٹا تھا۔ شاہ رخ دیگر بھائیوں سے مختلف تھا۔ حلیم و نرم مزاج، جو حکومت کی نسبت کتابوں کی طرف مائل تھا۔
ادھر اپنی داستان غم و اندوہ گوش گزار کرتے ہوئے پہلی بار خان زادی نے اپنے قبیلے کی کھوئی ہوئی برتری بحال کرنے کی کوشش کی۔ یوں اس نے میراں شاہ کی شخصیت کو کچھ اس رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا کہ تیمور کے لیے اپنا جانشین مقرر کرنے کا فیصلہ کرنا دشوار نظر آنے لگا۔
تیمور نے میراں شاہ کو بہت وسیع مملکت سونپی تھی مگر اس نے عیاشی کی وجہ سے مملکت کا نظام درہم برہم کر دیا تھا۔
ایسی صورت حال میں میراں شاہ کی جانشینی کسی طرح بھی موزوں نہیں تھی۔
خان زادی کی کوشش تھی کہ کسی طرح میراں شاہ کو نااہل قرار دلوا کر اپنے بیٹے کے لیے راہ ہموار کر لے۔
سردست خان زادی کی دلیری قابل تعریف تھی۔ اس نے نوشیرواں عادل سے عدل کی درخواست کی تھی۔ مدعا علیہ اسی عادل کا اپنا بیٹا تھا۔ وہ بے خوف اس کے سامنے کھڑی عدل اور انصاف کی بھیک مانگ رہی تھی اور تیمور نے فیصلہ کرنے میں دیر نہ کی۔
خان زادی کے تمام مالی نقصانات کی فوراً تلافی کر دی گئی۔ اسے نئے غلام اور کنیزیں عطا ہوئیں۔ جہانگیر کی بیوہ جس منصب کی حقدار تھی، وہ اسے عطا ہوئے۔
☆☆☆
امیر تیمور ہندوستان کے دور دراز سفر سے اسی وقت لوٹا تھا مگر اس نے اسی وقت گھوڑے تیار کرنے کا حکم دیا اور سلطانیہ کا رخ کیا۔
وہاں جا کر جب اس نے میراں شاہ کی بربادیوں کی تحقیق کر لی تو اسی وقت اس کی موت کے احکام جاری کر دیے۔ میراں شاہ کے گلے میں رسی ڈال کر اسے باپ کے سامنے لایا گیا۔
بادشاہ باپ کا مجرم بیٹا اس کے حضور سر جھکائے کھڑا تھا۔ تمام امراء نے میراں شاہ کی سفارش کی۔ تیمور نے امراء کے کہنے سے اس کی جان بخشی تو کر دی مگر اس سے تمام اختیارات اور مناصب چھین لیے گئے۔
☆☆☆
کچھ ماہ بعد خان زادی کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ میراں شاہ کا بیٹا تھا۔ اس کا نام خلیل سلطان رکھا گیا۔
اٹھارہ برس بیت چلے۔ امیر تیمور نصف دنیا کی افواج کو شکست دے چکا تھا۔ 1399ء کے موسم بہار میں امیر تیمور نے ہندوستان کا قصد کیا۔ ایک شام ہندوستان سے تیز رفتار قاصد سمرقند پہنچا۔
اہل سمرقند امیر تیمور کا پیغام جاننے کے لیے بے چین تھے مگر رازداری برتی گئی۔ دوسری صبح ریگستان میں خبر نہایت سرعت سے پھیلی۔ قاصد کا پیغام معلوم ہو چکا تھا۔ تمام رات حصار کے پہریدار اس کی وجہ سے جستجو کرتے رہے تھے۔
”امیر کا پیغام ایک حکم کی صورت میں تھا۔ شادی ملک کو موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم۔“ صرف چند لوگ

اسے جانتے تھے۔ ان میں بوڑھا سپہ سالار سیف الدین بھی تھا۔ یہ بوڑھا امیر گزشتہ مہم کے اختتام پر ایران سے واپسی پر سیاہ زلفوں والی ایک حسینہ کو ساتھ لایا تھا۔ سفید مرمریں رنگت، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی مالک اور حرم کی پروردہ ..... یہ تھی شادی ملک۔
خان زادی کا سب سے چھوٹا لڑکا خلیل اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کی درخواست پر سیف الدین نے یہ لڑکی اسے دے دی۔ دربار کے آداب سے واقف شاہی کنیزوں کے غمزوں سے شناسا شادی ملک اب تیمور کے پوتے کا قرب حاصل کر چکی تھی۔ خلیل اس کی محبت میں اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ وہ گھنٹوں اپنی اس نئی داشتہ کے قدموں میں بیٹھا رہتا۔ یہ داستان اس وقت ایک نئے موڑ سے دوچار ہوئی جب دربار کے تمام امراء، سردار اور شاہی خاندان کی شہزادیوں کو روندنے کے بعد اس نے شاہی طریقے پر [illegible] سے شادی کا ارادہ کیا۔
امیر تیمور نے خلیل کی یہ درخواست رد کر دی تھی اور حکم دیا تھا کہ شادی ملک [illegible] کے حضور میں پیش کر دیا جائے۔ جب خلیل [illegible] حکم [illegible] چاہا تو اس نے شادی ملک کو اپنے ایک دوست کے گھر چھپا دیا۔ تلاش بسیار کے باوصف تیمور کے خواجہ سرا شادی ملک کا سراغ نہ لگا سکے۔
اس کے ساتھ ہی فوج ہندوستان روانہ ہو گئی تھی۔ اب ہندوستان سے فاتح نے حکم بھیجا تھا کہ شادی ملک کو قتل کر دیا جائے۔ خلیل اب اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی وہ چھپ سکتی تھی۔ اس کے لیے سمرقند کا چپا چپا چھانا جا رہا تھا۔
شادی ملک نے نقاب پہنا اور سیدھی دربار کی ملکہ سرائے خانم کے محل جا پہنچی۔ وہاں اس نے ملکہ کے پاؤں پکڑ لیے اور جان بچانے کے لیے آہ و زاری شروع کر دی۔ اس میں تاتاریوں کی سی جرأت نہ تھی۔ اس کے سرخ و سپید رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں کا کاجل بہہ چکا تھا۔
سنجیدہ رو اور شاہانہ تمکنت والی ملکہ، جس کی تربیت تاتاری فاتحوں کی روایات میں ہوئی تھی، خاموش تھی۔ شادی ملک آخرکار پکار اٹھی کہ وہ خلیل سے حاملہ بھی ہے۔
”اگر یہ درست ہے .....“ ملکہ کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ ”تو پھر امیر تیمور اسے قتل نہ کرائے گا۔“
اس نے شادی ملک کو اپنے خواجہ سراؤں کے حوالے کیا اور اسے ہدایت کر دی کہ تیمور کی واپسی تک خلیل سے نہ ملے۔
بعد وہ تیمور نے ملکہ کے فیصلے کی تائید کی اور شادی ملک زندہ رہی۔ امیر تیمور نے اب تک اپنے جانشین کے متعلق کوئی وصیت یا اشارہ نہ کیا تھا۔
ملکہ سرائے خانم اب بوڑھی ہوتی جا رہی تھی۔ باوصف یہ کہ حالات سازگار نہ تھے، اسے امید تھی کہ شاہ رخ کو جانشین بنایا جائے گا۔ ادھر خان زادی اپنے چھوٹے لڑکے خلیل خاں کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہی تھی مگر دونوں میں سے کسی کو ہمت نہ تھی کہ کھلے طور پر تیمور کے سامنے یہ ذکر چھیڑے۔
جہاں تک پوتوں کا تعلق تھا، وہ خود ان کے معاملات میں غیر جذباتی، منصف اور صلح کن تھا۔ پندرھویں صدی کے شروع میں امیر تیمور تمام ایشیا پر قبضہ کر چکا تھا۔ صرف ملک خطا (چین) باقی رہ گیا تھا۔ اب اس نے اسے فتح کرنے کا فیصلہ کر لیا اور نومبر 1404ء میں دو لاکھ کا لشکر جرار لے کر شمال کی طرف روانہ ہوا۔
اس نے فوج کا میمنہ شہزادہ خلیل کی قیادت میں دے رکھا تھا۔ خلیل نے شہر سنگ میں اپنی فوج کو جاڑا ختم ہونے تک روک لیا۔ امیر تیمور شمالی سرحد کے قلعہ اشرار کی طرف بڑھا اور وہاں پڑاؤ ڈال دیا۔
مارچ 1405ء میں فوج پھر روانہ ہونے کو تیار تھی۔ علم بلند ہوئے۔ نقارے پر چوٹ پڑی اور امیر تیمور کو سلامی دی گئی مگر یہ سلامی مردہ امیر کے لیے تھی۔ اس کی موت اشرار میں واقع ہو چکی تھی۔ امیر نے مرنے سے پہلے امراء نور الدین اور شاہ ملک کو بلا کر وصیت کی تھی کہ جہانگیر کے بیٹے شہزادہ پیر محمد کو اس کا جانشین مقرر کیا جائے اور تمام عمر اس کا ساتھ دیا جائے تاکہ جانشینی کے لیے کشمکش پیدا نہ ہو سکے۔
شہزادہ خلیل شہر سنگ کے شمال کی طرف روانہ ہونے والا تھا کہ اسے امیر تیمور کی موت کی اطلاع ملی۔ ساتھ ہی یہ بھی علم ہوا کہ مملکت کا جانشین شہزادہ پیر محمد مقرر ہوا ہے اور فوج ملک خطا کی طرف مسلسل پیش قدمی کر رہی ہے۔
خلیل نے موقع غنیمت جانا اور میمنہ کے امیروں کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ جلد ہی وہ سمرقند پہنچ گیا جہاں اس نے اپنی والدہ خان زادی کی مدد سے متعدد امیروں سے حلف لے لیا۔ سمرقند کے باشندے بے دست و پا بھی تھے اور الجھن کا شکار بھی۔
تیمور کی وصیت کے متعلق صرف افواہ سنی تھی۔ خلیل تخت پر تسلیم شدہ شہنشاہ کی حیثیت سے جلوہ افروز ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلے شادی ملک کے ساتھ نکاح کیا۔ کنیز اب ملکہ بن چکی تھی۔ ناتجربہ کار نوجوان شہزادہ حکومت

واستبداد سے ناواقف تھا۔ اس کے تصرف میں بے اندازہ دولت تھی اور وہ حسین ایرانی نوساختہ ملکہ کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ وہ محفلوں اور جشنوں کے لاامتناعی سلسلے میں پڑ گیا۔ اب وہ شاعر بھی بن گیا اور اس کی محبوبہ کی شان میں نت نئی شاعری ہونے لگی۔ دولت لٹانے کی وجہ سے وہ ہر دلعزیز بن گیا اور اس کے ساتھیوں کی تعداد بھی بڑھ گئی مگر اس سے تجربہ کار امراء دربار خالی کر گئے اور اس طرح اس کے گرد اس کی پسند کے درباری اور امیر جمع ہو گئے۔

شادی ملک جس کی جان بوڑھی ملکہ سرائے خانم نے بچائی تھی اب اپنی مربی کی دشمن بن گئی۔ سمرقند کا شہنشاہ کچھ اس طرح رنگ و بو کی دنیا میں گم ہوا کہ سمرقند کا نقشہ ہی بدل گیا۔ ہیرے جواہرات زمین پر بکھیر دیے جاتے تاکہ جو ڈھونڈے وہی اٹھالے۔

سمرقند کے فواروں میں سے پانی کے بجائے شراب ابلنے لگی تھی۔ خلیل طاقت کے نشے میں مست تھا اور شادی ملک اپنا بدلہ لینے میں منہمک تھی۔ یوں ملک خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا۔

خان زادی کو اطلاع ملی کہ اس کا بڑا بیٹا پیر محمد ہندوستان سے آ رہا ہے۔ کچھ دیر کے لیے وہ کشمکش و پیچ میں مبتلا رہی۔ اس کے دونوں بیٹے ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو چکے تھے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس جنگ کو نہ روک سکتی تھی۔ اس نے جو آگ اپنے ہاتھوں سے لگائی تھی، اب اسے بجھانا ممکن نہ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس نے ہوسِ اقتدار میں ممتا کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ وہ کہیں کی نہ رہی تھی۔ پیر محمد اس سے متنفر ہو چکا تھا اور اسے کبھی بھی معاف کرنے کو تیار نہ تھا۔ ادھر خلیل اور شادی ملک کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ وہ اسے ایک غیر ضروری بوجھ سمجھتے ہیں۔

دونوں بھائی ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو چکے تھے۔ اقتدار کی ہوس میں اپنوں کا خون پانی کی طرح بہہ نکلا۔ تیمور کی طاقت آپس میں ہی نبرد آزما ہو کر نڈھال ہو گئی۔ دنیا کو سرنگوں کرنے والے جنگجو ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں جی توڑ کر لڑے لیکن پیر محمد کو حملہ آور ہونے کی حیثیت سے زیادہ نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ میدانِ جنگ سے پسپا ہو کر ہندوستان کے لیے روانہ ہو گیا۔

جب خلیل نے اپنی فتح کا مژدہ اور پیر محمد کے ہندوستان بھاگ جانے کی خبر اپنی ماں کو سنائی تو وہ نہ تو ہنسی نہ مسکرائی اور نہ ہی جشنِ فتح کی خوشیوں میں شریک ہو گئی۔ خلیل کا دل رکھنے کے لیے جب بھی اس نے مسکرانے کی کوشش کی، اس کی جھیل جیسی آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔

ملکہ سرائے خانم کے پاس بہت کم وقت تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اگر فوری طور پر کوئی قدم نہ اٹھایا گیا تو تیمور کی اس وسیع سلطنت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اس نے نورالدین سے رابطہ کیا۔

ابھی فتح کی تقریبات اختتام پر بھی نہیں پہنچی تھیں کہ تیموری امراء نے نورالدین کی سرکردگی میں سمرقند پر حملہ کر دیا۔ یہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا کہ تیمور کی برسوں کی محنت کو ان کا بیٹا شراب اور عورت کے لیے لٹا دے۔ خلیل نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن اس کی قسمت کا ستارہ نحوست کے زیرِ اثر آ چکا تھا۔ وہ گرفتار ہوا اور اسے قیدِ تنہائی کی سزا دے دی گئی۔ شادی ملک نے فرار ہونے کی کوشش کی مگر اسے بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسے گرفتار کر کے سرِ بازار رسوا کیا گیا۔

خان زادی اپنے بیٹے خلیل کی اعانت کے جرم میں ملزمہ کی حیثیت سے ملکہ سرائے کے سامنے پیش کی گئی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ملکہ سرائے خانم کو مکمل اختیارات ملے تھے۔ اس کی آنکھیں فتح کے جذبات سے چمک رہی تھیں۔ اس نے نفرت اور حقارت بھرے لہجے میں حکم سنایا۔

”چھوٹی خانم کو اس کے اپنے محل میں عمر بھر کے لیے نظر بند کر دیا جائے۔“

خان زادی کمال ضبط کے ساتھ یہ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ ملکہ سرائے خانم کے حکم کے مطابق خواجہ سراؤں کی معیت میں جب وہ اپنے محل میں پہنچی تو ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔

”ابا حضور! مجھے معاف کر دینا۔ میں ترکمانوں کے لیے کچھ نہ کر سکی۔“

اپنے باپ کی تلوار کے نیچے وہ سسک رہی تھی اور ہچکیوں سے خوابگاہ کے در و دیوار لرزنے لگے۔

مآخذات:

آئینہ ہند... والیٔ خوارزم، حسین صوفی یوسف صوفی... امیر تیمور... کمالاتِ ہند... تاریخِ ہند

آخری قتل

خالد شیخ طاہری

زندگی کے ایک موڑ پر تائب ہونے والے ایک شقی القلب قاتل کا قصہ......

معاشرہ مشرق کا ہو یا مغرب کا... ظلم ہر جگہ ظلم ہی کہلاتا ہے... رشتے، ان کا احساس اور درد ایک جیسا ہی محسوس ہوتا ہے... وہ جو ٹارگٹ کلر تھا... معاوضہ لے کر جان لینے والا شکنجہ... وہ بھی دل میں ایک درد چھپائے پھرتا تھا... جب تک اس درد کی دوا نہ پالیتا تب تک کیسے آرام سے بیٹھ جاتا... اور پھر ایک دن اس کی ملاقات اپنے معالج سے ہو گئی...

ایک پیشہ ور قاتل ہونے کی وجہ سے مجھے بس پیسے سے مطلب تھا جس میں ہر قتل سے پہلے لیتا کام ہونے کی سو فیصد گارنٹی دیتا۔ مقررہ وقت سے پہلے اپنا کام مکمل کر دیا کرتا۔ آج بھی میں ایک صحافی کو مارنے کے لیے اپنی مکمل تیاری کے ساتھ گھر سے نکلا۔ مجھے گمان تک نہیں تھا کہ آج کے بعد میری زندگی بدلنے والی ہے۔ میں سڑک کے کنارے کھڑا اپنے شکار کا انتظار کر رہا تھا۔ میری نظر اس کے آفس کے مرکزی دروازے پر مرکوز تھی۔ نو اسموکنگ بورڈ کے باوجود میں نے کوٹ کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایک لمبا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑ دیا۔ اچانک میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ مارا، میں بری طرح چونک اٹھا۔ مڑ کر دیکھا تو میری آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ میری صورت میں موت جس کے انتظار میں کھڑی تھی وہ شخص میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ تیس پینتیس سال کا دوبلا پتلا سا شخص بظاہر نارمل نظر آ رہا تھا مگر اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ اس کا نام بہلول تھا اور وہ ایک کرائم رپورٹر تھا۔

”میرا ہی انتظار کر رہے تھے نا؟“ آنے والے کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ اس وقت تک میں خود کو سنبھال چکا تھا۔ میں نے بغور اس کا جائزہ لیا تو وہ ایک بے ضرر سا

انسان دکھائی دیا مگر اس نے جس کے خلاف کام کیا تھا، وہ
شہر کا بہت ہی معزز انسان تھا۔ وہ کام کیا تھا؟ اس کا مجھے
علم نہیں تھا۔ جب ہی اس کے قتل کا معاوضہ بھی میری توقع
سے زیادہ دیا گیا تھا۔ وہ بھی ایڈوانس۔'اس پر گولی ضائع
کرنے کے بجائے گلا دبا کر ہی ماردوں گا۔' میں نے سوچا۔
''جی ہاں، مگر میں تمہیں یہاں نہیں ماروں گا کیونکہ
میں ہاتھ پیر بچا کر کام کرتا ہوں۔'' میں نے چہرے پر
مسکراہٹ سجائی اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بولا۔
''ہوں...... چلو پھر تمہاری پسند کی جگہ پر چلتے ہیں۔
میری گاڑی بیک سائڈ پر کھڑی ہے۔'' بوول کا کمزور مگر
پُراعتماد لہجہ مجھے پریشان کررہا تھا۔ اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ
گیا۔ مجبوراً میں بھی اس کے پیچھے چل دیا۔ میرا ہاتھ کوٹ کی
جیب میں سائلنسر لگے ریوالور کے دستے پر تھا۔
''کہاں چلنا ہے؟'' ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی
بوول بولا۔
''جہاں تم سکون سے مرنا پسند کرو۔'' میں نے سپاٹ
سے لہجے میں جواب دیا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور
سڑک پر لے آیا۔
''ہاہاہا...... مرنا تو ایک نہ ایک دن سب ہی کو ہے۔
مجھے تمہاری یہ بات پسند آئی۔ مجھے واقعی سکون سے مرنا
ہے۔'' اس کے اندازِ گفتگو سے بالکل بھی ایسا نہیں لگ رہا تھا
کہ وہ مرنے جارہا ہے۔ وہ پھر بولا۔ ''مگر میں چاہتا ہوں
میری موت کی وجہ رینڈی والسن ہو۔ یہ ثبوت لازمی میری
موت سے جڑا ہونا چاہیے۔'' اس کی بات سن کر میں بری
طرح چونک اٹھا کیونکہ اس کو قتل کرنے کی پیشگی رقم رینڈی
والسن نے ہی دی تھی۔
''یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلے یہ بتاؤ تمہیں کیسے پتا چلا
کہ میں تمہیں مارنے کے لیے آفس کے باہر کھڑا ہوں؟''
میرے ذہن میں یہ سوال ٹھوکریں ماررہا تھا۔
''مجھے وہ کچھ معلوم ہے جسے سن کر تم بھی چونک جاؤ
گے، مسٹر بارمینک......! کیونکہ تم بھی اسی سانپ کے ڈسے
ہوئے ہو جس کا سر کچلنے کے لیے میں نے جان ہتھیلی پر رکھ
دی ہے۔ جس کے نتیجے میں تم یہاں میرے ساتھ ہو۔'' اس
کے پُراعتماد لہجے نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا۔
''یہ ممکن نہیں ہے۔ میں جس کے لیے کام کرتا ہوں،
اس کا راز ہمیشہ کے لیے اپنے سینے میں دفن کردیتا ہوں
مگر میں تمہارے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔'' میں اپنے
سگریٹ کا آخری کش لیتے ہوئے بولا۔

''تم ایک پیشہ ور قاتل ہو۔ تمہارا نام بارمینک ہے۔
بے شمار قتل کرچکے ہو۔ نام بھی گنوا سکتا ہوں مگر وقت بہت کم
ہے۔ مجھے جب حکم ملا کہ رینڈی والسن پر کام بند کردوں تو
میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ رینڈی والسن کو میرے بارے
میں علم ہوچکا ہے پھر ایک دن میں نے تمہیں رینڈی والسن
کے ساتھ دیکھا۔ تمہاری ڈیل ڈولفن پارک کی بائیں طرف
والی آخری چوبی بینچ پر ہوئی تھی۔ رینڈی والسن جاگنگ کرتا
ہوا تمہارے پاس رکا تھا۔ تم نے اسے پانی کی بوتل دی اور
اس نے پھرتی سے ایک لفافہ تمہیں دیا تھا جسے تم نے بے
پروائی سے بینچ پر ہی رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد تمہاری اور
رینڈی والسن کی دو اور ملاقاتیں ہوئیں...... ان کی بھی
تفصیلات بتاؤں یا رہنے دوں؟''
اس کی معلومات نے مجھے بھی حیران کردیا تھا۔ ''جب
تم آفس کے سامنے پہنچے تھے، مجھے اسی وقت پتا چل گیا تھا۔
جبھی میں بیک ڈور سے نکل کر تمہارے پاس پہنچ گیا تھا۔ شاید
تم نے نوٹ نہیں کیا تھا کہ پارکنگ میں میری گاڑی نہیں تھی۔
اب مطمئن ہو؟'' اس کی معلومات واقعی حیران کن تھیں۔ میں
گاڑی میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ میں کس طرح رینڈی والسن کا
ڈسا ہوا ہوں؟ یہ عقدہ بھی تھوڑی دیر بعد کھل گیا۔
گاڑی اب شہر کی خارجی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔
گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے گاڑی ایک
ویرانے میں روک دی۔
''اس ویرانے میں تو تمہاری لاش کو دو دن میں ہی
چیل کوّے کھا جائیں گے اور کسی کو خبر تک نہیں ہوگی۔'' میں
نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر کہا۔
''میں بھی یہی چاہتا ہوں مگر مارنے سے پہلے میری
بات غور سے سن لو اور یہ بات اس پتے پر جاکر میری بیوی کو
بتا دینا۔'' پھر وہ بولتا چلا گیا۔
اس کی پوری بات سن کر کچھ لمحوں کے لیے میں سن ہو
کر رہ گیا۔ میرے سامنے اپنے چھوٹے بھائی کا سراپا لہرا گیا
جو منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔ اس کی سانپ کے ڈسنے والی
بات اب میں مکمل طور پر سمجھ چکا تھا۔
''اگر اس کے باوجود پوسٹ مارٹم کی وجہ سے انہیں پتا
چل گیا تو......؟'' اتنا کہہ کر میں نے اس کی طرف سوالیہ
نظروں سے دیکھا۔
''پھر سب کچھ برباد ہوجائے گا۔ میرے مرنے اور
رینڈی والسن کا مجھے مروانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ جو
ثبوت میں نے اپنے بار کو دے رکھے تھے، بس ردی کے سوا کچھ

نہیں ہیں۔ اصل ثبوت اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔''
اس نے مایوسی سے سر جھکا دیا۔
''تمہارا پلان زبردست ہے۔ میں یہ سب کام کرنے
کو تیار ہوں...... یہ نہیں ہوسکتا کہ میں تمہیں زندہ چھوڑ
دوں۔'' میں یہ کہہ کر خاموش ہوا پھر بولا۔ ''مگر اس سے کوئی
فائدہ نہیں ہوگا۔''
''یہی تو مسئلہ ہے۔ میرا مرنا بہت ضروری ہے۔ تم سمجھ
رہے ہونا؟'' اس کے معنی خیز جملے نے مجھے چونکا دیا۔ وہ پلٹا
اور گاڑی سے ایک فائل لاکر مجھے تھما دی۔ میں فائل پڑھنے
لگا۔ وہ اطمینان سے کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔
''ہوں...... چلو۔'' میں اتنا کہہ کر اس کی گاڑی کی
طرف بڑھ گیا۔ وہ مڑا اور گاڑی کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔
میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ ایک لمبی سانس لے کر
گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی اب شہر کی جانب دوڑ رہی تھی۔
میں اسے اپنی من پسند جگہ لے جارہا تھا۔

☆☆☆

میں جب قصبے میں پہنچا تو شام اتر آئی تھی۔ کسی بھی
وقت برف باری شروع ہوسکتی تھی جس کی وجہ سے سردی میں
اضافہ ہوچکا تھا مگر مجھے کسی بات کی جلدی نہیں تھی۔ میرا کام
آدھی رات کے بعد شروع ہونا تھا۔ بوول کے گھر کے
سامنے پہنچ کر میں نے اپنے اونی کیپ سے کانوں کو ڈھانپا
اور گھر کے اطراف کا اچھی طرح جائزہ لینے لگا۔ قصبے میں
اب رات گہری ہوچکی تھی۔ جائزہ لینے کے بعد میں ایک بار
میں آبیٹھا اور رات اور گہری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔
''جناب! بار بند کرنے کا وقت ہوچکا ہے۔ اگر آپ کو
زحمت نہ ہو تو تشریف لے جاسکتے ہیں۔'' بھاری بھرکم نسوانی
آواز سن کر میں چونک کر اپنی سوچ سے باہر نکل آیا۔ مجھے بار
میں بیٹھے کافی دیر ہوچکی تھی۔ بار کے کاؤنٹر پر کھڑی عورت
اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے کھڑی تھی۔ اس کا لہجہ اور الفاظ تو
شائستگی لیے ہوئے تھے مگر چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا
کہ وہ اب مجھے بار میں برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے۔ میں
نے اپنے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ بار میں، میں اکیلا ہی رہ گیا
تھا۔ ایک لمبی سانس لے کر میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔
سامنے رکھا آدھ پیا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کرکے ایک
نوٹ میز پر رکھا اور باہر نکل کر بوول کے گھر کی جانب بڑھ
گیا۔ گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا پارک تھا جس کے ایک
درخت کی اوٹ سے گھر کا بغور جائزہ لینے لگا۔ برف باری
شروع ہوچکی تھی۔ میں تمام احتیاطی تدابیر کے ساتھ وہاں پہنچا
تھا۔ قدرے اندھیرے میں ہونے کی وجہ سے میں مطمئن تھا
کہ کسی کی نظر میں نہیں آسکتا۔ ویسے بھی رات بہت سرد تھی، ہر
کوئی اپنے اپنے بستروں میں دبک چکا تھا۔ کھڑے کھڑے
تھک گیا تو بے فکر ہوکر ٹانگیں پھیلا کر ایسے رخ پر بیٹھ گیا کہ گھر
کی نگرانی بھی کرتا رہوں۔ میرے سامنے گزشتہ ہفتے کے
واقعات گھومنے لگے۔ بوول کے ملنے کے بعد میں نے اپنے
اندر کچھ تبدیلیاں محسوس کیں جن کی وجہ سے میں آج اس
چھوٹے سے قصبے میں موجود تھا۔ میں دل ہی دل میں الفاظ
ترتیب دے رہا تھا جو آج رات بوول کی بیوی سے بولنے تھے
مگر اس سے پہلے گھر میں موجود ثبوت اپنے قبضے میں لینے
تھے۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو ایک بجنے والا تھا۔
میں اٹھا اور اپنی پینٹ پر لگی برف جھاڑ کر محتاط انداز میں
بوول کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ لاک کھولنا میرے بائیں ہاتھ
کا کھیل ثابت ہوا۔ دروازہ کھول کر جیسے ہی اندر قدم رکھا، ٹھٹک
کر رک گیا کیونکہ چوبی فرش دروازے سے ایک فٹ نیچے
تھا۔ قدم رکھنے سے ایک ہلکی سی دھمک پیدا ہوئی۔ میں کچھ
دیر وہیں کھڑا رہا۔ جب کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا تو آگے بڑھا۔
دائیں جانب دو کمرے تھے اور سامنے ڈرائنگ روم تھا۔ میری
منزل ڈرائنگ روم تھا جس کی دیوار پر ایک پینٹنگ لگی ہوئی
تھی۔ اس پینٹنگ کے فریم میں میری مطلوبہ فائل رکھی ہوئی
تھی۔ میں احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے
اپنی مطلوبہ جگہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ابھی ڈرائنگ روم میں
قدم رکھا ہی تھا کہ اچانک میری چھٹی حس نے خطرے کا
احساس دلایا مگر اس وقت تک دیر ہوچکی تھی۔ میں گھوما مگر
گھومتے ہی میری کنپٹی پر ایک پٹاخہ سا چھوٹا۔ تکلیف کی ایک
لہر جسم میں دوڑ گئی۔ وار زوردار اور پرفیکٹ ٹائمنگ سے تھا
جس کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ آخری
منظر جو میں نے دیکھا، ایک عورت دوسرا وار کرنے کے لیے پر
تول رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا خون کنپٹی سے بہہ کر میرے
چہرے پر رینگ رہا تھا۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو ایک کرسی پر خود کو بندھا ہوا پایا۔ کچھ
دیر تو خالی خالی نظروں سے ڈرائنگ روم کو دیکھتا رہا۔ کرسی
کے دائیں جانب ایک اور کرسی رکھی ہوئی تھی جو اس وقت
خالی تھی۔ میں نے ایک گہرا سانس لے کر آنکھیں دوبارہ بند
کرلیں۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد بندشوں کا
زور لگا کر اندازہ لگایا جو کس کر باندھی گئی تھیں۔ اس کوشش
میں درد کی ایک لہر میرے سر سے ہوتی ہوئی کمر تک دوڑ گئی۔

میں نے آہ بھر کر اپنی کوشش ترک کر دی۔ میں بے خبری میں اس مصیبت میں پھنس گیا ورنہ کوئی مجھے اس طرح بے بس نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اپنی چوٹ کی فکر تھی جو نہ جانے کتنی گہری آئی تھی کیونکہ خون ابھی تک رس رہا تھا جو چہرے پر محسوس ہو رہا تھا۔ دروازہ کھلا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو بیول کی بیوی الانس اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک وہی بیٹ تھا جس سے وار کیا گیا تھا۔

"دیکھو الانس! یہ تم اچھا نہیں کر رہی ہو۔" میں نے بیول کی بیوی کو کرسی پر بیٹھتے ہوئے دیکھا تو کہا۔ مسلسل خون بہنے سے اب میرا کوٹ تر ہو چکا تھا۔ یہ سب اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ میرے ذہن سے وہ تمام الفاظ ہوا ہو گئے جو میں نے بڑی مشکل سے ترتیب دیے تھے۔

"یہ روایتی جملے بولنا بند کرو۔ میں خوب اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں کیا کر رہی ہوں۔" الانس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"کیا چاہتی ہو؟" میں نے اس بار پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔ ایک ایک حرف سچ اور مکمل۔" الانس قطعی لہجے میں بولی۔ "تم کون ہو؟ میرا نام کیسے جانتے ہو؟ میرے گھر میں اس طرح چوروں کی طرح کیوں داخل ہوئے؟ ہر بات سچ سچ...... سمجھے؟"

"سچ اتنا کڑوا ہے کہ شاید تم برداشت نہ کر سکو۔ بہتر ہے مجھے کھولو۔ میری بات غور سے سنو۔ جو چیز میں لینے آیا ہوں، مجھے لینے دو اور جانے دو۔ مجھے پتا ہے وہ چیز کہاں ہے۔" میں نے الانس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا جن میں تجسس بھرا ہوا تھا۔ میں پھر گویا ہوا۔ "اس میں ہم دونوں کا ہی فائدہ ہے۔ نہ صرف ہم دونوں کا بلکہ تمہاری بیٹیوں کا بھی کیونکہ اگر یہ کام میں نہیں کر پایا تو کوئی اور کسی اور انداز سے کرنے پہنچ جائے گا اور اس کو کسی بات کا علم نہیں ہوگا جس کی وجہ سے تم لوگوں کے لیے بہت خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"

میں خاموش ہوا تو الانس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں تھے مگر وہ خود کو نارمل ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

"جب تک مجھے اصل حقائق کا علم نہیں ہوگا، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ ہاں، دوسری صورت میں ہو سکتا ہے کہ پولیس کو ضرور اطلاع دے دوں۔ تم بتاؤ وہ چیز کہاں رکھی ہے اور اس میں کیا ہے؟"

"پولیس کی مدد کا مطلب سمجھتی ہو؟ سب ختم اور سب برباد ہو جائے گا۔" میرے اس معنی خیز جملے کا الانس پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ [illegible] سے کھڑی ہو گئی۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" الانس کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

"یہ بکواس نہیں، حقیقت ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ سچ بہت کڑوا ہے، تم برداشت نہیں کر پاؤ گی؟" میں نے اب طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارے بڑوں نے یہ کام تمہیں کیوں سونپا ہے؟" الانس کے متوقع سوال پر میرے چہرے پر ندامت سی عود آئی۔ میں نے سر جھکا لیا۔

"وہ یہ کام کسی اور سے کروانا چاہتے تھے کیونکہ میں اپنے حصے کا کام کر چکا تھا لیکن میری درخواست پر انہوں نے یہ کام بھی مجھے ہی سونپ دیا۔"

"تمہارا کام کیا تھا اور تم نے درخواست کیوں کی تھی؟" الانس نے پوچھا۔

"بیول کو قتل کرنا میرا کام تھا۔" اس بار میں نے سر اٹھا کر جواب دیا اور الانس کے سخت ہوتے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اس انکشاف پر الانس بے دم ہو کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے ردعمل کا انتظار کرنے لگا مگر وہ مسلسل فرش کو گھورے جا رہی تھی۔

"الانس......!" میں نے اس کو مخاطب کر کے خاموشی کو توڑا۔ "یہ کام میں نے اس لیے چنا کہ مجھے تمہیں کچھ سچائی بتانے کے ساتھ ساتھ اپنا کام تمہارے علم میں لائے بغیر سر انجام دے کر لوٹ جانا تھا۔ یہ بیول کی فرمائش تھی یا یوں سمجھو کہ آخری وصیت بھی۔" میری بات سن کر الانس نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"یہ میں کیسے مان لوں کہ تم نے بیول کو قتل کر دیا ہے اور یہ کام تم دن میں بھی کر سکتے تھے۔ رات کا انتخاب کیوں کیا؟" الانس نے سوال کیا۔ اس کے اداس چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔

"پہلی بات یہ کہ مجھے قصبے میں پہنچنے میں دیر ہو چکی تھی۔ دوسری اہم بات میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے اس گھر میں آتا جاتا دیکھے کیونکہ میں کوئی اچھا انسان نہیں ہوں۔ ایک پیشہ ور قاتل ہوں۔ پولیس کو میری اس گھر میں موجودگی کا ذرا بھی شک ہو جاتا تو تمہیں مشکوک ٹھہرایا جا سکتا تھا جس کا تمہیں بہت نقصان اٹھانا پڑتا۔ میں چاہتا تھا کہ میں پہلے اپنی مطلوبہ چیز حاصل کر لوں پھر تم سے بات کروں گا مگر تم نے......" اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ الانس کی آنکھوں میں تجسس [illegible]

"یقیناً تم نے میری اچھی طرح تلاشی بھی لی ہوگی؟ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے پھر بھی میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" میرے لہجے میں سچائی تھی جس کو الانس نے بھی محسوس کیا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد لوٹی تو اس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔ وہ خاموشی سے میرے سر کا زخم صاف کرنے لگی۔ زخم گہرا تھا، ٹانکوں کی ضرورت تھی مگر الانس نے کس کر پٹی باندھ دی جس کی وجہ سے خون بہنا بند ہو گیا مگر الانس نے مجھے اسی طرح بندھا رہنے دیا۔ مجھے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے قاتل پر اعتماد کر رہی تھی۔

"تم نے اس کو کیوں مارا؟" الانس نے پوچھا۔ وہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔

"اس کی فرمائش پر...... جو چیز اس کے پاس تھی، وہ میں بہ آسانی اس گھر سے حاصل کر سکتا تھا کیونکہ وہ کہاں رکھی ہے، اس نے پہلے ہی مجھے بتا دیا تھا۔" میں نے جواب دیا تو الانس کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں نمایاں ہو گئیں۔

"بیول کی لاش کہاں ہے؟" الانس نے پوچھا۔

"شہر کے بلاک الیون میں نئے بنے پلازا کے تہ خانے میں پڑی ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"اس طرح چوروں کی طرح گھر میں داخل ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھ سے بات کرتے اور اپنی چیز لے کر چلے جاتے۔" وہ اپنی مکمل تسلی کرنا چاہ رہی تھی۔

"یہ ہو سکتا تھا مگر بیول نہیں چاہتا تھا کہ اس چیز کا تمہیں علم ہو اور تم اور تمہاری بیٹیاں کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔ تمہارے لیے وہ بس کاغذ کے ٹکڑے ہیں لیکن ان میں جو کچھ ہے، بس یوں سمجھ لو کہ وہ کچھ ثبوت ہیں۔ اس سے زیادہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔"

"کس کے خلاف ہیں وہ ثبوت؟" الانس سے رہا نہ گیا تو سوال کر بیٹھی۔

"تم فضول سوالات میں وقت ضائع کر رہی ہو۔ ان کاغذات کے بارے میں، میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ بہتر یہ ہے کہ تم مجھے کھولو، میری بات سکون سے سنو اور مجھے جانے دو۔" الانس نہ جانے کیا سوچ کر اٹھی اور میری پشت پر آ کر ہاتھ کی رسیاں کھول دیں۔ میں نے جلدی سے اپنے ہاتھ سیدھے کیے اور ہتھیلیوں کو مسلنے لگا جو بندش سے سن ہو گئی تھیں پھر جھک کر اپنے پاؤں کی رسیاں خود کھولیں اور کھڑا ہو گیا۔

"الانس! اگر زحمت نہ ہو تو اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ میں بس دس منٹ میں آتا ہوں۔ واش روم کہاں ہے؟" مجھے متلی نے پر شدید دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔ الانس نے ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا اور اپنے کمرے کی جانب چل دی۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں الانس کو پلان کے مطابق سب کچھ سچ بتانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆

"رینڈی واٹسن بظاہر ایک معزز شہری ہے۔ فلاحی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے لیکن درپردہ وہ ایک بین الاقوامی منشیات فروشوں کے ایک بہت بڑے گروہ کا مقامی سربراہ ہے جس کا کام اسکولز اور کالجز میں منشیات پھیلانا اور خاص طور پر امیر طبقے کے نوجوانوں کو منشیات کی لت میں گرفتار کرنا ہے تاکہ اس کو جو ہدف دیا جاتا ہے، وہ جلد از جلد پورا ہو سکے اور گروہ میں اپنا نام نمایاں کر سکے۔" میں نے اتنا کہہ کر الانس کی طرف دیکھا جو ہمہ تن گوش تھی۔ "بیول نے مجھے منع کیا تھا کہ زیادہ باتیں تمہیں نہیں بتائی جائیں۔ میں تمہیں کیوں بتا رہا ہوں، نہیں جانتا مگر اتنا جان گیا ہوں کہ تم ایک بہادر عورت ہو۔ ہر قسم کے حالات کے مقابلے کے ساتھ ساتھ بہترین فیصلہ کر سکتی ہو۔"

"رینڈی واٹسن کے بارے میں، میں جانتی ہوں مگر جو کچھ تمہیں اور بیول کو پتا تھا وہ بتاؤ۔" الانس نے میری بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے علم نہیں تھا کہ میں کس انسان کو مارنے جا رہا ہوں۔ اس کا زندہ رہنا کتنا اہم ہے۔ مجھے جب ان سب باتوں کا علم ہوا تو میں نے بیول کو آفر دی۔"

"کیسی آفر؟" میرے آگے بولنے سے پہلے ہی الانس نے میری بات کاٹ دی۔

"میں نے اس سے کہا...... میں رینڈی واٹسن کو پیسے واپس کر دیتا ہوں اور تمہارے ساتھ مل کر یہ کام مکمل کر سکتا ہوں۔ اس سے میری ساکھ کو نقصان تو پہنچتا مگر جو کام بیول کر رہا تھا وہ میرے لیے بھی اہمیت کا حامل تھا مگر بیول نے میری آفر بے دردی سے ٹھکرا دی۔ وہ بضد تھا کہ آج ہی اسے قتل کیا جائے۔ میری اس آفر سے اتنا ہوا کہ بیول نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی۔" میری یہ بات سن کر الانس نے بے چینی سے پہلو بدلا مگر کچھ بولی نہیں۔

"ایک منٹ...... ابھی تم نے کہا کہ یہ سارا معاملہ تمہارے لیے بھی اہم تھا۔ اس کا کیا مطلب؟" ابھی میں نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ الانس جلدی سے بولی۔

"میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ میں چاہتا تھا

کہ میرا چھوٹا بھائی پڑھ لکھ کر معاشرے کا معزز شخص کہلائے۔ اس لیے میں نے اسے ایک بہترین کالج میں داخلہ دلوایا۔ وہ پڑھائی میں بھی بہت اچھا تھا۔ اعلیٰ نمبرز سے پاس ہوتا تھا۔ نہ جانے کب اور کیسے وہ منشیات جیسی گندی لت میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے اس کو اپنے پیشے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں ایک کام کے سلسلے میں دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ اسی دوران میرے بھائی کا منشیات فروشوں سے پیسوں کے معاملے میں جھگڑا ہو گیا۔ غلطی سے ہی، مگر میرے بھائی کو سر میں ایسی چوٹ لگی کہ وہ دو دن آئی سی یو میں داخل رہا۔ میں فوراً اپنا کام مکمل کر کے اسپتال پہنچا مگر اس وقت میرے بھائی کو مرے ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے اپنے طور پر کوشش کرنے کی ٹھان لی کہ منشیات فروشوں کے سرغنہ تک پہنچوں گا اور کیفرِ کردار تک پہنچاؤں گا۔ میں ابھی اپنا لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا کہ رینڈی والسن نے مجھے بوول کی سپاری دے دی۔ میں اپنا کام مکمل کر کے چلا جاتا مگر جب بوول نے تفصیلات بتائیں تو میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اس کے کام کو میں پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔'' میں نے تمام تفصیلات الائس کے سامنے رکھ دیں۔

''بوول مرنا کیوں چاہتا تھا؟'' الائس نے وہ سوال کر ڈالا جو اس کے اور اس کی بیٹیوں کے لیے بہت اہم تھا۔

''تم یہ فائل دیکھنا پسند کرو گی؟'' میں اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا اور فائل اس کی جانب بڑھا دی۔ یہی وہ فائل تھی جس میں رینڈی والسن کے خلاف ٹھوس ثبوت تھے جن کے منظرِ عام پر آجانے سے وہ عمر بھر جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑتا رہتا مگر میں کچھ اور ہی فیصلہ کر چکا تھا جس سے بوول کو تو آگاہ کر چکا تھا، اب الائس کو بتانا تھا لیکن اس بات کا دارومدار اس کے فائل دیکھنے کے بعد کے ردِعمل پر تھا۔

الائس نے ایک نظر فائل کی جانب دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر تھام لی۔ وہ غور سے ہر صفحے کو دیکھتی اور پلٹ دیتی۔ اچانک ایک صفحے پر چونک کر رک گئی۔ کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اس کو فائل سے الگ کر کے اپنی گود میں رکھ لیا۔ میں نے دیکھا وہ کسی نوعمر لڑکی کی تصویر تھی۔ اس کے نیچے کچھ لکھا ہوا تھا۔ الائس نے اس کے بعد فائل، سامنے موجود چھوٹی سی میز پر رکھ دی۔

''جانتے ہو یہ کون ہے؟'' اس نے گود میں رکھی تصویر کو میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں......'' میں نے تصویر ہاتھ میں لیتے ہوئے جواب دیا اور غور سے تصویر کو دیکھنے لگا۔ میرا خیال بار بار رینڈی والسن کی طرف جانے لگا۔

''یہ رینڈی والسن کی چھوٹی بیٹی ایما کی تصویر ہے۔'' اس نے دوبارہ فائل اٹھائی۔ ایک اور تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی اور کہا۔ ''یہ رینڈی والسن کی بڑی بیٹی سارا ہے جو رینڈی کو چھوڑ کر جا چکی ہے۔ کہاں گئی؟ آج تک پتا نہیں چل سکا۔''

''تمہیں یہ سب کیسے پتا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''شاید بوول نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں بیس بال کی بہترین کھلاڑی کا اعزاز حاصل کر چکی ہوں۔'' الائس کی بات سن کر میری نظر اس کے پاس رکھے بیٹ پر پڑی جس پر میرا خون ابھی تک موجود تھا۔ وہ پھر بولی۔ ''ایما میری چہیتی اور ہونہار شاگرد رہ چکی ہے۔ وہ مجھے بہت پسند کرتی تھی۔ شادی کے بعد میں نے کھیلنا چھوڑ دیا تھا، میں کوچنگ کیا کرتی تھی۔ سارا کی پیدائش کے بعد وہ بھی چھوڑ دی تھی۔ یہ سب تصاویر بوول کو کیسے ملیں؟''

''بوول آج کل اسی کیس پر کام کر رہا تھا۔ رینڈی والسن کو اس بات کا پتا چل گیا۔ دفتر سے تو یہ کیس بند ہو چکا تھا مگر بوول اپنے طور پر حقائق جمع کر رہا تھا۔ یہ سب اس کی محنت ہے۔ اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' میں اب جانا چاہتا تھا تاکہ اپنے زخم کا جائزہ لے سکوں جس میں اب ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

''میں اس مشن میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' الائس کی بات سن کر میں چونک اٹھا۔

''نہیں...... نہیں، یہ اب میرے اکیلے کی جنگ بن چکی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ جب تک یہ سب ختم نہیں ہو جاتا تم کچھ نہیں کرو گی اور اس بات کو بھول جانا کہ میں یہاں آیا تھا۔'' میں میز پر رکھی فائل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا تو الائس نے مجھ سے پہلے ہی فائل اٹھا لی۔

''یہ بوول کی جنگ تھی جس کی وجہ سے وہ جان سے گیا۔ اب تمام حقائق جان کر میں پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔'' الائس کے لہجے میں ہلکی سے غراہٹ شامل تھی۔

''بوول تم سے بہت پیار کرتا تھا۔ اسی لیے اس نے مجھے منع کیا تھا کہ تمہیں اس بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔'' میں الائس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ مجھے وہ کچھ دیر پہلی والی الائس ہرگز نہیں لگ رہی تھی، اس کے چہرے پر سختی عود آئی تھی۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور ایک لمبا سانس لے کر رہ گیا کیونکہ ایک اور بہت اہم فائل بھی تھی جو بوول نے مجھے دی تھی مگر وہ فائل الائس کو دینے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن جیسے ہی میں نے رینڈی والسن کو کام مکمل ہونے کی اطلاع دی، اس نے فوراً مجھے طلب کر لیا۔ فائل میرے ہاتھ میں تھی۔ میں مطمئن انداز سے اس کے آفس کی ایک راہداری میں چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے علم تھا کہ کیمرے کی آنکھ مسلسل میری نگرانی کر رہی ہے۔ میرے سر پر میری پسندیدہ اونی ٹوپی تھی جس کی وجہ سے میرا زخم چھپ گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں موجود فائل اصلی تھی۔ رینڈی والسن کا بھروسا جیتنے کے سوا میرے نزدیک اس فائل کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ رینڈی والسن کی حقیقت کھل کر میرے سامنے آ چکی تھی۔ اسے اپنے بل سے نکالنے کی پلاننگ ہو چکی تھی۔ اس کام میں الائس نے بھرپور ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔

''سرپلیز!'' میں جیسے ہی آفس کے پاس پہنچا، دروازے پر متعین گارڈ میرے اور دروازے کے درمیان حائل ہو گیا۔ میں نے مسکرا کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر دیے۔ اس نے پیشہ ورانہ انداز میں میری تلاشی لی۔

''ابھی ٹھہرو!'' وہ میرے سامنے سے نہیں ہٹا۔

''آنے دو جانی!'' اسی لمحے دروازے کے پاس لگے اسپیکر سے رینڈی والسن کی بھاری آواز ابھری۔

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ رینڈی ایک کوتاہ قامت، بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی لیکن ان میں عجیب سی خباثت تھی جس کو دیکھ کر عجیب سا احساس ہوتا تھا۔ سر کے بال جھڑنے کی وجہ سے پیشانی سر کے درمیان تک پہنچ چکی تھی۔ وہ اپنی کرسی پر اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ سب کام تسلی بخش اور اس کی منشا کے مطابق ہو چکا ہے۔

''بیٹھو بارنیک!'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''شکریہ۔'' میں نے اختصار سے جواب دیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ فائل ابھی تک میرے ہاتھ میں ہی تھی۔ رینڈی والسن کی نظریں فائل پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ اور لائٹر نکال کر میز پر رکھ دیے۔ مسکرا کر میری جانب دیکھا اور دراز کھول کر بڑے نوٹوں کی ایک گڈی میرے سامنے پھینک دی۔

''یہ میری طرف سے تحفہ سمجھ لو۔'' شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ فائل دینے سے پہلے میں کوئی بارگیننگ کروں گا۔

''بہت شکریہ...... مگر اس کام کی میں نے بغیر کسی فیس کے ہامی بھری تھی۔'' اتنا کہہ کر میں نے فائل رینڈی والسن کے سامنے رکھ دی۔ ''دیکھ کر تسلی کر لیں۔''

''رینڈی بہت کم کسی کو تحفہ دیتا ہے۔'' اس کے سخت لہجے سے میں سمجھ گیا کہ میرا جواب اسے پسند نہیں آیا۔ میں اس وقت اس کو کسی بھی قسم کے شک میں مبتلا نہیں کر سکتا تھا لہٰذا مسکرا کر نوٹوں کی گڈی اٹھا کر جیب میں رکھ لی۔ اس نے فائل اٹھائی، ایک نظر مجھ پر ڈالی اور فائل کھول کر دیکھنے لگا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کوئی بھی مندرجات مس نہیں کرنا چاہتا ہو۔ چند صفحات دیکھ کر اچانک ایک صفحے پر وہ رک گیا۔ ایک لمحے کے لیے رکا پھر فائل کو زیادہ توجہ سے دیکھنے لگا۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا جا رہا تھا، اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے جا رہے تھے۔ ''ناقابلِ یقین......'' وہ بڑبڑایا اور فائل میز کی دراز میں رکھ دی پھر گویا اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''میرا فیصلہ درست تھا۔ بوول کو مر جانا چاہیے تھا۔'' اس نے ایک اطمینان بھری سانس لی اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''آپ کے ساتھ کام کر کے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ امید ہے آئندہ بھی مجھے یاد کریں گے۔'' میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ میں اس کی نظروں کا مطلب سمجھ چکا تھا۔

''یہی وہ ذہانت ہے جس کی وجہ سے تم اپنے پیشے میں کامیاب ہو۔ بہت شکریہ۔'' اس کے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔ اس نے ہاتھ ملانا بھی گوارا نہیں سمجھا جس کا میں نے بالکل برا نہیں منایا۔ میں اس کے آفس سے نکل آیا۔ میری گاڑی اب شہر کے مرکزی حصے کی جانب دوڑ رہی تھی جہاں میرا گھر تھا۔ گھر کیا تھا، بس ایک کمرا تھا۔ وہ بھی ڈاکٹر البرٹ کی مہربانی تھی۔ زخم کی وجہ سے سر میں درد کی ٹیسیں بار بار اٹھ رہی تھیں۔ دوا کی ایک خوراک میں لے چکا تھا۔ قصبے سے لوٹ کر میں نے سب سے پہلا کام ہی یہ کیا تھا کہ اپنے زخم کا تفصیلی معائنہ کرایا۔ ڈاکٹر البرٹ میرے بچپن کا دوست تھا۔ وہ ایک ماہر پلاسٹک سرجن ہے جس کی دوستی پر مجھے آج بھی ناز ہے۔ البرٹ نے ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا تھا۔ اس نے زخم کا معائنہ کر کے دو ٹانکے لگا دیے اور میڈیسن کا ایک لفافہ بھی تھما دیا تھا۔

☆☆☆

مجھے یقین تھا کہ الائس نے تمام معاملات احسن طریقے سے نمٹا دیے ہوں گے۔ دو دن گزر چکے تھے۔ مجھے اس کے فون کا انتظار تھا۔ تیسرے دن میری آنکھ موبائل فون کی مسلسل بجنے والی گھنٹی سے کھلی۔

''فوراً قصبے کے چرچ پہنچو۔'' الائس نے بلا تمہید بات شروع کی اور ختم کردی۔ شہر سے قصبے کا فاصلہ ایک گھنٹے کا تھا۔ میں نے فوراً بستر چھوڑا اور تیار ہو کر نکل پڑا۔

الائس مجھے چرچ کے سامنے ہی مل گئی۔ دونوں بیٹیاں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ ان کے چہروں پر الائس کی معصومیت و خوب صورتی اور آنکھوں میں بوول کی ذہانت جھلکتی صاف نظر آرہی تھی۔ میں نے دونوں کو پیار کیا تو وہ شرما سی گئیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے چرچ کے اندر داخل ہو گئے۔ میں نے طائرانہ نظروں سے دیکھا، چرچ اس وقت تقریباً خالی تھا۔ پہلی صف میں بس ایک عمر رسیدہ شخص کے ساتھ ایک نوعمر لڑکا بیٹھا تھا۔ ہم نے پچھلی نشستیں سنبھال لیں۔

''ایما سے ملاقات کیسی رہی؟'' میں نے الائس کی چھوٹی بیٹی کو اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ مجھے یقین تھا کہ الائس نے ایما سے ملاقات کے بعد کافی کام کی باتیں معلوم کرنے کے بعد ہی مجھے فون کیا ہوگا۔

''ایما اب رینڈی کے ساتھ نہیں، ہاسٹل میں رہتی ہے۔ رینڈی ہر ہفتے اس سے ملنے جاتا ہے۔ کس دن جاتا ہے، یہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ حتیٰ کہ ایما کو بھی ملاقات سے آدھے گھنٹے پہلے اطلاع دی جاتی ہے۔ وہی ایک دن ہوتا ہے جب وہ کسی بھی قسم کی سیکیورٹی کے بغیر باہر نکلتا ہے کیونکہ اس کی ایما کے علاوہ بھی کچھ خاص مصروفیات ہوتی ہیں۔ وہ اپنے تمام معاملات سے ایما کو دور رکھنا چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ بڑی بیٹی کی طرح چھوٹی کو بھی کھو دے۔'' الائس نے تفصیل بتائی تو میرے اندر بجلی سی دوڑ گئی۔

''یعنی کہ میرے پاس اپنا کام پورا کرنے کے لیے صرف آدھا گھنٹا ہوگا۔''

''وہ بھی اس صورت میں کہ ایما اس دوران مجھے اطلاع دے دے۔'' الائس نے جلدی سے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تمہیں یقین ہے کہ وہ ایسا کرے گی؟'' میرے سوال پر الائس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''ہاں، کیونکہ یہ رینڈی کی غلط فہمی ہے کہ ایما کچھ نہیں جانتی۔ وہ سب کچھ تو نہیں لیکن بہت کچھ جانتی ہے۔'' الائس کی باتیں سن کر میرا تجسس اور بڑھ گیا۔ الائس نے ایما سے ہونے والی تفصیلی ملاقات کا تمام احوال میرے گوش گزار کر دیا۔ اب مجھے تیار رہنا تھا۔

☆☆☆

میں ایما کی اطلاع کے انتظار میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ رینڈی کے روزمرہ کے معمولات کی مجھے کچھ حد تک خبر تھی مگر اس دوران اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ میں اسے کسی طرح انجام تک پہنچا بھی دیتا مگر اپنی جان سے ضرور جاتا کیونکہ اس کے تربیت یافتہ سیکیورٹی گارڈز ایک لمحے میں مجھے بھون کر رکھ دیتے۔ دوسری بات، میں اسے آسان موت دینے کے حق میں بھی نہیں تھا۔ اس کو بہت کچھ دکھانا تھا جو اس کے لیے مرنے سے پہلے، مرنے سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ میں نے اپنا حلیہ کافی حد تک تبدیل کرلیا تھا جس کا سہرا ڈاکٹر البرٹ کو جاتا تھا۔ اس نے میرے چہرے پر کافی تبدیلیاں کردی تھیں۔ اب کوئی مجھے پہلی نظر میں تو ہرگز نہیں پہچان سکتا تھا۔ الائس کی معلومات نے میرے ذہن میں ایک پلان بنا دیا تھا جس پر عمل کرنے کے لیے مجھے مناسب وقت کا انتظار کرنا تھا اور وہ وقت کسی بھی دن آسکتا تھا۔ ایک دن میں حسب معمول رینڈی کے آفس کے قریبی ریسٹورنٹ میں بیٹھا رینڈی کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میری بے چینی اس وقت سوا ہوگئی جب مقررہ وقت سے پندرہ منٹ زائد ہو گئے۔ یہ پورے ہفتے میں پہلی بار ہوا تھا۔ میرے عضلات تن سے گئے۔ جب پندرہ منٹ مزید گزر گئے تو میں نے فوراً ہاتھ میں پکڑا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کیا اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا۔ سامنے رینڈی کے آفس کا مرکزی دروازہ تھا۔ اچانک موبائل بجنے پر میں چونک اٹھا۔ موبائل جیب سے نکالا تو میرے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ کال الائس کے نمبر سے آرہی تھی۔

''کہاں ہو بار بیک؟'' الائس کی آواز ابھری۔

''رینڈی کے آفس کے بالکل سامنے کھڑا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''فوراً ایما کے ہاسٹل کے دروازے پر پہنچو۔ ابھی ابھی رینڈی ہاسٹل میں داخل ہوا ہے۔'' الائس کی بات سن کر میں چونک گیا۔

''بس بیس منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔'' دوسری طرف سے کال کاٹ دی گئی۔ الائس اپنا کام احسن طریقے سے انجام دے رہی تھی۔ الائس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے میں گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ ابھی چند فرلانگ ہی دور گیا تھا کہ موبائل نے ایک بیپ کے ذریعے پیغام موصول ہونے کی اطلاع دی۔ پیغام الائس کی جانب سے تھا۔ پیغام میں گاڑی کا رنگ، رینڈی کا حلیہ، گاڑی کا نمبر اور وقت درج تھا۔ میں نے موبائل ڈیش بورڈ پر رکھا اور رفتار بڑھا دی۔ شہر کے پُرفضا مقام پر بنے جدید ہاسٹل کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر میں نے گاڑی روکی اور موبائل ڈیش بورڈ سے اٹھاتا ہوا باہر نکل آیا۔ مجھے بس ایک بات کنفرم کرنی تھی۔ اس کے لیے مجھے الائس سے رابطہ کرنا تھا۔ الائس نے پہلی ہی بیل پر میری کال ریسیو کرلی۔

''رینڈی کی آمد کی اطلاع ایما نے دی تھی؟'' اپنی بات کی کنفرمیشن کے لیے یہ سوال بہت ضروری تھا۔

''ہاں، اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔''

''کسی طرح یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس وقت رینڈی کے ساتھ کتنے لوگ ہیں؟'' الائس کا جواب سن کر میں نے جلدی سے اپنا مدعا بیان کردیا۔

''کوشش کرتی ہوں۔ اگر رینڈی، ایما کے ساتھ ہوا تو ایما میری کال ہرگز نہیں اٹھائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا موبائل ہی بند ہو۔''

''ہوں...... کوشش کرو۔ اگر یہ بات پتا چل جائے تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔'' میں نہیں چاہتا تھا کہ زیادہ ہنگامہ ہو۔ اگر رینڈی کے ساتھ دو گارڈز بھی ہوئے تو میں سنبھال سکتا تھا مگر اس کے لیے مجھے بھرپور ایکشن کرنا پڑتا۔ پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ الائس کی کال آگئی۔

''رینڈی آج بھی اکیلا ہے۔'' الائس کی بات سن کر میں چونک گیا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''میں نے ہاسٹل کی انچارج کو فون کیا اور کہا کہ میں ابھی ایما سے ملنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے معذرت کرلی۔ میں نے تکا مارا کہ جب تک ایما فارغ نہیں ہو جاتی میں رینڈی صاحب کے گارڈز کے ساتھ انتظار کرسکتی ہوں۔ میرا تکا کامیاب رہا۔ ''سوری، وہ گارڈز کے ساتھ نہیں آتے'' یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کردیا مگر ہمارا کام ہو چکا تھا۔ میں چاہتی بھی نہیں تھی ایما کو میری اس بات کا پتا چلے کیونکہ میں نے صرف اس کو اس بات کے لیے راضی کیا تھا کہ جب بھی اس کا باپ اس سے ملنے آئے، مجھے اطلاع کردے۔''

''ویلڈن الائس!'' الائس نے تفصیل بتائی تو میں ایک بار پھر دل ہی دل میں اس کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکا۔ اب میرا کام آسان ہو گیا تھا۔

''بوول کو ہمیشہ تم پر فخر رہے گا۔'' اتنا کہہ کر میں نے فون بند کیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا کیونکہ کسی بھی وقت رینڈی باہر آسکتا تھا۔ میرا انتظار چند منٹ میں ہی ختم ہوگیا۔ ہاسٹل کا گیٹ کھلا۔ ایک پرانے ماڈل کی کار برآمد ہوئی۔ اگر مجھے گاڑی کا رنگ پہلے سے معلوم نہ ہوتا تو میں کبھی یقین نہیں کرتا کہ رینڈی اس گاڑی میں سفر کرسکتا ہے۔ گاڑی میرے سامنے سے گزرتی ہوئی شہر کی جانب بڑھ گئی۔ رینڈی اس وقت عام سے حلیے میں ایک ٹی شرٹ اور آنکھوں پر تاریک شیشوں کا چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ اس نے اپنی پہچان چھپانے کی پوری کوشش کی تھی مگر الائس کی ہوشیاری نے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ میں نے اپنی گاڑی احتیاط سے اس کے پیچھے لگا دی۔ رینڈی میرے اندازے کے مطابق جا رہا تھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ اب کہاں جائے گا۔ وہیں مجھے اپنا کام کرنا تھا۔ میں اطمینان سے تعاقب کر رہا تھا۔ معروف شاہراہ پر پہنچنے کے بعد اس کی گاڑی ایک پوش علاقے کی جانب مڑ گئی۔ میں مسکرا کر رہ گیا۔ میں نے رفتار بڑھا کر فاصلہ کم کیا اور رینڈی کی گاڑی کو اوورٹیک کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ اسی وقت میرے موبائل پر الائس کی کال آنے لگی۔

''کہاں پہنچے؟''

''کامیابی کے بالکل قریب۔''

''ٹھیک ہے...... میں تمہیں وہیں ملوں گی جہاں کل ملاقات ہوئی تھی۔'' اتنا کہہ کر الائس نے کال کاٹ دی۔ میں نے بیک مرر میں دیکھا، رینڈی کی گاڑی کی رفتار کم ہو رہی تھی۔ میں نے رفتار بڑھائی اور ایک نوتعمیر جدید بلڈنگ کے عقب میں درختوں کے نیچے گاڑی روک دی۔ گاڑی لاک کرکے میں تیز تیز قدموں سے بلڈنگ کے مرکزی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ رینڈی اپنی گاڑی پارک کرکے بلڈنگ کے اندر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ میں نے جیب سے ڈاکٹر البرٹ کا وزٹنگ کارڈ نکالا، سیکیورٹی گارڈ کو دکھایا اور تیزی سے رینڈی کی طرف بڑھا۔ رینڈی لفٹ تک پہنچ چکا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں میں رینڈی کو بے بس کرسکتا تھا۔ آگے کیا کرنا تھا، یہ میں بہ خوبی جانتا تھا۔ لفٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ رینڈی اطمینان سے اندر داخل ہو گیا۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھا۔ مجھے تیزی سے آتے دیکھ کر رینڈی کا ہاتھ بٹن دباتے ہوئے رک گیا۔

''شکریہ جناب!'' میں نے مسکرا کر رینڈی کی جانب دیکھا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد اس نے ہاتھ بڑھا کر چوتھی منزل کا بٹن دبا دیا۔ اسی وقت میرا ہاتھ گھوما اور رینڈی کی کنپٹی پر پڑا۔ میرے اس اچانک تلے وار سے اکثر لوگ پہلی ہی بار میں بے ہوش ہو جاتے ہیں مگر رینڈی سخت جان تھا۔ وہ لڑکھڑا کر سیدھا ہو گیا اور جوابی وار کرنا چاہا مگر میں اس وقت تک اپنا پستول نکال چکا تھا۔ رینڈی جیسے ہی میرے قریب ہوا، میں

نے پوری قوت سے پستول کا دستہ اس کے سر کی پشت پر مارا۔ یہ حربہ کامیاب رہا اور رینڈی لفٹ کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ مجھے پتا تھا بلڈنگ میں جگہ جگہ سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہوئے ہیں مگر مجھے ان کی ذرا پروا نہیں تھی۔ میں ویسے ہی پولیس کو مطلوب تھا۔ مطمئن اس لیے تھا کہ میرا حلیہ کافی بدلا ہوا تھا۔ لفٹ چوتھی منزل پر رکی تو میں نے جلدی سے گراؤنڈ فلور کا بٹن دبا دیا اور رینڈی کی جیب سے اس کی گاڑی کی چابی نکال کر اپنی جیب میں منتقل کر لی۔ لفٹ جیسے ہی رکی، میں نے رینڈی کو کندھے پر لادا اور باہر نکلتے ہی پارکنگ کی جانب دوڑا۔

"سیکیورٹی......! سیکیورٹی......!" میں نے چیخ کر آوازیں دیں۔

"کیا ہوا ڈاکٹر صاحب؟ سر بے ہوش کیوں ہیں؟" میں نے جب سیکیورٹی گارڈ کو اپنا کارڈ دکھایا تھا، وہ فوراً میرے قریب آیا۔

"لفٹ میں اچانک نہ جانے کیا ہوا، یہ بے ہوش ہو گئے۔ دروازہ کھولو۔ سر کو فوراً اسپتال پہنچانا ہے۔" میں رینڈی کی گاڑی کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"سر! ایمبولینس کو فون کروں؟" گارڈ نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں...... سر کی حالت سیریس ہے۔ میں خود ڈاکٹر ہوں۔ تم دروازہ کھولو۔" اس کا جواب سنے بغیر میں نے رینڈی کو پچھلی سیٹ پر ڈالا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ سیکیورٹی گارڈ دروازے کی جانب لپکا۔ اسی وقت چوتھی منزل پر ایک کھڑکی کھلی اور ایک جوان عورت نظر آئی۔ اس نے چیخ کر سیکیورٹی گارڈ کو کچھ کہا۔ اس وقت تک گارڈ دروازہ کھول چکا تھا۔ میں نے تیزی سے گاڑی عمارت سے باہر نکالی اور گاڑیوں کے ازدحام میں شامل ہو گیا۔ کچھ دور جا کر میں ایک ذیلی سڑک پر مڑ گیا۔ اس دوران میں نے ڈاکٹر البرٹ کو کال کر کے وہ دونوں فائلز لانے کو کہا جو میں نے امانت کے طور پر اس کے پاس رکھوائی تھیں۔ ساتھ میں نے نیشنل پارک کا مرکزی دروازہ بتایا تھا۔

اب مجھے کسی سنسان گلی کی تلاش تھی جہاں پہنچ کر رینڈی کا مکمل بندوبست کرنا تھا۔ جلد ہی ایک گلی مل گئی۔ میں نے گاڑی روکی اور رینڈی کو باہر نکال کر اپنا کام کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ جب تک رینڈی کی گاڑی کی تلاش شروع ہو گی، میں اپنا کام مکمل کر کے ایک نئی زندگی کی طرف بڑھ چکا ہوں گا۔

☆☆☆

رینڈی اپنی ہی گاڑی کی ڈکی میں بندھا پڑا تھا۔ نیشنل پارک کے سامنے جب میں نے گاڑی روکی تو ڈاکٹر البرٹ پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں دونوں فائلز تھیں۔

"میں ابھی ایمرجنسی میں ہوں۔ مجھے جلد ہی کہیں پہنچنا ہے۔ تفصیلات بعد میں بتاتے رہنا۔" ڈاکٹر البرٹ نے فائلز اور اپنی گاڑی کی چابی مجھے تھماتے ہوئے کہا اور مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ مجھے البرٹ کی دوستی پر ہمیشہ فخر رہا ہے اور رہے گا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری آنے والی نئی زندگی کی راہ ہموار کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ میں اس کے بارے میں سوچتا ہوا پارک میں داخل ہو گیا۔ الائس سنسان گوشے میں ایک چوبی بینچ پر بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔

"تم ایک بہادر عورت ہو۔ بوول تم سے اور اپنی بیٹیوں سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس کا راز فاش نہ ہوتا تو آج وہ بھی زندہ ہوتا اور رینڈی واٹسن کی عبرتناک موت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا مرنا اب لازم ہو چکا ہے۔ وہ تم لوگوں کو اس سارے معاملے سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اسے جب پتا چلا کہ اس کو مارنے کا کام میرے سپرد کیا گیا ہے تو وہ خود چل کر میرے پاس آ گیا کیونکہ میرے بارے میں وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔" میں الائس کی خوب صورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"مگر وہ مرنا کیوں چاہتا تھا؟ حالانکہ تم نے ایک اچھی آفر بھی دی تھی۔"

الائس کے سوال کے جواب میں اب لازم ہو چکا تھا کہ یہ راز بھی کھول دوں۔ میں نے ہاتھ میں پکڑی ایک فائل اس کی طرف بڑھا دی۔ یہ بوول کے انشورنس کی فائل تھی۔ الائس فائل کھول کر پڑھنے لگی۔ اس میں تمام شرائط لکھی ہوئی تھیں۔

"بوول نے یہ سب کیوں کیا؟ میں اس کے ساتھ خوش تھی بلکہ بہت خوش......" الائس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تم نے شاید آخری پیپر نہیں پڑھا۔" میں نے فائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے جلدی سے فائل کھولی اور آخری پیپر نکال کر پڑھنے لگی۔ وہ ایک میڈیکل رپورٹ تھی جس میں بوول کا لنگ کینسر کا مرض ثبت تھا۔ انشورنس پالیسی میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر بوول طبعی موت مرے گا تو اس کی بیوہ کو پالیسی کے مطابق رقم ادا کی جائے گی اور اگر وہ حادثاتی موت مرتا تو کمپنی بیوہ کو دگنی رقم دینے کی پابند ہو گی۔ الائس کو بوول کی خود قتل ہونے کی وجہ سمجھ آ گئی اور وہ رپورٹ پوری پڑھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں اسے روتا ہوا دیکھتا رہا پھر نہ جانے کیا ہوا۔ میں آگے جھکا اور اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ کسی معصوم بچی کی طرح میرے سینے سے لگی روتی رہی۔ جب دل کا غبار ہلکا ہوا تو وہ ہولے سے مجھ سے الگ ہوئی اور اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔

"سوری......" اس کے منہ سے نکلا تو میں نے بے اختیار اس کو دوبارہ سینے سے لگا لیا۔ وہ چند لمحے تو ساکن سی ہو کر رہ گئی پھر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میں نے اس کے ماتھے پر پیار کیا اور اس کے کندھوں کو پکڑ کر بولا۔

"میرا انتظار کرنا۔" اس نے گردن جھکا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے دوسری فائل جس میں رینڈی واٹسن کے سارے کرتوت کی فوٹو کاپیاں موجود تھیں، الائس کو تھمائی اور مسکراتا ہوا پارک سے نکل کر رینڈی کی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے اسے پھرتی سے ڈاکٹر البرٹ کی گاڑی کی ڈکی میں منتقل کیا اور واشنگٹن کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

واشنگٹن میں رات ہو چکی تھی۔ میں نے گاڑی ایک گلی کے کنارے پر روک دی۔ یہ گلی ہمارے مہذب معاشرے کی وہ غلیظ ترین تصویر تھی جس میں قدم رکھنے کا کوئی مہذب انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ ایک گلی نہیں تھی، ایسی کئی گلیاں تھیں جو امریکا کے ہر شہر میں جابجا بکھری ہوئی تھیں۔ ان گلیوں کو آباد کرنے والے شہر بلکہ ملک کے مہذب ترین شہری ہی تھے جن میں سے ایک رینڈی واٹسن بھی تھا جس کو میں آج یہاں لایا تھا۔ رینڈی کو یہاں لا کر مارنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔

رینڈی کو میں نے گاڑی سے نکالا اور گلی کے فرش پر پھینک دیا۔ اس نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی مگر پاؤں کی بندشوں کی وجہ سے لڑکھڑا کر دوبارہ زمین بوس ہو گیا۔ میں نے اسے کالر سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا گلی کے وسط میں لے آیا۔ گلی کے کونے کھدروں سے میلے جسم پر بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس ہر عمر کے انسان جن میں مرد اور عورتیں سب شامل تھے، نکل کر حیرت سے ہمارے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ میں نے ایک زوردار لات رینڈی کی پسلیوں پر ماری اور اس کا گریبان پکڑ کر غصے سے بولا۔

"ان رینگتے ہوئے انسانوں کو دیکھ!" یہ کہہ کر میں نے اس کا گریبان چھوڑا اور دو قدم آگے بڑھ کر ایک نوجوان کا بازو پکڑ کر رینڈی کے پاس لے آیا۔ "اس بچے کو دیکھ...... ابھی اس کی عمر اٹھارہ سال بھی نہیں ہوئی ہے مگر ستر سال کے بوڑھے میں بھی اس سے زیادہ طاقت ہوگی۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ابھی جو کچھ تو دیکھنے والا ہے، اسے دیکھ کر تیری روح بھی کانپ اٹھے گی۔" اتنا کہہ کر میں نے بچے کو چھوڑا اور رینڈی کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا ایک تاریک کونے میں لے گیا جہاں ایک نوجوان لڑکی میلے سے کمبل میں لپٹی اس سارے معاملے سے بے نیاز دیوار سے باتوں میں مشغول تھی۔ میں نے رینڈی کو اس کے سامنے پٹخ سا دیا اور اس کے منہ پر چپکا ٹیپ ایک جھٹکے سے الگ کر دیا۔

"میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں، دو کوڑی کے انسان!" رینڈی کی اکڑ ابھی تک نہیں گئی تھی۔

"تم نے اپنی بیٹی تک کو نہیں چھوڑا...... دیکھ، کیا حشر کیا ہے تو نے۔" میری بات سن کر رینڈی کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے فوراً کروٹ بدلی اور غور سے نوجوان لڑکی کو دیکھنے لگا۔

"جینا!" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"ہاں، یہ تیری ہی بیٹی ہے جسے تو نے اپنے ہاتھوں سے اس حال میں پہنچایا ہے۔ شاید یہ اب تجھے بھی پہچان نہ سکے۔" میرے لہجے کی غراہٹ نے رینڈی پر اثر کیا۔ وہ رونے لگا جس کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جینا اب بھی بے نیاز اپنے مشغلے میں مصروف تھی۔ اس نے ایک نظر بھی ہم پر نہیں ڈالی تھی۔ رینڈی اب باقاعدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مجھے پتا تھا یہ سب وقتی جذبات ہیں۔ رینڈی جیسے لوگ کبھی نہیں سدھر سکتے۔ ان کا ایک ہی حل ہے کہ ان جیسے انسانوں سے اس دنیا کو پاک کر دیا جائے۔ مجھے رینڈی کو جو دکھانا تھا، دکھا دیا تھا۔

"اس کو اس حال میں پہنچانے والے تیرے ہی وفادار تھے۔ تو نے نہ جانے کتنی زندگیاں برباد کر دیں۔ اب تیرے جیسا ہر ذلیل انسان برباد ہوگا۔ تیرے کرتوتوں کا اب بھی ہر ثبوت میرے پاس ہے۔ اب سب ختم رینڈی...... اور تو بھی......" اتنا کہہ کر میں نے پستول کی نال اس کی چھاتی پر رکھی اور گولی چلا دی۔ میں چاہتا تھا کہ جب پولیس کو اس کی لاش ملے تو باقاعدہ پہچانا جائے کہ یہ کون تھا، کیا کرتا تھا؟

یہ میری زندگی کا آخری قتل تھا جو میں کر چکا تھا۔ میں نے جینا کو اٹھایا اور ڈاکٹر البرٹ کی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ اب میرے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا سوائے شریفانہ زندگی گزارنے کے جو الائس کے ساتھ ہی ممکن تھا جس کا ڈاکٹر البرٹ نے مکمل انتظام کر دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ انکار نہیں کرے گی۔

⌘⌘⌘
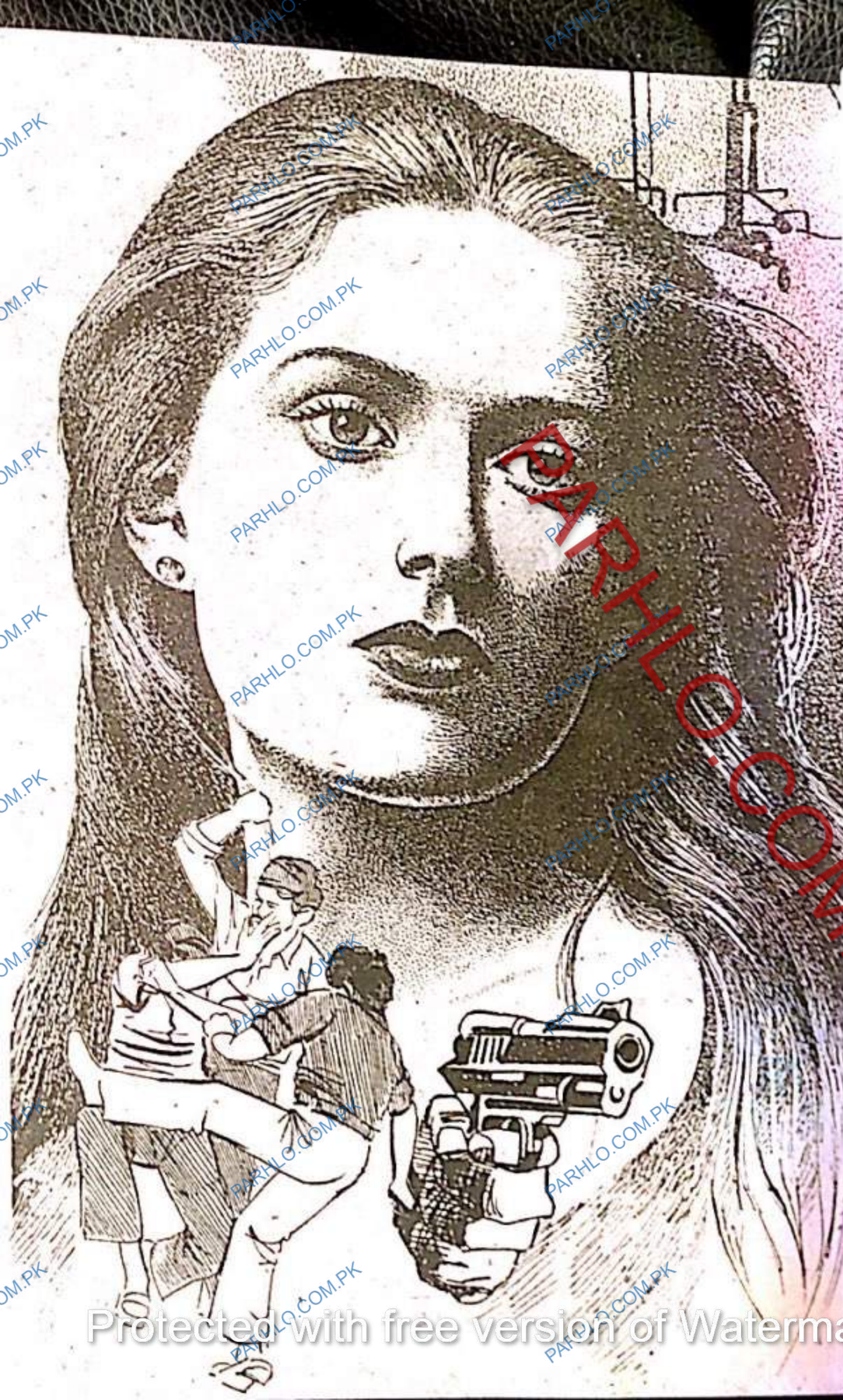
قسط: 32

زندگی پیار ... ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹانے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جوالمیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ میں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہوسکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی حیرانگیز داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ اسے مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہوتا ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونیکیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس جگہ بھی وہ ایک زیرِ تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر چھوڑ دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کردیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹوگرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہوجانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آجاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کریم نامی اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیرقانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کررہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں اور گولی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کرکے ماردیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کردیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہوجاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کرکے اسے ان کے حوالے کردیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہوجاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کردیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کرلیتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کرکے اس کے ذہن کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیفو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن تجل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہوجاتا ہے۔ ادھر بشریٰ وہیں پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کرلیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہوجاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا روانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یاتریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہوجاتا ہے۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے داروں کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، تجل اور سرمد انڈیا روانہ ہوجاتے ہیں۔ ایئرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے ان کا راستہ روک لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی

ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ معاذ لوٹ لیتے ہیں۔ ادھر بشریٰ اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ بنگلے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کردیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بہ حفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کردیتا ہے۔ وہ زخمی ہوجاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہوجاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لیے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر بشریٰ باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر تجل کو اس کا شوہر ذہنی اذیت دیتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے تجل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرمد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھر لیے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ معاذ، وشا کے ذریعے عالم اور سرمد کو رہا کروانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وشا کی گاڑی حادثے کا شکار ہوجاتی ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو ایک باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علینہ پاکستان میں ثوبیہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ثوبیہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھر والوں کو ماردیا جاتا ہے۔ معاذ سجاش نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے تاہم وہ مارا جاتا ہے اور معاذ بھی زخمی ہوجاتا ہے اور اپنا نشان وہاں چھوڑ دیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اس کے ساتھ مل کر موہن نامی "را" کے ایجنٹ کو اغوا کرلیتا ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو ماردیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے تجل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں "را" کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجاتی ہے اور اسے اپنے تعاون اور مدد کی یقین دہانی کرواتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کرلیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہوجاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کردیتے ہیں۔ تجل اور جلیل مارے جاتے ہیں اور فیصل اور اس کے بیٹے زخمی ہوجاتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کرلیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدرآباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور راداھا دیوی کو حیدم ایکس کے پہنچ جانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کردیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے مگر نواب صاحب کا بیٹا ان کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ تجل کو بھی اغوا کرکے حویلی لے آتا ہے۔ تاہم وہ لوگ عبید کو قبضے میں کرکے وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جارو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے "را" کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ ادھر تجل کا بیٹا اعظم اپنی ناک میں پتھر پھنسا لیتا ہے۔ جارو اور معاذ، تجل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا عالم وغیرہ سمیت سب کو ٹھکانا بدلنے کا کہہ کر معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص وغیرہ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلو کا باڈی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ وقاص بھی معاذ کو ڈھونڈتا ہوا وہیں پہنچ جاتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کرکے کہیں لے جارہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آجاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

''میں ٹھیک ہوں۔ سب واپس اندر چلیں۔'' سرمد کے ہیلمٹ کے اڑتے پرخچوں، نیچے گرتے وجود اور خون کی

سرخی نے اس منظر میں بجتی فون کی گھنٹی کی آواز کے ساتھ پورے منظر کو ساکت کردیا تھا۔ اس منظر کو دوبارہ متحرک

کرنے والی آواز بھی سرد کی تھی۔ وہ خوش نصیب ثابت ہوا تھا۔ جس گولی نے اس کے سر پر موجود ہیلمٹ کے پرخچے اڑا دیے تھے وہ محض اس کے کان کو بوسہ دیتے ہوئے گزری تھی اور گولی کے اس بوسے ہی نے اچھا خاصا خون جاری کر دیا تھا۔

اندر آ کر کچھ لوگ اس کے زخم کی دیکھ بھال میں لگ گئے جبکہ سونیا نے مستقل مزاجی سے بجتے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ معاذ بھی لپک کر دوسرے سیٹ تک پہنچا۔

"بہت خوب! بڑی رونق لگا رکھی ہے تم لوگوں نے۔ میں دور بیٹھا بھی بہت انجوائے کر رہا ہوں لیکن میرے خیال میں اب کچھ سنجیدہ باتوں کا وقت آ گیا ہے۔" ڈیوڈ کی گھرگھراتی آواز میں ان کے لیے مضحکہ بھی تھا اور تنبیہ بھی۔

"ہم بھی سنجیدہ بات ہی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ خواہ مخواہ کا تماشا کرنے کے بجائے سیدھے سیدھے اپنی شرائط بتاؤ۔" چند ثانیے قبل ہونے والے واقعے کے اثرات ابھی تک معاذ کے دل و دماغ پر تھے اس لیے سونیا کے کچھ بولنے سے قبل ہی وہ تیز لہجے میں بول اٹھا۔

"اوہ معاذ ڈارلنگ! سنا ہے تم نے میڈم ایکس کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں اور وکٹر جیسے شاطر کی موجودگی کے باوجود اس کے قابو میں نہیں آئے۔ تمہارے اتنے قصے سن کر تم سے ملاقات کا بہت شوق تھا اور دیکھو ایک اتفاق نے یہ شوق پورا کروا ہی دیا۔ قسمت خود گھیر کر تمہیں میری کچھار تک لائی ہے۔" معاذ کے غصیلے لہجے کے مقابلے میں، اس کے انداز میں شوخی تھی۔

"کچھار نہیں بل ہے یہ، بزدل چوہوں کا بل۔ جن کے اندر سامنے آ کر لڑنے کی ہمت نہیں اور چھپ چھپ کر وار کرتے ہیں۔" معاذ کو اس کی یہ شوخی ذرا نہ بھائی اور تند لہجے میں جواب دیا۔

"معاذ اپنے ساتھیوں کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے ڈیوڈ۔ تم نے میرے اور اس کے لیے چوائس دی تھی کہ ہم یا تو موت کو قبول کر لیں یا اس زندگی کو جو تم ہمارے لیے منتخب کرو گے۔ تمہیں یہ فیصلہ سنانے سے پہلے معاذ اپنے دوستوں کا مستقبل جاننا چاہتا ہے۔" ان دونوں کے درمیان کوئی نئی بحث چھڑنے کے ڈر سے سونیا نے گفتگو میں دخل دیا اور اصل موضوع پر بات کی۔

"سوچا تو یہی تھا کہ ان سب کو نرگ پہنچا کر انڈین پولیس کو آتنک وادیوں کو ٹھکانے لگانے کا کریڈٹ دلوا دیں گے لیکن ابھی جو معاذ کی ان سے محبت دیکھی ہے تو کچھ اور سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔" اس کی [illegible] آواز میں [illegible] کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

"کیا...... کیا سوچا ہے تم نے؟" سونیا نے [illegible] خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود بات کو آگے بڑھایا۔

"سوچا ہے کہ دوستوں کو دوست کے ساتھ رکھتے ہیں اور انہیں بھی وہ سارے مزے کرواتے ہیں جو تم لوگ کرنے والے ہو۔" وہ گویا کسی بہترین تفریح کے خیال سے لطف لے رہا تھا اور یہ تو وہ اپنی پہلی کال میں ہی بتا چکا تھا کہ انہیں جو زندگی ملنے والی ہے وہ بے حد اذیت ناک ہوگی۔ اس لیے اس کا جواب سن کر معاذ کا چہرہ ستا گیا۔

"ہمارے ساتھیوں میں ایک کمزور لڑکی اور معصوم بچہ بھی شامل ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اور کسی کے لیے نہ سہی ان دونوں کے لیے کوئی گنجائش نکالی جائے اور ان سے کچھ نرمی برتی جائے۔" موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس نے اپنے غصے پر قابو پایا اور قدرے عاجزی سے درخواست کی۔

"کیوں نہیں؟ تمہاری یہ فرمائش بالکل پوری ہو سکتی ہے۔ ہم بچے اور اس کی ماں کو یہاں زندہ چھوڑ دیں گے۔ ماں کچھ دن انڈین پولیس کا دل بہلانے کے کام آ جائے گی پھر اس پر کورٹ میں پاکستانی جاسوس کی حیثیت سے کیس چلائیں گے، اور رہا بچہ...... تو بچے کا کیا مسئلہ؟ بچہ جیل میں رہے یا اناتھ آشرم میں، لوٹ پوٹ کر بڑا ہو ہی جائے گا۔" اس نے سنبل اور اعظم کے مستقبل کا وہ نقشہ کھینچا کہ معاذ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

"لگتا ہے مسٹر معاذ کو میری آفر پسند نہیں آئی؟" شاطر ڈیوڈ کے لیے اس کی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

"اس آفر کو کرنے سے بہتر تھا کہ تم صاف انکار کر دیتے۔" معاذ سمجھ گیا کہ وہ اس کی درخواست قبول نہیں کرنا چاہتا۔

"میں، مقابل کی کمزوریوں کو نظر انداز کرنے کا بالکل بھی قائل نہیں۔ یہ پیاری پیاری حسین کمزوریاں آگے چل کر بڑے کام آنے والی ہیں۔" اس نے اپنے الفاظ سے جتا دیا کہ وہ سنبل کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔ اس موقع پر معاذ نے خاموشی اختیار کر لینا ہی مناسب سمجھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جتنا سنبل کی رہائی کے لیے زور لگائے گا ڈیوڈ اس کی اہمیت سے واقف ہوتا جائے گا اور یہ واقفیت آگے بلیک میلنگ کی راہ ہموار کر دیتی۔

"سنبل ایک بے ضرر سی گھریلو عورت ہے ڈیوڈ جو اتفاقاً اپنے بچے سمیت اس سارے چکر میں پھنس گئی ہے۔ اسے اس سارے مسئلے سے الگ کرو، وہ تمہارے کسی کام نہیں آنے والی۔" سونیا نے بھی اپنے تئیں ڈیوڈ کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

"تم تو ہم سے واقف ہو ڈارلنگ! ہم چاہیں تو پتھروں سے بھی کام لے لیں وہ تو ایک جیتی جاگتی، خوبصورت عورت ہے۔ کسی اور کام نہ بھی آئی تو [illegible]"

"بکواس بند کرو۔" معاذ کے اندر حوصلہ نہیں تھا کہ سنبل سے متعلق اس کی مزید بے ہودہ گفتگو سن سکتا۔

"آرام سے معاذ۔" سونیا نے اسے اس کے جذباتی پن پر ٹوکا۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ دوسرے کمرے میں رکھے سیٹ پر ڈیوڈ سے گفتگو کر رہا تھا اور ایسے زاویے پر بیٹھا تھا کہ صرف سونیا ہی اسے دیکھ سکتی تھی۔ باقی سب صرف وہی یک طرفہ گفتگو سن پا رہے تھے جو سونیا ڈیوڈ سے کر رہی تھی ورنہ ممکن تھا کہ معاذ کے جذباتی لب و لہجے سے عالم شاہ بھی صورت حال کو بھانپ لیتا اور اس کی طرف سے بھی کوئی ایسا ردعمل ظاہر ہو جاتا جو ڈیوڈ کی ناراضی کا سبب بنتا۔

"یہ انڈو پاک کے لوگ بڑے جذباتی ہوتے ہیں، معمولی معمولی باتوں پر بھڑک جاتے ہیں۔ تم معاذ کو سمجھاؤ ہی کہ خود پر قابو پانا سیکھے کیونکہ آگے اسے صرف باتیں نہیں، عملی طور پر بھی بہت کچھ برداشت کرنا ہوگا۔" ڈیوڈ ٹھنڈے لہجے میں سونیا سے مخاطب ہوا۔

"میرے خیال میں ہم ان باتوں کو رہنے دیتے ہیں ڈیوڈ۔ ہم یہاں تمہارے رحم و کرم پر ہیں اور ہوتا وہی ہے جو تم چاہتے ہو اس لیے یہ چوائس دینے اور خواہشات پوری کرنے کے ڈرامے بند کرو اور وہ کر گزرو جو کرنا چاہتے ہو۔" اس بار سونیا نے اس سے دو ٹوک بات کی۔

"تم کتنی سمجھدار ہو بے بی لیکن افسوس کہ تم نے ہمارا ساتھ چھوڑنے کا احمقانہ قدم اٹھایا۔ بہرحال ابھی تو تم لوگ ویٹ کرو۔ میرا فیصلہ جلد تم تک پہنچ جائے گا۔" ڈیوڈ نے یکدم ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

"کیا طے ہوا؟" ریسیور رکھ کر سونیا اور معاذ سب کے درمیان بیٹھے تو پہلا سوال وکی کی طرف سے آیا۔

"ہمارے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ جو کچھ طے کرنا ہے انہوں نے ہی کرنا ہے۔" معاذ نے واضح صورت حال بیان کی۔

"وہ ہمیں اس بنگلے میں، مکمل طور پر بے بس کر چکے ہیں۔ نہ ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں اور نہ ہی کسی سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ میں نے چیک کیا ہے۔ یہاں موبائل پر سگنلز بھی نہیں آ رہے تھے۔" وکی نے نئی اطلاع دی۔

"مجھے یقین ہے کہ اب یہ لینڈ لائن نمبر بھی مردہ ہو چکا ہوگا۔ اس لیے یہ سوچنا بے کار ہے کہ ہم کسی صورت بچ کر نکل سکتے ہیں یا کسی کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتے ہیں۔ ہمیں اب فرار کی ترکیبیں سوچنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر ان حالات کے لیے تیار کرنا ہوگا جو آگے پیش آ سکتے ہیں۔" سونیا نے صورت حال کی وضاحت کی۔

"تم سنبل کے بارے میں اس سے کچھ کہہ رہی تھیں، کیا وہ اسے اور اعظم کو کوئی رعایت دینے کے لیے تیار ہوا؟" عالم شاہ نے موہوم سی امید کے سہارے سوال کیا۔ وہ ایک بھائی تھا اور خود سے بھی زیادہ بہن اور بھانجے کے لیے فکر مند تھا۔

"نہیں، وہ کسی رعایت کے لیے راضی نہیں ہوا۔" سونیا کو اسے مایوس کرنا پڑا۔ اچھی بات یہ تھی کہ سنبل اس وقت وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ اعظم کے رونے کی آواز سن کر اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔

"ٹھیک ہے یارو! جب کچھ نہیں ہو سکتا تو کچھ کھانا پینا کر لیتے ہیں۔ پتا نہیں آگے عالم پیٹ بھر روٹی کھائیں بھی یا نہیں۔" جارو نے بوجھل فضا میں ایک الگ ہی مسئلہ اٹھایا اور پھر ایک کونے میں دبکے انوپ اور ہاشو سے مخاطب ہوا۔

"چلو اوئے شتونگڑو! بڑی دیر آرام کر لیا تم نے۔ اب ذرا کچن میں چل کر میرے ساتھ روٹی شوٹی کا تو انتظام کرواؤ۔"

"اچھا صاحب۔" انوپ کی طرف سے پہلے جواب آیا۔ بدلتی ہوئی صورت حال کے ساتھ ساتھ اس کی طراری بھی دم توڑنے لگی تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ یہاں کوئی بڑا کھیل چل رہا ہے اور اتنا تو اسے اندازہ تھا کہ ایسے بڑے کھیلوں میں اس جیسے معمولی مہروں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اسے اپنی اور ہاشو کی زندگیاں خطرے میں نظر آنے لگی تھیں۔

"جب تک کھانا تیار ہو رہا ہے، میں اندر سنبل کے پاس جا کر آرام کرتی ہوں۔" سونیا مزید سوالوں سے بچنا چاہتی تھی اس لیے بہانہ بنا کر اٹھ گئی اور ہلکی سی دستک دے کر سنبل کے زیر استعمال کمرے میں داخل ہوئی۔ سنبل جو اعظم کو فیڈ کروانے کے بعد اس کے کپڑے تبدیل کروا رہی تھی اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"کیسی ہو سنبل! طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری!" سونیا نے بیڈ کے پائینتی بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تھوڑا سا سر میں درد ہو گیا تھا لیکن اب چین کر لینے سے بہتر ہے۔" اس نے دھیرے سے بتایا اور اعظم کی شرٹ

کے بٹن انہماک سے بند کرنے لگی۔ سونیا اس کے حرکت کرتے ہاتھوں اور صبیح چہرے کو انہماک سے دیکھنے لگی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'' سجل نے اس کے دیکھنے کو محسوس کیا۔

''دیکھ رہی ہوں کہ تم میں ایسا کیا ہے جو تمہیں دنیا کی سب عورتوں سے منفرد بناتا ہے۔'' سونیا کے دل کی حسرت اس کی زبان پر آ گئی۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میری جیسی تو بہت ہیں۔ ہاں تمہارے جیسا حسن نایاب ہوتا ہے اور کہیں کہیں ہی دکھائی دیتا ہے۔'' سجل نے جواباً سچائی سے کام لیا۔

''نہیں، تم میں کچھ اور بات ہے جب ہی تو......''

سونیا نے عین وقت پر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیا جب ہی تو؟'' وہ اعظم پر سے توجہ ہٹا کر پوری طرح سونیا کی طرف متوجہ ہوئی۔

''کچھ نہیں۔ میں کچھ دیر آرام کروں گی۔ کھانا تیار ہونے کا پیغام ملے تو مجھے جگا دینا۔'' اس نے سجل کو ٹالا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بستر پر دراز ہو گئی۔ وہ سجل سے کیسے کہتی کہ ہوش ربا حسن کے باوجود وہ معاذ کی نظر سے محروم ہے جسے وہ سجل کے حضور جھکائے رکھے تب بھی اس میں جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔

''ٹھیک ہے تم سو جاؤ، میں اسے باہر سرمد کے حوالے کر دیتی ہوں۔ یہ اپنی نیند پوری کر چکا ہے اور اب کھیلنے کے موڈ میں ہے۔'' وہ اعظم کو لے کر باہر نکل گئی۔ ان حالات میں سونیا کو نیند آنا تو ممکن نہیں تھا لیکن آنکھیں موندے لیٹی رہی۔ اس نے سجل کا واپس کمرے میں آنا اور احتیاط سے چیزوں کا سمیٹنا بھی محسوس کیا لیکن آنکھوں پر سے ہاتھ نہیں ہٹایا۔

''باہر کھانے کے لیے بلا رہے ہیں۔'' لیٹے لیٹے وہ نیم غنودگی میں چلی گئی جب سجل نے ہولے سے اس کا بازو ہلا کر پکارا۔ وہ انتہائی بے دلی سے منہ ہاتھ دھو کر سب کے درمیان پہنچی تو کھانا لگ چکا تھا۔ سب ہی بہت دیر سے بھوکے تھے اس لیے تناؤ کے باوجود کچھ نہ کچھ حلق سے اتار لیا۔

''تمہارا کیا حال ہے؟'' کھانے کے بعد اس نے سرمد سے دریافت کیا۔

''ٹھیک ہوں۔ تھوڑا سا بخار ہو گیا تھا لیکن گولی کھانے سے وہ بھی اتر گیا۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''یہاں کچھ گھٹن سی محسوس نہیں ہو رہی؟'' کھانے کے بعد سب ذرا ڈھیلے ڈھالے ہو کر بیٹھ گئے جب معاذ نے جمائی لینے والے انداز میں پوچھا۔

''نہیں تو، مجھے تو ایسا نہیں لگ رہا۔'' عالم شاہ نے اختلاف کیا۔

''مجھے تو پیٹ بھرنے کے بعد والی سستی محسوس ہو رہی ہے۔'' وکی صوفے پر ہی لمبا لیٹ گیا۔

''گلے میں کچھ خراش سی ہو رہی ہے۔'' جبار علی عرف جارو نے شکایت کی۔

''باہر نکلو۔ سب جلدی سے باہر نکلو۔'' فرداً فرداً سب کی رائے سنتی سونیا زور سے چیخی لیکن اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کی آواز اتنی بلند نہیں نکلی ہے جتنا اس نے اپنا زور لگایا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

''یہ کوئی بے رنگ اور بے بو گیس ہے جو ہم پر اپنا اثر دکھا رہی ہے۔'' وہ سب کو بتانا چاہتی تھی لیکن آواز پہلے سے بھی زیادہ گھٹ گئی تھی۔ دوسروں کے تاثرات سے بھی ظاہر تھا کہ ان پر اثر ہونے لگا ہے۔ اس نے اپنی پوری قوت صرف کر کے خارجی راستے کی طرف بڑھنا چاہا لیکن مشکل سے دو قدم چل سکی۔ تیسرا قدم اٹھنے تک وہ چکراتے سر کے ساتھ زمین بوس ہو چکی تھی۔ آنکھیں بند ہوتے ہوئے اس نے دیکھا کہ معاذ سمیت سب کا برا حال تھا۔ کچھ آنکھیں بند کر کے لڑھک چکے تھے اور کچھ بے ہوشی کے قریب تھے۔

بے ہوشی کا یہ عرصہ کتنا طویل تھا، ہوش میں آنے کے بعد وہ اندازہ نہیں لگا سکی۔ بس یہ تھا کہ اب وہ اس بنگلے میں نہیں تھی جہاں بے ہوشی کا یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ ایک بالکل اندھیری جگہ پر موجود تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے کسی اسٹریچر نما شے پر لیٹی ہوئی ہے۔ اس کے جسم کو اس اسٹریچر پر جمائے رکھنے کے لیے بیلٹ وغیرہ سے باندھا گیا تھا اور وہ بالکل بھی اندازہ نہیں لگا پا رہی تھی کہ معاذ اور اس کے دوسرے ساتھی بھی اس کے ساتھ اس جگہ پر موجود ہیں یا نہیں۔

''معاذ......!'' اس نے کچھ بے چینی کے ساتھ پکارا۔ پکارتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کی زبان اور حلق بالکل خشک ہو رہے ہیں۔

''میں یہاں قریب ہی ہوں سونیا! تمہیں کب ہوش آیا؟'' اندھیری قبر میں معاذ کی آواز سنائی دی تو جیسے آس کا کوئی جگنو روشن ہو گیا۔

''میں ابھی ہوش میں آئی ہوں لیکن کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا کہ ہم کہاں ہیں؟''

''میرے خیال میں ہم کسی سواری میں موجود ہیں اور کافی دیر سے موجود ہیں۔'' معاذ نے جواب دیا تو اسے بھی احساس ہوا کہ وہ کسی حرکت کرتی ہوئی شے میں موجود ہیں۔

منہ اور زبان کی خشکی کے ساتھ ساتھ اکڑا ہوا جسم بھی اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہ وہ واقعی بہت دیر سے اس حالت میں موجود ہے۔ پیٹ بھی بالکل خالی محسوس ہو رہا تھا لیکن زیادہ ناتوانی کا احساس نہیں تھا۔

''کیا ہمارے باقی ساتھی بھی ہمارے ساتھ موجود ہیں؟''

''شاید ہوں۔ ہماری طرح انہیں بھی ہوش آئے تو پتا چلے گا۔ ان خبیثوں نے تو اتنا شدید اندھیرا کر رکھا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔'' معاذ کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔

''میں ہوش میں آ گیا ہوں بھائی جان اور چپکے چپکے آپ کی باتیں سن رہا ہوں۔'' اندھیرے میں وکی کی آواز بھی گونجی۔

''چپکے چپکے سن لے بھائی مگر یہ میرے سر پر سوار ہو کر کیوں سن رہا ہے؟'' وکی کی آواز معاذ کی نسبت اوپر سے آئی تھی اس لیے اس نے فقرہ کسا۔

''سب دشمنوں کی مہربانی ہے جناب! ان کا جس کو جہاں جی چاہا ہے، فٹ کر دیا ہے۔'' وقاص نے حقیقت گوش گزار کی۔ آپس میں ہونے والی اس گفتگو سے ان پر واضح ہو گیا تھا کہ جگہ کی تنگی کے باعث اوپر نیچے برتھوں کی طرح کا کوئی سیٹ اپ ہے جس میں انہیں ایڈجسٹ کیا گیا ہے۔ اس سیٹ اپ کی وجہ سے امید کی جا سکتی تھی کہ باقی ساتھی بھی ان کے ساتھ ہی اس سواری میں موجود ہیں۔ وہ تینوں باقیوں کی نسبت زیادہ مضبوط قوی کے مالک ہونے کی وجہ سے ذرا جلدی ہوش میں آ گئے تھے۔

''دشمن ہی سہی، پر حفظ مراتب کا خیال تو رکھنا چاہیے تھا۔ یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ رشتے اور عمر دونوں میں چھوٹے بندے کو اوپر جگہ دے دی اور ہمیں اس کے نیچے لگا دیا۔'' معاذ نے یوں اعتراض کیا جیسے اس صورتِ حال پر سخت بدمزہ ہوا ہو لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اس طرح کی ہلکی پھلکی گفتگو کر کے وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کا دھیان بٹانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اس متحرک اندھی قبر میں نامعلوم سمت میں جاری سفر اعصاب کو متاثر نہ کرے۔

''کیا پتا انہوں نے سوچا ہو کہ یہ جو سرکس کا جوکر ہے، اسے اونچی چھلانگیں لگانے اور اوپر کی رسی پر چلنے کی عادت ہے تو اسے اوپر ہی رکھ دیتے ہیں ورنہ نیچے بے چین رہے گا۔'' وکی فضول گوئی میں اس کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا۔

''یہ وجہ ہے تو ان لوگوں کو معاف کیے دیتا ہوں۔ ویسے بھی مجبوری ہے کہ یہ جوکر اب میری بہن کا شوہر بن چکا ہے۔'' معاذ نے شوخ لہجہ میں اسے جواب دیا۔ اسی وقت انہوں نے محسوس کیا کہ ہموار راستے پر دوڑتی گاڑی کسی ناہموار راستے پر آ گئی ہے۔ پرسکون چلتی گاڑی کو ہچکولے سے لگنا شروع ہو گئے تھے۔ ابتدا میں یہ ہچکولے معمولی تھے لیکن رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان مستقل ہچکولوں ہی کا اثر تھا کہ جو اب تک بے ہوش تھے، آہستہ آہستہ جاگنا شروع ہو گئے تھے اور اپنے اپنے انداز میں اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے تھے۔

''ہم کہاں ہیں اور یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟'' سوئے ہوئے میں سے سب سے پہلے جارو نے حیرت کے اس اظہار کے ساتھ اپنے جاگنے کا اعلان کیا۔

''اس وقت تم سے پرانی پاکستانی فلموں کی اس ہیروئین کی فیلنگ آ رہی ہے جو ایک تو پہلے موقع محل دیکھے بغیر بے ہوش ہو جاتی ہے اور جب ہوش میں لایا جائے تو آنکھیں پٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ایسی پریشانی سے، میں کون ہوں اور کہاں ہوں، جیسے سوال کرتی ہے۔ جیسے زمین پر بے ہوش ہونے کے بعد سیدھے مریخ پر آنکھ کھلی ہو۔'' ہچکولے اتنے شدید ہو چکے تھے کہ بات کرنے میں بھی دشواری ہو رہی تھی پھر بھی معاذ نے اسے پورا لیکچر دے ڈالا۔ ویسے اچھی بات یہ تھی کہ وہ بیلٹوں کی مدد سے اپنی اپنی جگہ بندھے ہوئے تھے ورنہ ان شدید جھٹکوں میں ادھر ادھر لڑھک کر زخمی ہو سکتے تھے۔

''اعظم! میرا اعظم کہاں ہے؟'' ابھی وہ خاموش ہی ہوا تھا کہ اندھیرے میں سجل کی وحشت اور کرب میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

''یہیں ہوگا سجل! سب کو علیحدہ علیحدہ جگہوں پر باندھا گیا ہے۔ اعظم بھی تمہارے آس پاس ہی کہیں ہوگا۔ بچہ ہے نا۔ ہو سکتا ہے ہوش میں آنے میں اسے بڑوں سے زیادہ وقت لگے۔'' عالم شاہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز کی کپکپاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ خود اندیشوں کا شکار ہے۔

''وہ نہیں ہے ادا سائیں! وہ ہوتا تو مجھے اس کے ہونے کا احساس ہو جاتا۔ اس کی خوشبو آ جاتی مجھے۔'' عالم شاہ کی تسلی کے باوجود اس کی وحشت میں کمی نہیں آئی تھی اور یہ وحشت ہی تھی جس نے اس جیسی لڑکی کا خود پر سے کنٹرول ختم کر دیا اور وہ دیوانہ وار اعظم اعظم کرتی بیٹے کو پکارنے لگی۔ اس کے لہجے کی تڑپ اور وحشت نے معاذ کے اندر خلش کی ایسی لہر دوڑائی کہ اس نے خود کو بیلٹوں کی جکڑ سے نکالنے کے لیے جسم کا سارا زور لگا دیا۔ یکدم ہی گاڑی میں بھونچال سا

آ گیا۔ سب کے حلق سے بے ساختہ چیخیں بلند ہوئیں اور اس ادراک نے کہ گاڑی ڈرائیور کے کنٹرول سے نکل کر ڈھلوان سطح پر لڑھکتی جا رہی ہے، اوسان خطا کر دیے۔

☆☆☆

''جانا ضروری ہے کیا؟'' وہ آنکھوں میں ڈھیروں خوف لیے یوں جانے والے سے پوچھ رہی تھی جیسے اسے روک لینا چاہتی ہو لیکن یہ بات کہنے کی ہمت نہ ہو۔

''ضروری نہ ہوتا تو میں اپنی بٹیا کو زبان پر یہ سوال لانے کی زحمت ہی نہیں دیتا۔'' وہ اس سے نرمی سے مخاطب تھا لیکن آج بتا پیے ہی سرخ انگارہ ہو جانے والی آنکھوں میں غم و غصے کا جو آتش فشاں دہک رہا تھا، اس کی تپش آس پاس کھڑے نفوس محسوس کر سکتے تھے۔

''میں آپ کے بغیر میں خود کو غیر محفوظ محسوس کروں گی۔'' وہ عالم اضطراب میں اپنی دونوں ہتھیلیاں آپس میں مسل رہی تھی۔

''میں تم لوگوں کی حفاظت کا پورا انتظام کر کے جا رہا ہوں۔ اول تو یہاں تک کسی کی رسائی کا امکان نہیں لیکن اگر کوئی آ بھی گیا تو میرے آدمی استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔ میرے وکی کی امانت ہو تم۔ تمہاری جان میرے لیے اپنی جان سے زیادہ قیمتی ہے۔'' گمبھیر لہجے میں سچائی تھی۔

''لیکن......''

''کوئی لیکن ویکن نہیں۔ بس اب جانے دو نا بیٹی۔ چھوٹی بچی تو نہیں ہو جو اس طرح ضد کر رہی ہو۔'' پہلو میں کھڑے خاور صاحب نے اسے ''لیکن'' سے آگے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور ذرا سخت لہجے میں ٹوکا۔

''نہ نہ خاور صاحب! یوں ڈانٹیں مت میری بٹیا کو۔ مجھے اس کے چہرے کی اداسی اچھی نہیں لگتی۔'' علینہ نے باپ کے ڈانٹنے پر منہ بسورا تو فوراً اس کی حمایت کی گئی۔

''اداسی اچھی نہیں لگتی پھر بھی مجھے اداس کر کے جا رہے ہیں۔'' اس نے جھٹ جملہ پکڑا اور بچوں کی طرح منہ بسور کر بولی۔

''اداس تو میں خود بھی ہوں بٹیا! ہمیشہ سے ایک خواب تھا دل میں کہ ایک دن سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی ایک الگ تھلگ پرسکون دنیا بساؤں گا لیکن ہم جیسوں کے نصیب میں شاید جیتے جی سکون آنا ممکن ہی نہیں ہے۔ میں مجبور ہو گیا ہوں اس دنیا کی طرف لوٹنے پر جسے اپنی مرضی سے چھوڑ آیا تھا۔'' آنکھوں کی سرخی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا اور تصور میں گلو کی سوختہ لاش کی تصویر لہرائی۔ اسے جس [illegible]

طرح تشدد کر کے ہلاک کیا گیا تھا، وہ نا قابلِ برداشت تھا۔ ایک ایسا وفادار جو اس کے پسینے پر اپنا خون بہانے کے لیے تیار رہتا تھا، اس بات کا حقدار تھا کہ اس کے قاتلوں سے اس کے خون کا حساب لیا جائے اور یہ حساب لینے کے لیے اس کا خود میدان میں اترنا ضروری تھا۔

''آپ بے فکر ہو کر جائیے لالہ! اسے میں خود سنبھال لوں گا۔ میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔ آپ کی مجبوریوں کو سمجھ لے گی۔'' خاور صاحب نے ایک بار پھر دخل اندازی کی ضرورت محسوس کی۔

''ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ جائیے۔ میں اب آپ کو نہیں روکوں گی لیکن جانے سے پہلے وعدہ کر کے جائیں کہ پابندی سے رابطہ کرتے رہیں گے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ آپ بھی وکی کی طرح ہمیں بھول جائیں۔'' جانے کی اجازت دیتے ہوئے فرمائش کے ساتھ ساتھ شکوہ بھی ہوا۔

''بھولا تو وہ بھی نہیں ہو گا۔ بس کسی ایسی مصروفیت میں پھنس گیا ہو گا کہ اس کے پاس تم سے رابطے کی گنجائش نہیں ہو گی۔'' وکی کی صفائی پیش کرتے ہوئے وہ خود اندر ہی اندر تشویش میں مبتلا تھا۔ وکی کی بھارت روانگی کے بعد سے اس کے متعلق کوئی خبر نہیں ملی تھی۔

''اسے صحیح سلامت مجھ تک لانا آپ کی ذمے داری ہو گی۔ میں اپنوں کی جدائی سہہ سہہ کر تھک گئی ہوں۔ اللہ سے کہیے گا اب وہ میرا امتحان نہ لے۔'' علینہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''کاہے کو فکر کرتی ہو بٹیا! وکی ضرور آئے گا اور اپنے ساتھ معاذ کو بھی لے کر آئے گا۔'' لالہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر یقین دہانی کروائی۔

''لالہ نے کہہ دیا ہے تو اعتبار کر لو بیٹی! تم جانتی ہو کہ انہوں نے بڑے سے بڑا نقصان اٹھا کر بھی اپنا وعدہ نبھایا ہے۔ آج اگر ہم زندہ سلامت یہاں بیٹھے ہیں تو اس کے پیچھے لالہ کی ہی مہربانی ہے۔'' خاور صاحب نے بیٹی کو سمجھانے کا فریضہ انجام دیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ابو! انہوں نے مجھے صرف بیٹی کہا نہیں بلکہ دل سے اس رشتے کو نبھایا ہے اور اس کے لیے میں ان کا جتنا شکریہ ادا کروں، وہ کم ہے۔'' علینہ نے اعتراف کیا اور شکر گزار نظروں سے لالہ کی طرف دیکھا۔

''شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹیوں کا باپ پر حق ہوتا ہے اور باپ تو اسی میں خوش رہتا ہے کہ اس کی بیٹی کے لبوں پر مسکراہٹ ہو۔'' لالہ کے الفاظ نے علینہ کو

ازحد متاثر کیا اور نم آنکھوں کے ساتھ چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔

''آپ کی بیٹی اس امید پر ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر آپ کو رخصت کر رہی ہے کہ جب آپ واپس آئیں گے تو آپ کے سنگ اس کی خوشیوں کا خزانہ موجود ہو گا۔''

''ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔'' لالہ نے بھی دل سے وعدہ کیا اور خاور صاحب سے الوداعی معانقہ کر کے سفر کے لیے قدم آگے بڑھائے۔ کچھ فاصلے پر وہ وفادار و خدمت گار سامان شانوں پر لادے پتھر لیے راستے پر منتظر کھڑے تھے جنہوں نے اس کے ساتھ سفر پر جانا تھا۔ سفر جو مشکل اور دشوار گزار تھا اور جس کے اختتام پر بھی کئی ہنگامے اس کے منتظر تھے۔

☆☆☆

معاذ کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو نرم گرم بستر پر پایا۔ ساتھ ہی یہ بھی احساس ہوا کہ اس کے اوپر ایک بھاری کمبل پھیلا ہوا ہے۔ کمبل اس کے جسم کو خوشگوار حرارت دے رہا تھا اور اس کی موجودگی بجلی کے جھٹکے کی طرح سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ اس گرم بستر میں کیوں موجود ہے؟ اس قسم کے بستر میں موجود ہونے اور خوشگواریت محسوس کرنے کا مطلب تھا کہ وہ کسی سرد مقام پر موجود ہے۔ معتدل موسم سے نکل کر اس سرد ماحول میں پہنچ جانے کے احساس نے اس کے ذہن میں بھونچال سا پیدا کر دیا تھا۔ اس ذہنی بھونچال نے یکدم ہی اسے وہ بھونچال یاد دلایا جس سے وہ بے ہوش ہونے سے قبل گزرا تھا۔

اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ سب ایک ایسی گاڑی میں سفر کر رہے تھے جو کسی تابوت کی طرح بند اور تاریک تھی۔ اس گاڑی میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو برتھ نما بستروں پر بیلٹوں سے جکڑ کر رکھا گیا تھا اور گاڑی کو حادثہ پیش آنے سے قبل وہ سب اپنی جگہ لیٹے لیٹے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس گفتگو کے دوران ہی گاڑی کو جھٹکے لگنے لگے تھے اور ان جھٹکوں سے کنول کو بھی ہوش آ گیا تھا۔ ہوش میں آتے ہی اس نے اعظم کو پکارا تھا اور اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ اعظم گاڑی میں موجود نہیں ہے۔ اس کے اعظم کے لیے واویلے کے دوران ہی گاڑی لڑھک گئی تھی اور کسی کو کسی کی کیا، اپنی ہی خبر نہیں رہی تھی۔

''کنول!'' حادثے کا خیال آیا تو اس نے تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا کہ [illegible]

کامیاب نہ ہوسکا لیکن اٹھنے کی کوشش میں پہلو سے اٹھنے والی دردکی ٹیس نے احساس دلایا کہ وہ زخمی ہے۔
''او خدا، یہ سب کیا ہے؟'' وہ دھیرے سے بڑبڑایا پھر خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ جگہ نیم تاریک سی تھی اور جو تھوڑی بہت روشنی موجود تھی، اسے اس کا منبع دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ روشنی کی کمی کے باوجود وہ یہ جاننے میں کامیاب ہوگیا کہ وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مزید فرشی بستر بھی موجود ہیں اور وہ جس جگہ موجود ہیں، وہ کوئی باقاعدہ کمرا نہیں ہے۔ کوئی مختلف سی جگہ تھی۔ عام رہائشی عمارتوں سے بالکل الگ۔
وہ نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس جگہ کا جائزہ لیتا رہا اور بڑی دیر بعد اس کو یہ ادراک ہوا کہ وہ جگہ ایک غار ہے۔ ایک ایسا غار جس کی تراش خراش میں انسانی ہاتھوں کا بھی کچھ نہ کچھ کمال شامل ہے۔ وہ گمان کرسکتا تھا کہ وہاں موجود دیگر بستروں پر اس کے اپنے ساتھی محوِ آرام ہیں۔ ایک چلتی ہوئی گاڑی کے شدید حادثے کے بعد اگر وہ کسی مقام پر آرام دہ بستروں پر موجود تھے تو یہ لازمی بات تھی کہ انہیں یہاں تک پہنچانے میں انسانوں کا ہاتھ تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ انسان ان کے دوست تھے یا دشمن۔ جس طرح انہیں آرام دہ بستروں پر لٹایا گیا تھا، اس سے تو ان کے دوست ہونے کا ہی گمان ہوتا تھا لیکن باندھ کر بے بس کرنا دشمنوں کی ادا تھی۔
'ہوسکتا ہے انہیں ہماری طرف سے خدشات ہوں اور ہمیں باندھنا محض ایک احتیاطی تدبیر ہو۔' سوچتے سوچتے اسے یوں باندھے جانے کی ایک معقول وجہ سمجھ آ گئی۔ ساتھ ہی کچھ دھندلے دھندلے مناظر بھی یاد آنے لگے۔ سب سے پہلا منظر حادثے کا ہی تھا۔ گاڑی لڑھکی تھی تو سب ہی فطری طور پر خوف سے چیخنے چلّانے لگے تھے۔ اس یاد کے بعد دوسری یاد درد کی شدید لہروں، آہوں اور سسکیوں کی تھی پھر کچھ اور دھندلی یادداشتیں تھیں۔ جسم کو ہچکولے سے لگ رہے تھے۔ گھوڑے یا خچر جیسی کسی سواری پر لدے ہونے کا احساس تھا۔ کبھی کبھی کسی کے منہ میں رقیق غذا ڈالنے کا خیال آتا تو کبھی زبان پر ان کڑوی کسیلی دواؤں کا ذائقہ تازہ ہوجاتا تھا جو حلق تک کو کڑوا کردیتی تھیں۔ ان سب کے بیچ جسم کے مختلف حصوں میں درد کا احساس اپنی جگہ تھا لیکن کچھ بھی بہت واضح نہیں تھا۔ جو کچھ یاد آرہا تھا، وہ ٹکڑوں میں تھا اور ایک دھندلکے میں لپٹا ہوا تھا اور اس سے وہ یہی [illegible] کم کرنے [illegible]

کسی اور مقصد کے تحت اسے اور یقیناً باقی ساتھیوں کو بھی باقاعدگی سے نیند آور دواؤں کا استعمال کروایا جاتا رہا تھا۔ ان دواؤں کے زیر اثر وہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے تھے اور ذہن میں ابھرنے والے سوالات کے جواب حاصل کرنے کے لیے اب ان لوگوں سے ملاقات کے محتاج تھے، جو انہیں یہاں لائے تھے۔
'جانے اب بھی مجھے ہوش میں رکھا جائے گا یا نہیں؟ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ایک بار پھر کوئی مسکن دوا دے کر نیند کی آغوش میں بھیج دیا جائے۔' وہ دیکھ رہا تھا کہ بھاری کمبلوں کے نیچے سوئے ہوئے نفوس میں سے کوئی ایک بھی جنبش نہیں کررہا، اس لیے اس کے دماغ میں اندیشہ ابھرا۔
'مجھے فی الحال خاموشی سے لیٹے رہنا چاہیے اور سن گن لینے کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ سب کیا ہے؟' ذہن میں ابھرنے والے اندیشے نے اسے اس خواہش کو دبانے پر مجبور کردیا کہ وہ آواز دے کر کسی کو وہاں بلائے اور اس سے صورت حال کے متعلق استفسار کرے۔ خاموش لیٹے لیٹے البتہ وہ اپنی بندشوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا تھا۔ چمڑے کے وہ بندھن بہت مضبوط تھے اور محض جسمانی طاقت کے بل بوتے پر انہیں توڑ دینا ممکن نہیں تھا۔
یونہی لیٹے لیٹے خاصا وقت گزر گیا۔ اس کے لیے یہ بات حیرت کا باعث تھی کہ اتنی دیر میں کسی اور ساتھی کو ہوش نہیں آیا تھا۔ جو جیسا لیٹا تھا، ابھی تک ویسا ہی ساکت لیٹا ہوا تھا۔ وہ جس زاویے سے لیٹا تھا اس کے سامنے محض تین بستر ہی تھے اور وہ پوری طرح اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ ان بستروں پر اس کے کون سے تین ساتھی موجود ہیں۔ کبھی آنکھیں کھولتے اور کبھی بند کرتے مزید کچھ وقت آگے سرکا تو اس کے کانوں میں قدموں کی مدھم چاپیں گونجیں۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ کم از کم تین افراد تھے جو اسی طرف آرہے تھے۔ اس نے آنکھیں موند کر خود کو ساکت کرلیا۔ آنے والے قریب آتے چلے گئے اور آخرکار قدموں کی آوازیں اس کے قریب آکر ٹھہر گئیں۔ آنے والوں میں سے ایک تیز تیز کچھ بولا۔ معاذ اس کے الفاظ کا مفہوم نہیں سمجھ پایا لیکن اتنا اندازہ ہوگیا کہ وہ چینی زبان میں بات کررہا ہے۔ اس نے اپنی پوری توجہ ہونے والی گفتگو کی طرف مرکوز کرلی۔ اپنی متلون مزاجی کے ہاتھوں مجبور اس نے ایک بار چھٹیوں میں چینی زبان سیکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے کورس میٹس میں سب سے اچھا طالب علم ثابت ہوا تھا [illegible]

کرے تو جلد اس مشکل زبان کو روانی سے بولنے کے لائق ہوجائے گا لیکن عادت کے مطابق وہ بہت دیر تک اس کورس میں ٹک نہیں پایا تھا اور کسی اور مشغلے کی طرف متوجہ ہوگیا تھا اس لیے اسے چینی زبان کی معمولی سی شد بد تو تھی لیکن اچھی طرح بولنے یا سمجھنے پر قادر نہیں تھا۔
''میں چیک کرتا ہوں۔'' پوری توجہ سے سننے پر اسے دوسرے آدمی کی زبان سے ادا ہونے والے جملے کا جو مفہوم سمجھ آیا، وہ کچھ یہی تھا۔ کلائی کی نبض پر کسی کی انگلیاں آکر ٹھہریں تو تصدیق بھی ہوگئی۔ نبض دیکھنے والا ایک بار پھر تیزی میں کچھ ایسا کہہ گیا جس کا مطلب اسے سمجھ نہیں آیا اور فوراً ہی کوئی اس کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے اردو میں پکارا۔
''اٹھو، مسٹر اٹھ جاؤ۔'' اس پکار پر اس نے اداکاری ختم کی اور آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے عین سامنے دو افراد کھڑے ہوئے تھے جبکہ تیسرا جس نے اپنے ہاتھوں میں کسی قسم کی روشنی اٹھا رکھی تھی، اس کے سر کے پیچھے اس زاویے سے کھڑا تھا کہ وہ اس کی موجودگی کو محسوس تو کرسکتا تھا لیکن دیکھنے سے قاصر تھا۔
''تمہارا نام کیا ہے؟'' اسے آنکھیں کھول کر اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر سامنے کھڑے دونوں افراد میں سے ایک نے پوچھا تھا۔ اگرچہ وہ خاصی روانی سے اردو بول رہا تھا لیکن اس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ اہلِ زبان نہیں ہے۔ ہاں، اس کا اور اس کے ساتھی کا ناک نقشہ اور قد کاٹھ ان کے چینی ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔
''تم لوگ کون ہو؟'' اس نے خود سے کیا جانے والا سوال نظرانداز کرکے ان کی بابت دریافت کیا۔ اس کے یوں سوال کرنے پر اس سے مخاطب شخص کی آنکھوں میں ایک سرد سا تاثر ابھرا اور تاثر جیسے ہی سرد مہر لہجے میں بولا۔
''تم سے جتنا پوچھا جائے کیول اتنا ہی جواب دو۔ سوال کرنے کا ادھیکار نہیں ہے تمہارے پاس۔'' اس بار معاذ پر واضح ہوگیا کہ وہ اردو نہیں بلکہ ہندی بول رہا ہے۔
''ہاں، تو اب بتاؤ تم کون ہو؟'' اس نے ذرا مختلف الفاظ میں اپنا سوال دہرایا۔
''مسافر، جو ایک حادثے کا شکار ہوکر جانے کیسے آپ لوگوں تک آ پہنچا ہے۔'' معاذ کو اندازہ تو تھا کہ اگر ایک بھیانک حادثے کا شکار ہونے کے بعد وہ اور اس کے ساتھی زندہ تھے تو اس میں ان لوگوں ہی کی مہربانی تھی لیکن اتنی بڑی مہربانی کے بعد ان کا انداز دوستانہ نہیں تھا۔ انہوں نے اسے اور یقیناً دوسروں کو بھی باندھ کر رکھا ہوا تھا اور اب اس

سے معاندانہ لہجے میں باز پرس کررہے تھے اس لیے وہ مکمل کر کسی سوال کا جواب دینے میں متذبذب تھا۔
''اسے باہر لاؤ۔'' اس کے سامنے کھڑے افراد میں سے دوسرے نے چینی زبان میں اپنے ساتھی سے کہا۔ معاذ اس بار اس کی بات سمجھنے میں کامیاب رہا لیکن اپنے تاثرات سے ظاہر نہیں کیا۔
''سیدھی طرح میرے سوالات کا جواب نہ دے کر تم نے خود کو کٹھنائی میں ڈال لیا ہے۔'' ہندی جاننے والے چینی نے اس سے تخت لہجے میں کہا اور جھک کر اس کی بندشیں کھولنے لگا۔ وہ نسبتاً لمبے قد اور بھاری جثے کا مالک تھا اور بھکشوؤں کی طرح نارنجی لباس پہنے ہوئے تھا جبکہ اس کے ساتھ کھڑا شخص کوتاہ قد اور دبلا پتلا تھا۔ اس نے پینٹ شرٹ پر چرمی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ جیسے ہی اس کے ساتھی نے معاذ کی بندشیں کھولنا شروع کیں، اس نے اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ سر کے عقب میں کھڑا شخص مسلسل خاموش اور بے حرکت تھا۔ بندشیں کھولنے والے نے ہاتھوں کے سوا اس کی ساری بندشیں کھول دیں۔
''اٹھو۔'' حکم دینے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنا ہاتھ بھی سہارا دینے کے لیے بڑھایا۔ معاذ کو جب سے ہوش آیا تھا، اپنی ٹانگوں کو محدود سی ہی سہی، حرکت دیتا رہا تھا۔ اس کے باوجود جب بستر سے اتر کر کھڑا ہونے کی کوشش کی تو ٹانگیں کپکپا سی گئیں۔ اگر اس شخص نے اسے سہارا نہ دے رکھا ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ سیدھا کھڑا ہی نہ رہ پاتا۔ ٹانگوں کی یہ حالت گواہ تھی کہ انہیں کئی دنوں سے استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ کھڑے ہونے پر اسے تیسرا شخص بھی دکھائی دے گیا۔ وہ بھی چینی تھا اور اس نے بھی بھکشوؤں والا نارنجی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے گلے میں مالائیں بھی موجود تھیں اور چھوٹے قد کے ساتھ بھاری بدن کے باعث قدرے مضحکہ خیز دکھائی دے رہا تھا۔ روشنی کے لیے اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک جلتی ہوئی مشعل تھام رکھی تھی۔
''آگے بڑھو۔'' معاذ کو حکم دیا گیا تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے لگا۔ کسی نے اس کی سست روی پر اعتراض نہیں کیا۔ یقیناً وہ جانتے تھے کہ اس وقت چلنا اس کے لیے ایک کارِ دشوار ہے۔
''اسٹیمنا دیکھو اس کا۔'' ہندی بولنے والا چینی، چینی زبان میں پینٹ شرٹ والے چینی سے مخاطب ہوا اور اس جملے سے آگے بھی چند جملے کہے جو معاذ کو سمجھ نہیں آئے البتہ اندازہ ضرور ہوا کہ وہ اسی کے متعلق گفتگو کررہا ہے۔ اس کا

دھیان اس گفتگو سے زیادہ آس پاس کا جائزہ لینے میں لگا ہوا تھا۔ کھڑے ہونے پر اسے غار میں ایک چوتھا بستر بھی دکھائی دے گیا تھا لیکن اسے یوں لگا تھا کہ وہ بستر خالی ہے۔ آگے بڑھتے ہوئے اس اندازے کی بھی تصدیق ہوگئی تھی کہ وہ اس وقت ایک غار میں موجود ہے۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے، روشنی بڑھتی گئی اور وہ غار کے دہانے پر پہنچ گئے۔ غار جتنا کشادہ تھا، اس کے مقابلے میں اس کا دہانہ خاصا تنگ تھا اور اس تنگ دہانے سے اندر آنے والی روشنی اتنی نہیں تھی کہ غار کو اندر تک مکمل روشن کر دیتی اس لیے دن کا وقت ہونے کے باوجود غار اندر سے نیم تاریک تھا اور آنے والوں کو مشعل لے کر اندر آنا پڑا تھا۔

غار کے دہانے سے باہر قدم رکھتے ہی اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ہر سو بکھری برف سے ٹکرا کر منعکس ہونے والی سورج کی تیز شعاعیں ایسے شخص کے لیے یقیناً تکلیف دہ تھیں جس نے ایک نامعلوم مدت کے بعد کھلی آنکھوں سے اس روشنی کو دیکھا تھا۔

"چنتا نہ کرو، تھوڑے سے میں تمہاری آنکھیں عادی ہو جائیں گی۔" اردو یا ہندی دان چینی نے اس کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے تسلی دی اور اس سمت بڑھنے کا اشارہ کیا جہاں لکڑی اور گھاس پھونس سے بنا ایک بڑا سا جھونپڑا نما مکان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے جسم پر جو لباس تھا وہ اگرچہ اونی کپڑے کا بنا ہوا تھا لیکن غار کے مقابلے میں کھلی فضا میں آ کر ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔ پینٹ شرٹ والے چینی نے بھی باہر نکل کر اپنی جیکٹ کی زپ بند کرلی تھی لیکن نارنجی لبادوں والے دونوں چینی بھکشوؤں کو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا اور وہ مزے سے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ مشعل والے بھکشو نے باہر نکلنے کے بعد اپنی مشعل بجھا دی تھی اور اب وہی سب سے آگے تھا۔ ان کے اس جھونپڑے نما مکان تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ لکڑی کے دروازے پر دستک دے کر اسے کھلوا چکا تھا۔ معاذ بنا کسی مزاحمت کے باقی سب کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ اندر، باہر کے مقابلے میں ٹھنڈک کم تھی لیکن غار جتنا آرام دہ ماحول نہیں تھا۔ یہاں اسے مزید دو چینی بھکشوؤں والے لباس اور حلیے میں دکھائی دیے تو اسے شک ہونے لگا کہ وہ ہندوستان کی حدود سے نکل کر چین میں داخل ہو چکا ہے۔ اس شک کی تصدیق کے لیے وہ مترجم کو مخاطب کرتا اس سے قبل ہی ایک تیز نسوانی چیخ نے توجہ کھینچ لی۔ چیخ اس پردے کے پیچھے سے آئی تھی جو اس وسیع جھونپڑے کو دو حصوں میں منقسم کر رہا تھا۔ اسے چیخ کی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر مترجم اور پینٹ شرٹ والا چینی دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر پراسرار انداز میں مسکرائے اور پھر مترجم نے وہاں موجود بھکشوؤں کی طرف دیکھ کر کچھ کہا۔ وہ دونوں پھرتی سے آگے بڑھے اور پردے کو سمیٹ دیا۔ پردے کے پیچھے کا منظر دردناک تھا۔ معاذ نے بے ساختہ ہی اپنے قدم آگے بڑھائے لیکن پینٹ شرٹ والے چینی نے پھرتی سے آگے بڑھ کر پسٹل کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی اور بارعب لہجے میں بولا۔

"اسٹاپ۔" کنپٹی پر رکھی پسٹل اس کا مطلب سمجھانے کے لیے ویسے ہی کافی تھی۔ اس بار انگریزی استعمال بھی ہوا تو بات پوری طرح عقل میں آ گئی۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" خود کو بہ مشکل قابو میں رکھتے ہوئے اس نے سوال کیا اور ایک بار پھر ستون کے ساتھ بندھی سونیا پر نظر ڈالی۔ بے ہوشی کی حالت میں اس کا سر ایک طرف جھول رہا تھا۔ خوب صورت چہرہ متورم اور نیلگوں تھا اور جگہ جگہ سے پھٹ جانے والے لباس کے باعث جسم پر پڑی سرخ لکیریں واضح دکھائی دے رہی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے ہنٹر وغیرہ کی مدد سے بری طرح پیٹا گیا ہے۔

"یہ ہمارے سوالوں کے جواب دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔" مترجم نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں کھلی دھمکی تھی یعنی وہ بتا رہا تھا کہ اگر اس نے زبان نہ کھولی تو اس کا بھی یہی انجام ہوگا۔

"تو کیا یہ سب کرنے کے بعد تمہیں اپنے جوابات مل گئے ہیں؟" معاذ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ سونیا ایک مکمل تربیت یافتہ عورت ہے اور اتنی کمزور نہیں کہ تشدد سے بچنے کے لیے اپنی مرضی کے خلاف زبان کھول دے۔

"یہ جواب نہ بھی دے تو کوئی پرابلم نہیں ہے۔ اس کے گلے میں موجود ڈیوڈ اسٹار نے ہمیں اس کی اصلیت بتا دی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سلور رنگ کے درمیان موجود چھ کونوں والا گولڈن اسٹار کس اسرائیلی تنظیم کے اعلیٰ عہدیدار کو دیا جاتا ہے۔" سونیا نے پتا نہیں کب سنہری ستارے کو اس کے باکس سے نکال کر اپنے گلے کی زنجیر میں پرو لیا تھا اور اس کی موجودگی کے باعث مشکوک ٹھہری تھی۔

"وہ اس کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ اگر ہو بھی تو آپ کو اس سے کیا مسئلہ ہے؟" اس نے بے اختیار ہی سونیا کی طرف سے صفائی پیش کی۔

"ہمیں ہر اس شے سے مسئلہ ہے جو ہمارے دشمن

کے لیے پرابلم پیدا کرے۔"

"کیسی پرابلم؟ کیا آپ نے اسے اپنے ملک میں دہشت گردی کی کوئی واردات کرتے ہوئے پکڑا ہے؟" وہ جانتا تھا کہ گاڑی کو حادثہ ہندوستان میں پیش آیا تھا اس لیے سخت لہجے میں باز پرس کی۔

"واردات کرتے نہیں پکڑا لیکن وارداتیوں کو اپنی حدود کے قریب پا کر دبوچا ضرور ہے۔"

"کیا مطلب؟ کیا اس وقت ہم چائنا میں ہیں؟" وہ اس جواب کو سن کر بری طرح چونکا اور حیرت سے پوچھا۔

"ایسا ہی ہے۔" دوسری طرف سے تصدیق کر دی گئی۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" معاذ حیرت سے بڑبڑایا۔

"یہی تو ہم جاننا چاہتے ہیں کہ یہ کیسے ہوا؟" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"میرے لیے یہ ایک حیرت انگیز بات ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اپنے ہوش و حواس میں آخری بار ہندوستان کی حدود میں تھا۔ وہاں بے ہوش ہوا تو پھر ایک چلتی گاڑی میں آنکھ کھلی اور پھر اس گاڑی کو حادثہ پیش آگیا۔ حادثے کے بعد میں ایک بار پھر بے ہوش ہوگیا اور اب یہاں آپ لوگوں کے درمیان آنکھ کھلی ہے۔" معاذ نے حقائق بیان کیے جنہیں سن کر بھکشو نے اپنی گردن کو جنبش دی اور پھر جیکٹ والے سے چینی زبان میں بات کرنے لگا۔ وہ شخص پوری توجہ سے اس کی بات سنتا رہا اور اپنے ساتھی سے بے حد روانی میں کچھ کہا۔ معاذ ان کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کے چند الفاظ اور اکا دکا ادھورے جملے ہی سمجھ سکا۔ اس کے اندازے کے مطابق بھکشو نے اپنے ساتھی کو اس سے ہونے والی گفتگو کے متعلق ہی آگاہ کیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ حادثے کی حد تک ہم تمہاری بات مان سکتے ہیں کیونکہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس حادثے کے بعد بچانے والے ہم ہی تھے۔ تم اس بڑی سی گاڑی کے کیبن نما حصے میں بنی برتھوں سے بندھے ہوئے تھے اور شاید اسی چیز نے تم لوگوں کی زندگیاں بچالیں ورنہ وہ لوگ جو گاڑی کے اگلے حصے میں سوار تھے، بری طرح زخمی ہو کر موقع پر ہی ہلاک ہوگئے تھے۔"

"میرے ساتھیوں میں سے کسی کو زیادہ نقصان تو نہیں پہنچا ہے نا؟" تفصیل سن کر معاذ نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ حادثے میں تم لوگ خوش نصیب ثابت ہوئے ہو پر تو......" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا کوئی گڑبڑ ہے؟" معاذ اس کے انداز پر ٹھٹکا۔

"تم لوگ ہمیں جس حالت میں ملے ہو، اس سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ تمہاری حیثیت قیدی کی تھی پر تو! اس سے تم نردوش ثابت نہیں ہوتے۔ گولڈن اسٹار کی موجودگی نے تمہیں بہت مشکوک کر دیا ہے۔" اس نے معاذ کی تشویش کو نظر انداز کر کے اپنی مرضی کے موضوع پر گفتگو جاری رکھی۔

"میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ وہ میری ساتھی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ ہم ایک جگہ پناہ لینے کے لیے رکے تھے۔ وہاں تلاشی کے دوران ایک الماری سے وہ گولڈن ڈیوڈ اسٹار ملا اور میری ساتھی نے اس کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر اسے اپنے گلے کی زنجیر میں ڈال لیا۔" وہ جس طرح اس ستارے کے باعث بھڑکے ہوئے نظر آ رہے تھے، مناسب یہی تھا کہ سونیا کی تنظیم سے وابستگی کو ظاہر نہ کیا جائے اس لیے آدھی ادھوری بات بتا کر گزارہ کرنے کی کوشش کی۔

"تم کس سے پناہ لینے کے لیے اور کہاں چھپے ہوئے تھے؟" اس نے بھی وقتی طور پر سنہری ستارے کی بات جانے دی اور معاذ کی گفتگو کا ایک نکتہ پکڑا۔

"یہ بہت طویل داستان ہے دوست اور یہاں کھڑے کھڑے نہیں سنائی جا سکتی۔" معاذ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم کہیں بیٹھ کر شانتی سے بات کر لیتے ہیں۔" بھکشو نے پیشکش کی۔ اس ساری گفتگو کے دوران اس کے باقی ساتھی بالکل بے نیاز رہے تھے۔ صرف پینٹ شرٹ والا متوجہ تھا لیکن اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اس گفتگو کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

"میں چاہوں گا کہ اس سے پہلے میری ساتھی کو یہاں سے ہٹا کر اسے طبی امداد دی جائے۔" معاذ نے سونیا کی طرف اشارہ کر کے مطالبہ کیا۔

"تم ہمارے سامنے شرطیں نہیں رکھ سکتے۔" بھکشو کے چہرے پر غصے کی سرخی امڈی لیکن پینٹ شرٹ والے نے اچانک گفتگو میں دخل دیا اور سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ بولا۔ اس کی بات سن کر بھکشو کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات آئے لیکن وہ خود پر قابو پا کر اپنے ساتھی بھکشوؤں سے تیز تیز لہجے میں کچھ کہنے لگا۔ ردعمل میں وہ سونیا کے قریب جا کر اس کی بندشیں کھولنے لگے۔

"تمہاری اچھا پوری کی جا رہی ہے۔ اب تمہارا بھی کام ہے کہ ہمارے ساتھ کوآپریٹ کرو۔" بھکشو نے اس پر احسان جتایا۔

''میں کوشش کروں گا کہ آپ کے ہر سوال کا جواب دے سکوں۔'' معاذ نے اسے یقین دہانی کروائی تو وہ اسے لے کر وہیں جھونپڑے میں ایک جانب بچھے فرشی قالین کی طرف بڑھ گئے۔ اسی دوران سونیا کو ستون سے کھول کر ایک بستر پر لٹا دیا گیا تھا۔ وہ ابھی بے ہوشی کی حالت میں ہی تھی۔

ادھر وہ تینوں قالین پر بیٹھ چکے تو پینٹ شرٹ والے نے جگشو سے کچھ کہا جسے سن کر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر معاذ کی طرف متوجہ ہوا۔

''سب سے پہلے اپنا نام بتاؤ۔'' اس نے مطالبہ کیا۔

''معاذ احمد!'' اس بار معاذ نے مزاحمت نہیں کی اور اپنا اصل نام بتا دیا۔

''تم کہاں سے ہو؟ مطلب کس دیش سے؟'' اس بار جگشو کے سوال سے پہلے پینٹ شرٹ والا چینی بولا تھا۔ یعنی اب وہ خود سوالات کر رہا تھا اور جگشو کی حیثیت صرف مترجم کی تھی۔

''پاکستان سے۔'' معاذ نے قدرے تذبذب سے ہی سہی لیکن اس بار بھی سچ ہی بولا۔ اس نے دیکھا کہ پاکستان کے حوالے پر وہ دونوں ہی کچھ چونکے تھے۔

''پاکستان سے اپنے انڈیا پہنچنے اور وہاں سے آگے کی پوری تفصیل بتاؤ۔'' نہایت سنجیدگی سے سوال ہوا۔

''میری داستان بہت عجیب ہے۔ پتا نہیں آپ اس پر اعتبار کریں بھی یا نہیں۔'' معاذ جھجکا۔

''وہ ہم پر چھوڑ دو۔ وشواس کرنا نہ کرنا ہمارا کام ہے۔'' جگشو نے اسے ٹوکا۔

''میں پاکستان کے شہر کراچی کی ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتا ہوں۔ پڑھنے لکھنے میں اچھا تھا لیکن شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر آئے دن نئے نئے فنون بھی سیکھتا رہتا تھا۔ میری اس عادت سے گھر والے خوش نہیں تھے کیونکہ انہیں لگتا تھا کہ اسی عادت کی وجہ سے میں اپنی تعلیم کو پوری طرح فوکس نہیں کر رہا ہوں۔ بہرحال وہ ایک الگ قصہ ہے لیکن آپ کو بتانے کی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ میری شخصیت کے اسی رخ نے کچھ خاص لوگوں کو میری طرف متوجہ کر دیا۔'' اس نے کافی حد تک انہیں سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا اس لیے روانی سے بولتا جا رہا تھا۔ جگشو اس کی بات ترجمہ کر کے اپنے ساتھی تک پہنچا رہا تھا۔

''وہ لوگ جرائم پیشہ بلکہ ملک دشمن تھے اور چاہتے تھے کہ میری صلاحیتوں کو دہشت گردی کی کارروائیوں میں استعمال کریں۔ مجھے اپنا قیدی بنانے کے ساتھ ساتھ میرے بھائی کو یرغمال بنا کر انہوں نے مجھے بالکل بے دست و پا کر دیا تھا۔ وطن اور انسانیت دونوں سے دشمنی میرے خمیر میں نہیں ہے لیکن بھائی اور دیگر گھر والوں کی خاطر میں نے ظاہری طور پر ان لوگوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ تربیت کے بعد مختلف ٹاسکس دیے جانے لگے۔ میں ظاہری طور پر سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق کرتا لیکن چپکے سے کچھ ایسا بھی کر جاتا جس سے ان کا سارا پلان فیل ہو جاتا۔ پاکستان میں میری مسلسل ناکامیوں کے بعد ان لوگوں نے مجھے انڈیا بھجوا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ انڈیا سے روایتی دشمنی کی وجہ سے میں یہاں ان کے مطلب کی کارروائیاں خوشی خوشی کرنے لگ جاؤں گا۔ یہ لڑکی بھی میرے ساتھ میری گائیڈ اور ہیلپر کے طور پر بھیجی گئی تھی۔'' اس نے دوسرے حصے میں موجود سونیا کی طرف اشارہ کیا اور خشک ہو جانے والے حلق کے باعث خاموشی اختیار کر لی۔ جب سے ہوش میں آیا تھا، ہلکی ہلکی پیاس محسوس ہو رہی تھی اور اب مسلسل بولنے سے پیاس نے شدت اختیار کر لی تھی۔

''چپ کیوں ہو گئے؟ بولتے رہو۔'' جگشو نے اسے ٹوکا۔

''میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ میں پانی پینا چاہتا ہوں۔'' اس نے زبان سے مطالبہ کرنے کے ساتھ ساتھ اشارہ کر کے بھی بتایا تاکہ پینٹ شرٹ والا بھی اس کی بات سمجھ جائے۔ جگشو کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ انکار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن پینٹ شرٹ والا بات سمجھ کر درمیان میں بول پڑا۔ اس کی سفارش پر معاذ کو ایک چھوٹے سے پیالے میں پانی پلا یا گیا۔

''ابھی اس سے تمہارے لیے زیادہ پانی پینا ٹھیک نہیں رہے گا۔'' جگشو نے پانی کی قلیل مقدار کے بارے میں وضاحت بھی دے دی تو معاذ نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی۔ ساتھ ہی اسے اپنے اس اندازے پر بھی گہرا یقین ہونے لگا کہ وہ دو دن کے وقفے کے بعد مکمل ہوش میں آیا ہے۔

''میں انسانیت پر یقین رکھنے والا انسان ہوں اور بغیر کسی ٹھوس وجہ کے محض ملک اور مذہب کی بنیاد پر کسی بے قصور کو نشانہ بنانے پر یقین نہیں رکھتا۔ اسی لیے انڈیا میں بھی میں ان کے حسب منشا کام نہیں کر سکا۔ مجھے ایک شک یہ بھی تھا کہ میرے ہاتھوں انڈیا میں دہشت گردی کروا کر وہ پاکستان کو بدنام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بعد میں میرا اندازہ درست ثابت ہوا اور ایک بار موقع ملنے پر میں ان کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ بھی مجھ سے متاثر ہو کر میرے ساتھ آملی اور یوں ہم دونوں ہی ان کے عتاب

آ گئے۔'' اس نے سونیا کے متعلق سارے حقائق کو حذف کر کے گفتگو کو اپنی ذات تک محدود رکھا۔

''اور باقی سارے لوگ؟ وہ کون ہیں؟''

''ہمارے ساتھیوں میں جو ایک بھاری تن و توش کا آدمی ہے، اس کے سوا سب پاکستانی اور میرے دوست ہیں۔ وہ بے چارے ایک فیملی ٹرپ پر انڈیا آئے تھے اور یہاں آ کر مشکل میں پھنس گئے۔'' اس نے عالم شاہ وغیرہ کی داستان بھی اختصار کے ساتھ بیان کر دی۔

''میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اپنے دوستوں کو مشکل میں چھوڑ کر اپنے بچاؤ کی فکر کرتا۔ انہیں بچاتے بچاتے ایک بار پھر مشکل میں پھنس گیا اور قسمت کے ہاتھوں ہم سب خود ہی دشمن کے نرغے میں پہنچ گئے۔ دشمن ہمیں نہ جانے کس عقوبت خانے میں پہنچانا چاہ رہا تھا کہ وہ حادثہ پیش آ گیا اور ہم سب آپ لوگوں کے درمیان پہنچ گئے۔'' اس نے جھوٹ سے گریز کیا تھا لیکن بہت سی باتیں حذف بھی کر گیا تھا۔

اس کے خاموش ہونے پر جگشو کی زبانی سب کچھ سنتے چینی نے جگشو کو کچھ ہدایات دیں اور خود پنسل ایک طرف رکھ کر جیب سے ڈیجیٹل نوٹ پیڈ نکالا۔ معاذ اس کی بات سمجھ چکا تھا کہ وہ اس کے گھر کا پتا وغیرہ جاننا چاہتا ہے لیکن جگشو کی طرف سے سوال ہونے تک خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اس نے اس کے پنسل کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے سے بھی گریز کیا کہ سمجھتا تھا کہ اس وقت کوئی بھی ایڈونچر محض حماقت ہے۔

''میرے باقی ساتھیوں کا کیا حال ہے؟ وہ سب ٹھیک تو ہیں؟ انہیں ابھی تک ہوش کیوں نہیں آیا ہے؟'' وہ انہیں ان کی مطلوبہ معلومات فراہم کر چکا تو ایک بار پھر اپنے ساتھیوں کی طرف سے اطمینان حاصل کرنا چاہا۔

''وہ ٹھیک ہیں۔ تھوڑی دیر میں ہوش میں بھی آ جائیں گے۔ تم یقیناً ان سب کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہو جو ہر بار سب سے پہلے ہوش میں آ جاتے ہو۔ ہمیں پورے سفر میں سب سے زیادہ تمہارا ہی دھیان رکھنا پڑتا تھا۔'' جگشو نے اس سے جو کچھ کہا، اس سے تصدیق ہو گئی کہ اس کے ذہن میں جو دھندلی دھندلی تصویریں ابھرتی تھیں وہ محض اس کے تخیل کا کمال نہیں تھا بلکہ واقعی اسے بیچ بیچ میں ہوش آتا رہا تھا اور کچھ مناظر ذہن پر نقش ہو گئے تھے۔

''کیا میرے ساتھیوں میں کوئی بچہ بھی شامل تھا؟'' [illegible] اعظم کی بابت پریشان ہو رہی تھی اور اسے پورا یقین تھا کہ اعظم ان کے ساتھ گاڑی میں موجود نہیں ہے۔

''بچہ، کیسا بچہ؟'' جگشو نے اس کے سوال پر حیرت کا اظہار کر کے اس امر کی تصدیق کر دی کہ کنبل کا شک غلط نہیں تھا۔

''ہمارے ساتھ ایک چھوٹا گود کا بچہ بھی تھا۔ ہمارے ساتھ موجود دوسری خاتون کا بچہ۔'' جگشو کی حیرت نے اسے مایوس تو کر دیا تھا پھر بھی اسے اعظم کے متعلق بتایا۔

''کیا اس بچے کا نام اعظم ہے؟''

''ہاں ہاں، بالکل اعظم ہی ہے۔ کیا تم کچھ جانتے ہو اس کے بارے میں؟'' جگشو کی زبان سے اعظم کا نام سن کر وہ پرجوش ہو گیا۔

''تمہاری وہ دوسری ساتھی غنودگی میں کئی بار یہ نام پکار چکی ہے۔'' جگشو نے اسے بتایا تو اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ایک ماں اپنی بچھڑی اولاد کے سوا کسے پکار سکتی تھی۔

''وہ خود کیسی ہے؟ اسے حادثے میں کوئی شدید چوٹ تو نہیں لگی؟'' موقع مل گیا تھا تو اس نے کنبل کا الگ سے احوال جاننا مناسب سمجھا۔ اس کے اس سوال پر جگشو پہلے اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا پھر اس کے اثبات میں سر ہلانے پر معاذ کی طرف رخ کر کے بولا۔

''حادثے میں سب سے کم چوٹیں اسی لڑکی کو آئی ہیں لیکن اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بنا کسی دوا کے بھی مسلسل غنودگی میں ہے۔ بس اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے سر میں شدید درد ہے پر خوب بہت دیکھنے پر بھی اس کے سر پر کوئی چوٹ دکھائی نہیں دیتی۔ وید جی کا اندازہ ہے کہ اس کے دماغ میں کوئی رسولی وغیرہ ہے جس کے کارن اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔'' جگشو جو کچھ کہہ رہا تھا، اس نے معاذ کو ہلا کر رکھ دیا۔ دل میں پہلی خواہش یہ ابھری کہ ایسی بدفال منہ سے نکالنے والے کے ایک تھپڑ جڑ دے یا پھر اس وید کو گالیاں دے جو ایسے بُرے اندازے لگا رہا تھا لیکن پھر وہ خود ہی بھربھری مٹی کی طرح ڈھے گیا۔ اسے بار بار کنبل کے سر میں ہونے والا درد یاد آیا۔ یہ درد فیصل کے وحشی پن کی دین تھا۔ اس نے کنبل کے اپنی زوجیت میں آنے کے بعد کئی بار اسے بے رحمی سے تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور تشدد کی ان کارروائیوں میں ہی ایک بار کنبل کا سر بیڈ کے کنارے سے بری طرح ٹکرایا تھا۔ اس واقعے کے بعد اس کی جیٹھانی ڈاکٹر فردوس بڑی تگ و دو کے بعد اسے اسپتال لے گئی تھی۔ وہاں [illegible] کنبل [illegible] ٹیسٹ اور غالباً سی ٹی اسکین بھی

کروا دیا تھا لیکن معاذ کو رپورٹس کے بارے میں واضح طور پر کچھ نہیں معلوم تھا۔ اسے زبانی طور پر بتا دیا گیا تھا کہ نبیل ٹھیک ہے اور اس کے ساتھ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ اب اس وقت اسے احساس ہو رہا تھا کہ مسئلہ تو تھا لیکن نبیل نے اس سے چھپا لیا تھا۔ ڈاکٹر فردوس کو بھی یقیناً اس کی خواہش پر ہی نہ چاہتے ہوئے خاموش رہنا پڑا تھا۔ ان دنوں معاذ کو ان کے رویے میں کچھ عجیب سا محسوس بھی ہوا تھا لیکن بھاگ دوڑ اور افراتفری اتنی تھی کہ رک کر غور کرنے کا موقع ہی نہیں تھا پھر حالات نے ڈاکٹر فردوس سے رابطہ ہی منقطع کر دیا تھا اور اس بے چاری کے موت کی آغوش میں جانے تک دوبارہ رابطہ بحال نہیں ہو سکا تھا۔ اس کی خواہش پر اسپتال چھوڑ کر فرار اختیار کرنے والی نبیل اپنی دوائیں تو ساتھ لائی تھی لیکن رپورٹس چھوڑ دی تھیں۔ رپورٹس کے بارے میں اس کا موقف تھا کہ افراتفری میں اسے خیال نہیں رہا لیکن شاید ایسا نہیں تھا۔ وہ جان بوجھ کر رپورٹس چھوڑ کر آئی تھی اور بعد میں بھی مسلسل اپنی بیماری کو چھپاتی رہی تھی۔

"کاش میں نے ہی بار بار اس کے سر میں ہونے والے درد کو سنجیدگی سے لیا ہوتا۔" اس کا قصور نہیں تھا۔ حالات نے تنگ کر سکون سے ایک جگہ بیٹھنے ہی نہیں دیا تھا پھر بھی اسے ایسا لگ رہا تھا کہ نبیل کے معاملے میں اس سے کوتاہی ہوئی ہے اور اب یہی کوتاہی اسے بری طرح چبھ رہی تھی۔

ضروری تو نہیں کہ وید کا اندازہ بالکل درست ہو۔ تشخیص میں غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے کسی بھی طرح اس سے نبیل کو اس برف زار سے نکال کر کسی بڑے شہر لے جانا ہوگا جہاں صحیح سے اس کے مرض کی تشخیص ہونے کے ساتھ ساتھ بہتر سے علاج بھی ہو سکے۔ نبیل کے متعلق سوچتے سوچتے وہ اردگرد سے بے خبر ہو گیا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ پینٹ شرٹ والا چینی بہت غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا ہے۔

"میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔" آخرکار اپنی سوچوں سے نکل کر اس نے ان لوگوں سے مطالبہ کیا۔ حسب معمول یہ مطالبہ بجشو کے ذریعے پینٹ شرٹ والے تک پہنچا۔

"لو یو؟" اس نے معاذ کی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے دو لفظ سوالیہ انداز میں ادا کیے۔ یقیناً وہ معاذ سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کیا تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو اور اس کے لیے اس نے اپنی انگریزی کے محدود ذخیرے میں سے دو لفظ نکال کر ادا کیے تھے۔ معاذ اس سوال کے جواب میں ہاں [illegible]

آواز میں بولا۔

"شی از میریڈ!"

"اوہ۔" دوسری طرف سے افسوس کرنے کے انداز میں ایک لفظ ادا کیا گیا یعنی وہ انکار یا اقرار دونوں نہ کرنے کے باوجود اس کی ترجیحی کو سمجھ گیا تھا اور اس کے لیے ہمدردی محسوس کی تھی جب ہی دھیمے سے بجشو سے کچھ کہا۔ بجشو نے پہلے تو نفی میں سر ہلایا اور تیز لہجے میں کچھ کہا لیکن پھر پینٹ شرٹ والے چینی نے سمجھانے بجھانے والے انداز میں کچھ کہا تو ٹھنڈا پڑ گیا۔ معاذ کو اس کے الفاظ سے محض اتنا سمجھ آیا کہ وہ کسی معاملے میں پہلے ویدجی سے اجازت لینے کا خواہاں ہے۔

"اچھو، تم نے جو کچھ بتایا ہے، پہلے اس کی پڑتال ہوگی پھر تم لوگوں کے بھوشے کا فیصلہ ہوگا۔ تب تک تمہیں اپنے تمہارے مترون کو ہماری قید میں رہنا ہوگا۔" آپس کی گفتگو ختم کرنے کے بعد بجشو نے اسے رعب دار لہجے میں حکم دیا۔

"اور وہ ملاقات......؟" معاذ وہیں اٹکا ہوا تھا۔

"لڑکی، ویدجی کی نگرانی میں ہے۔ ان سے پوچھ لوں تو تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔ تب تک اپنے مترون کے سنگ شانتی سے رہو۔ کھانا پینا سب ملتا رہے گا پر کوئی گڑبڑ نہ کرنا۔" بجشو نے اسے جواب دیا اور ساتھ ہی کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔

"اور یہ...... اس کا کیا ہوگا؟" وہ اشارے پر کھڑا تو ہو گیا لیکن بے سدھ پڑی سونیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فکر سے پوچھا۔

"آ جائے گی یہ بھی تم لوگوں کے بیچ۔ پہلے اس سے پوری جانکاری تو لے لیں۔" بجشو نے اسے ٹالا۔

"عورت ذات ہے سادھو جی! اس پر اس کی طاقت سے زیادہ تشدد نہ کریں۔ جو کچھ سچ تھا، میں نے آپ کو بتا دیا۔" اس نے انکساری سے سونیا کے لیے سفارش کی۔

"اتنی سیدھی عورت نہیں ہے یہ...... سیدھی ہوتی تو اس حال کو نہ پہنچتی۔ بہت کچھ ہے جو اس نے اپنے من میں چھپا رکھا ہے۔ اس کے من کے بھید تک پہنچے بنا ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے۔" بجشو نے اس کی سفارش کو رد کر دیا تو اسے چار و ناچار خاموش ہونا پڑا۔ ایک بار پھر اسے اسی غار میں واپس پہنچا دیا گیا جہاں اس کے دوسرے ساتھی بھی موجود تھے۔ اب کی بار اتنی سہولت دی گئی کہ بندشوں میں اس طرح جکڑا گیا کہ محض بستر پر لیٹا نہ رہنا پڑے اور وہ اپنی [illegible]

بستر سے اتر کر چند قدم بھی چل سکتا۔ رہنا اسے اب بھی بستر تک ہی محدود تھا۔ البتہ اب وہ گردن گھما کر آس پاس کا اچھی طرح جائزہ لے سکتا تھا۔ وہاں اس کے علاوہ کل پانچ عدد بستر مزید موجود تھے جن میں سے پانچواں بستر خالی تھا۔ وہ بستر شاید نبیل کے لیے لگایا گیا تھا لیکن اس کی طبیعت کے پیش نظر ویدجی نے اسے اپنے قریب اپنی زیر نگرانی رکھا ہوا تھا جبکہ سونیا کو تو شروع سے انہوں نے مشکوک جان کر سب سے الگ رکھا ہوا تھا۔

"نبیل کو زندگی اور صحت دینا میرے مالک اور ساتھ ہی بہت سارا حوصلہ بھی کہ وہ اعظم کی جدائی کو سہہ سکے۔" بستر پر سمٹ سمٹ کر بیٹھے اس نے نبیل کے لیے دعا کی۔ وہ اس لمحے سے خوفزدہ تھا جب نبیل اس کے سامنے ہوا اور وہ اس سے اعظم کے متعلق سوال کرے۔ اعظم کا ان کے ساتھ نہ ہونے کا مطلب تھا کہ ڈیوڈ نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور فی الحال وہ جن حالات سے گزرے ہوئے تھے، اعظم کی تلاش میں جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

"کوئی ہے اس غار میں جو جاگ رہا ہو یا پھر میں اکیلا ہی مردہ ہوں جسے حساب کتاب کے لیے اٹھایا گیا ہے۔" غار میں وکی کی بڑبڑاہٹ گونجی تو وہ سوچوں کے گرداب سے نکل کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"اٹھایا تو تمہیں ابھی نہیں گیا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کسی نے کو یاد دے سلایا بھی نہیں جا سکتا اس لیے تم خود بخود ہی جاگ گئے ہو۔" معاذ نے اس پر چوٹ کی۔

"بندی قبلہ برادر نسبتی پہلے سے جاگ رہے ہیں اور اگر جاگ رہے ہیں تو اس مسئلے پر روشنی ڈالیں کہ یہ کیسی بیگار ہے کہ بندہ جاگ تو گیا ہے لیکن اٹھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ یہاں تک کہ اپنے جسم کی درمیانی منزل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بیت الخلا کا رخ نہیں کر سکتا۔" وہ مضبوط اعصاب کا مالک زندہ دل لڑکا تھا جو ایسے مخدوش حالات میں بھی شوخی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"میرے پاس کوئی ٹارچ ہوتی تو ایسا ضرور کرتا۔ فی الحال مجبوری ہے۔"

"آپ ہمارے مقابلے میں کم کم مجبور دکھائی دے رہے ہیں۔ کم از کم اٹھ کر بیٹھنے کے حقوق تو حاصل ہیں آپ کو۔" وکی نے آواز کی مدد سے اس کی موجودگی کے مقام کا تعین کر لیا تھا اور لیٹے لیٹے ہی کسی طرح گردن گھما کر اسے دیکھنے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

[illegible]

حاصل ہوئے ہیں۔ دعا کرو تم پر بھی یہ وقت جلدی آئے۔" وہ اپنا دھیان بٹانا چاہتا تھا اس لیے وکی کی اتنی سیدھی باتوں کا جواب اسی کے انداز میں دے رہا تھا۔ اسے شدت سے اس لمحے کا انتظار تھا جب بجشو اسے نبیل سے ملاقات کے لیے لے کر جاتا۔

"مطلب قبر میں سوال جواب کا سلسلہ نہیں ہے۔ اس کے لیے الگ انتظام ہے۔"

"جی ہاں۔ الگ انتظام ہے اور وہ بھی بڑا وکھری قسم کا۔" اس نے جان بوجھ کر وکی کو ڈرایا۔

"افواہوں پر کان دھرنے والے اے آسمان ہم نہیں۔" وہ بہت کائیاں تھا۔ بھانپ گیا کہ اسے ڈرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

"قبر میں محفل مشاعرہ کھلی پارٹی ہے سائیں!" یہ سرمد تھا جو ہوش میں آتے ہی شامل گفتگو ہو گیا تھا۔

"کوئی محفل مشاعرہ نہیں ہے بھائی۔ کہیں تم اپنے مالک کا نمک حلال کرنے کے لیے اس کی شان میں قصیدہ گوئی نہ شروع کر دینا۔" معاذ نے بے اختیار اسے ٹوکا تو وہاں ایک قہقہہ پڑا۔

"آپ اچھے دوست نہیں معاذ سائیں جو دوست کا قصیدہ بھی نہیں سن سکتے۔" قہقہے تھمے تو سرمد نے شکوہ کیا۔

"دل چھوٹا نہ کرو یار! زمانہ ہی ایسا آ گیا ہے۔" عالم شاہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن سرمد کی تسلی کیا ہوتی۔ وہ اس کی آواز میں کچھ محسوس کر کے چونک گیا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں سائیں؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہے نا؟ کوئی زخم وغیرہ......؟" اس کے بس میں ہوتا تو خود اٹھ کر عالم شاہ کا مکمل معائنہ کرتا۔

"مجھے لگ رہا ہے کہ میری بائیں ٹانگ میں فریکچر ہو گیا ہے۔ میں ٹانگ کو ہلا نہیں پا رہا اور ایسا لگ رہا ہے کہ ٹانگ پر پلاستر بھی چڑھا ہوا ہے۔" اس نے اپنی حالت سے آگاہ کیا۔

"ہم حادثے کا شکار ہوئے تھے اس لیے سب کو لازمی کوئی نہ کوئی زخم آیا ہے۔ بس اچھی بات یہ ہے کہ ہم جہاں ہیں، وہاں ہمارے علاج کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ تمہاری ٹانگ بھی ان شاءاللہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔" معاذ کو خبر سن کر دھچکا لگا تھا لیکن اظہار کرنے کے بجائے عالم شاہ کو تسلی دی۔

"کوئی بتائے تو سہی کہ ہم ہیں کہاں؟" اب تک خاموش [illegible]

"اب تم جیسے لمبے کانوں والا بھی یہ سوال کرے گا؟"

"ان لمبے کانوں نے اب تک ہوا کی شائیں شائیں کے علاوہ صرف چیاؤں شیاؤں سنی ہے اور بندے کو یہ چیاؤں شیاؤں سمجھ نہیں آتی۔" اس نے معاذ کے ٹوکنے پر اپنی مجبوری بیان کی تو وہ ہنس پڑا۔

"یہ نگل اور سونیا کہاں ہیں؟ اب تک ان دونوں میں سے کسی کی آواز سنائی نہیں دی۔" عالم شاہ نے وہ سوال کیا جس کی توقع معاذ کو پہلے ہی تھی چنانچہ سوچا سمجھا جواب دیا۔

"خواتین کو الگ جگہ رکھا گیا ہے۔ ہم جن لوگوں کے درمیان موجود ہیں وہ سادھو، جنگجو قسم کے لوگ ہیں اور مرد و زن کے آزادانہ میل جول کو پسند نہیں کرتے۔"

"مگر میں نگل کا بھائی ہوں۔ میرے اس سے ملنے پر پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔" عالم شاہ نے احتجاج کیا۔

"بے شک تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان اعتماد کی فضا قائم ہو جائے تو ان کے سامنے یہ بات رکھی جائے گی۔" معاذ نے نرمی سے اسے جواب دیا۔

"لیکن یہ ہیں کون لوگ؟ ہمیں بھی تو ان کے بارے میں کچھ بتاؤ۔" جارو نے مطالبہ کیا۔

"چیاؤں شیاؤں سے تم خود سمجھ گئے ہو گے کہ ہمارا واسطہ چینیوں سے پڑا ہے۔ بدقسمتی سے وہ ہماری طرف سے شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم کسی بری نیت سے ان کی حدود میں داخل ہوئے ہیں۔ جب تک اس سلسلے میں ان کی تسلی نہیں ہو جاتی، ہمیں تھوڑی تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔"

"ان کی حدود سے کیا مراد ہے آپ کی؟ کیا اس وقت ہم چین کی حدود میں ہیں؟" وکی نے فوراً اس کے الفاظ پکڑے۔

"مجھے یہی اطلاع دی گئی ہے۔" اس کے پاس اعتراف کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"اس کا مطلب ہے ایک اور غیر قانونی داخلے کا الزام......؟" عالم شاہ کراہا۔

"الزام تو ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے دفاع کا موقع دیا جا رہا ہے۔" وہ ہر حال میں اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بلند رکھنا چاہتا تھا۔

"شش...... کوئی اس طرف آ رہا ہے۔" یکدم ہی جارو نے خبردار کیا تو ان سب نے چپ سادھ لی۔ تھوڑی دیر میں وہ [illegible] دو جنگجوؤں کے ساتھ وہاں نازل ہو گیا۔

"لگتا ہے سب کو ہی ہوش آ گیا ہے۔" [illegible] کی روشنی میں وہاں کا جائزہ لے کر وہ اپنے بھاری سر کو ہلاتے ہوئے بولا۔

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" معاذ نے اسے جواب دینے کی ذمے داری نبھائی۔

"اچھی بات ہے۔ یہ میرے ساتھی، ابھی سب کو باری باری فراغت کے لیے لے جائیں گے۔ اگر تم لوگ شانت رہے اور کوئی شرارت نہ کی تو سرکشت رہو گے۔ دوسری صورت میں مجھے دوش نہ دینا کہ پہلے خبردار نہیں کیا۔" اس کے انداز میں واضح دھمکی تھی۔

"آپ فکر ہی نہ کریں سوامی جی! یہ میرے دوست بہت سمجھ دار ہیں۔ آپ کو ان سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔" معاذ نے فوراً اپنے ساتھیوں کی طرف سے یقین دہانی کروائی۔

"میں کیوں کروں چنتا؟ چنتا تو تمہیں کرنا ہو گی کہ کہیں یہ تمہاری پہلے ہی سے ٹوٹی پھوٹی ٹیم مزید ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہو جائے۔" اس نے بے نیازی کے اظہار کے لیے شانوں کو جھٹکا دے کر نخوت سے جواب دیا تو معاذ کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

"میں تمہیں لینے کے لیے آیا تھا۔ وید جی سے بات ہو گئی ہے۔ انہوں نے تمہیں ملاقات کی اجازت دے دی ہے۔" خاموشی کے صلے میں اسے وہ خبر سننے کو ملی جس کا شدت سے منتظر تھا۔

"میں تیار ہوں چلنے کے لیے۔" ایک طرف ملاقات کے لیے بے چینی تھی تو دوسری طرف وہ اپنے ساتھیوں خصوصاً عالم شاہ کو نگل کی حالت سے آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے بہت ہی زیادہ جلدی کا مظاہرہ کیا۔ جنگجو نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے اپنے ایک ساتھی کو اسے کھولنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنے ساتھی کا اس سے نگل کے سلسلے میں استفسار سن چکا تھا اور اس کا ردعمل بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اس لیے پُریقین تھا کہ اسے اپنی محبوبہ سے ملنے کی بے چینی ہے اور بے چینی تو تھی۔ وہ لاکھ خود کو دلائل دیتا کہ وہ کسی اور کے نکاح میں ہے، ایک بچے کی ماں ہے یا یہ کہ عالم شاہ کی بہن ہے وغیرہ وغیرہ لیکن دل کی بے اختیاری اپنی جگہ تھی اور یہ بے اختیار دل بے طرح دھڑکتا اسے جنگجو کے پیچھے پیچھے لیے جا رہا تھا۔

☆☆☆

"تو تم زندہ ہو لالہ؟" حامد اگرچہ راستے سے خود کو اغوا کر کے لائے جانے پر گھبرایا ہوا تھا لیکن لالہ عیسیٰ کے سامنے آتے ہی بولے بغیر نہیں رہ سکا۔

"جس طرح تم لوگوں نے میرے کلیجے پر ہاتھ ڈالا ہے، میں مر بھی گیا ہوتا تو قبر پھاڑ کر نکل آتا۔" لالہ عیسیٰ نے غراتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔ واپسی کے سفر کا آغاز کرتے ہی اس نے گھو کے نائب اصغر کو حکم دے دیا تھا کہ میری آمد سے پہلے پہلے حامد کو اغوا کرا دے۔ یہاں پہنچتے ہی حامد اس کی خدمت میں حاضر کر دیا گیا تھا۔

"میں سمجھا نہیں، آپ مجھ پر کس چیز کا الزام لگا رہے ہیں؟" حامد نے تجاہل سے کام لیا۔

"اب تو یہ بولے گا کہ تجھے گھو کے بارے کا پتا نہیں؟"

"معلوم ہے لالہ! مجھے بڑا افسوس ہوا تھا کہ بے چارے کو اتنی بے دردی سے مارا گیا لیکن اس سب کا مجھ سے کیا تعلق ہے جو مجھے اس طرح سے یہاں لایا گیا ہے۔" اس نے لالہ کی گھورتی نظروں سے آنکھیں چراتے ہوئے خود کو معصوم ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"تو کیا سمجھتا ہے کہ میں نے اتنے سالوں اس شہر میں گھاس کھودی ہے؟ مجھے نہیں معلوم کہ تیری، مکسن کا تیل میل کدھر کو جاتا ہے!"

"مجھے نہیں پتا ہے، کھل کر کہہ دو لالہ!" حامد نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے اس کا طنز برا لگا ہو۔

"تو نے اپنی میڈم کی تلاش کا کام میرے آدمیوں کو کیوں سونپ کر گیا تھا۔ تیرے اپنے پاس بندوں کی کمی ہے کیا؟" لالہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

"میرے بندے مجھے اس کام کے لیے ٹھیک نہیں لگے تھے اس لیے تمہاری طرف آ گیا تھا اور منہ مانگے داموں پر بندہ ہائر کیا تھا۔ اگر گھو استاد کو اعتراض تھا تو وہ انکار کر سکتا تھا۔ میں نے کوئی گن پوائنٹ پر تو اس کو مجبور کیا نہیں تھا۔" حامد نہ تو یہ بتا سکتا تھا کہ سونیا کی تلاش سونیا سے بھی چھپا کر کی جا رہی تھی اس لیے اپنے بندے سامنے لانا مناسب نہیں تھا اور نہ ہی اس بات کا اعتراف کر سکتا تھا کہ یہ میڈم ایکس کی خواہش تھی اس لیے قدرے جارحانہ لہجے میں لالہ کے سوال کا جواب دیا اور بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"تمہارے آدمی کو کام دینا ویسے بھی ایک غلطی ثابت ہوا ہے۔ کوئی پروگریس رپورٹ دینا تو دور کی بات، اس نے دوبارہ ہم سے کانٹیکٹ ہی نہیں کیا۔ اس کی ڈیل سے حیدر آباد کے لیے فلائٹ میں بکنگ تھی۔ اس نے وہ فلائٹ بھی نہیں لی۔ اصولاً تو مجھے یہاں آ کر باز پرس کرنی چاہیے تھی اور تم سے لینا چاہیے تھا کہ تمہارا آدمی ہم سے پیسے لے کر کام کیوں نہیں کر رہا لیکن میں نے پرانے تعلق کا لحاظ کیا اور ایسے وقت میں جب یہاں گھو کی موت کا سوگ منایا جا رہا تھا، اس قسم کی بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میری اس مروت اور لحاظ کا یہ صلہ دیا گیا ہے کہ مجھے راہ چلتے اغوا کیا گیا ہے اور مجرموں کی طرح مجھ سے تفتیش کی جا رہی ہے۔" ہر نئے جملے کے ساتھ حامد کا لہجہ مزید جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔

"زیادہ ڈرامے نہ کر۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ میں تیری اس تقریر سے متاثر ہو جاؤں گا۔ میرے کو پورا حساب چاہیے کہ ادھر انڈیا میں جا کر میرا آدمی کدھر گم کیا ہے تم لوگوں نے؟" لالہ عیسیٰ نے اس کی پوری تقریر کا جواب چند جملوں میں دے ڈالا۔

"یہ تو وہی حساب ہوا کہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔" حامد جلبلا کر بولا۔

"کوتوال اور چور کا فرق تو تجھے ابھی پتا لگ جائے گا۔" لالہ نے سرد لہجے میں جواب دیا اور اپنے دائیں طرف کھڑے اصغر کی طرف گردن گھما کر بولا۔

"ذرا تو توا لوگوں والی خاطر مدارت کرو اس کی اور جب تک یہ میرے سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب نہ دے، تواضع رکنی نہیں چاہیے۔"

اصغر نے حکم ملتے ہی اردگرد کھڑے اپنے مسلح گرگوں کو اشارہ کیا۔ وہ سب تیر کی طرح حامد کی طرف لپکے۔

"تم یہ ٹھیک نہیں کر رہے ہو لالہ! تمہیں اس سب کا حساب دینا ہو گا۔" حامد اس افتاد پر بوکھلا کر دھمکیوں پر اتر آیا۔

"کون لے گا حساب؟ تیری وہ میڈم ایکس جو خود سارا وقت بل میں چھپ کر بیٹھی رہتی ہے؟" لالہ نے حقارت سے اس کی طرف تھوکا۔

"بل میں نہیں چھپی بیٹھی۔ شیرنی ہے وہ شیرنی اور جب اپنی کچھار سے نکل کر تم پر حملہ کرے گی تو بھاگنے کا موقع بھی نہیں ملے گا تمہیں۔" اس کی طرف سے کسی رعایت کی امید نہ پا کر حامد بھی کھل کر بول رہا تھا۔

"تیری شیرنی سے چوہوں سے شکار نکال کر لے گیا تھا میں، پر ابھی تو جانے دے اس بات کو۔ ابھی تو، تو ثابت کر کے دکھا کہ تجھ میں کتنا دم خم ہے۔ حسین عورت کا باڈی گارڈ کم سیکریٹری بن کر ٹھنڈی گاڑیوں میں گھومنے اور

مردوں کی مار کھا کر اپنا گرم گرم خون بہتے دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' لالہ کے لہجے میں اس کے لیے استہزا تھا۔ غصے میں آیا حامد شاید کوئی جواب دیتا لیکن اصغر کے گرگوں نے اسے مزید زبان درازی کی مہلت نہیں دی اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔

اس کے باہر جاتے ہی لالہ کے ماتھے پر ایک موٹا سا بل پڑ گیا اور اس نے خود کو پُرسکون کرنے کے لیے سامنے رکھا جام ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کے لیے ایک طرف گلو جیسے وفادار کی دردناک موت بڑا دھچکا تھا تو دوسری طرف وقاص کے بارے میں کوئی خبر نہ ملنے پر پریشان تھا۔ گلو کے اپنے موبائل بھول کر جانے کی غلطی اس حد تک تو کارآمد ثابت ہوئی تھی کہ وقاص سے اس کے آخری رابطے کے بارے میں علم ہو گیا تھا اور اس حد تک حامد بھی سچا ہی تھا کہ اس کے پاس وقاص کے بارے میں آخری خبر دہلی پہنچنے کی تھی لیکن لالہ کو اندازہ تھا کہ حامد پورا سچ نہیں بول رہا ہے۔

''باذل کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟'' تھوڑی دیر میں اصغر واپس لوٹا تو لالہ نے اس سے دریافت کیا۔

''کوئی اطلاع نہیں لالہ! منظر سے بالکل غائب ہے۔ میں اس کے تمام ٹھکانوں کی نگرانی کروا رہا ہوں لیکن وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ ایک بندے نے عرفان اللہ کے ایک آدمی تک بھی کسی طرح پہنچ کر اندر کی بات نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا کہنا بھی یہی ہے کہ عرفان اللہ خود باذل کے لیے پریشان ہے۔ اس نے پچھلے ہفتے اپنے بیٹے سلطان کو بیوی کے ساتھ علاج کے لیے باہر روانہ کیا ہے اور خود سیاسی داؤ پیچ لگانے میں مصروف ہے۔ ان حالات میں اسے باذل کی بہت ضرورت ہے لیکن باذل گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہے۔'' اصغر نے اسے مکمل رپورٹ پیش کی۔

''میری چھٹی حس کہتی ہے کہ باذل، وکی کے پیچھے ہے۔ وکی نے میڈم ایکس کو چھیڑنے کی جو غلطی کی تھی، وہ اس کا پورا بدلہ چکا رہی ہے۔ وہ بہت تجربہ کار عورت ہے اور وکی اس کے سامنے کل کا بچہ ہے۔'' گلو کے بعد اصغر ہی سب سے قابلِ اعتماد بندہ تھا اس لیے لالہ اس کے سامنے کھل کر بات کر رہا تھا۔

''بڈھی والا کام اپن نہیں جانتے لالہ! اپنے کو آپ بس یہ بولو کہ کیا کرنے کا ہے۔ اپن کر کے دکھا دیتے ہیں۔'' اصغر قابلِ اعتبار بھی تھا اور جی دار بھی لیکن یہ اس کی کمزوری تھی کہ دماغی سوچ بچار کے چکر میں نہیں پڑتا تھا اور اس کی یہ کی لالہ کو شدت سے گلو استاد کی یاد دلاتی تھی۔ گلو ایسے مواقع پر بڑے صائب مشوروں سے نوازتا تھا۔

''ابھی تو، تو بس اس باڈی گارڈ کے بچے کی زبان کھلوا۔ اس سے کوئی کلیو ملے گا تو آگے کی سوچیں گے۔'' لالہ نے اسے جواب دیا اور ذہن نشین کروانے لگا کہ حامد سے کون کون سی معلومات حاصل کرنا ہیں۔

''بس، اب آپ بے فکر ہو جاؤ لالہ! اپن بندے کو الٹ کر اس کے اندر سے سب کچھ نکلوا لے گا۔'' اصغر نے سینہ ٹھوک کر یقین دہانی کروائی لیکن وہاں سے گیا نہیں۔

''کچھ کہنے کا رہ گیا ہے کیا؟'' لالہ نے نیا جام بناتے ہوئے اس کی موجودگی کو محسوس کر کے استفسار کیا۔ پچھلے عرصے میں اس نے شراب نوشی تقریباً چھوڑ دی تھی لیکن جب سے اپنے ٹھکانے پر قدم رکھا تھا، مسلسل پی رہا تھا۔ اس کے آدمی اس کی بلانوشی کے عادی تھے اس لیے کسی نے کچھ محسوس نہیں کیا تھا لیکن خود لالہ اپنے اندر ایک احساسِ شرمندگی میں مبتلا تھا کہ جانتا تھا علینہ نے بڑے مان سے اس سے یہ عادت چھڑوائی تھی اور اگر اسے اس سب کی خبر ہو جاتی تو وہ بہت دکھی ہوتی۔

''ظہور کی بیٹی نے درخواست کی ہے کہ انہیں واپس گھر جانے دیا جائے۔ اصل میں ظہور کی بیوہ اپنی زندگی کے آخری دن پورے کر رہی ہے اور اس کی خواہش ہے کہ وہ یہ آخری دن اپنے گھر میں گزارے۔'' اصغر نے اسے مسئلہ بتایا۔ ظہور لالہ کا وہی آدمی تھا جس نے باذل کے بندے کو غلط اطلاعات فراہم کر کے باذل کو اس فارم ہاؤس پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا تھا جہاں لالہ کا ڈپلیکیٹ اپنی زندگی کے آخری دن گن رہا تھا۔ اس شخص نے لالہ سے وفاداری نبھانے کے لیے اپنی زندگی کے ٹمٹماتے چراغ کو خود اپنے ہاتھ سے بجھا دیا تھا جبکہ ظہور کو اس کے جرم کی سزا میں باذل نے مار ڈالا تھا۔ اس شقی القلب انسان نے بدلہ لینے کے لیے محض ظہور کی موت کو کافی نہ جانا تھا اور ایک روز ظہور کے گھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھس گیا تھا۔ یہ تو اچھا تھا کہ ایسے ہی کسی خدشے کے پیشِ نظر گلو، ظہور کی بیوہ اور بیٹی کی نگرانی کروا رہا تھا اس لیے انہوں نے بروقت مداخلت کر کے ان ماں بیٹی کو بچا لیا تھا اور اب وہ دونوں ان ہی کی سرپرستی میں کہیں رہ رہی تھیں۔

''جانے دو ان دونوں کو۔ باذل کی غیر موجودگی میں انہیں وہاں کوئی خطرہ نہیں ہوگا پھر بھی تم اپنے بندوں کی باری باری ڈیوٹی لگا کر ان کی حفاظت کرتے رہنا۔'' لالہ نے اجازت دے دی تو اصغر وہاں سے ہٹ گیا۔

''تو بھی بڑا بدقسمت ہے لالہ عیسیٰ! بندے کھا گیا پر اس گدی سے دور نہ رہ سکا۔ اب بیٹھا رہ یہاں اور خون کی ہولی دیکھ۔'' لالہ زیرِ لب بڑبڑایا اور جام ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی سانس میں سارا مشروب پی گیا۔

☆ ☆ ☆

گھور سیاہ آنکھیں بند پپوٹوں کے پیچھے گم تھیں۔ دہکتے عارض زرد پڑ گئے تھے، ستواں ناک میں لشکارے مارتی لونگ غائب تھی اور گلاب کی پنکھڑی سے مشابہ لبوں پر یوں پپڑیاں جمی تھیں جیسے عرصے سے پانی نہ ملا ہو۔ وہ اس تبجل شاہ کا بس سایہ ہی دکھائی دیتی تھی جس کے عنابی چادر میں چھپے رہنے والے چہرے کی اس نے ایک جھلک ہی دیکھی تھی اور اس کے آگے دل ہار بیٹھا تھا۔ اس کی جسمانی اور قلبی تکلیف نے اس کے چہرے کو کسی دھند کی طرح ڈھانپ لیا تھا اور اس دھند کے پار وہ اس پہلے والی تبجل کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس تلاش میں اس کی نظریں جیسے ہی لب کے قریب بائیں کونے پر موجود موٹے سے سیاہ تل پر پڑیں تو دل زور سے دھڑکا اور اس تل نے اسی طرح اسے اپنی طرف کشش کیا جیسے پہلی دید پر کیا تھا۔ وہ تل عجیب طرح جی لے لبھاتا تھا اور چمک چمک کر چھیڑتا تھا کہ آؤ مجھے چھو کر دیکھو۔ اس وقت بھی یہی خواہش دل میں جاگی اور اس کے ہاتھ نے بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے حرکت کی۔ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کی پور سے اس شرارتی تل کو چھوتے ہوئے اس کی پوری جان اس پور میں سمٹ آئی تھی۔ انگلی کی پور نے اس تل کو چھوا تو ایسا محسوس ہوا جیسے ریشم کو چھو لیا ہو۔ پورے وجود میں ایک سرور سا دوڑ گیا لیکن یہ بس ایک لمحے کا ہی احساس تھا۔ یکدم ہی اسے یاد آ گیا کہ اس کی انگلی کی پور جس کے چہرے کو چھو رہی ہے، اسے اپنے چہرے پر کسی نامحرم کی نگاہ تک گوارا نہیں ہے۔ فوراً ہی ریشمی لمس کی جگہ دہکتے انگارے نے لے لی اور اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ سرور کی جگہ سکوت نے لے لی اور وہ گویا پوری طرح سن ہو گیا۔ یہ کیسی گستاخی سرزد ہو گئی تھی اس سے۔ وہ جو اسے خیال میں بھی بہت احتیاط سے سوچتا تھا، کیسے اسے چھو بیٹھا تھا۔ چھونے کا تو حق ہی نہیں تھا اس کے پاس بلکہ دیکھنے کا بھی نہیں تھا۔ وہ کوئی نہیں تھا تبجل شاہ کا۔ بے شک وہ اس کے دل میں بستی تھی لیکن وہ اس کا محرم نہیں تھا اور اس کی زندگی میں محرم رشتوں کے سوا کسی کی گنجائش نہیں تھی۔

شرمندگی اور جھنجلاہٹ میں ڈوبے اس نے اپنی دائیں ہاتھ کی انگلیوں کا مکا بنا کر پوری قوت سے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارا اور تبجل کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ رخ پھیرتے ہی اس کی نظر نارنجی لباس والے بوڑھے پر پڑی۔ بوڑھا وہ بس اس اعتبار سے تھا کہ اس کے کندھوں پر جھولتے بالوں سمیت بھویں تک سفید تھیں لیکن ان سفید بالوں کے برعکس وہ کسی جوان کی سی شان سے بغیر کسی سہارے کے تن کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں کی جلد جھریوں سے پاک، خوب تنی ہوئی تھی اور وہ آنکھوں میں بے پناہ چمک لیے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ چمک اتنی زیادہ تھی کہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ معاذ نے خود کو اس دشواری میں نہ ڈالا اور نظریں جھکا لیں۔ وہ پہلی ملاقات میں ایک ایسے شخص سے مقابلے کی فضا پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا جو یقیناً اس وقت خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔

''تمہاری ساتھی کی حالت ٹھیک نہیں ہے جوان! یہ زندگی اور موت کے درمیان پھنسی ہوئی ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس جنگ میں زندگی کی جیت ہوگی یا موت کی۔'' بوڑھے نے اس سے گفتگو کا آغاز کیا تو معاذ کو اس سے پوچھنے کی حاجت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ کون ہے۔ وہ اس غار کے اندرونی گوشے سے نکل کر آیا تھا جس میں بھکشو اسے تبجل سے ملاقات کے لیے لے کر آیا تھا اور بھکشو نے اسے یہ بات پہلے ہی بتا دی تھی کہ تبجل کو ویدجی کے زیرِ نگرانی رکھا گیا ہے۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ اس کے دماغ میں رسولی ہے؟'' ویدجی نے اسے اردو میں مخاطب کیا تھا اس لیے اس نے بھی اردو ہی میں سوال کیا۔

''یہ بھی یقین ہے کہ یہ بہت پرانی رسولی ہے جو عرصہ دراز سے خاموشی سے دماغ میں موجود تھی لیکن کچھ عرصے سے اس نے خاموشی توڑ کر اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کر دیا ہے۔ لڑکی بہت تکلیف میں ہے اور مجھے یہ بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ اس کی تکلیف میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔'' وید بولتا جا رہا تھا اور معاذ کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اس کے سینے پر عین دل کے مقام پر پوری قوت سے گھونسے رسید کرتا جا رہا ہو۔

''آپ کے اندازے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ آپ کون سا کوئی ماہر سرجن ہیں۔'' اس نے سرخ آنکھوں سے وید کی چمکیلی آنکھوں کو گھورتے ہوئے چیخ کر کہا۔ اس وقت وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ وید سے مقابلہ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

''چند دن یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتے ہیں اس لڑکی کے پاس۔ اس کے لیے اگر کوئی کچھ کر سکتا ہے تو صرف یہ کہ

اس کی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کرے۔" وید کو اس کے لہجے کی تیزی کی کوئی پروا نہیں تھی اور جو بولنا تھا وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولتا جا رہا تھا۔ اس کے یوں آنکھوں سے آنکھیں ملانے پر معاذ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے دماغ کو بجلی کے ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے ہوں۔

"ہپناٹسٹ!" معاذ کے ذہن میں ایک لفظ گونجا اور اس بار اس نے ذرا سنبھل کر بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس کے یوں دیکھنے پر وہ خفیف سا مسکرایا۔

"اگر اسے کسی بڑے اسپتال لے جایا جائے تو اس کا علاج ہو سکتا ہے۔" اس نے بوڑھے کی مسکراہٹ کو نظر انداز کر کے اپنی بات پر زور دیا۔

"ضرور لے جاؤ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کی حالت سفر کرنے کے لائق نہیں ہے۔ ویسے کون سے بڑے اسپتال لے کر جاؤ گے تم اسے؟ انڈیا، پاکستان، چین یا یورپ کا کوئی ملک...... کسی اسپتال کا نام تو ہوگا تمہارے دماغ میں؟" وید کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی اور معاذ کو یکدم ہی ادراک ہوا کہ وہ محض جذباتیت کا مظاہرہ کر رہا ہے ورنہ حالات تو یہ ہیں کہ وہ خود اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکتا تھا، بیمار تجل کو ساتھ لے جانا تو بہت دور کی بات تھی۔ حقیقت کو تسلیم کرتے ہی اس کی نظریں ایک بار پھر جھک گئیں۔

"انسان بہت سی جگہ بے بس ہوتا ہے۔ اسے اپنی بے بسی کو تسلیم بھی کرنا پڑتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کوشش ہی نہ کرے۔ میں آخر تک کوشش پر یقین رکھنے والا انسان ہوں۔ اس لڑکی کے علاج کے لیے جو کچھ ممکن ہے، کر رہا ہوں اور میری کوشش ہے کہ یہ کم از کم اس لائق ہو جائے کہ سفر کر سکے۔ یہ سفر کے لائق ہو گئی تو میں خود کوشش کروں گا کہ اسے فوری طور پر کسی بڑے اسپتال منتقل کروا دوں۔" بوڑھے وید کا لہجہ یکدم ہی نرم ہو گیا اور وہ تسلی دینے والے انداز میں بولتا چلا گیا۔

"اگر آپ ایسا کر سکیں تو میں ذاتی طور پر آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا اور اس مہربانی کے بدلے آپ کی ہر خدمت کرنے کے لیے تیار رہوں گا۔" اس نے دل کی گہرائیوں سے یہ الفاظ ادا کیے۔ اس وقت تجل کی زندگی سے زیادہ کچھ بھی اہم نہیں لگ رہا تھا۔ سارے مسائل جیسے یکدم پس پشت چلے گئے تھے۔ بوڑھے نے اس کے الفاظ سنے اور متانت سے مسکرا کر رہ گیا۔

"یہ بہت مظلوم لڑکی ہے وید جی! اس کم عمری میں ہی اس نے بہت دکھ دیکھ لیے ہیں۔ میرا دل نہیں مانتا کہ اس کے ساتھ کچھ برا ہو۔" اس بار وہ پست لہجے اور عاجزانہ انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔

"یہ دنیا کی سب سے خوش نصیب، خوش حال... ہلاک یا ظالم لڑکی بھی ہوتی تو تم اپنے دل میں اس کے لیے یہی خواہش رکھتے جوان! کوئی کوئی دنیا میں ایسا ہوتا ہے... چاہے جیسا ہو، ہم اس کے ساتھ برا ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔" وہاں گویا سب ہی اس کے دل کا بھید جان چکے تھے۔ وہ [illegible] کہتا، بس خاموشی سے سر جھکا دیا۔

"آؤ، وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" بوڑھا اسے تجل کے بستر سے ہٹ کر زمین پر بچھے اونی نمدے تک لے گیا اور بیٹھتے ہی بولا۔

"سنا ہے تم پاکستانی ہو؟"

"جی، آپ نے صحیح سنا ہے۔" اضطراری کیفیت میں اس کی انگلیاں اون کے ریشوں کو کھینچنے لگیں۔ وید نے تجل کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ ایک بھاری بوجھ کی طرح اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

"پاکستان میں کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"میں نے اپنا پورا پتا آپ کے آدمیوں کو لکھوا دیا ہے۔ آپ جس ذریعے سے چاہیں، میرے بارے میں معلومات کروا لیں۔ میں نے کوئی بھی غلط انفارمیشن نہیں دی ہے۔" اس کے ذہن میں تھا کہ ان پر سے شکوک ختم ہوں گے تو تجل کے علاج کے لیے بھی کوئی پیشرفت ہو سکے گی اس لیے اس انداز میں جواب دیا۔

"معلومات کروانا جن کا کام ہے، وہ کرواتے رہیں گے۔ میں تو صرف اس لیے پوچھ رہا تھا کہ اگر تم کراچی کے رہنے والے ہو تو تم سے اپنے ماضی کی کچھ یادیں بانٹ سکوں۔" وید کا انداز دوستانہ تھا۔

"میں سمجھا نہیں۔" معاذ ہونق ہوا۔

"میں نے اپنی زندگی کے کئی ماہ کراچی میں گزارے ہیں۔ اردو بے شک میں چین ہی سے سیکھ کر گیا تھا لیکن اس میں روانی اور صفائی کراچی میں رہنے سے آئی ہے۔ زندگی کا وہ دور خوبصورت تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ میرا دل ہجوم سے اکتانے لگا اور ایک دن میں اٹھ کر برف زار میں آ گیا۔ یہاں زندگی بہت پرسکون اور دلچسپ ہے۔ فطرت سے اتنے قریب رہ کر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔" بوڑھے نے یوں ناک سکیڑ کر سانس لی جیسے ماحول کی تازگی اور سکون کو سانسوں کے ذریعے اپنے اندر اتار رہا ہو۔

"یعنی آپ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آپ کسی جوگی یا سادھو کی طرح بن باس لے کر اس ویرانے میں رہ رہے ہیں؟"

"تم چاہو تو یہی سمجھ لو۔"

"میں ایسا سمجھ لیتا اگر جدید دنیا کے لوگوں سے آپ کے اتنے گہرے روابط نہ ہوتے۔"

"تم یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہو؟" بوڑھا چونکا۔

"حالات اور واقعات کے تجزیے سے...... آپ کے مطابق یہ جگہ آپ کا مستقل ٹھکانا ہے تو پھر آپ لوگ جائے حادثہ پر کیا کر رہے تھے؟ میرے اندازے کے مطابق وہ جگہ اگر ہندوستان میں نہیں تھی تو اس سے قریب ترین ضرور تھی اور آپ کو وہاں سے یہاں تک پہنچنے کے لیے طویل سفر طے کرنا پڑا ہے۔ ایک عرصے سے دنیا سے کٹ کر رہنے کے باوجود آپ کی معلومات کا یہ حال ہے کہ آپ گولڈن اسٹار کی حقیقت سے آگاہ ہیں اور نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ آپ کے ٹھکانے پر جدید دنیا کا ایک نمائندہ شخص بھی موجود ہے جو یہاں سے وہاں آپ کا رابطہ بھی رکھتا ہے اور آپ کو وہ ساری معلومات بھی حاصل کر کے دے سکتا ہے جس کی آپ کو ضرورت ہو۔" معاذ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

"تمہارے بارے میں میرا اندازہ بالکل درست تھا جوان! تم اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ ذہین اور بیدار مغز ہو۔"

"میں جاننا چاہوں گا کہ اس اندازے کی بنیاد کیا ہے کیونکہ ہم تو پہلی بار ایک دوسرے سے باقاعدہ گفتگو کر رہے ہیں۔" معاذ نے اس بار بھی اس کی بات پکڑ لی۔ تجل کی پریشانی اپنی جگہ تھی لیکن اس کی فطری ذہانت اپنا کام دکھا رہی تھی۔

"تمہاری ساتھی کے پاس مخصوص سنہری ستارے کی موجودگی نے ہمیں مجبور کیا کہ تم لوگوں کو اپنے ٹھکانے پر منتقل کر کے تم سے اہم معلومات حاصل کی جائیں۔ اپنے اس ٹھکانے کے محل وقوع کو پوشیدہ رکھنے کے لیے تم لوگوں کو راستے میں بے ہوش رکھا گیا تھا لیکن تم وہ فرد تھے جو بار بار مخصوص دورانیے سے قبل ہوش میں آ جاتے تھے اور تم پر خصوصی دھیان رکھنا پڑتا تھا۔"

"اس سے میری ذہانت یا بیدار مغزی کیسے ثابت ہوتی ہے؟ زیادہ سے زیادہ آپ اسے اچھی قوت مدافعت کا نام دے سکتے ہیں۔" معاذ نے بوڑھے کی وضاحت قبول نہیں کی۔

"شاید تم یہ ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میرے تجربے نے [illegible] نیازی سے جواب دیا۔

"آپ نے جو نتیجہ اخذ کیا، اس کے پیچھے اصل وجہ یہ تھی کہ آپ نے مجھے بے ہوشی کی حالت میں میرے دماغ میں گھسنے کی کوشش کی تھی لیکن آپ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔" معاذ نے جیسے اس کی سماعتوں پر بم پھوڑا۔

"مجھے راستے میں پیش آنے والے کچھ واقعات دھندلے دھندلے سے یاد ہیں اور ان دھندلی یادوں میں ایک یاد یہ بھی ہے کہ ایک پراسرار آواز میرے دماغ میں گونجا کرتی تھی لیکن یہ میرے استاد کا کمال ہے کہ میں نے بہت کم عرصے کی تربیت کے باوجود اپنے دماغ کو بلاک کرنا سیکھ لیا ہے اور کوئی نہیں ہے جو آسانی سے میرے اندر تک پہنچ سکے۔" معاذ نے وہ کہہ دیا جو اس کے دل میں تھا۔ بوڑھا اس کی اس صاف گوئی پر کچھ دیر خاموشی سے اسے گھورتا رہا پھر شکست تسلیم کرنے والے انداز میں بولا۔

"تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔"

"تم اپنے اس علم سے فائدہ اٹھا کر میری ساتھی سے بھی معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ اسے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنانے کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے قدرے تلخ لہجے میں بوڑھے سے شکوہ کیا تو اس نے ایک گہری سانس لی اور متانت سے بولا۔

"میں اپنی اس صلاحیت کو ناگزیر حالات کے علاوہ استعمال کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہم نے حب الوطنی کا ثبوت دیتے ہوئے مشکوک افراد کو بیجنگ کے نمائندے تک پہنچا دیا ہے۔ اب بیجنگ کا مسئلہ ہے کہ جیسے چاہے معلومات حاصل کرے۔ رہا تمہارا معاملہ تو میری چھٹی حس نے تمہاری شخصیت کا غیر معمولی پن محسوس کر کے صرف تجسس کے تحت تمہارے بارے میں جاننے پر اکسایا تھا۔ میں کسی بھی قسم کے مفاد کے حصول کے لیے تمہارے بارے میں جاننے کا خواہشمند نہیں تھا۔"

"میرے اندر اگر کوئی صلاحیت ہے تو اسے پروردگار کی عنایت کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ باقی میں اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوں جو پہلے ہی آپ کے ساتھیوں کو بتا چکا ہوں۔" معاذ نے ایک بار پھر اپنا لہجہ نرم کر لیا کہ بوڑھے کا رویہ اس کے ساتھ مسلسل نرم اور مہربان تھا۔

"تم اگرچہ ہمیں مشکوک مقام اور مشکوک حالات میں ملے ہو لیکن میں تمہارے ساتھ سخت رویہ اس لیے نہیں رکھ پایا کہ مجھے تمہارے اندر سے مثبت لہریں نکلتی محسوس [illegible]

ہمیں تم سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔"

"میں احسان کے لیے آپ کا شکریہ ہی ادا کرسکتا ہوں۔" بوڑھے کی رائے سن کر وہ مزید نرم پڑا اور عاجزی سے جواب دیا۔ جواباً بوڑھا کچھ نہیں بولا اور صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اسی وقت فضا میں نسوانی کراہ گونجی۔ وہ تڑپ کر تجل کی طرف مڑا اور بے اختیار اس کی طرف بڑھنا چاہا۔

"اب تم واپس جاؤ جوان! مجھے اپنی مریضہ کو توجہ سے دیکھنے کے لیے تنہائی کی ضرورت ہے۔" وید کے بلند آواز میں ٹوکنے پر اس کے قدم ٹھٹکے اور ساتھ ہی وجود میں طیش کی ایک لہر بھی اٹھی۔ وہ کون ہوتا تھا اسے اس طرح جانے کا کہنے والا۔

"زانتھو! اسے واپس لے جاؤ۔" اس کی کیفیت سے بے نیاز بوڑھے نے بلند آواز میں چینی زبان میں پکارا تو نہ جانے کس گوشے میں گم نارنجی لبادے والا ججشو یکدم نمودار ہوگیا۔

"چلو مہاراج!" ججشو نے سرد نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے بہ مشکل اپنے مزاج کو قابو کیا۔ یہاں ان کی حیثیت قیدیوں کی سی تھی، ان لوگوں کا سلوک برا نہیں تھا۔ ایسے میں خوامخواہ کا جوش حالات کو بگاڑ سکتا تھا اس لیے بہتر تھا کہ کچھ ضبط سے کام لیا جائے۔ وہ دل پر جبر کرتا ہوا ججشو کے پیچھے چل پڑا۔ وید اس کی اندرونی کشمکش پر توجہ دیے بغیر پہلے ہی تجل کے بستر کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"آ...... اصغر!" غار سے نکلتے نکلتے اس کی سماعت سے تجل کی نحیف آواز ٹکرائی تو بے بسی سے اپنی مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔ وہ تکلیف میں تھی لیکن ہوش کی طرف آتے ہوئے سب سے پہلے بیٹے کا ہی نام پکارا تھا اور وہ مجبور تھا کہ اس کی پکار پر اس کا بیٹا اس کے سامنے پیش نہیں کرسکتا تھا۔

☆☆☆

"کیا پروگریس ہے؟" میڈم ایکس نے پلکیں اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے شخص پر سوالیہ نظر ڈالی تو اس نے دیکھا کہ میڈم کی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے ہیں۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ اس نے کافی زیادہ شراب نوشی کر رکھی ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنے ہاتھ میں ایک جام تھام کر بیٹھی ہوئی تھی۔

"ہم حامد کا کچھ پتا نہیں چلا سکے۔ اسے خان ہاؤس سے سہراب گوٹھ کی طرف جانے والے کچے راستے پر اغوا کیا گیا ہے اور اس راستے پر کوئی کیمرا نصب نہیں ہے۔ آگے ... [illegible]

سیکڑوں گاڑیوں میں سے اپنی مطلوبہ گاڑی تلاش کرنا ممکن نہیں ہے۔ شیر علی نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ لوگ سیاہ گاڑی میں حامد کو لے کر گئے ہیں اور ہم وہاں سے گزرنے والی ہر سیاہ گاڑی کے بارے میں معلومات حاصل نہیں کرسکتے کیونکہ جو فوٹیجز ملی ہیں، ان میں سے بہت کم گاڑیوں کی نمبر پلیٹس پڑھی جارہی ہیں۔" اس نے مؤدبانہ میڈم کو رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں مذکورہ شیر علی زخمی شخص ان تین افراد میں سے ایک تھا جو بہ وقتِ اغوا حامد کے ساتھ تھے۔ دو افراد تو موقع پر ہی مارے گئے تھے جبکہ شیر علی زخمی حالت میں بچ گیا تھا۔ شیر علی کے بیان سے صرف اغوا کی تصدیق ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کوئی قابلِ ذکر معلومات فراہم نہیں کرسکا تھا۔ اغوا کاروں کے بارے میں بھی اس کا یہی کہنا تھا کہ انہوں نے چہروں پر نقاب لگائے ہوئے تھے اس لیے وہ ان میں سے کسی کو شناخت نہیں کرپایا تھا۔

"کیا ممکن ہے اور کیا نہیں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ میں صرف ایک بات جانتی ہوں اور وہ یہ کہ مجھے حامد کے بارے میں اپنے جاننے چاہیے۔"

"ہم کوشش کررہے ہیں میڈم! اس پہلو کو بھی ذہن میں رکھا گیا ہے کہ یہ گگو کی موت کا ری ایکشن نہ ہو۔ اس کے آدمیوں کو ٹٹولنے کی بھی کوشش کی جارہی ہے لیکن اب تک کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی۔ کہنے والوں کا کہنا ہے کہ اصغر نے توقع کے خلاف بہت تیزی سے سارے معاملات سنبھال لیے ہیں اور پہلے کے مقابلے میں کئی گنا ایکٹو دکھائی دے رہا ہے۔ اس بات پر کچھ لوگ اس کے خلاف باتیں بھی بنارہے ہیں کہ ایسا لگتا ہے، گگو کی موت سے اس کی لاٹری نکل آئی ہے اور اب وہ خود باس بن جانے پر خوش ہے۔"

"ہوں......" میڈم ایکس نے محض ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔

"کچھ لوگ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اصغر کے کام کرنے کے انداز نے لالہ کی یاد دلادی ہے۔ معاملات بالکل ایسے چلنے لگے ہیں جیسے لالہ کی زندگی میں چلتے تھے۔"

"کیا واقعی؟" اس بار وہ چونکی۔

"مجھے خبر پہنچانے والے کا تو یہی کہنا ہے۔"

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے ... [illegible]

"میں تمہیں قتل کرنے جارہا ہوں اور جب تم روتے ہوئے مجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگو گے تو تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں اس منظر سے کس قدر لطف اندوز ہوں گا۔ تم نے میرے خلاف ثبوت اکٹھا کر کے جو غلطی کی ہے، اب اس کی سزا کا وقت ہے۔" جواب میں لیوی نے پستول گنجے کے سر کے قریب کردیا۔

گنجے کا چہرہ سپاٹ رہا۔ "شکریہ باب! آپ جاسکتے ہیں۔"

"لیکن میری لاشیں ابھی پوری نہیں ہوئیں۔"

"میرے خیال میں اتنا کافی ہے۔" گنجے آدمی نے جس کا نام ولیم ہنری تھا، ایک پیڈ پر کچھ لکھا پھر اپنی کرسی کھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

لیوی نے حرکت نہیں کی۔

"میرے پاس اور لوگ بھی ہیں۔"

لیوی نے بڑے سے خالی آڈیشن ہال میں چاروں طرف دیکھا پھر ہنری کی طرف جھک گیا۔

"تو آپ نے کیا سوچا؟"

"اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنا مشکل ہے۔"

"اگر آپ چاہیں تو میں اسے کسی اور طریقے سے کرسکتا ہوں۔"

مزید مصیبت ... جس طرح سے آپ چاہتے ہیں۔"

احسان

عائشہ نصیر

وہ ایک ناکام اداکار تھا لیکن اسے ایک عجیب راز نے کامیاب اداکاروں کی فہرست میں لاکھڑا کیا... اسے نہیں معلوم تھا کہ اتنے بڑے راز کی حفاظت کرنے کا اسے اتنا بڑا انعام ملے گا مگر اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ جسے وہ انعام سمجھ رہا تھا، وہ تو کسی کا انتقام تھا...

اداکاری کرتے کرتے حقیقی قاتل کا روپ دھارنے والے نوجوان کی روداد...

ہنری نے سگریٹ کا دھواں اڑایا۔ ”ابھی آپ گھر جائیں اور اپنے ایجنٹ کی کال کا انتظار کریں۔“

لیوی نے سر ہلایا۔ اسے یقین ہونے لگا...... کاسٹنگ ڈائریکٹر نے اسے ایک سگنل دیا ہے جس کا مطلب تھا کہ اسے یہ رول مل گیا ہے۔

یہ اچھی خبر تھی کیونکہ اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ وہ ہنری کو دیکھ کر مسکرایا اور وہاں سے مطمئن ہو کے چلا آیا۔

☆☆☆

لیوی کئی سالوں سے ”ڈی بز“ میں کام کر رہا تھا۔ اسے کئی چھوٹے موٹے عجیب و غریب کردار کرنے کو ملے تھے مگر کوئی بھی اتنا پاورفل نہیں تھا جو اسے اس ریسٹورنٹ میں ویٹر بننے سے بچا پاتا۔ اسے بدتمیز گاہکوں اور چیخنے والے بچوں سے نفرت تھی جو اکثر اس کی سفید وردی پر کیچپ اور دیگر چیزیں پھینکتے تھے۔ اسے امید تھی کہ یہ وہ رول ہوگا جو اسے سب سے اوپر لے جائے گا۔ شاید اس کو اپنے آئیڈیل ال پچینو کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل جائے۔

میزوں کی صفائی کے دوران لیوی نے اپنے ایجنٹ کو متعدد بار فون کیا لیکن یہ ہمیشہ وائس میل پر جاتا۔ چنانچہ اگلے دن ریسٹورنٹ میں شفٹ ہونے کے بعد وہ ایجنٹ کے دفتر چلا گیا۔ دفتر چھوٹا تھا جس کی دیوار پر مشہور اداکاروں کے درجنوں آٹوگراف والی تصویریں تھیں جن میں سے کسی سے بھی اس کا ایجنٹ برنی کبھی نہیں ملا تھا۔

برنی اپنی بڑی میز کے پیچھے کافی سے داغے اسکرپٹ سے چہرہ ڈھکے بیٹھا تونا سینڈوچ کھا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے اپنا سر ہلایا اور کہا۔ ”سوری......!“

لیوی کو اپنی تمام امیدیں ختم ہوتی محسوس ہوئیں۔ ”میں سمجھا نہیں؟“

برنی نے آدھا کھایا سینڈوچ پلیٹ میں پھینک دیا۔ ”اس نے معذرت کر لی۔“

لیوی اسے گھور رہا تھا۔ وہ اس پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا جو وہ سن رہا تھا حالانکہ وہ اس سے پہلے بھی سب ... ہو چکا تھا۔

”اس نے کیا کہا؟“

”کچھ نہیں۔“

”اس نے کچھ تو کہا ہوگا۔ یہ میرا اب تک کا سب سے بہترین آڈیشن تھا۔“

برنی نے اس طرح تھوک نگلا جیسے اس کے حلق میں کوئی کڑوا ذائقہ گھل گیا ہو۔

”ویل......! اس نے کہا کہ تمہارا انداز ایسا نہیں تھا کہ تم واقعی کسی کو مار سکتے ہو۔ تم میں وہ بات نہیں۔“

لیوی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”کیا......؟“

برنی نے سینڈوچ والی پلیٹ ایک طرف کھسکا دی۔ ”ہاں، اس نے کہا کہ تمہارے انداز میں وہ مجرمانہ شدت نہیں تھی جو کسی ممکنہ قاتل کے انداز میں ہو سکتی ہے۔ ہاں...... اس نے یہی کہا کہ تم میں وہ بات نہیں۔“

لیوی کی سانسیں تیز ہو گئیں۔ اس نے اس آڈیشن پر کتنی محنت کی تھی۔ مووی ز دیکھیں، کرائم شوز دیکھے، گینگسٹرز کے بارے میں کتابیں پڑھیں پھر بھی کاسٹنگ ڈائریکٹر کو اس کا انداز ٹھیک نہیں لگا؟ یہ کیسے ممکن تھا۔

”تم فکر مت کرو لیوی! میں تمہارے لیے کوئی اور رول ڈھونڈ لوں گا۔“

لیوی کو کوئی اور رول نہیں چاہیے تھا۔ اسے یہی رول چاہیے تھا۔ وہ تھک گیا تھا، سیکنڈ ریٹر کے اس ٹھپے سے...... پچھلے چھ مہینوں میں یہ پہلی بڑی فلم تھی جو اس کی قسمت بدل سکتی تھی۔

”کیا انہوں نے کسی کو فائنل کیا؟“

”مجھے علم نہیں۔ اس ہفتے کے اینڈ تک آڈیشن کی لاسٹ ڈیٹ ہے۔“

”کیا تم ان کے ساتھ میرا ایک اور آڈیشن کرا سکتے ہو؟“

لیوی ملتجی لہجے میں پوچھنے لگا۔

برنی نے ہاتھ پھیلائے۔ ”وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔“

”پلیز......!“

برنی نے اس کے امید بھرے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور گہری سانس لی۔

”ٹھیک ہے، میں دیکھوں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“

لیوی ہمیشہ کی طرح بذریعہ سب وے گھر آیا۔ عام حالات میں تو وہ گھر آتے ہی سو جاتا تھا مگر آج نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ آڈیشن کو کیسے بہتر بنایا جائے۔ اسی وقت اس کے فون کی بیل نے اس کے خیالات میں خلل ڈالا۔ یہ برنی تھا۔

”انہوں نے کہا ہے کہ تم صبح ساڑھے دس بجے آ سکتے ہو۔“

”اوہ...... بہت بہت شکریہ۔“ وہ یہ سنتے ہی کھل اٹھا۔

”تم واقعی انہیں یہ سمجھانے میں بہت دیر لگی کہ تمہیں دوسرا چانس دیا جائے۔“ برنی بولا۔

”بے فکر رہو۔ میں اس بار انہیں مایوس نہیں کروں گا۔“ اس کے لہجے میں یقین تھا۔

فون رکھنے کے بعد وہ پھر سے اسی خیال میں الجھ گیا۔ وہ جب بھی بزنس سے متعلق کسی پریشانی کا شکار ہوتا تو خود سے سوال کرتا کہ پچینو اس صورتِ حال میں کیا کرے گا؟ اس وقت بھی اس نے یہی کیا اور اسے فوراً جواب ملا...... وہ کسی ماہر سے رابطہ کرتا...... مگر لیوی صرف ایک ماہر کو جانتا تھا۔ وہ ٹرین اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا اور نیوہیون کا ٹکٹ لیا جہاں اس کے انکل ارل رہتے تھے۔ ارل کی شادی لیوی کی خالہ سے چند سال پہلے ہوئی تھی۔ جب تک کہ وہ لاپتا نہیں ہو گئی۔ پولیس نے تفتیش کی لیکن کبھی پتا نہیں چلا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا۔ لیوی کے والد نے فرض کیا کہ ان کی گمشدگی کے پیچھے ارل کا ہاتھ تھا۔ لیوی ٹیکسی لے کر وان انویو گیا۔ وہ سڑک پر بیس بال کھیلتے بچوں کے پاس سے گزرا اور ڈرائیو وے سے سفید اور گلابی گھر کی طرف مارچ کیا۔ یہ مضافاتی علاقے کے ہر دوسرے گھر کی طرح لگ رہا تھا۔

لیوی نے دروازے پر دستک دی اور انتظار کیا۔ اس کی آنٹی کے لاپتا ہونے کے بعد کسی نے انکل ارل سے رابطہ نہیں رکھا تھا اور لیوی کو تو یاد بھی نہیں تھا کہ وہ ان سے کبھی ملا بھی تھا۔ اسے صرف امید تھی کہ ارل اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔

اسی وقت دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا شخص باہر آیا۔ وہ دیکھنے میں عام سا تھا مگر اس کی آنکھوں کے نیچے کی جلد سوجی ہوئی تھی۔ لیوی نے سوچا، اس عمر میں آ کر اکثر نیند کے مسائل ہو جاتے ہیں۔

”ہیلو، میں جوناتھن لیوی ہوں۔ آپ جانتے ہیں، لیری کا بیٹا!“

ارل کے شانے ایک دم سیدھے ہو گئے۔ اس کی آنکھیں لیوی کو ایسے گھورنے لگیں جیسے وہ کوئی ایلین ہو۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

لیوی نے اس آدمی کی طرف دیکھا جو اب اس کے تصور سے بھی زیادہ سخت لگ رہا تھا اور سوچنے لگا، کیا اس نے یہاں آ کر درست فیصلہ کیا ہے؟

”مجھے...... مجھے تمہارا ایک احسان چاہیے۔“

ارل مسکرایا۔ ”تمہیں مجھ سے کیا احسان چاہیے؟ تمہارے پاپا اور میں نے برسوں سے بات نہیں کی۔“

لیوی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تیزی سے بولنا شروع کیا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے سکھاؤ کہ کسی کو کیسے مارتے ہے۔“

ارل نے اپنی بھویں اچکائیں اور پھر ہنسنے لگا۔ ”یہ کیا بکواس ہے، کوئی مذاق......؟“

[illegible]

الفاظ منہ سے نکال ہی لیے جو وہ کہنا چاہتا تھا لیکن کہنے سے اتنا ہی ڈرتا تھا۔ ”میرے...... میرے ڈیڈ نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے سیم رینالڈز کے ساتھ کیا کیا۔“

ارل رک گیا۔ اس کے چہرے پر سختی چھا گئی۔

”اس نے مجھے بتایا کہ ایک رات تم دونوں نشے میں دھت تھے جب تم نے اس کا قتل کیا اور پھر اس کی لاش کو اپ اسٹیٹ ٹاؤن کے ساتھ والے جنگل میں دفن کر دیا تھا۔“

ارل نے لیوی کی شرٹ کا کالر پکڑا اور اسے اپنے چہرے کی طرف کھینچ لیا۔ اس وقت وہ ایسے شیر کے مانند لگ رہا تھا جو غزال کی گردن میں بس دانت گاڑنے ہی والا ہو۔ لیوی، بوڑھے کی گرم سانسوں کو محسوس کر سکتا تھا۔

”تو تم کیا کرو گے...... بچے؟“

لیوی خود کو روک نہیں سکا۔ ”م...... میں پولیس کو بتا سکتا ہوں۔“

ارل کا دوسرا ہاتھ اس کی پچھلی جیب میں پہنچا۔ لیوی کا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے خود کو گولی کھانے کے لیے تیار کر لیا تھا۔

ارل کا ہاتھ آگے آیا تو اس میں رومال تھا۔ اس نے اپنی پیشانی صاف کی اور لیوی کو چھوڑ دیا پھر وہ منہ پھیر کر اندر چلا گیا۔ لیوی کی سانسیں معمول پر آ گئیں۔ اس نے ارل کی پیٹھ کو گھور کر دیکھا۔ نہ جانے اس کا ارادہ کیا تھا۔ لیوی نے ایک نظر کھلے دروازے پر ڈالی۔ کیا وہ اسے اندر مدعو کر رہا تھا؟

لیوی نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور اندر چلا آیا۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے وہ جس بڑے کمرے میں پہنچا، اس کی دیواروں پر قدرتی مناظر کی کئی تصاویر تھیں۔ ایک کتا، ایک دیہی سڑک پر بیٹھا ہوا، ایک گھاس بھری پہاڑی، کچھ گائیں آبشار کے گرد گھوم رہی تھیں۔ سامنے رکھے ایک چمڑے کے صوفے پر ارل ایک ٹانگ ٹیبل پر پھیلا کر بیٹھا تھا۔

لیوی آہستہ سے قریبی کرسی کی طرف بڑھا اور اس پر بیٹھ گیا۔ ارل نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ اب نرم تھا۔

”تم جانتے ہو، میں تم کو پسند کرتا ہوں۔“

لیوی مسکرایا۔ ”تو تم میری مدد کرو گے؟ تم سکھاؤ گے کہ کسی کو کیسے مارتا ہے؟ مجھے یہ جاننا ہے کہ یہ کیسا محسوس ہوتا ہے۔ مجھے یہ فلم ہر حال میں چاہیے...... اور......“

”فلم......؟ اوہ ہاں، اداکار۔ مجھے یاد ہے کہ تمہارے ڈیڈ نے اس بارے میں بتایا تھا کہ تم ہمیشہ اداکار بننا چاہتے تھے۔ جیسا کہ مجھے یاد ہے، تمہاری ماں اس سے خوش نہیں تھی۔“

”وہ چاہتی تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں لیکن یہ میری خواہش نہیں ہے۔“ لیوی نے دیکھا کہ ارل کی نظریں اس سے ہٹ کر کھڑکی کی طرف گئیں۔

”اوہ، یہ کمینہ......“

”کیا؟“

ارل صوفے سے اٹھا اور لنگڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ لیوی نے اسے چیختے ہوئے سنا لیکن صرف ایک جملہ۔ ”تم میرے ہاتھوں مروگے۔“

کچھ دیر بعد ارل واپس اندر آیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور سانسیں بے ترتیب تھیں۔

”بیوقوف، کمینے۔“ وہ واپس صوفے پر بیٹھ گیا۔

”تو کیا آپ میری مدد کریں گے، انکل ارل؟“

”ہوں؟“

”آپ اداکاری کے بارے میں جانتے ہیں۔ مجھے بتائیں کہ میں کیسے کسی قاتل کی طرح نظر آسکتا ہوں؟“

ارل نے ایک لمحے کو سوچا۔ ”ہاں، ہاں، ضرور۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ایک کیبنٹ کی طرف لپکا۔ اس نے ایک دراز سے پستول نکال کر لیوی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ”یہ لو۔“

لیوی کا جسم کانپنے لگا۔ ”مجھے...... مجھے اصلی پستول کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سین میں ایک نقلی پستول استعمال کر رہا ہوں۔“

”یہ بکواس بات ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ کردار میں جان پڑے تو تمہیں اصلی ہتھیار استعمال کرنا ہوں گے۔ یہی چیز تمہیں طاقت دیتی ہے کہ صرف ایک شاٹ سے تم دنیا کو کسی بھی گندگی سے چھٹکارا دلا سکتے ہو۔“

لیوی نے پستول کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے اس کے وزن کو محسوس کیا۔

”قاتل کو کوئی خوف نہیں ہوتا۔ وہ سب کو یوں دیکھتا ہے جیسے وہ کوڑے کا ڈھیر ہوں اور جانے کب اسے ان سے نجات حاصل کرنی پڑ جائے۔“

ارل لڑکھڑا گیا۔ اس نے جلدی سے دیوار کا سہارا لے کر اپنا توازن بحال کیا۔ ”قاتلوں کو صرف ایک رول یاد ہوتا ہے۔ کسی پر کوئی احسان کیا ہے تو اس کا بدلہ لو۔ سمجھ گئے؟“

لیوی بالکل نہیں سمجھا تھا لیکن پھر بھی اس نے یوں سر ہلایا جیسے سب سمجھ گیا ہو۔ ارل نے اسے بتایا کہ پستول کیسے پکڑنا ہے، کیسے کھڑا ہونا ہے، گولی کیسے چلانی ہے۔ ایک گھنٹے کے بعد لیوی نے محسوس کیا کہ وہ اب آڈیشن کے لیے بالکل تیار ہے۔

”انکل ارل! یہ بہت اچھا رہا۔ آپ کا شکریہ۔ مجھے لگتا ہے یہ فلم مجھے ضرور ملے گی۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

”ابھی سبق ختم نہیں ہوا۔“

لیوی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ جاننے کے لیے کہ قاتل بننا کیسا ہوتا ہے، تمہیں خود ہی اس کا تجربہ کرنا پڑے گا اور تم یہ یہاں کر سکتے ہو۔ دیکھو، میرا پڑوسی، میری باڑ پر اگنے والے قیمتی بیریز لینے کے لیے ہمیشہ میرے لان کے اطراف میں چکر اتارتا ہے۔ میں نے اسے سو بار کہا کہ ایسا نہ کرو لیکن وہ نہیں مانتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کے پاس جاؤ اور اسے سبق سکھاؤ۔“

لیوی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”کیا؟“

”پستول لو اور اگلے دروازے پر جاؤ۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

”یہ واحد طریقہ ہے جس سے تم واقعی سیکھ سکتے ہو کہ ایک قاتل کا رول کیسے پلے کرنا ہے...... اور بے فکر رہو اس میں گولیاں نہیں ہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم یہ سنسنی محسوس کرو اور اسے تھوڑا سا ڈراؤ...... بس۔“

”مجھے گھر جانا چاہیے۔“ وہ بڑبڑایا۔

ارل دھیرے سے اس کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر اس کی انگلیوں کو چٹخانے لگا۔ لیوی کو اپنی انگلیاں ٹوٹتی محسوس ہوئیں۔

”میں تیار ہوں۔“ وہ چیخا۔

ارل نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”گیارہ بج رہے ہیں اس لیے وہ شاید ابھی سو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کے بیڈ روم میں جاؤ۔ یہ مین فلور پر ہے۔ سمجھ گئے؟“

لیوی سمجھ گیا تھا کہ وہ پھنس چکا ہے۔ اب وہ چاہے یا نہ چاہے اسے یہ کرنا ہی پڑے گا۔

چند لمحوں بعد وہ دونوں اس کے پڑوسی کے پچھلے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ ارل نے بنا جھجکے تالا کھولا اور لیوی کو اندر بھیج دیا۔

وہ ڈرتے ڈرتے اس تاریک گھر میں گھسا تھا اور اندھیرے میں فرنیچر سے ٹھوکریں کھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا پھر ایک کمرے سے آتے خراٹوں کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔ وہ اس سمت آیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس نے بیڈ پر موجود شخص کو دیکھا اور ... ہاتھ پھیرا۔

بیڈ کے قریب آکر اس نے گن کا بیرل اس کی پیشانی سے لگاتے ہوئے وہ الفاظ دہرائے جو ارل نے اسے کہنے کو کہا تھا۔

”اٹھو، کمینے۔“

اس کی آنکھیں کسی خطرے کو محسوس کرتے ہی ایک دم سے کھل گئیں۔ ایک اجنبی دراندازکو اپنے سر پر کھڑا دیکھ کر اس کے چہرے پر وحشت ناچنے لگی۔ ”تم کون ہو؟“

”مجھے تمہارے پڑوسی نے بھیجا ہے۔“

”وہ پاگل......“ وہ چلایا۔

”میں نے کہا اٹھو۔ یہاں کوئی پارٹی نہیں چل رہی۔“

لیوی نے اس ڈائیلاگ کا اضافہ اپنی طرف سے کیا تھا، یہ سوچتے ہوئے کہ اس سے اس کی پرفارمنس میں اور جان آئے گی اور ایسا ہوا بھی۔

”ارل نہیں چاہتا کہ تم اس کے لان میں چوری چھپے آکر اس کی قیمتی بیریز چراؤ۔ سمجھے تم کتے کی دم؟“ لیوی نے گن اس کی پیشانی میں چبھوئی۔

اس غریب کے چہرے پر آنسو بہنے لگے۔ ”گولی مت چلانا۔ میں دوبارہ ایسا نہیں کروں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔“

لیوی نے اس آدمی کو گھورتے ہوئے ایک طرح کی خوشی محسوس کی۔ وہ قاتل نہیں تھا مگر اس وقت ایک عجیب سا طاقت بھرا احساس تھا جو اس کے دل و دماغ پر چھانے لگا تھا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب اسی احساس کے زیر اثر اس نے ٹریگر دبا دیا۔

گولی کی آواز ... گن میں گولیاں تھیں۔ اس شخص نے ایک کربناک چیخ کے ساتھ اپنا سینہ پکڑ لیا۔

لیوی کو یہ سمجھنے میں ایک لمحہ لگا کہ اس نے کیا، کیا ہے۔ اس کی دھڑکنیں رک گئیں۔ چند لمحے بت کے مانند ساکت کھڑے رہنے کے بعد وہ گن وہیں چھوڑ کر سر پر پیر رکھ کر وہاں سے بھاگا۔

وہ یوں بھاگتے بھاگتے اسٹیشن آیا جیسے اس کے پیچھے کوئی عفریت لگا ہو۔ ٹرین میں بھی سیٹ میں دبکا وہ سوچ سوچ کر لرزتا رہا۔ جب وہ گھر پہنچا تو کمبل میں گھس کر آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگا مگر ارل کے پڑوسی کا خون آلود جسم نظروں کے سامنے آجاتا اور اسے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولنا پڑتیں۔ گن بھری ہوئی تھی یعنی ارل نے اس سے جھوٹ بولا تھا یا پھر شاید ارل کا خیال تھا کہ وہ ٹریگر دبا ہی نہیں پائے گا یا پھر وہ جانتا تھا اور اس نے جان بوجھ کر لیوی کو اس مصیبت میں پھنسایا تھا۔

پولیس کبھی بھی ارل کو اس کے پڑوسی کی موت سے نہیں جوڑ پائے گی کیونکہ گن پر لیوی کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ کیا ارل پولیس کو بتائے گا کہ یہ کام لیوی کا ہے؟

صبح ہوئی تو لیوی بستر سے نکلا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے ارل کو یہ یاد دلانے کے لیے فون کیا کہ وہ انٹر اسٹیٹ ٹائن کے قریب دفن ہونے والے لڑکے کے بارے میں جانتا ہے۔

”سوری بچے......! اب وہاں کوئی دفن نہیں ہے۔“

لیوی ہکا بکا رہ گیا۔ ”مجھے لگتا ہے، آپ مجھے پھنسانے کا پلان بنا رہے ہیں۔“

جب ارل نے جواب دیا تو اس کی آواز نرم تھی۔ ”نہیں بچے! تم خاندانی ہو۔ میں نہیں چاہوں گا کہ تم کسی ایسے معاملے میں پھنسو۔ وہ گن میرے پاس محفوظ ہے۔ کسی کو اس بارے میں بھی پتا نہیں چلے گا۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔“

لیوی نے فون بند کر دیا۔ اس کی حسیات جامد تھیں۔ وہ اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ وہ کیسا محسوس کر رہا ہے لیکن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آڈیشن میں جائے گا۔ اس معاملے پر وہ بعد میں بھی پریشان ہو سکتا ہے۔

جب وہ آڈیشن ہال میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ولیم ہنری کے بجائے، لمبے سیاہ بالوں والا ایک نوجوان میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔

”ہیلو! میں جوناتھن لیوی ہوں۔ میں یہاں آڈیشن دینے آیا ہوں؟“

”اوہ، ہاں...... میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔“ نوجوان نے اسے دیکھتے ہی چونک کر اٹھتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

لیوی نے تذبذب کے عالم میں اس کا ہاتھ تھاما۔ ”کیا مطلب......؟“

”آپ کو یہ رول مل گیا ہے۔“

لیوی نے پلکیں جھپکائیں۔ ”میں سمجھا نہیں...... میں نے تو ابھی تک آڈیشن ہی نہیں دیا۔“

”میں مسٹر ہنری کا اسسٹنٹ ہوں۔ وہ نہیں آپائے مگر انہوں نے یہ یقینی بنایا کہ آپ کو بتا دیا جائے کہ آپ کو اس رول کے لیے کاسٹ کر لیا گیا ہے۔“

لیوی کو اچھا لگنا چاہیے تھا لیکن یہاں کچھ گڑبڑ تھی۔ ”مسٹر ہنری کہاں ہیں؟“

لڑکے کے چہرے پر ایک دم اداسی چھا گئی۔ ”وہ، آہ...... آج صبح کسی نے ان پر حملہ کیا اور گولی ماردی۔“

لیوی کو ایک جھٹکا لگا۔ ”یہ کس نے کیا؟“

اس نے کندھے اچکائے۔ ”پتا نہیں...... لیکن مرنے سے کچھ دیر پہلے اس نے اسپتال کی ایک نرس سے بات کی تھی کہ اس بات کو یقینی بنائے کہ اس کا خاندان محفوظ ہے اور آپ کو اس فلم میں کاسٹ کر لیا گیا ہے۔“

لیوی کو اس وقت تک سمجھ نہیں آئی تھی جب تک اسے یہ ٹیکسٹ موصول نہیں ہوا۔

”تم نے مجھ پر احسان کیا۔ میں نے تم پر۔“

***
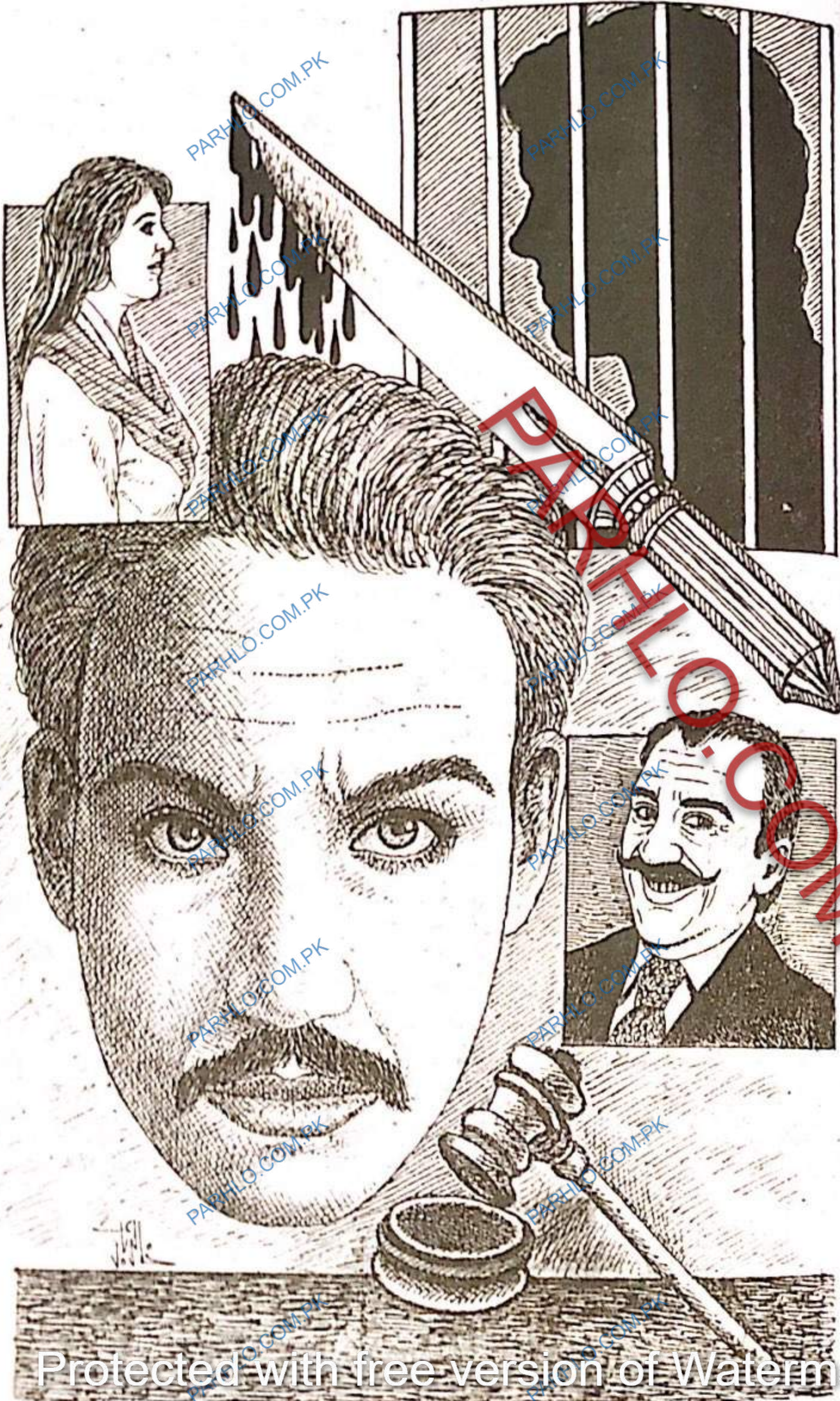
زنگار

مرزا امجد بیگ

یہ حقیقت ہے کہ انتقام کی آگ بہت ہلاکت خیز ہوتی ہے اور اس کے نتائج و اثرات ہمیشہ حادثات ہونے کے بعد سامنے آتے ہیں... وہ بھی ایسی ہی آگ میں جل رہا تھا جس کے مزدور باپ کو فیکٹری کی انتظامیہ کی بے پروائی اور دولت کا گھمنڈ کھا گیا... وہ غریب تھا اور اپنے باپ سے بے حد محبت کرتا تھا لیکن... انتقام کا یہ طریقہ کسی صورت اچھا نہیں تھا اور یہی بتانے کے لیے مرزا امجد بیگ کو عدالت کے احاطے میں اترنا پڑا...

''کاشش'' کی آس لیے ایک بے سمت

مسافر کا دلسوز انجام

میرے ایک ہم پیشہ کے قتل کا مقدمہ اتفاق سے مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کیس میں جس شخص کو ملزم نامزد کیا گیا تھا، وہ میرا ایک دیرینہ شناسا تھا اور اسی کی بیوی کی درخواست پر میں نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

عقیل بزمی مرحوم و مقتول ایک پبلک پراسیکیوٹر یعنی سرکاری وکیل تھا۔ کہتے ہیں مرنے والے کی برائی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس دنیا سے جانے کے بعد سب اچھے ہو جاتے ہیں لیکن کہانی کی ابتدا میں، میں عقیل بزمی کی تعریف کیے بنا نہیں رہ سکتا۔ اللہ معاف کرے...... موصوف اپنے پیشے کے لحاظ سے ایک ''کامیاب'' اور دھانسو قسم کے وکیل تھے۔ انہوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں نام اور پیسا خوب کمایا تھا۔ ان کی وکالت کی تاب نہ لاتے ہوئے سیکڑوں ملزمان عمر قید اور سزائے موت کے حقدار ٹھہرائے گئے تھے جن میں غالب تعداد مصیبت زدہ بے گناہوں کی تھی۔ اکثر لوگوں کو عدالت کے احاطے میں یہ کہتے ہوئے سنا گیا تھا......!

''ایک تو عقیل، اوپر سے وکیل...... یہ تو ایسے ہی ہے جیسے ڈبل پتی راجا جانی!''

مقتول کے مختصر ''تعارف'' کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ وہ ماہِ اکتوبر کا اختتام تھا۔ موسم گرما پوری طرح رخصت نہیں ہوا تھا تاہم ان دنوں راتیں گلابی جاڑے کا احساس دلاتی تھیں۔ ایسی ہی ایک خوشگوار رات میں سونے سے پہلے ایک قانونی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ میرے گھر کے فون کی گھنٹی بجی۔ ان دنوں فون کے نام پر صرف لینڈ لائن کنکشن ہی ہوا کرتے تھے۔ سیل فون اور دوسرے نیٹ ورکس ابھی متعارف نہیں کرائے گئے تھے۔ میں نے کتاب کو بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھا اور فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

میرے ''ہیلو'' کے جواب میں ایک گھبرائی ہوئی نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''کیا بیگ صاحب بات کر رہے ہیں...... وکیل مرزا امجد بیگ......؟''

''اگر آپ نے رات کے گیارہ بجے کسی وکیل بیگ

صاحب کے گھر میں فون کیا ہے تو پھر میں ہی آپ کا مطلوبہ بندہ ہو سکتا ہوں۔'' میں نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں دوسری طرف بولنے والی کو پہچان نہیں پایا تھا۔ ''ویسے آپ کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور آدھی رات کو فون کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟''

''میرا نام فریحہ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''قاسم کی بیوی۔ میرے شوہر نے آپ کے نئے گھر میں کام کیا تھا اور آپ اس کے کام سے بہت خوش ہوئے تھے اور...... اور آپ نے کہا تھا، زندگی میں کبھی بھی کوئی قانونی پریشانی گھیر لے تو ہم آپ کو فون کریں۔ میں نے بڑی مشکل سے آپ کا نمبر تلاش کیا ہے۔''

فریحہ ایک ہی سانس میں کافی کچھ کہہ چکی تو مجھے فوراً سے پیشتر وہ جوڑا اور ان کی خوبیاں یاد آ گئیں۔ قاسم ایک اَن پڑھ ذہین شخص تھا۔ اس نے اپنی محنت اور توجہ سے کئی کام سیکھ رکھے تھے جن میں الیکٹریشن، پلمبر، کارپینٹر، پینٹر اور موٹر مکینک کے شعبے سرِفہرست تھے۔ ان کے علاوہ دیگر درجنوں خوبیوں میں ایک ہنر قربانی کے جانور ذبح کرنے کا بھی تھا۔ وہ اللہ کا بندہ بکرے سے لے کر اونٹ تک ہر چھوٹے بڑے جانور کو گرانے اور مہارت سے ذبح کرنا جانتا تھا۔ ہاں، یہ سچ ہے کہ میں نے اپنے گھر کے بیشتر کام قاسم ہی سے کرائے تھے اور اس سے وہ وعدہ بھی کیا تھا جس کا ابھی فریحہ نے ذکر کیا تھا یعنی کسی بھی قانونی پیچیدگی میں ان کی مدد کرنا۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ لوگ کسی مصیبت میں پھنس چکے ہیں؟''

''قاسم کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔'' فریحہ نے گلوگیر آواز میں بتایا۔

فریحہ ایک ہاؤس وائف (گھریلو عورت) تھی۔ اس کی عمر پینتالیس کے قریب تھی۔ وہ قاسم سے پانچ سال چھوٹی اور تین گنا موٹی تھی۔ تعلیمی میدان میں وہ دونوں ہم پلہ تھے۔ وہ تین بچوں کے ساتھ امن و سکون کی زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں کسی قانونی پیچیدگی کے حوالے سے میری یعنی ایک وکیل کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔

''یہ کب کی بات ہے؟'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''اور اس کی گرفتاری کا سبب کیا ہے؟''

''یہ دو دن پہلے کا واقعہ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور قاسم پر ایک شخص کے قتل کا الزام ہے۔''

''اس وقت قاسم کہاں ہے؟''

آج اٹھائیس اکتوبر کی تاریخ تھی۔ فریحہ کے بیان کی روشنی میں قاسم کی گرفتاری چھبیس اکتوبر کو عمل میں آئی ہو گی۔ اس حساب سے قاسم کو ریمانڈ پر پی سی (پولیس کسٹڈی) میں ہونا چاہیے تھا۔

''وہ تھانے کی حوالات میں بند ہے اور پولیس والے اس سے کڑی پوچھ تاچھ کر رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ایک دن قاسم کو عدالت میں بھی پیش کیا گیا تھا۔ میں قانونی جھمیلوں سے بالکل واقف نہیں ہوں۔ کسی ہمدرد نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ مجھے اپنے شوہر کے لیے کسی قابل وکیل کا بندوبست کر لینا چاہیے ورنہ قاسم کے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ میں دن بھر سوچتی رہی کہ کہاں جاؤں اور کیسے کسی وکیل کا انتظام کروں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے ذہن میں آپ کا نام آیا۔ میں نے بڑی مشکل سے آپ کا فون نمبر تلاش کیا اور اب آپ سے بات کر رہی ہوں۔''

فریحہ کی اضطراری بپتا سے بہت ساری اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے سوال کیا۔ ''قاسم پر کس کو قتل کرنے کا الزام ہے؟''

''ہم نے ایک ڈیڑھ ماہ پہلے گھر تبدیل کیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اب ہم لوگ خداداد کالونی میں آ گئے ہیں۔ اس سے پہلے جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ہم صدر کے علاقے میں رہتے تھے۔ صدر والے گھر میں بہت سے مسائل کا سامنا تھا اسی لیے ہم نے رہائش تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔'' وہ سانس درست کرنے کے لیے تھمی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''مکان خالی کر کے حساب کتاب کے سلسلے میں قاسم اور مالک مکان کے بیٹے میں ملاقات ہوئی تو اس بندے نے ایڈوانس کی پوری رقم واپس نہیں کی۔ قاسم نے جب نا انصافی پر احتجاج کیا تو مالک مکان کے بیٹے نے کہا کہ قاسم نے ان کے گھر کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ اس پر قاسم اور اس شخص میں گرما گرمی ہو گئی۔ اس نے کہا کہ جو رقم ایڈوانس سے کاٹی ہے، وہ کسی صورت واپس نہیں کرے گا۔ اگر قاسم کو وہ پیسے چاہئیں تو تھانے میں جا کر اس کے خلاف رپورٹ درج کرا دے یا عدالت سے رجوع کرے۔ اس پر قاسم نے غصیلے لہجے میں کہہ دیا۔

''میں اپنے پیسوں کے لیے پولیس کے پاس جاؤں گا اور نہ ہی کسی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔ مجھے اپنی رقم وصول کرنا آتی ہے اور وہ میں تمہارے حلق میں ہاتھ ڈال کر نکال لوں گا۔ تمہیں بالکل اندازہ نہیں کہ میں تمہارا کیا حشر کروں گا۔''

مالک مکان کے بیٹے کو گرمی دکھا کر قاسم وہاں سے آ گیا تھا۔ جب قاسم اس ہوٹل سے نکل رہا تھا تو اس بندے کی دھمکی آمیز آواز اس کے کان میں پڑی تھی۔

''میرا نام عقیل بزمی ہے۔ میں نے درجنوں لوگوں کو پھانسی کے پھندے تک پہنچایا ہے۔ تمہاری حقیقت میری نظر میں ایک چیونٹی سے زیادہ نہیں ہے۔ تم میرا کیا حشر کرو گے؟ میں تمہیں کسی ایسے مقدمے میں الجھاؤں گا کہ تمہاری سات نسلوں کی زندگی عدالتوں کے چکر کاٹتے ہوئے گزر جائے گی۔ تم ایک وکیل کی طاقت سے واقف نہیں ہو۔''

''قاسم نے جذبات میں بہت کچھ کہہ دیا تھا لیکن گھر آنے تک اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے نقصان پر فاتحہ پڑھی اور چند روز ہی میں اس ناخوشگوار واقعے کو بھول گیا۔ اس بات کو لگ بھگ ایک ماہ ہو گیا ہے۔ اب اس وکیل عقیل بزمی کو کسی نے قتل کر دیا ہے اور اس کے قتل کے الزام میں قاسم کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔''

میں نے فریحہ کی پریشانی کو پوری توجہ سے سنا اور آخر میں پوچھا۔ ''قاسم کو کس تھانے میں رکھا گیا ہے؟''

اس نے مجھے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔

''میں کل کسی وقت تھانے جا کر قاسم سے تفصیلی ملاقات کروں گا۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر قاسم نے کوئی جرم نہیں کیا تو میں اس کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہونے دوں گا۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ بیگ صاحب!'' اس نے ممنونیت بھرے انداز میں کہا۔ ''میں آپ سے روبرو بھی ملنا چاہتی ہوں۔''

''میں سہ پہر سے رات نو بجے تک اپنے آفس میں ہوتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کسی بھی دن ان اوقات میں آفس آ کر مجھ سے مل سکتی ہیں۔''

بات کے اختتام پر میں نے فریحہ کو اپنے آفس کا ایڈریس سمجھا دیا۔ اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا پھر ہمارے درمیان ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہو گیا۔

فون کے ریسیور کو کریڈل کرنے کے بعد میں نے بیڈ سائڈ ٹیبل سے وہ ضخیم کتاب اٹھائی اور دوبارہ اس کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ میرے محدود علم کے مطابق میڈیکل اور قانون ہی دو ایسے پیشے ہیں جن میں ایک ڈاکٹر اور وکیل بن جانے کے بعد ضخیم کتابوں کے مطالعے سے جان نہیں چھوٹتی اور انسان خود کو ''اپ ڈیٹ'' رکھنے کے لیے اپنی زندگی کی آخری سانس تک کتابوں میں سر کھپاتا رہتا ہے۔

☆☆☆

آئندہ روز عدالت سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بھرپور لنچ کیا پھر قاسم سے ملنے متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں کسی ملزم سے ملاقات کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے لیکن میں نے فرہاد کی ثابت قدمی اور استقلال سے ایسے اسباق سیکھ رکھے ہیں کہ مجھے اس دشوار کام میں کبھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

اس روز بھی میں نے اپنی آزمودہ کار ترکیب کا استعمال کر کے بہ آسانی قتل کے ملزم قاسم سے کم و بیش آدھے گھنٹے کی ملاقات کر لی اور اس کی مبنی بر حقیقت روداد سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بے گناہ ہے اور کسی گہری سازش کے تحت اسے اس معاملے میں پھنسایا گیا ہے۔ میں نے وکالت نامے، درخواست ضمانت اور دیگر قانونی کاغذات پر اس کے دستخط کرائے اور تسلی دلاسا دے کر وہاں سے آ گیا۔

قاسم کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی اسکول، کالج یا یونیورسٹی نہیں گیا تھا تاہم اس میں سیکھنے کا مادہ بہ درجہ اتم موجود تھا۔ دیگر دستکاریوں کے علاوہ اس نے کسی حد تک اردو پڑھنا اور لکھنا بھی سیکھ لیا تھا اور اس کا یہ ''لکھنا پڑھنا'' دراصل ''کام چلاؤ'' کے زمرے میں آتا تھا جس سے اس کا کام بہ خوبی چل رہا تھا۔ اس نے تمام ضروری کاغذات پر اردو میں دستخط کیے تھے جو کیڑے مکوڑوں سے گہری مشابہت رکھنے کے باوجود بھی پڑھنے میں آ رہے تھے۔

اسی شام فریحہ بھی مجھ سے ملنے آفس پہنچ گئی۔ میں نے اسے بھی اچھا خاصا وقت دیا اور سمجھانے بجھانے کے بعد رخصت کر دیا۔ جب وہ میرے پاس آئی تھی، خاصی حواس باختہ ہو رہی تھی لیکن جاتے وقت وہ کافی سنبھلی ہوئی اور پُراعتماد دکھائی دیتی تھی۔ دراصل پولیس اور کورٹ کچہری کے معاملات بڑے بڑوں کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں اور سادہ مزاج غریب انسان تو کچھ زیادہ ہی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ میں نے اس نوعیت کے حالات میں صرف دو قسم کے لوگوں کو ٹینشن فری اور اطمینان کی دولت سے مالا مال پایا ہے۔ نمبر ایک...... جس کے پاس طاقت اور اختیار کی کوئی کمی نہ ہو اور نمبر دو...... جس کا اپنے پروردگار پر پختہ یقین ہو۔ ایمان اور یقین کی قوت کے سامنے پہاڑ ریزہ ریزہ اور

سمندر مقیم کوزہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے بڑا تصرف اور کیا ہوگا۔
آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو اس کیس کے پس منظر سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ کسی بھی پیش منظر کو سمجھنے کے لیے اس کے پس منظر سے آگاہی لازمی ہے۔ واضح رہے کہ ان میں سے کئی ایک باتیں مجھے بعد میں ادھر اُدھر سے پتا چلی تھیں جنہیں میں نے اس خلاصے میں شامل کرلیا ہے تاکہ واقعات کا تسلسل قائم رہے اور کہانی میں دلچسپی کے عنصر کو برقرار رکھنے کے لیے میں نے دانستہ کچھ باتیں چھپا بھی لی ہیں جن کا ذکر مناسب مواقع پر کیا جائے گا۔

صدر کا علاقہ ہمیشہ ہی سے گنجان آباد رہا ہے۔ اگرچہ آج کئی ایک جدید طرز کی تعمیر کی حامل رہائشی عمارتوں نے بھی اپنی جگہ بنالی ہے لیکن اب بھی غالب تعداد پرانی عمارتوں ہی کی ہے۔ انہی قدیم رہائشی عمارتوں میں ایک "حاجی منزل" بھی تھی جس کا مالک حاجی یعقوب تھا۔ یہ کارنر کے ایک پچپن مربع گز پلاٹ پر تعمیر شدہ ایک تین منزلہ عمارت تھی جس کے گراؤنڈ فلور پر دو چھوٹی دکانیں تھیں جن میں ایک "بسم اللہ بیکری" اور دوسری "ریکو ورائٹی گیلری" تھی۔ ان کے اوپر تینوں منزلیں رہائش کے لیے تھیں جن کا زینہ بغلی گلی سے تھا۔

پہلی منزل پر ایک بیوہ خاتون صغریٰ بیگم اپنے جوان بیٹے عدنان کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ عدنان گلبہار (گولیمار) میں واقع ایک سینیٹری اینڈ ٹائلز کی بڑی دکان میں بطور سیلزمین کام کرتا تھا۔ کسی زمانے میں یہ عالیشان دکان عدنان کے باپ سعید خواجہ کی ہوا کرتی تھی۔ حالات کی ایک بے رحم کروٹ نے سب تہس نہس کر دیا تھا۔ اب سعید خواجہ اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا اور وقت کی ستم ظریفی کہ عدنان آج اسی دکان میں ایک معمولی سے ملازم کی حیثیت سے کام کرنے پر مجبور تھا جو کبھی ان کی ملکیت ہوا کرتی تھی۔ صغریٰ بیگم بہت زیادہ بیمار رہتی تھی لہٰذا عدنان نوکری چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ماں کی ادویات، گھر کا کرایہ اور کچن و دیگر اخراجات سب اسی کے ذمے تھے اور وہ یہ ذمے داری بخوبی نبھا رہا تھا۔

دوسری منزل پر میرا موکل قاسم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہا کرتا تھا جو لگ بھگ ڈیڑھ ماہ پہلے اس مکان (فلیٹ) کو خیرباد کہہ کر خداداد کالونی میں جابسا تھا لیکن صدر والے اس گھر نے ملزم قاسم کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ اپنے سابق مالک مکان کے بیٹے کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر پولیس کی "مہمان نوازی" سے "لطف اندوز" ہو رہا تھا۔

تیسری منزل والے فلیٹ میں ایک عمر رسیدہ جوڑا اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی ساٹھ کا ہندسہ عبور کر چکے تھے۔ ان کی صرف ایک ہی اولاد تھی۔ یعنی اکلوتا بیٹا کاشف جو شادی کے بعد اپنی بیوی شازیہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کی مریدی میں آ گیا تھا۔ اس کی مرشدنی شازیہ اپنے ساس سسر کو سخت ناپسند کرتی تھی لہٰذا اپنی پیرنی کے حکم پر کاشف نے اپنے ضعیف والدین کو گھر سے نکال کر اس مختصر سے فلیٹ میں آباد کر دیا تھا۔ اپنی "سعادت مندی" کا علم بلند کرنے کی غرض سے وہ اس فلیٹ کا کرایہ اور اس بڈھی بڈھے کے کھانے پینے کا خرچہ اٹھا رہا تھا اور خود اپنی پیرنی و مرشدنی کی خدمت میں حاضر تھا۔ ان کی شادی کو چار سال ہو گئے تھے لیکن ابھی تک وہ دونوں اولاد اور آخرت کی ہر نعمت سے محروم تھے اور قہر خداوندی کے طلب گار......!

الغرض، اس رہائشی تین منزلہ عمارت کے ہر فلیٹ کی اپنی ایک عبرت اثر کہانی تھی لیکن میرا فوکس اپنے موکل اور اس کیس کے ملزم پر ہے جو کچھ عرصہ پہلے اسی عمارت "حاجی منزل" کی دوسری منزل کا مقیم ہوا کرتا تھا۔ اس نے یہ فلیٹ چند مسائل کی وجہ سے چھوڑا تھا اور مالک مکان حاجی یعقوب کے وکیل بیٹے عقیل بزمی کے ساتھ ہونے والی بدمزگی کی پاداش میں قتل کا ملزم ٹھہرا دیا گیا تھا۔

"حاجی منزل" مقتول کے مفلوج باپ حاجی یعقوب کی ملکیت تھی۔ اس کے تینوں فلیٹس اور نیچے والی دونوں دکانیں کرائے پر اٹھی ہوئی تھیں۔ حاجی یعقوب کی عمر ستر سے متجاوز تھی۔ وہ پچھلے دس سال سے محتاجی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں مفلوج تھیں۔ ایک حادثے کے نتیجے میں وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ عقیل بزمی اس کی اکلوتی اولادِ نرینہ تھا۔ حاجی یعقوب کی چار بیٹیاں تھیں جو سب کی سب شادی شدہ تھیں۔ اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ عقیل بزمی کے ساتھ کھارادر کے علاقے میں رہتا تھا جو کہ اس کا آبائی مکان تھا اور اب اس کے مفلوج بڑھاپے کا واحد سہارا عقیل بزمی رہے "مقتولیت پر فائز" ہو چکا تھا۔

ملزم قاسم ماہانہ آٹھ سو روپے کرایہ ادا کیا کرتا تھا اور اس نے اس فلیٹ میں رہائش اختیار کرتے وقت ایڈوانس کے طور پر پانچ ماہ کا کرایہ یعنی مبلغ چار ہزار روپے ادا

کر رکھے تھے۔ ایک بیڈ روم، ایک لاؤنج پر مشتمل اس چھوٹے سے فلیٹ کے آٹھ سو کرائے سے اپنے ذہن کو الجھانے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ آج سے کم و بیش اتنالیس، چالیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ دورِ حاضر میں ایسے فلیٹ کا کرایہ پچیس سے تیس ہزار ماہانہ چل رہا ہے۔

عقیل بزمی نے حساب کتاب کے لیے قاسم کو ٹاور کے علاقے میں واقع "کیفے اوکے" نامی ایک ریسٹورنٹ میں بلایا تھا۔ مذکورہ ریسٹورنٹ مقتول کی رہائش کے نزدیک تھا اور وہ اکثر رات کو وہاں بیٹھا کرتا تھا۔ ریسٹورنٹ کا مالک اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ "کیفے اوکے" کا بالائی کمرا عقیل بزمی اور اسی کے جیسے کرم فرماؤں کے لیے مختص تھا جہاں مقتول اپنے ملاقاتیوں کی سنگت میں روزانہ دو چار گھنٹے گزارا کرتا تھا۔ قاسم کو بھی مقتول نے وہیں آنے کو کہا تھا۔

اس وقت ان دونوں کے علاوہ اس مختصر سے صاف ستھرے کمرے میں ایک اور شخص بھی موجود تھا جس کا نام واجد قریشی تھا۔ واجد ایک سیاسی آدمی تھا اور اس کا شمار مقتول کے دوستوں میں ہوتا تھا۔ مقتول اور ملزم آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان میز پر کرائے کا ایگریمنٹ رکھا تھا۔ مقتول نے اپنی جیب میں سے تین ہزار روپے کے کرنسی نوٹ ملزم کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس ایگریمنٹ کی تحریر کے مطابق آپ کے چار ہزار روپے بطور ایڈوانس حاجی صاحب کے پاس جمع تھے۔ ان میں سے میں نے ایک ہزار کاٹ لیے ہیں۔"

"وہ کس لیے وکیل صاحب؟" ملزم نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "میں تو ہر ماہ پابندی سے کرایہ آپ کو دے رہا ہوں۔ اگر آپ کو بلز کی مد میں کچھ رقم روکنا ہی ہے تو سو، ڈیڑھ سو روپے روک لیں۔ میرے خیال میں دس روز بعد آنے والے بلز اس سے زیادہ کے نہیں ہوں گے۔"

"میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔" مقتول نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ کا کرایہ بالکل کلیئر ہے اور یوٹیلٹی بلز بھی اتنے کے ہی ہوں گے۔ میں یہ ایک ہزار روپے کسی اور وجہ سے کاٹ رہا ہوں۔"

"اور کون سی وجہ......؟" ملزم کے استفسار سے الجھن جھلک رہی تھی۔

"آپ نے ہمارے فلیٹ کو جو نقصان پہنچایا ہے۔" مقتول نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "یہ کٹوتی اسی سلسلے میں ہے۔"

"یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں جناب!" ملزم نے بے یقینی سے مقتول کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو الٹا آپ کے فلیٹ کا اس طرح خیال رکھا ہے جیسے یہ میرا ذاتی گھر ہو۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بہت سارے کام کر سکتا ہوں۔ ان چار سالوں میں، میں نے آپ کو کبھی کسی کام کے لیے زحمت نہیں دی۔ الیکٹرک، پلمبنگ، کارپینٹنگ کا کوئی مسئلہ ہو یا موٹروں کی خرابی کا ایشو، میں نے خود ہی ٹھیک کیا ہے اور ماہانہ کرائے میں سے ایک روپیہ بھی نہیں کاٹا اور آپ الٹا میری ہی طرف ایک ہزار روپے نکال رہے ہیں؟"

"انسان جہاں رہتا ہے، وہاں یہ سب کرنا پڑتا ہے قاسم صاحب!" مقتول نے روکھے لہجے میں کہا۔ "آپ نے یہ سب کر کے حاجی صاحب پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میرا اشارہ کسی اور نقصان کی جانب ہے۔"

ملزم نے الجھن زدہ نظر سے مقتول کو گھورا اور پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "مثلاً کون سا نقصان؟"

مقتول نے کرائے کا ایگریمنٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ "اس میں سب کچھ تفصیل سے لکھا ہوا ہے۔ کیا آپ نے ان چار سالوں میں کبھی اسے پڑھنے کی زحمت کی؟ اس میں تمام شرائط اور قواعد و ضوابط بڑی وضاحت کے ساتھ درج ہیں۔"

"میں تو ٹھیک سے اردو نہیں پڑھ پاتا۔" ملزم نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "اور اس ایگریمنٹ میں تو سب کچھ انگلش میں لکھا ہوا ہے۔"

"اگر تم ان پڑھ، جاہل اور گنوار ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" مقتول نے "آپ" سے "تم" پر آتے ہوئے برہمی سے کہا۔ "اگر تم اس ایگریمنٹ کو نہیں پڑھ سکتے تھے تو کسی سے پڑھوا کر سمجھ لیا ہوتا۔ یہ قانونی دستاویز جس پر تمہارے دستخط موجود ہیں، اسے ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کے لیے تیار نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ اونر جس کنڈیشن میں فلیٹ کرائے دار کے حوالے کر رہا ہے، اسی کنڈیشن میں کرائے دار نے مالک مکان کو واپس بھی کرنا ہے جبکہ تم نے ان چار سالوں میں فلیٹ کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے اور یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ تم نے اپنے گھر کی طرح اس کا خیال رکھا ہے۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے غصیلی نظر سے ملزم کو دیکھا پھر طنزیہ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے دونوں کمروں میں نئے پنکھے، کچن میں چولہا، اطلاعی گھنٹی اور تمام لائٹس وغیرہ بھی لگا کر دی تھیں۔ کوئی بھی مالک مکان ایسی فیور نہیں دیتا اور اس وقت فلیٹ کی اندرونی حالت افسوسناک ہے۔ کچن کا ووڈن کیبنٹ

جگہ سے جلا ہوا ہے، چولہا بھی کباڑا بن چکا ہے۔ کچن والی کیبنٹس پر چکناہٹ کے بدنما دھبے دیکھنے والی آنکھ کو کسی بھوت کے مانند ڈرانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ واش روم کا دروازہ نیچے سے پوری طرح گل چکا ہے۔ تمہارے بیوی بچوں کو فوارے کے نیچے غسل فرمانے کا بہت شوق ہے لیکن اتنی تمیز نہیں کہ شاور کا رخ کس طرف رکھنا چاہیے۔ ان کے ساتھ ساتھ دروازہ بھی چار سال بھگتتا رہا ہے۔ تمام دروازوں کے لاک غائب ہیں۔ ان کی جگہ چٹخنیاں لگادی گئی ہیں۔ میں نے کچن اور واش روم میں اعلیٰ درجے کے ٹھنڈے گرم پانی کے نل لگائے تھے جو کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ اب وہاں گھٹیا قسم کے نل نظر آتے ہیں اور پورے فلیٹ کا پینٹ بھی بری طرح تباہ ہوچکا ہے۔ اس کنڈیشن میں کوئی پارٹی اس فلیٹ کو کرائے پر لینے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔ میں نے تمہارے ایڈوانس میں سے ایک ہزار روپے اسی لیے کاٹے ہیں تاکہ فلیٹ کی حالت کو روز اول جیسا کرسکوں اور یہ ایگریمنٹ کے عین مطابق ہے۔ تم کسی انگریزی جاننے والے شخص سے اس دستاویز کو پڑھوالو۔ اگر میں غلط کر رہا ہوں تو جا کر مجھ پر کیس کردو۔"

"یہ تو سراسر زیادتی والی بات ہے جناب!" ملزم نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ "آپ نے کرائے دار کی ذمے داریوں کے حوالے سے بڑی تاثیر انگیز تقریر کی ہے۔ اس کے جواب میں اگر میں کرائے دار کے حقوق گنوانا شروع کروں گا تو آپ اس تلخ حقیقت کو برداشت نہیں کرسکیں گے۔ ہر ماہ کرایہ وصول کر کے مطمئن ہوجانا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس کے بدلے میں مالک مکان پر بھی کئی ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔"

"اگر تمہیں حقوق و فرائض کی جنگ لڑنے کا کیڑا کاٹ رہا ہے تو بڑے شوق سے عدالت میں آجانا۔" مقتول نے ملزم کو حقارت بھری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور اب جاؤ یہاں سے... گیٹ آؤٹ!"

اس بحث بحثی کے بعد ہی وہ گرما گرمی ہوئی تھی جس کا ذکر ملزم کی بیوی فریحہ نے اس رات فون پر مجھ سے کیا تھا۔ ملزم نے مجھے بتایا کہ مقتول سے اس کی بدمزگی کے دوران میں وہاں موجود مقتول کا دوست واجد قریشی بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ گوشت و پوست کا کوئی انسان نہیں بلکہ ایک سنگی مجسمہ ہو۔

میرے موکل نے اس امکان کا اظہار بھی کیا تھا کہ [illegible]

انگور سے دل بہلا رہے تھے۔ اس نے اس مختصر سے بالا خانے (ریسٹورنٹ کے بالائی کمرے) کی فضا میں مرکے جیسی بو بھی محسوس کی تھی اور مقتول جب اس سے مذاکرات کر رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں بھی خماری بڑی واضح دکھائی دے رہی تھی۔

بعدازاں میری تحقیق نے ملزم کے تمام خدشات پر مہر تصدیق ثبت کردی تھی۔ نادرن کے علاقے میں واقع "کرینچی اوکے" نامی اس ریسٹورنٹ کے بالائی کمرے میں اس نوعیت کی سٹنگز ہوا کرتی تھیں۔ مقتول کا اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں بیٹھنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ کاروباری گفتگو کے ساتھ ساتھ یہ شوق پورا کرنے کی آزادی بھی حاصل تھی۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کردیا۔ اسی روز میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواست ضمانت بھی دائر کردی اور اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

"یور آنر! میرا موکل ایک مزدور پیشہ غریب انسان ہے اور اپنے گھر کا واحد کفیل بھی۔ یہ لوگ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں اس لیے معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ ملزم کی ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اسے رزق کمانے کے لیے آزاد کردیا جائے تاکہ ان کے گھر کا چولہا جلتا رہے۔"

"یہ کوئی معمولی سی چوری یا ٹریفک کا کوئی قانون توڑنے کا کیس نہیں ہے جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے ملزم کی ضمانت کے خلاف زور آزمائی کرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ "ایک قانون داں کی جان گئی ہے۔ صرف اس بنا پر ملزم کو ضمانت پر رہا نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کوئی غریب شخص ہے۔ اس فارمولے کے تحت تو ہر مزدور اور غریب انسان کو ہر نوعیت کا جرم کرنے کا گویا لائسنس مل جائے گا۔"

وکیل استغاثہ کے آخری جملے پر حاضرین عدالت میں ہلکی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جج نے چوبی ہتھوڑے کو مخصوص انداز میں چلایا اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"آرڈر، آرڈر... آرڈر ان دی کورٹ!"

اگلے ہی لمحے کورٹ روم (کمرۂ عدالت) میں خاموشی چھا گئی۔

"جناب عالی! میرا موکل بے قصور ہے۔" میں نے اپنے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کسی گہری سازش [illegible]

پر میں اس کی بے گناہی کو ثابت کر کے، اس کے خلاف کی جانے والی سازش کو بھی بے نقاب کردوں گا۔"

"وقت آنے پر..." وکیل سرکار نے استہزائیہ انداز میں میرے الفاظ دہرائے پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ "میں اپنے فاضل دوست کی پیش کردہ تجویز سے مکمل اتفاق کرتا ہوں یور آنر!" اس کے لہجے سے طنز ٹپکتا تھا۔ "جب ڈیفنس اپنے موکل کی بے گناہی کو ثابت کر کے ملزم کے خلاف رچائی جانے والی سازش کا پردہ فاش کردیں گے تو مجھے ملزم کی رہائی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن..." اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر مجھے تپانے کی غرض سے کہا۔

"اور وہ ناممکن وقت آنے تک میں ملزم کی ضمانت کے خلاف جاتے ہوئے اس خطرناک شخص کو عدالتی ٹرائل پر رکھنے کی درخواست کرتا ہوں۔"

"ملزم کی عمر پچاس سے تجاوز کر رہی ہے جناب عالی!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کی زندگی میں کسی معمولی سے معمولی جرم کا سراغ بھی نہیں ملتا لہٰذا اسے "خطرناک شخص" قرار دینا سراسر زیادتی ہوگی۔"

وکیل استغاثہ جبران عدیل ایک منجھا ہوا پبلک پراسیکیوٹر تھا۔ اسے مقتول سے بھی اونچے پائے کا وکیل سمجھا جاتا تھا۔ میں مقتول کی طرح جبران عدیل کے کارناموں سے بھی بخوبی واقف تھا۔

"کوئی بھی شخص اپنے جرم کے وقت جس طرح مجرمانہ ریکارڈ کے ساتھ اس دنیا میں قدم نہیں رکھتا، ویسے ہی یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ پچاس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد کوئی جرم نہیں کرے گا اور وہ جیسا پاک دامن پیدا ہوا تھا، ویسا ہی بے قصور و بے گناہ اس دنیا سے رخصت ہوجائے گا۔" وکیل استغاثہ نے معتدل انداز میں کہا۔ "دنیا بھر کی عدالتوں کے ریکارڈ پر ایسے کیسز بھی موجود ہیں جب کسی شخص نے اپنی زندگی کی آخری سانسوں میں بھی کسی سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا یعنی ساٹھ... ستر... اسی سال کی عمر میں اور یہاں تو معاملہ بالکل صاف ہے۔ پولیس کے پاس ملزم کے خلاف اتنے ٹھوس ثبوت موجود ہیں کہ کسی بھی قیمت پر اسے ضمانت پر رہا نہیں کیا جاسکتا۔"

"میں اپنے موکل کے عدالتی ٹرائل کے خلاف نہیں ہوں یور آنر!" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں نے معزز عدالت سے ملزم کی بریت کے لیے نہیں بلکہ ضمانت پر اس کی رہائی کی استدعا کی ہے تاکہ وہ اپنی فیملی کی کفالت کے لیے کام دھندا کرسکے۔ باقی عدالت بھی یہیں ہے اور کیس بھی یہیں۔ دونوں جانب سے ٹھوس ثبوت اور دلائل کا سلسلہ جاری رہے گا۔ بہت جلد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے جبران عدیل کی طرف دیکھا پھر طنزیہ انداز میں کہا۔

"یہ گھوڑا اور یہ میدان... پھر ڈر کاہے کا؟"

"یور آنر!" وکیل استغاثہ نے برا سا منہ بنا کر مجھے نظر انداز کرتے ہوئے روئے سخن جج کی جانب موڑ لیا اور کہا۔ "آلۂ قتل وہ خنجر نما چھری ملزم کی ملکیت ہے اور اس کے دستے پر ملزم کے فنگر پرنٹس بھی پائے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ملزم کی جائے وقوعہ پر آمد و جامد کا ایک چشم دید گواہ بھی موجود ہے۔ دیگر درجنوں ایسے عوامل اور ثبوت بھی استغاثہ کو حاصل ہیں جو ملزم کو مجرم ثابت کرسکتے ہیں لہٰذا ملزم کی درخواست ضمانت کو منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔" پھر اس نے ایکوزڈ باکس میں کھڑے میرے موکل کی سمت انگلی اٹھاتے ہوئے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہی از اے کولڈ بلڈڈ کلر...!"

"یعنی کہ... بے رحم اور سفاک قاتل؟" میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "یس! آئی مین اٹ۔"

"شکریہ میرے فاضل دوست!" میں نے معتدل انداز میں کہا پھر گھوم کر جج سے مخاطب ہوا۔ "جناب عالی! میرے موکل کی درخواست ضمانت تو زیر سماعت ہے ہی۔ میں اس کے ساتھ ہی معزز عدالت سے ایک اور استدعا بھی کرنا چاہوں گا۔"

"کیسی درخواست؟" جج نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"میرے فاضل دوست کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں "آئی وٹنس" کی حیثیت سے شامل کرنے کی درخواست۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ "انہوں نے ابھی کورٹ روم میں معزز عدالت کے روبرو ملزم کو ایک سفاک اور بے رحم قاتل کا نام دیا ہے اور اس دعوے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پبلک پراسیکیوٹر مقتول بزمی کا قتل میرے فاضل دوست کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا ورنہ ایک ملزم کو قاتل یعنی مجرم کہنا کسی بھی طور پر قانوناً جائز ہے اور نہ ہی منطقاً درست۔" پھر میں نے جبران عدیل کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں اضافہ کردیا۔

"ایم آئی رائٹ مائی ڈیئر کونسلر؟"

وہ کھسیانا سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میرے اٹھائے ہوئے نقطۂ اعتراض پر جج نے وکیل استغاثہ سے کہا۔ "جب تک کسی ملزم کا جرم ثابت نہیں ہو جاتا، اسے مجرم نہیں کہا جا سکتا۔ آپ اپنے بیان میں سے "کولڈ بلڈڈ کلر" کے الفاظ کو خارج کر کے ضمانت کے خلاف دلائل دے سکتے ہیں۔"

اس کے بعد وکیل استغاثہ میرے موکل کی ضمانت کو رکوانے کے لیے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی کوڑیاں لالا کر عدالت میں پیش کرنے لگا۔

قتل کے ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی، خصوصاً جب چالان میں عینی شاہد کا ذکر موجود ہو اور آلۂ قتل پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات بھی پائے گئے ہوں۔ میرے موکل کے خلاف تیار کردہ چالان میں تو پولیس نے قتل کا محرک بھی لکھ ڈالا تھا چنانچہ عدالت نے ملزم قاسم کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیجنے کے احکامات صادر کرنے کے بعد اگلی پیشی کے لیے ایک ماہ کی تاریخ دے دی تھی۔

جب میں عدالت کے کمرے سے باہر آیا تو فریحہ میرے ساتھ تھی۔ اس نے عدالت میں موجود رہ کر آج کی پوری کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھی اور اپنے کانوں سے سنی تھی۔ کوریڈور میں میرے برابر چلتے ہوئے اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بیگ صاحب! آج کی کارروائی تو بیکار رہی گئی۔"

میں اس کی مایوسی کا سبب بخوبی سمجھتا تھا پھر بھی میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"میں سمجھ رہی تھی کہ آج قاسم کی ضمانت ہو جائے گی اور میں اسے اپنے ساتھ لے کر گھر جاؤں گی۔" اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ "اسی مقصد کے لیے میں نے آپ کو اس کا وکیل مقرر کیا تھا۔"

سو میں سے پچانوے کلائنٹس قانونی معاملات کی حقیقت سے واقف نہیں ہوتے اسی لیے چھوٹی موٹی پیچیدگی پر بھی ان کا ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے اور ان میں سے بعض تو ابتدائی مراحل میں ہی ہمت چھوڑ بیٹھتے ہیں اور پہنچے ہوئے باباؤں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں جو اپنے کسی کرشماتی تعویذ سے کیس کو ان کے حق میں موڑ دیں۔ ایسے پہنچے ہوئے عامل کامل بابا لوگ اپنے سائلین کو کہاں "پہنچا" دیتے ہیں، یہ ایک وسیع موضوع ہے جس پر گھنٹوں نہیں بلکہ مہینوں اور سالوں بحث کی جا سکتی ہے۔

میں نے اوپر جن پچانوے فیصد کلائنٹس کا ذکر کیا انہیں دراصل سمجھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کام ایک اچھے وکیل کے فرائض کا حصہ ہوتا ہے۔ اگرچہ ہر شخص کو سمجھانا ممکن نہیں ہوتا لیکن یہ سوچ کر ایسی کوشش کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں فریحہ کو معاملات عدالت سے روشناس کرانے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آپ نے اس کیس میں مجھے اپنے شوہر کی پیروی کرنے کے لیے چنا، یہ آپ کا ایک درست اقدام ہے۔ اگر آپ کا تعاون مجھے حاصل رہا تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ قاسم اس عدالتی جھمیلے سے باعزت بری ہو جائے گا۔"

اس کے چہرے پر اطمینان کا ایک رنگ سا آ کر گزر گیا پھر وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوئی۔ "آپ مجھ سے کس طرح کا تعاون چاہتے ہیں؟"

قاسم کی گول مٹول سادہ لوح بیوی کے استفسار کے جواب میں، میں نے کہا۔ "آپ کو ہمت سے کام لینا ہے۔ اپنے حوصلے کو جمع کر کے رکھنا ہے اور ایک دو گھریلو کام کرنے ہیں۔ قاسم تو جے سی (جیل کسٹڈی) ہو گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ کام آپ بہ آسانی کر لیں گی کیونکہ اس کا تعلق "حاجی منزل" میں رہنے والے آپ کے پرانے پڑوسیوں سے ہے۔"

"آپ کام بتائیں۔" وہ ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے جلدی سے بولی۔ "قاسم کی باعزت بریت کے لیے آپ جو کہیں گے، میں کرنے کے لیے تیار ہوں بیگ صاحب!"

آئندہ دس منٹ میں، میں نے اسے اس کی "جاب" کے بارے میں اچھی طرح سمجھا دیا اور آخر میں کہا۔

"ہر پیشی پر آپ کو عدالت آنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کے معاملات کو میں دیکھ لوں گا۔ اگر کوئی اہم بات ہوئی تو میں آپ کو اپنے آفس میں بلا لوں گا۔ آپ کو بچوں کا خیال رکھنا چاہیے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ جو آپ ہمارے لیے اپنے دل میں ہمدردی کے جذبات رکھتے ہیں۔" وہ متفکرانہ انداز میں بولی۔ "میرے بچے اب اتنے بھی چھوٹے نہیں رہے کہ انہیں ہر وقت ماں کی ضرورت ہو۔ میری بڑی بیٹی کرن نے انٹر کیا ہے اور وہ گھر ہی میں ہوتی ہے۔ اس سے چھوٹا بیٹا جواد پندرہ سال کا ہے۔ وہ اگلے سال میٹرک کا امتحان دے گا اور سب سے چھوٹا بیٹا فواد بھی پانچویں جماعت میں ہے۔ کرن نے گھر کے کاموں کو پوری طرح سنبھال رکھا ہے اور پھر کون سا روز روز مجھے عدالت آنا ہے۔ بس میری

"اگر اس روز ملزم اور مقتول کے بیچ جاری جھگڑے میں، میں نے دخل اندازی کی کوشش نہیں کی تو اس سلسلے میں مجھ پر قانون کی کون سی دفعہ لگائی جا سکتی ہے؟"

"بنیادی اخلاقیات ہر انسان اپنے بچپن ہی میں سیکھ لیتا ہے۔ اگر والدین نے اس کی معقول تربیت کی ہو تو......!" میں نے قریشی کے واہیات استفسار کا جواب دیتے ہوئے ترش لہجے میں کہا۔ "ایسی مثبت باتوں کے نفاذ کے لیے قانون کی کتابوں میں باب پر باب باندھنے کی ضرورت نہیں لیکن میں نے آپ کی اس حرکت کے ذیل میں ایک دفعہ سوچ لی ہے۔"

"وہ کیا؟" قریشی مضطرب لہجے میں مستفسر ہوا۔

"ایک اچھا سیاست داں بننے کے لیے بنیادی طور پر ایک اچھا انسان ہونا بہت ضروری ہے۔" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن اس روز آپ نے جس مجرمانہ غفلت اور غیر ذمے داری کا ثبوت دیا تھا، وہ آپ کو ایک اچھے انسان کے منصب سے کک آؤٹ کرتا ہے۔ اب آپ اپنے گریبان کے اندر جھانک کر خود ہی فیصلہ کرلیں کہ اپنے ضمیر کی عدالت میں آپ کس پائے کے سیاست داں ہیں؟"

واجد قریشی کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ مجھے کچا چبانے کی پلاننگ کر رہا ہو لیکن افسوس کہ عدالت کے روبرو اس کی یہ تمنا پوری نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھورنے پر اکتفا کرکے اپنے انتقامی جذبات کو سہلانے کی کوشش کرتا رہا۔

"مجھے استغاثہ کے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہاں...... میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند اہم سوالات کرنے کی اجازت چاہوں گا۔"

جج نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "پرمیشن گرانٹیڈ!"

کسی بھی کیس میں تفتیشی افسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔

چند سیکنڈ پہلے جہاں واجد قریشی کھڑا تھا، اس کی جگہ اب آئی او (انکوائری آفیسر) نے لے لی تھی۔ آئی او عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ اس کا نام جنید شاہ تھا۔

"شاہ جی! میں نے اس کیس کی فائل، پوسٹ مارٹم اینڈ کیمیکل ایگزامنر رپورٹ اور دیگر چیزوں کو بڑی باریک بینی سے چیک کیا ہے۔" میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "امید ہے، اس سلسلے میں آپ نے بھی کسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کیا ہوگا۔"

"اس کیس کا چالان میں نے بڑی احتیاط اور ذمے داری سے تیار کیا ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "لہٰذا کسی غفلت یا کوتاہی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"جب مارکیٹ میں سچے اور کھرے جوابات کا فقدان پیدا ہو جائے تو پھر نت نئے سوالات کو اٹھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔" میں نے ذو معنی انداز میں کہا۔ "بہرحال، آپ جیسے مستعد پولیس آفیسر سے بات کرکے مزہ آئے گا۔"

جنید شاہ نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں نے "مزہ" کا لفظ کس حوالے سے استعمال کیا تھا۔ میں نے اسے سوچوں سے باہر نکالنے کی غرض سے کہا۔

"پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، مقتول عقیل بزمی کی موت چھبیس اکتوبر کی رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ میری معلومات کے حساب سے مقتول ہر جمعرات دس بجے سے نصف شب تک کیفے اوکے کے بالائی کمرے میں اپنے خاص دوستوں کے ساتھ پارٹی کیا کرتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقتول کے وہاں پہنچتے ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں وکیل صاحب!" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "کیونکہ پوسٹ مارٹم رپورٹ غلط نہیں ہو سکتی۔"

"اتفاق میں برکت ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "یہ محاورہ ہم سب نے اپنے بچپن ہی سے پڑھ رکھا ہے۔ مجھے تو اس محاورے کی صداقت پر پختہ یقین ہے۔ آپ کا مجھے پتا نہیں۔"

اپنی بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ "میں نے بھی اس محاورے کو درست ہی پایا ہے۔"

"پھر تو اور بھی زیادہ مزہ آنے والا ہے۔" میں نے معنی خیزی کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کیمیکل ایگزامنر نے اپنی رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ مقتول کے معدے سے حاصل ہونے والے مواد میں نشہ آور اشیا کی آمیزش پائی گئی ہے۔ آپ کے خیال میں

قاتل نے مقتول کی زندگی کا چراغ گل کرنے سے پہلے اسے کوئی نیند کی گولی یا کوئی انجکشن دے دیا ہوگا؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ بڑے وثوق سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "مقتول، ملزم کو اچھی طرح جانتا تھا اور وقوعے سے لگ بھگ ایک ماہ پہلے ان دونوں میں شدید نوعیت کا جھگڑا ہو چکا تھا لہٰذا اس بات کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا کہ اس نے ملزم کے ہاتھ سے کوئی نشہ آور شے لے لی ہو۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں......" لمحاتی توقف کرکے اس نے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا پھر ٹھوس انداز میں بولا۔ "آپ نے جس دختر انگور کا ذکر کیا ہے، مقتول نے وہ کچھ زیادہ ہی لے لی ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے حواس میں نہ رہا ہو اور ملزم نے مقتول کی اسی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی گردن کاٹ ڈالی ہو۔"

"آپ سے اتفاق کرنے کا معاہدہ کر چکا ہوں شاہ جی! چنانچہ ذہن کے قبول نہ کرنے کے باوجود بھی میں آپ کی تھیوری کو مان رہا ہوں کیونکہ اس کے اندر ایک ایسی شے موجود ہے جو میرے موکل کے حق میں جاتی ہے۔" میں نے اپنے بیان کو نتیجے دار بناتے ہوئے کہا پھر چوبی میز پر رکھے ہوئے آلۂ قتل کو اٹھا کر آئی او کی نگاہوں کے سامنے جھلاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اسی چھری کی مدد سے مقتول کی گردن کاٹی گئی تھی؟"

آلۂ قتل یعنی وہ خطرناک تیز دھار چھری، اہم ثبوت کی حیثیت سے ایک سیلوفین بیگ کے اندر محفوظ تھی۔ اس کی دھار پر مقتول کا خون بھی موجود تھا جو خشک ہونے کے بعد سیاہ رنگت اختیار کر چکا تھا۔

"جی بالکل!" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "یہ چھری ہمیں جائے وقوعہ سے ملی تھی۔ ملزم نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ یہ چھری اسی کی ملکیت ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ بہانہ کر رہا ہے کہ مذکورہ چھری کہیں گم ہو گئی تھی۔ بہرکیف، اس چھری کے دستے پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں، خیر......" اس نے کچھ ایسے انداز سے توقف کیا جیسے اسے کوئی خاص بات یاد آ گئی ہو پھر اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ اس کے استفسار میں بے تابی پائی جاتی تھی۔

"آپ نے بتایا نہیں۔ میری تھیوری میں ایسی کون سی شے ہے جو ملزم کے حق میں جاتی ہے؟"

"آپ نے ملزم کے جائے وقوعہ پر پہنچنے اور مقتول کا گلا کاٹنے والے واقعے کو امکانی انداز میں بیان کیا ہے۔ مثلاً ایسا ہوا ہوگا، ویسا ہوا ہوگا......" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو بھی اس بات کا یقین نہیں ہے کہ میرے موکل ہی نے حاجی یعقوب کے وکیل بیٹے کو موت کی نیند سلایا ہے؟"

"آپ میرے بیان سے غلط مطلب اخذ کر رہے ہیں وکیل صاحب!" وہ سنبھلتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ملزم کے قاتل ہونے کے ٹھوس ثبوت ہمارے پاس موجود ہیں جن کی بنا پر یہ سزا سے بچ نہیں سکے گا۔"

اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی آئی او خاصا چوکنا ہو گیا تھا لیکن مجھے اس کی ہوشیاری اور چوکنے پن سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ میں نے اپنا ہوم ورک اچھے سے کر رکھا تھا۔

"ٹھوس ثبوت!" میں نے آلۂ قتل والے سیلوفین بیگ کو ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے لاتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ "یعنی یہ تیز دھار چھری جس کی مدد سے مقتول کا گلا کاٹا گیا اور 'کیفے اوکے' کا وہ ویٹر...... جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ملزم کو مقتول کی گردن پر چھری چلاتے دیکھا تھا...... ہیں نا؟"

"فیاض نے ملزم کو بالائی کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" وہ بے ساختہ بول اٹھا۔ "ملزم کے واپس جانے کے بعد جب فیاض، مقتول کا آرڈر لے کر اوپر پہنچا تو مقتول اپنی کرسی پر اس طرح لڑھکا ہوا تھا کہ اس کا گلا کٹا ہوا تھا اور...... اور وہ زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔"

"تھینک یو شاہ جی......!" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "باقی کی باتیں آئندہ پیشی پر کریں گے۔ ابھی مجھے ان فوٹوگرافس پر بھی آپ کی قیمتی رائے لینا ہے جو آپ کے ساتھ جانے والے سرکاری فوٹوگرافر نے جائے واردات پر مقتول کی کٹی ہوئی گردن کی بنائی تھیں۔ مذکورہ تمام تصاویر کیس فائل کے اندر لگی ہوئی ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا شاہ جی؟"

"آپ نے بالکل درست فرمایا ہے۔ وہ فوٹوگرافس اس کیس کا حصہ ہیں۔" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ سے سوال و جواب تو ہوتے رہیں گے لیکن یہ تو بتا دیں کہ آپ نے کس بات کے لیے میرا شکریہ ادا کیا ہے؟"

میں اس کی اندرونی بے چینی اور اس کے دماغ میں مچی ہوئی کھلبلی سے بخوبی واقف تھا مگر میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے چند لمحات کے لیے اسے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھا پھر گول مول انداز میں کہا۔

"وکیل مخالف کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے میں تہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں شاہ جی۔ آپ اپنے ذہن پر خوامخواہ کا دباؤ بڑھانے کی کوشش نہ کریں۔ یہ عمل آپ کی صحت کے لیے سازگار نہیں ہوگا۔ ابھی یہ کیس زیر سماعت ہے اور آئندہ پیشی پر ہم نے مقتول کی کٹی ہوئی گردن والی فوٹو گرافس پر بھی ڈسکس کرنا ہے۔"

وہ بے دلی سے اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا اور یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ میں تو صرف اور صرف اپنے موکل کو اس کیس سے باعزت بری کرانے کا ذمے دار تھا اور یہ ذمے داری میں بخوبی نبھا رہا تھا جو میرے اطمینان کے لیے کافی تھا۔

میری اور انکوائری آفیسر کی گفتگو اور ہوتے ہوتے عدالت کا مقررہ وقت بھی ختم ہو گیا تھا۔ جج نے اگلی سماعت کی تاریخ دی تو میں نے کہا۔

"یور آنر! آئندہ پیشی پر میں کچھ خاص کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جو اس کیس کا پانسا پلٹ دے گا لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ ہمارے کیس کو سب سے اوپر لگانے کے احکامات صادر کیے جائیں تاکہ مجھے اپنا کام کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے۔"

میری اس خلاف توقع درخواست پر وکیل استغاثہ جبران عدیل اور تفتیشی افسر جنید شاہ نے الجھن بھری نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے بھی کیے لیکن میری فرمائش نما عرضی میں چونکہ کوئی قباحت نہیں تھی لہٰذا جج نے پیشکار کو خصوصی ہدایت دینے کے بعد عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دی کورٹ از ایڈجارنڈ!"

آج کی عدالتی کارروائی سے فریحہ بہت خوش تھی۔ میری کارکردگی نے اسے مایوسی کے گھنے بادلوں سے نکال کر جینے کا حوصلہ بخشا تھا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی طرف سے چار گواہوں کو پیش کیا گیا جن میں سے دو کے بیانات میں کوئی خاص بات نہیں تھی اس لیے میں ان کا ذکر گول کر کے آگے بڑھتا ہوں۔ اس پیشی کے لیے میں نے اپنے گواہ بھی ارینج کر رکھے تھے۔

اگلا گواہ "ریکو ڈرائی کلینرز" کا مالک ابرار علی تھا۔ ابرار کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک عام سی شکل صورت اور گندمی رنگت کا شخص تھا۔ واضح رہے کہ "حاجی منزل" صدر کے نچلے حصے میں جو دو دکانیں تھیں، ان میں سے ایک بسم اللہ بیکری اور دوسری یہی ریکو ڈرائی کلینرز ہی کی تھی۔

ابرار علی نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ اس کے قریب چلا گیا اور ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ اس بندے کو جانتے ہیں؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا پھر ناپسندیدہ نظر سے ملزم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کچھ عرصہ پہلے تک یہ ہماری ہی بلڈنگ میں رہتا تھا اور......"

"اور کیا؟" وکیل استغاثہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔

"اور یہ کہ اس کے خیالات بہت خطرناک ہیں۔"

"مثلاً...... اس کے خیالات میں کس قسم کی خطرناکی پائی جاتی ہے؟"

"یہ منفی انداز میں سوچتا ہے۔" گواہ نے بتایا۔ "جس سے ایک بار تو تکرار ہو جائے پھر اسے نقصان پہنچانے کی منصوبہ بندی میں لگ جاتا ہے۔"

"اوہ...... یہ تو واقعی بہت تشویش ناک بات ہے۔" وکیل استغاثہ نے اسے شہ دینے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ بندہ اس وقت کس کیس میں یہاں کھڑا ہے؟"

"اس پر ہماری بلڈنگ کے مالک حاجی یعقوب کے بیٹے کے قتل کا الزام ہے۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے، اسی نے مقتول بزمی کو موت کے گھاٹ اتارا ہوگا؟" وکیل استغاثہ نے اپنے الفاظ کو اس کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"اس میں لگنے والی کون سی بات ہے وکیل صاحب!" گواہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "یہ جس قسم کی باتیں کرتا پھرتا تھا، اس سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ بہت جلد یہ بندہ کوئی چاند چڑھائے گا اور آپ دیکھ لیں، اس نے کیا گھٹیا کام کیا ہے۔ مقتول بھائی بہت ہی اچھے انسان تھے۔"

"تو تم معزز عدالت کو یہ بتانا چاہ رہے ہو کہ ملزم مقتول کے خلاف بھی زہر افشانی کرتا رہتا تھا؟" وکیل استغاثہ نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

گواہ نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"کیا تم عدالت کو بتاؤ گے کہ ملزم، مقتول کے خلاف

کس قسم کی باتیں کیا کرتا تھا؟" وکیل استغاثہ نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

"باتیں تو بہت ساری تھیں وکیل صاحب!" گواہ نے معتدل انداز میں کہا۔ "جیسا کہ یہ مالک مکان کی دولت اور جائیداد کے بارے میں الٹی سیدھی بکواس کرتا رہتا تھا۔ کہتا تھا، ان لوگوں نے کروڑوں کی پراپرٹی بنا رکھی ہے۔ اس وکیل ہی کو دیکھو...... یہ خطرناک مجرموں کو رہا کرا کے ان کی جگہ معصوم اور بے گناہ لوگوں کو سزائے موت دلاتا ہے۔ اگر میرا بس چلے تو میں انہیں گرم تیل کی کڑاہی میں ڈال کر بھون ڈالوں...... اور جب مقتول بھائی اور اس کا جھگڑا ہوا تو ادھر ادھر کہتا پھرتا تھا...... اس وکیل کے بچے کو کچھ اندازہ نہیں کہ میں اس کے ساتھ کون سا سین کرنے والا ہوں۔"

"اسی سین کو کرنے کی پاداش میں یہ سڑیل شخص اس وقت ملزموں والے کٹہرے میں کھڑا ہے اور یہاں سے سیدھا پھانسی کے تختے پر جائے گا۔" وکیل استغاثہ نے زہر آلود انداز میں کہا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے رعونیت بھرے انداز میں ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"ویٹس آل یور آنر!"

استغاثہ کے گواہ ابرار علی کے بیان کو دیکھ کر صاف محسوس ہو جاتا تھا کہ وہ بیان اسے رٹوایا گیا تھا ورنہ اگر میرے موکل کے دل میں اپنے مالک مکان اور اس کے بیٹے کے لیے اس قدر نفرت چھپی ہوتی تو وہ چار سال تک ان کے فلیٹ میں مقیم نہ رہتا۔ ابرار نے میرے موکل کے خلاف اتنا زہر کس مقصد سے اگلا تھا، میں اس سے بخوبی آگاہ تھا اور یہ آگاہی مجھے ملزم کی بیوی فریحہ نے دی تھی۔

"ڈیفنس......!" جج کی مخصوص گونج دار آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں مستعدی سے وٹنس باکس کے نزدیک پہنچا اور استغاثہ کے گواہ پر اس کیس کی سب سے مختصر جرح کی۔ میں نے ابرار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اچھی طرح سوچ کر جواب دو۔ اکیوزڈ باکس میں جس شخص کے بارے میں تم نے ابھی دروغ گوئی کا عالمی ریکارڈ توڑ ڈالا ہے، یہ مجبور ولاچار انسان کون سے ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہے۔ لیفٹ یا رائٹ...... مطلب، دائیں یا بائیں سے؟"

"میں اتنا بھی گیا گزرا نہیں کہ مجھے لیفٹ اور رائٹ کے معنی معلوم نہ ہوں۔" وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ "ملزم اپنے سیدھے یعنی دائیں ہاتھ سے ہر کام کرتا ہے یعنی یہ رائٹ ہینڈڈ ہے۔"

"مجھے تم سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "اس موقع پر میں معزز عدالت سے ایک نمائندہ گواہ کو پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔"

"نمائندہ گواہ......؟" وکیل استغاثہ کی حیرت بھری آواز کورٹ روم میں گونجی۔ "پابندی گواہ، وعدہ معاف گواہ، موقع کا گواہ وغیرہ کا نام تو سنا ہے۔ یہ نمائندہ گواہ کس چڑیا کا نام ہے؟"

"یہ چڑیا نہیں، چڑے کا نام ہے میرے فاضل دوست!" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "جس طرح چڑے کا گوشت نہایت ہی لذیذ، نرم اور توانائی بخش ہوتا ہے، موسم سرما میں بھی انسان کا پسینا نکال دیتا ہے، بالکل ویسے ہی میرے نمائندہ گواہ کا بیان آپ کے گواہ کے بیان کو پگھلا کر رکھ دے گا۔"

میری بات وکیل استغاثہ کی سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن وہ الجھن بھری، معاندانہ نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ قبل اس کے کہ میں اپنے حریف کو کسی اور مشکل میں ڈالتا، جج کی آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کر لی۔

"ڈیفنس "نمائندہ گواہ" کی آسان الفاظ میں تشریح کرے۔"

"جناب عالی! نمائندہ گواہ سے میری مراد ایک ایسا نوجوان ہے جس کا بیان درجن بھر افراد کے خیالات کی ترجمانی کرے گا۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی استغاثہ کے گواہ ابرار علی نے میرے موکل اور اس کیس کے ملزم قاسم کی فطرت اور مزاج کے خلاف جس قسم کی نامعقول باتیں کی ہیں، اس کی تردید کے لیے میں "حاجی منزل" کے گردونواح سے درجن بھر افراد کو یہاں لا سکتا ہوں لیکن کورٹ روم کو مچھلی بازار بننے سے بچانے کے لیے میں نے صرف ایک نوجوان کا انتخاب کیا ہے جو خود بھی "حاجی منزل" کا رہائشی ہے۔ اگر عدالت کا حکم ہوگا تو میں اپنے موقف کی تصدیق کی خاطر ایک درجن کیا، اس سے زیادہ گواہوں کو بھی عدالت میں لا سکتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" جج نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "آپ اپنے نمائندہ گواہ کو اندر بلا سکتے ہیں۔"

ٹھیک دو منٹ کے بعد "حاجی منزل" کی پہلی منزل کی رہائشی صغریٰ بیگم کا اکلوتا بیٹا عدنان وٹنس باکس میں صفائی کے گواہ کی حیثیت سے کھڑا تھا۔ اس نے میری درخواست پر آج سینیٹری والی دکان سے چھٹی کی تھی۔ وہ قاسم کو بے گناہ

سمجھتا تھا اس لیے بڑے جذبے کے ساتھ وہ گواہی دینے عدالت آیا تھا۔

عدنان سچ بولنے کا حلف اٹھا چکا تو میں نے مختصر الفاظ میں اسے ابرار علی کی دروغ گوئی کے بارے میں بتایا اور کہا۔ "تم اس حوالے سے معزز عدالت کو کیا بتانا چاہو گے؟"

"ابرار کی قاسم سے دشمنی کا سبب تو بہت ہی حساس موضوع ہے وکیل صاحب!" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "اس کے علاوہ بھی ابرار کی چکر بازیاں کسی قطار شمار میں نہیں ہیں ـــــ یعنی لاتعداد ہیں۔"

"معزز عدالت ملزم اور گواہ کے بیچ پائی جانے والی رنجش میں خصوصی دلچسپی رکھتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے استغاثہ کے ڈرائی کلینر گواہ کی ایک آدھ چکر بازی کا ذکر بھی ہو جائے تو میرے موکل کے کردار پر لگے ہوئے الزامی دھبوں کی ڈرائی کلیننگ ہو جائے گی۔"

"یہ بندہ کرائے پر بھی کپڑے دیتا ہے۔" عدنان نے پُر اعتماد لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے پاس دھلائی کے لیے جو کپڑے آتے ہیں، ان میں سے قیمتی اور پارٹی ڈریس کو یہ تین چار گھنٹے کے لیے، شادی بیاہ اور دوسری تقریبات اٹینڈ کرنے والے افراد کو کرائے پر دے کر اضافی رقم کما لیتا ہے اور ان کپڑوں کو دوبارہ دھو کر یا محض استری کر کے ہینگرز پر لٹکا دیتا ہے۔ ان کپڑوں کے مالکان کو معلوم ہی نہیں ہوتی کہ ان کے ڈریس کے ساتھ کس نوعیت کی واردات ہو چکی ہے۔"

"یہ تو بہت ہی شرم کی بات ہے۔" میں نے ابرار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو بیان دینے کے بعد حاضرین عدالت کے بیچ جا بیٹھا تھا پھر میں نے روئے سخن اپنے گواہ کی جانب موڑتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ایسی گھٹیا حرکتوں پر یہ کبھی پکڑا نہیں گیا؟"

"کئی بار پکڑا گیا ہے وکیل صاحب!" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "اور کئی لوگوں نے اس کی دھلائی بھی کی ہے مگر انسان کی فطرت میں جو گندگی بھری ہو، اس کی صفائی ممکن نہیں۔"

"ایک ڈرائی کلینر کی ڈرائی کلیننگ ـــــ!" میں نے مزاح کے رنگ میں کہا۔ "ویسے "دھوبی کی دھلائی" بھی برا عنوان نہیں ہے۔" پھر میں نے جج کی سمت دیکھتے ہوئے دبنگ انداز میں اضافہ کر دیا۔

"جناب عالی! جس شخص کا کردار اتنا گھناؤنا ہو، اس کی گواہی کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔"

جج نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور وٹنس باکس میں کھڑے صفائی کے گواہ عدنان سے پوچھا۔ "تم ملزم اور استغاثہ کے گواہ کی آپسی دشمنی کے حوالے سے کیا کہنے والے تھے؟"

"ابرار کی آنکھ میں حیا ہے اور نہ ہی دل میں کوئی شرم ـــــ!" عدنان نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "یہ اپنی ایسی ہی اخلاق باختہ حرکتوں کی وجہ سے بدنام ہو چکا ہے۔ اس نے قاسم بھائی کی جوان بیٹی کرن کو بھی میلی نگاہ سے دیکھا تھا۔ کرن نے گھر جا کر بتایا تو قاسم بھائی نے اسے بہت برا بھلا کہا۔ بس اس دن کے بعد سے یہ بندہ قاسم بھائی سے نفرت کرنے لگا تھا۔"

"تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہو گے؟" جج نے ڈرائی کلینر ابرار علی سے پوچھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جھکی ہوئی گردن کے ساتھ کورٹ روم سے باہر نکل گیا۔ کسی نے بھی اس پلید انسان کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"جناب عالی! سچائی روز روشن کے مانند عیاں ہو چکی ہے۔" میں نے توانا لہجے میں کہا۔ "میرے موکل نے "حاجی منزل" کو کیوں چھوڑا؟ اس کی بنیادی وجہ یہ ڈرائی کلینر ابرار علی ہی تھا۔ ملزم نے متعدد بار مقتول سے اس کی بدنگاہی کی شکایت بھی کی تھی مگر مقتول نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔ مجبوراً ملزم وہ فلیٹ چھوڑ کر خداداد کالونی میں جا بسا اور اب ـــــ" میں نے دانستہ توقف کیا پھر تاثر انگیز آواز میں کہا۔

"اب میرے موکل کو مقتول کی موت کا ذمے دار ٹھہرانے اور قاتل ثابت کرنے کے لیے ابرار جیسے کردار کے لوگوں کو گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ میرا موکل بے گناہ ہے۔ اسے کسی گہری چال کے تحت اس معاملے میں گھسیٹا گیا ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے میرے موکل کو باعزت بری کیا جائے۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا جناب عالی!"

جج تھوڑی دیر تک اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کا جائزہ لیتا رہا۔ ایک کاغذ پر اس نے کوئی نوٹ بھی لکھا پھر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ اپنے کسی اور گواہ کو پیش کرنا چاہیں گے؟"

"یس سر!" وکیل سرکار نے جلدی سے کہا۔ "استغاثہ کا آخری گواہ باقی ہے۔"

"اسے جلدی سے کٹہرے میں بلایا جائے۔" جج نے حکمرانہ انداز میں کہا۔ "آج ڈیفنس اپنے وعدے کے مطابق عدالت میں کچھ خاص کر کے دکھانے والے ہیں۔ کچھ وقت انہیں بھی ملنا چاہیے۔" پھر جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

"استغاثہ کے آخری گواہ سے پہلے یا بعد میں ـــــ؟"

"کسی بھی ڈرامے کا ڈراپ سین ہمیشہ کہانی کے اینڈ پر ہی آتا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے اپنے موکل کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے جو ڈیمو دینا ہے، اس کے لیے آخر کا وقت ہی مناسب رہے گا۔"

جج نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

استغاثہ کا آخری گواہ فیاض وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی عمر تیس کے ارد گرد رہی ہو گی۔ وہ اس ریسٹورنٹ میں ویٹر کی جاب کرتا تھا۔ وہ اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرا چکا تو وکیل استغاثہ اس کے نزدیک پہنچ گیا اور اسے احترام بھرے لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کر دیا۔

"فیاض صاحب! وقوعہ کی رات ملزم کتنے بجے مقتول سے ملنے آیا تھا؟"

"یہی کوئی دس، ساڑھے دس بجے۔" گواہ نے جواب دیا۔

"کیا اس وقت مقتول کیفے کے بالائی کمرے میں موجود تھا؟"

"جی ـــــ وکیل صاحب پانچ دس منٹ پہلے ہی وہاں پہنچے تھے۔" گواہ نے بتایا۔ "میں نے انہیں پانی دیا تھا اور ان کا آرڈر لینے کے بعد واپس مڑا ہی تھا کہ انہوں نے کہا، مجھ سے کوئی ملنے آنے والا ہے۔ تم اسے سیدھا اوپر آنے دینا۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کرنے کا یقین دلایا اور نیچے آ گیا۔ پانچ منٹ سے بھی پہلے ملزم وہاں پہنچ گیا اور اس نے وکیل صاحب سے ملنے کا بتایا۔ میں نے اسے بالائی کمرے میں بھیج دیا لیکن تھوڑی ہی دیر میں یہ واپس آ گیا اور ریسٹورنٹ سے نکل گیا۔ میں یہ سمجھا کہ شاید یہ اتنی ہی دیر کے لیے وکیل صاحب سے ملنے آیا تھا۔ پھر جب میں مقتول کا آرڈر لے کر اوپر گیا تو وہاں میں نے ایک وحشت ناک منظر دیکھا ـــــ!"

اپنے بیان کو ادھورا چھوڑ کر گواہ نے خوفزدہ انداز میں ایک جھرجھری لی تو وکیل استغاثہ نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ "آپ نے بالائی کمرے میں ایسا کیا دیکھ لیا تھا؟"

"وکیل صاحب اپنی کرسی پر مردہ حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کا بدن ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا اور کٹی ہوئی گردن سے خون جاری تھا۔" اس نے ایک ہی سانس میں جائے وقوعہ کا نقشہ بیان کر دیا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وکیل صاحب کو اسی درندے نے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔"

وکیل استغاثہ نے اپنی جرح ختم کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "یور وٹنس پلیز!"

میں وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا اور استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔ "کیا تم میرا ایک کام کر سکتے ہو؟"

وہ مجھ سے کسی ایسے سوال کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہوئے۔ اس نے عجیب سے انداز میں وکیل استغاثہ کو دیکھا پھر ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔

"اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور کروں گا۔"

"ارے ـــــ بس کیا، وہ کام تو تمہارے ٹرک اور ٹریکٹر میں بھی ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"میں ـــــ میں کچھ سمجھا نہیں جناب!" اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔ "پتا نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟"

مصروفیت

ایک صاحب ایک بے حد معروف ڈاکٹر کے پاس گئے۔ انہیں ڈاکٹر سے ملاقات کے لیے ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ اس طویل انتظار کے بعد جب وہ ڈاکٹر کے پاس گئے اور ابھی انہوں نے اپنے مرض کے بارے میں چند الفاظ ہی کہے تھے کہ ڈاکٹر کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور ڈاکٹر صاحب باتیں کرنے لگے۔ اسی طرح ہر دوسرے منٹ پر گھنٹی بجتی اور ڈاکٹر صاحب فون پر مصروف ہو جاتے۔ وہ صاحب یہ صورت حال دیکھ کر واپس جانے لگے تو ڈاکٹر نے پوچھا۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"قریبی فون بوتھ میں۔" ان صاحب نے جواب دیا۔

(مرسلہ: سنبل خان، پشاور)

"ویری سمپل!" میں نے اپنے بیان میں سسپنس کا عنصر برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے، وہ کام بہت ہی آسان ہے اس لیے زیادہ ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں۔"

"جی......" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "بتائیں...... کیا کام ہے؟"

"اس میز پر آلۂ قتل رکھا ہوا ہے۔" میں نے چوبی میز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ سیلوفین بیگ اٹھالاؤ۔"

لمحے بھر کی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے میری ہدایت پر عمل کر ڈالا۔ میں یہ سب ایک خاص مقصد کی خاطر کررہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا تم جانتے ہو، اس بیگ کے اندر کیا ہے؟"

"ایک خطرناک چھری۔" وہ سیلوفین بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ملزم نے اسی چھری کی مدد سے وکیل صاحب کی گردن کاٹ کر انہیں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ پولیس کو یہ چھری ریسٹورنٹ کے بالائی کمرے میں وکیل صاحب کی لاش کے قریب پڑی ملی تھی۔"

"شاباش! تم نے میرا کام کردیا۔" میں نے معنی خیز انداز میں اس کی تعریف کی اور کہا۔ "اب اس سیلوفین بیگ کو اس کی جگہ پر رکھ کر واپس کٹہرے میں آجاؤ۔"

اس دوران میں، میں نے اس کی حرکات و سکنات پر مسلسل گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ اس کے دوبارہ وٹنس باکس تک پہنچنے سے پہلے میں اپنے مقصد کو حاصل کرچکا تھا۔ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جناب عالی! مجھے استغاثہ کے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔"

وکیل استغاثہ بے ساختہ پکار اٹھا۔ "یہ کس قسم کی جرح تھی؟ میں نے ایسا کراس ایگزامینیشن پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"میرے فاضل دوست......!" میں نے استغاثہ کے تازہ زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔ "انسان گود سے گور تک اپنے مشاہدے اور تجربے کے توسط سے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے، یعنی انسان کی تعلیم و تربیت کا عمل پوری زندگی جاری رہتا ہے۔ اس کراس ایگزامینیشن کو آپ اپنے مشاہدے، تجربے اور پیشہ ورانہ علم میں ایک گراں قدر اضافہ سمجھ لیجیے گا۔" پھر میں انکوائری آفیسر کی طرف مڑا اور پوچھا۔

"تو ہم اپنا کام شروع کریں شاہ جی؟"

"جی ضرور۔" وہ متعاون لہجے میں بولا۔

میں نے کیس فائل میں موجود، مختلف زاویوں سے کھینچی ہوئی مقتول کی لاش کی نصف درجن تصاویر میں سے [illegible] آدمی جج کی میز پر رکھ دیں۔ ایک تصویر وکیل استغاثہ کو تھمادی۔ باقی اپنے ہاتھ میں رکھتے ہوئے میں نے بآواز بلند کہا۔

"ہر فوٹو میں مقتول کی کٹی ہوئی گردن بہت واضح دکھائی دے رہی ہے لہٰذا میں جو کہنا چاہتا ہوں، اسے سمجھنے میں کسی کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔"

"میں جاؤں......؟" استغاثہ کے گواہ نے میری بات مکمل ہوتے ہی وکیل استغاثہ سے پوچھا۔

قبل اس کے کہ وکیل استغاثہ اسے جانے کی اجازت دیتا، میں نے تیز آواز میں کہا۔ "ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو میں نے تم سے بہت سارے خفیہ سوالات پوچھنا ہیں۔ تمہارے کیفے کا مالک پولیس اور بااثر افراد کی ملی بھگت سے "کیفے او کے" کے بالائی کمرے میں جو خصوصی "سروس" فراہم کررہا ہے، اس کا بھانڈا پھوڑنا باقی ہے۔"

دخترِ انگور کی عزت کو سرِ عدالت اچھالنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ بات میں نے محض ویٹر فیاض کو ڈرانے اور کمرائے عدالت میں روکے رکھنے کے لیے کی تھی۔ وہ مارشل لاء کا دور تھا اور وطن عزیز خاصے نازک حالات سے گزر رہا تھا۔ فیاض خوفزدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"کٹہرے سے نکلو اور چپ چاپ حاضرین عدالت کے درمیان جا کر بیٹھو۔" میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "اور جب تک معزز عدالت اجازت نہ دے، تم کہیں نہیں جاؤ گے...... سمجھ گئے نا؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور فوراً سے پیشتر میرے حکم کی تعمیل کردی۔

اس دوران میں جج کی اجازت سے تفتیشی افسر وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے ایک فوٹو اسے بھی پکڑادی اور اپنے کام کا آغاز کردیا۔

"شاہ جی! اس فوٹو کو دیکھ کر مجھے تو لگتا ہے قاتل نے مقتول کے عقب میں کھڑے ہو کر اس کی گردن پر چھری چلائی ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس بارے میں آپ کی ماہرانہ رائے کیا ہے؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!" وہ میری بات کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ "اگر قاتل نے سامنے سے وار کیا ہوتا تو کٹ کی شکل کچھ اور ہی ہوتی۔"

میں بظاہر آئی او سے بات کررہا تھا لیکن جج اور وکیل استغاثہ پر بھی میں نے گہری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں

بھی مقتول کی گردن کٹی لاش کی فوٹوز کو بغور دیکھ رہے تھے۔

"کٹ...... سے میرے ذہن میں ایک اہم سوال ابھرا ہے۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

آئی او نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ "کون سا سوال؟"

"اس کٹ کا سائز کم و بیش پانچ انچ ہوگا۔" میں نے آئی او کو پہلے سے سوچے ہوئے منصوبے میں بہ احتیاط ایڈجسٹ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا اندازہ غلط تو نہیں؟"

"نہیں...... یہ کٹ اسی سائز کا ہے۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"اگر ہم مذکورہ کٹ کے زاویے اور ساخت کا بغور جائزہ لیں تو یہ ہمیں ایک قوس کی صورت دکھائی دیتا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور اس کٹ کے زاویے کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا جائے تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ مقتول کی شہ رگ کاٹنے کے بعد قاتل نے چھری کو اوپر کی جانب گھمایا تھا کیونکہ اس کٹ کا آخری سرا مقتول کے بائیں کان کی لو کی سمت اشارہ کرتا نظر آتا ہے۔ یعنی اس کا رخ مقتول کے بائیں کان کی جانب ہے۔"

قبل اس کے کہ تفتیشی افسر میرے پیش کردہ خیالات پر اپنی رائے دیتا، میں نے جج کی طرف دیکھا۔ وہ پورے انہماک سے فوٹو کو گھور رہا تھا۔ وکیل استغاثہ کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ میں مطمئن ہو کر آئی او کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"آپ کی بات میں دم ہے وکیل صاحب!" آئی او نے اپنی مڑی ہوئی انگلی کی پشت سے فوٹو کو مخصوص انداز سے بجاتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ "قاتل کے ہاتھ میں موجود تیز دھار چھری نے اینٹی کلاک وائز حرکت کی ہوگی جبھی مقتول کی شہ رگ کو کاٹنے کے بعد چھری کا کٹ مقتول کے بائیں کان کی سمت گیا ہے۔"

"اینٹی کلاک وائز (مخالف گھڑی وار) چھری کی حرکت ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے شاہ جی! خصوصاً جب قاتل، مقتول کے عقب میں کھڑے ہو کر اس کی گردن پر چھری چلائے۔" میں نے آئی او کے چہرے پر نگاہ لگاتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "اس حوالے سے آپ کے ذہن میں کچھ آرہا ہے؟"

میں غیر محسوس انداز میں انکوائری آفیسر کو اپنے دام میں لاچکا تھا۔ اسے مطلق خبر نہیں تھی کہ وہ بے دھیانی میں میرے ساتھ چلتے ہوئے کس خطرناک مقام تک پہنچ چکا ہے۔ میری کیلکولیشن کے مطابق وہ ایک گہری کھائی کے کنارے پر کھڑا تھا۔ بس، میرا ایک دھکا اسے یعنی استغاثہ کو اس اندھی کھائی کی تہ میں پہنچا سکتا تھا۔

اس نے فوٹو کو دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو باری باری چھری چلانے والے انداز میں حرکت دی پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے نتیجہ خیز آواز میں بولا۔

"وکیل صاحب! میں نے آپ کے سوال کا جواب ڈھونڈ لیا ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں یہی آرہا ہے کہ قاتل نے مقتول کی گردن کاٹتے ہوئے چھری کو اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔"

"ایسا تو اسی صورت میں ممکن ہے جب قاتل لیفٹ ہینڈڈ ہو۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کوئی بھی رائٹ ہینڈڈ شخص اپنے ٹارگٹ کے عقب میں کھڑے ہو کر اس زاویے سے چھری نہیں چلا سکتا۔"

"ایبسولیوٹلی رائٹ!" وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ "اس سلسلے میں آپ سے میں مکمل اتفاق کرتا ہوں۔"

"تھینک یو شاہ جی!" میں نے واقعتاً دل کی گہرائیوں سے انکوائری آفیسر کا شکریہ ادا کیا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے پاٹ دار آواز میں کہا۔

"جناب عالی! ابھی میں نے جو ڈیمو دیا ہے، اسے میرے علاوہ معزز عدالت، وکیل استغاثہ اور تفتیشی افسر نے بھی انجوائے کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ معزز عدالت اور وکیل استغاثہ نے اس حقیقت کو پالیا ہوگا جو ابھی آئی او صاحب نے بیان کی ہے یعنی مقتول بزمی کی شہ رگ کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارنے والا شخص لیفٹ ہینڈڈ ہے یعنی وہ بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہے جبکہ میرا موکل اور اس کیس کا ملزم ہر کام اپنے دائیں ہاتھ سے کرتا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ مقتول کی عبرتناک موت میں میرے موکل کا ہاتھ نہیں ہے البتہ......"

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"البتہ...... اس وقت کمرائے عدالت میں کیس سے جڑا ہوا ایک ایسا شخص موجود ہے جو بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت نے دیکھا ہے کہ میرے کہنے پر مردِ مذکور نے آلۂ قتل والا سیلوفین بیگ اپنے بائیں ہاتھ سے اٹھایا اور رکھا تھا...... ویٹس آل یور آنر!"

ادھر میری بات ختم ہوئی ادھر "کیفے او کے" کے ویٹر فیاض نے حاضرین عدالت میں سے اٹھ کر دروازے کی جانب دوڑ لگادی۔ اگلے ہی لمحے جج کی تحکمانہ پکار سنائی

دی۔ وہ غصیلی آواز میں متعلقہ عدالتی عملے سے مخاطب تھا۔
”پکڑو اسے...... جانے نہ پائے......!“
فوراً ہی پیشتر جج کے حکم کی تعمیل کر دی گئی۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور اکیوزڈ باکس میں میرے موکل کی جگہ استغاثہ کا سابق گواہ اور اس کیس کا موجودہ ملزم ”کیفے اوکے“ کا ویٹر فیاض سر جھکائے کھڑا تھا۔ گزشتہ پیشی پر میرے چٹانی دلائل اور ویٹر کی فراری کوشش کے پیش نظر جج کے حکم پر اسے گرفتار کر کے شامل تفتیش کر لیا گیا تھا۔ پولیس کسٹڈی کی مروجہ صعوبتوں کو وہ سہہ نہ پایا اور اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا یعنی پبلک پراسیکیوٹر عقیل بزمی کو اسی نے حسرت ناک موت کا مزہ چکھایا تھا۔

اس کیس کی ابتدا میں جب میں نے استغاثہ کے گواہوں کی کنڈلی نکالی تھی تو فیاض کا بیان میرے دل و دماغ میں کھٹکنے لگا تھا۔ میں نے اس پہلو پر خاصا کام کیا تھا لیکن کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس نے عقیل بزمی کو قتل کرنے کے بعد قاسم کو اس معاملے میں کیوں پھنسایا تھا۔ قاتل ہونے کے ناتے مقتول یا ملزم سے اس کی دشمنی کا سراغ میں کوشش کے باوجود بھی نہیں لگا سکا۔ بہرکیف، فیاض کی گرفتاری کے بعد سب کچھ روزِ روشن کے مانند عیاں ہو گیا تھا۔

پولیس کسٹڈی میں فیاض نے اقبالِ جرم کر لیا تھا۔ اس پیشی پر جب اس کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہو چکا تو جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”حالات و واقعات، دونوں جانب کے گواہان کے بیانات، اس سلسلے میں پیش کیے گئے ثبوتوں اور وکلاء کے دلائل کے بعد یہ عدالت اس فیصلے پر پہنچی ہے کہ ملزم قاسم بے گناہ ہے لہٰذا عدالت اسے باعزت بری کرتے ہوئے عقیل بزمی کے قاتل فیاض کو عمر قید کی سزا سناتی ہے اور یہ فیصلہ محفوظ کرتے ہوئے عدالت برخاست کی جاتی ہے...... دی کیس از کلوزڈ اینڈ دی کورٹ از ایڈجارنڈ!“

چلتے چلتے فیاض کی بپتا کا مختصر احوال بھی سن لیں۔ اس نے اقبالِ جرم کرتے ہوئے عدالت کے سامنے بے خوف و خطر کہا تھا۔

”میں پچھلے پانچ سال سے اپنے باپ کی المناک موت کے انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ میرا باپ ایک مل مزدور تھا۔ اس فیکٹری میں مالک کی مجرمانہ غفلت اور ناقص تنصیبات کے سبب خوفناک آگ بھڑک اٹھی تھی جس میں میرے باپ کے علاوہ تین اور مزدور بھی جل کر کوئلہ ہو گئے تھے۔ فیکٹری کی یونین نے اس حادثے کا ذمے دار مالک کو ٹھہراتے ہوئے اس پر مقدمہ کروایا تھا لیکن عقیل بزمی نے مل مالک کے ساتھ سازباز کی اور منہ مانگا معاوضہ لے کر اپنی شیطانی وکالت کے زور پر مل مالک کو بے گناہ ثابت کر کے اس کیس کو بند کروا دیا تھا۔ میرے دل میں اس مردود وکیل کے خلاف نفرت اور انتقام کا دریا ہر لمحہ موجزن رہتا تھا اور پھر گزشتہ عیدِ قرباں پر میرے ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیا آیا۔ ملزم قاسم ہمارے پڑوس میں قربانی کی گائے کاٹنے آیا تو میں نے بڑی صفائی سے اس بندے کی ایک چھری چرا کر اپنے پاس محفوظ کر لی۔ عید سے چند روز پہلے میں نے ملزم کو مقتول کے ساتھ کیفے کے بالائی کمرے میں جھگڑا کرتے دیکھ لیا تھا۔ مقتول مجھے شکل سے نہیں پہچانتا تھا چنانچہ مجھے اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں نے وقوعہ کے روز چائے میں ایک نشلی دوائی ملا کر مقتول کو پلا دی۔ جب وہ اپنے حواس میں نہ رہا تو میں نے ملزم کی چرائی ہوئی چھری کو ایک نیپکن سے پکڑ کر مقتول کی گردن کاٹ ڈالی اور چھری کو مقتول کی لاش کے قریب پھینک کر ملزم کی وہاں آمد کے حوالے سے پولیس کو ایک جھوٹی کہانی سنا دی لیکن افسوس......!“ اس نے لمحاتی توقف کر کے شاکی نظر سے میری طرف دیکھا اور کڑوے لہجے میں بولا۔

”ایک شاطر وکیل نے معاملے کی تہ میں گھس کر میرے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ کاش، مقتول بھی اسی مثبت سوچ کا حامل وکیل ہوتا تو عدالت سے انصاف پانے کے بعد میرے انتقام کی آگ سرد ہو جاتی اور مجھے یہ سنگین قدم نہ اٹھانا پڑتا۔ شاید میرے نصیب میں یہی لکھا تھا......“

”شاید“ اور ”کاش“ کے بعد کچھ کہنے کو باقی نہیں بچتا۔ انتقام کی آگ واقعتاً بہت ہلاکت خیز ہوتی ہے۔ یہ زنگار کے مانند انسان کی سوچ کے ساتھ چپک کر رہ جاتی ہے اور جلد ہی اس کے ذہن کو زہریلا زنگ آلود بنا دیتی ہے۔ یہ سبزی مائل نیلا زہر ”زنگار“ اپنے شکار کو وہ سب کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جو فیاض نے کیا۔

عقیل بزمی کے ساتھ غلط ہوا یا صحیح، اس بحث سے دامن بچاتے ہوئے مجھے قاسم کی باعزت بریت کی جہاں خوشی تھی، وہیں فیاض کے انجام کا افسوس بھی...... شاید زندگی اسی کا نام ہے۔

(تحریر: حسام بٹ)

توانا معذور

عتیق بخاری

اسٹور روم میں پڑی کوئی ناکارہ چیز ہو... یا کوئی کھوٹا سکّہ، یا پھر کوئی بے مصرف انسانی وجود... کبھی کبھی اتنا کارآمد اور قیمتی بن جاتا ہے کہ لوگ برسوں اس کی افادیت کو بھول نہیں پاتے... وہ بھی تو اپنے معذور جسم کو بلا مقصد گھسیٹنے پر مجبور تھا لیکن ایک لمحہ ایسا بھی آیا جب اسے اپنے معذور جسم کو کارآمد ثابت کرنا تھا... سو کر ڈالا... اور بہت سے صحت مند لوگوں کو حیران کر دیا...

دنیا کی نظروں میں محض بوجھ بن جانے والے انسان کا حیران کن حوصلہ......

بڑی سرد صبح تھی۔ برف باری کا سلسلہ کئی روز سے جاری تھا۔ شدید سردی پڑ رہی تھی۔ معمول کے کام کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے مسٹر جارج کمرے کی کھڑکی میں سے باہر کا موسم دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے ان کا ناشتا پڑا تھا جو کچھ دیر پہلے ان کی ملازمہ رکھ کر گئی تھی لیکن وہ اسے نظر انداز کیے شیشے کے پار کے منظر پر نظر جمائے بیٹھے تھے۔ کھڑکی سے چند فٹ کے فاصلے پر کافی کشادہ لان تھا۔ وہ لان کو دیکھے جا رہے تھے پھر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ ”لگتا ہے آج بھی برف باری ہوگی۔“ انہوں نے خود کلامی کی۔ برف باری انہیں بہت پسند تھی اور یہ پسندیدگی چند سال پہلے ہوئی تھی۔ برف کے گالے جب کشادہ لان میں گرتے تو

انہیں وہ منظر بہت اچھا لگتا۔ حالانکہ ایسے میں معاملات زندگی رک جاتے لیکن مسٹر جارج کے لیے یہ کافی خوش کن و دلچسپ ہوتا۔

برف باری سے ان کی دوستی ان کی معذوری کے چند ماہ بعد ہی ہو گئی تھی۔ مسٹر جارج جب بھی اس منحوس دن کے بارے میں سوچتے جب وہ معذور ہوئے تھے تو وہ شدید کرب اور غم میں ڈوب جاتے۔ اس روز وہ اور ان کی مسز اپنے قصبے سے کچھ میل دور شہر میں اپنے دوست کی جھولے پارٹی میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ یہ پارٹی رات گئے تک جاری رہی۔ واپسی پر مسٹر جارج پر نیند کا غلبہ چھا رہا تھا۔ انہوں نے اپنی نیند کو جھٹکتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھا دی تاکہ گھر جلدی پہنچ سکیں لیکن وہ چند منٹ ہی تیز رفتاری سے گاڑی چلا سکے۔ اچانک گاڑی بے قابو ہو کر درخت سے جا ٹکرائی اور وہ اسپتال پہنچ گئے۔ جہاں ان کا ایکسیڈنٹ ہوا وہ کافی ویران جگہ تھی۔ حادثہ ہونے کے کافی دیر بعد ایک گاڑی وہاں سے گزری۔ اس کے ڈرائیور کی نظر ان پر پڑی تو ان کو اسپتال لے جایا گیا۔ ان کی بیوی موقع پر ہی دم توڑ گئی تھی اور خود ان کی ٹانگیں اتنی بری طرح زخمی ہوئیں کہ انہیں جسم کے ساتھ جوڑے رکھنا ناممکن ہو گیا۔ ہوش میں آنے پر مسٹر جارج کو معلوم ہوا کہ وہ بیوی اور دونوں ٹانگوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ وہ سکتے میں آ گئے۔

ان کا بیٹا اینڈی جو تعلیم مکمل کر کے دوسرے شہر میں جاب کرتا تھا، وہ چند روز ان کے ساتھ رہا اور مسٹر جارج کی دیکھ بھال کے لیے ان کے لیے ملازم، ملازمہ کا بندوبست کر کے واپس چلا گیا۔ معذور ہو جانا، کچھ نہ کر سکنا اور تنہا رہ جانا مسٹر جارج کو ڈپریشن کی جانب لے جا رہے تھے۔ ایک رات جب وہ اپنے کمرے میں لیٹے اپنی تقدیر پر غور کر رہے تھے، اچانک برف باری ہونے لگی۔ اس وقت ان کا اکلوتا بیٹا اینڈی میلوں دور اپنے کام اور زندگی میں مگن تھا۔ ملازمہ میڈیسن اور کھانا دے کر اپنے روم میں جا چکی تھی۔ ملازم ٹام اپنے کمرے میں تھا۔ برف باری دیکھنے کے لیے مسٹر جارج کہنیوں کے بل تھوڑا سا اوپر ہوئے تو انہیں یہ نظارہ اچھا لگا۔ وہ اٹھ بیٹھے۔ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے باہر دیکھنے لگے۔ اچانک انہیں اس میں رونق اور دوسراہٹ سی نظر آئی۔ انہیں لگا کہ نیم تاریک ماحول میں گرنے والے برف کے گالے ان کا اکیلا پن دور کرنے آئے ہیں۔ انہیں پچھتاوا ہونے لگا کہ وہ دو رات کیوں لے چکے ہیں۔ اب چند ہی منٹ میں نیند آ جائے گی اور میں یہ منظر نہیں دیکھ سکوں گا۔ وہ ایک دم اداس سے ہو گئے۔ صبح اٹھے تو ملازمہ ان کے کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔

”کھڑکی کے سامنے پردے کیوں کر دیے؟ ہٹاؤ انہیں۔“ انہوں نے اٹھتے ہی یوں تیزی سے کہا کہ ملازمہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ اس نے جلدی سے پردے ہٹا دیے۔ مسٹر جارج کے ناشتا کرنے کے دوران برف باری شروع ہو گئی۔ سلائس توڑتے ہوئے انہوں نے رک کر بڑی خوشی سے جب یہ سب دیکھنا شروع کیا تو انہیں احساس ہوا کہ وہ کسی سے دوستی کر چکے ہیں۔ ٹام، ان کا ملازم ان کا چہرہ دیکھ کر کافی حیران تھا کہ جب سے وہ آیا تھا مسٹر جارج کا اترا اور اداس چہرہ ہی دیکھا تھا۔

”کیا بات ہے سر! آج موڈ کافی اچھا لگ رہا ہے۔“ اس سے رہا نہ گیا تو اس نے پوچھ ہی لیا۔

”ہاں..... رات کا موسم مجھے بہت اچھا لگا۔ زندگی میں پہلی بار برف باری دل کو بہت بھائی۔ اتنی کہ یہ منظر دیکھتے دیکھتے میرے اعصاب ایک سکون سا محسوس کرنے لگے تھے۔“ مسٹر جارج عرصے بعد ہلکا سا مسکرائے تھے۔

اس رات اور صبح کے بعد ان کی اس موسم سے دوستی ہو گئی۔ اگر برف باری کے چند فیصد بھی امکانات ہوتے تو وہ خواہش کرتے کہ یہ امکانات سو فیصد ہو جائیں اور جب ان کی خواہش پوری ہو جاتی تو وہ کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ جاتے اور اس موسم کو خوب انجوائے کرتے۔ جتنی دیر وہ یہ منظر دیکھتے رہتے، انہیں یہ احساس بھول جاتا کہ وہ کیسے رک سے گئے ہیں، کسی بھی کام کرنے کے قابل نہیں رہے اور اپنے کاموں کے لیے دوسروں کے محتاج ہو گئے ہیں۔

موسم کے تیور آج بھی برف باری کا پتا دے رہے تھے۔ ”لگتا ہے آج بھی برف باری ہو گی۔“ انہوں نے خود کلامی کی اور پھر چند منٹوں بعد وہ ناشتا کرنا شروع کر دیا جو ان کی ملازمہ کافی دیر پہلے رکھ گئی تھی اور جو ان کے کافی دیر تک باہر دیکھتے رہنے کی وجہ سے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ انہوں نے گھنٹی بجا کر ملازمہ کو بلایا اور ناشتے کی ٹرے اٹھانے کا کہا۔

”یہ کیا مسٹر جارج! آپ نے صرف ہاف فرائی انڈا کھایا ہے۔ آپ کو پورا ناشتا کرنا چاہیے۔“ روزی نے ٹرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ ایک طرح سے ان کی نرس ہی تھی۔

”ہاں، بس روزی ابھی جی نہیں چاہ رہا ناشتا کرنے کو..... ٹام کو بلاؤ ذرا۔“ کہہ کر انہوں نے سائڈ ٹیبل پر پڑی کتاب اٹھانا چاہی لیکن وہ مل کر رہ گئی۔ بازو وہاں تک نہ پہنچا۔ انہوں نے ذرا اونچا ہو کر چاہا کہ بازو مزید بڑھائیں لیکن نہ کر سکے۔ روزی جو انہیں دیکھ رہی تھی، تیزی سے ان کے قریب آئی۔

”مجھے بتائیں، آپ کو کیا چاہیے؟ میں پکڑا دیتی ہوں..... جب پتا ہے کہ آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے تو کیوں خود کو۔“ روزی نے اپنی طرف سے تکلیف دیتے ہیں ہمدردی دکھائی لیکن ”آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے“ کے الفاظ نے مسٹر جارج کے اندر کچھ توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ انہیں لگا کہ ان کی روح زخمی ہو گئی ہے۔ حادثے کے بعد وہ ایسے ہی ہو گئے تھے۔ جب کوئی ان پر ترس کھاتا، انہیں بہت تکلیف ہوتی۔ ”آخر ایسا کیوں ہوا میرے ساتھ؟“ وہ کتنوں کرب سے سوچتے۔

”کچھ نہیں، بس ایسے ہی ذرا وہ کتاب دیکھنا چاہ رہا تھا۔“ ان کا لہجہ روکھا سا ہو گیا۔ انہیں روزی پر غصہ آ رہا تھا۔ ”مجھے خود کو بھی پتا ہے کہ میں کچھ کرنے سے معذور ہوں تو یہ بات بار بار جتانے اور بتانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”کون سی کتاب.....؟ یہ والی؟“ روزی نے ان کی سائڈ پر پڑے ناولز دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

”نہیں..... میرا خیال ہے وہ یہاں نہیں ہے۔“ حالانکہ ان کا مطلوبہ ناول وہیں رکھا تھا لیکن انہوں نے صاف جھوٹ بول دیا۔ نہ جانے کیوں۔

”تو کہاں ہو سکتا ہے؟ مجھے بتائیے، میں لا دوں مسٹر جارج!“ روزی نرمی سے پوچھ رہی تھی۔

”وہ سامنے الماری میں ہے۔“ جارج نے کسی اور ناول کا نام بتایا۔

”مجھے بتائیے، میں لا دوں“ ہونہہ..... یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ظاہر ہے تم ہی لاؤ گی۔ میں خود تو اسے اٹھانے سے رہا۔“ روزی الماری کا پٹ کھول رہی تھی اور مسٹر جارج نے جلتے بھنتے ہوئے لیکن دھیمے انداز میں خود کلامی کی۔ خود کلامی کرنا ان کی عادت بنتی جا رہی تھی۔

”یہ آج برف باری کیوں نہیں ہو رہی؟“ ناول پکڑاتی روزی سے انہوں نے پوچھا۔

وہ حیران سی ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ”کیا مطلب سر؟ میں سمجھی نہیں۔“

”ارے بھئی مطلب یہ کہ برف باری کی پیش گوئی ہوئی تو ہے لیکن ہو نہیں رہی اس لیے یونہی پوچھ لیا۔“ وہ ناول پکڑتے ہوئے بولے۔ نظریں کھڑکی کے پار لان پر جمی ہوئی تھیں۔

روزی نے ناشتے کی ٹرے اٹھائی اور آہستگی سے دروازہ بند کرتے ہوئے باہر چلی گئی۔

’معذوری، تنہائی، دوسروں کی مدد سے چند کام کرنا اور اپنی حالت پر کڑھتے رہنا میری زندگی بن گئی ہے۔‘ ناول ہاتھ میں پکڑے جارج نے سوچا اور پھر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے ناول پڑھنا شروع کر دیا لیکن جلد ہی بور ہو کر بند کر دیا۔ انہوں نے کرسی کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور کافی..... پچھلے سالوں میں چلے گئے۔

’میں کتنا متحرک تھا۔ گھنٹوں ورزش کرتا، تیراکی کرتا..... فٹ بال کھیل اتنا پسند تھا کہ گراؤنڈ کے علاوہ گھر کے لان میں اینڈی کے ساتھ کھیلا کرتا۔‘ سوچتے سوچتے انہوں نے ایک دم آنکھیں کھول کر اپنی ٹانگوں کو دیکھا۔ بے اختیار سرد آہ لبوں سے نکلی۔

'فٹ بال کھیلنا ایک طرف، چلنے پھرنے سے بھی گیا۔' آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ اچھی بھلی زندگی تھی۔ اچھی جاب، بیوی، بیٹا۔ بھرپور لائف گزارتے گزارتے سب بدل گیا۔ بیٹا تعلیم مکمل کرتے ہی دوسرے شہر میں سیٹل ہو گیا پھر کچھ عرصے بعد الم ناک حادثے نے ایک ہی بار میں بیوی اور ٹانگیں چھین لیں اور معذوری و تنہائی دے کر قابلِ رحم بنا دیا۔' سوچتے سوچتے وہ چونکے۔

"اوہ، اینڈی کا فون آیا تھا۔ کچھ رقم بھجوائی تھی اس نے۔ وہ لینے جانا تھا۔ مجھے بھول کیوں جاتا ہے۔ لگتا ہے آہستہ آہستہ یادداشت بھی کام کرنا چھوڑ رہی ہے۔" انہوں نے گھنٹی بجا کر ٹام کو بلایا۔

"جی سر! آرام کرنا ہے تو بیڈ تک لے جانے میں مدد کروں؟" وہ مستعدی سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں، تم تیار ہو جاؤ۔ بینک جانا ہے۔ تب تک میں بھی اپنی تیاری کرتا ہوں۔" مسٹر جارج نے کہا۔

"آپ خود سے کیسے تیاری کر سکتے ہیں؟ بھئی میں ہیلپ کروں گا تو ہی کام ہوگا نا۔" عام سے انداز میں کہتے ہوئے ٹام ہلکا سا ہنسا تو جارج کو وہ خود پر ہنستا محسوس ہوا۔

"میں ہیلپ کروں گا تو ہی......" مسٹر جارج کے کانوں میں بار بار گونجنے لگا پھر پھوٹ پھوٹ ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں بینک میں تھے۔ وہاں بالکل رش نہیں تھا۔ صرف چھ سات افراد موجود تھے۔ ویسے بھی وہ کم آبادی والے علاقے کا چھوٹا سا بینک تھا۔ زیادہ لوگوں کو وہاں کام پڑتا ہی نہ تھا۔ ٹام نے مسٹر جارج کی وہیل چیئر کاؤنٹر کے پاس کھڑی کر دی۔ ان کی باری آنے میں ابھی تھوڑا سا ٹائم تھا۔ مسٹر جارج بینک کا جائزہ لے رہے تھے۔ عرصہ ہوا وہ ہر چیز "معذوری سے پہلے اور معذوری کے بعد" کو سامنے رکھ کر دیکھتے تھے۔ ان کی باری آ گئی تھی۔ ٹام انہیں کیشیئر کے قریب لے جا رہا تھا کہ فائر کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی سیکیورٹی گارڈ گرتا دکھائی دیا۔ بینک میں موجود تمام افراد بشمول عملہ ساکت ہو گئے۔ چھوٹے سے بینک کی برائے نام سیکیورٹی اور موسم کی خرابی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دو ڈاکو بینک کے اندر داخل ہو چکے تھے۔

سیکیورٹی گارڈ کراہ رہا تھا۔ اس کے بازو میں فائر مارا گیا تھا۔ اسے ایک سائیڈ پر دھکا دیتے ہوئے ایک ڈاکو باقی افراد کی طرف متوجہ ہو کر گن تانتے ہوئے بولا۔ "کوئی بھی چالاکی نہ دکھاتے ہوئے سب یہاں آ کر کھڑے ہو جائیں۔" سب ڈرے سہمے ادھر آنے لگے۔ اس ڈاکو کا ساتھی بھی کیشیئر کو گن پوائنٹ پر رکھ چکا تھا۔

باقی افراد دونوں ڈاکوؤں کے نشانے پر تھے۔ صرف مسٹر جارج اپنی جگہ پر اکیلے بیٹھے تھے۔ وہ خاموش و بے بس نظروں سے صورت حال کو دیکھ رہے تھے۔

"یہ لو بیگ اور جلدی سے رقم ڈالو اس میں جلدی...... ورنہ کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔" کیشیئر پر گن تانے ڈاکو نے بڑی درشتی سے کہا کہ اچانک اس کی نظر وہیل چیئر پر بیٹھے شخص پر پڑی۔

"یہ یہاں بالکل آزاد بیٹھا ہے۔ اس کو تم نے نہیں کہا تم نے؟" اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ اس کے لہجے میں کوئی خاص تشویش نہ تھی۔ وہیل چیئر پر بیٹھے بیمار شخص کی حالت دیکھتے ہوئے وہ عام انداز میں ہی کہہ رہا تھا۔

"بیٹھا رہنے دو اسے۔ فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بے چارہ کیا کر سکتا ہے۔" مکروہ ہنسی کے ساتھ اس کے ساتھی نے جواب دیا۔ اچانک جیسے چونک پڑا۔ "ارے اس کے پاس سیل فون تو ہوگا۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔"

"تو احمق پھر دھیان سے لو اس کی تلاشی...... اور تم ذرا جلدی رقم ڈالو۔" اپنے ساتھی کو حکم دیتے ہوئے اس نے کیشیئر کو ڈانٹا۔ سب لوگوں پر گن تانے اس کا ساتھی الٹے قدموں مسٹر جارج کے پاس پہنچا اور ان کے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ مارنے لگا۔ جلد ہی اسے ان کا سیل فون مل گیا۔

"کیسے خاموشی سے بیٹھا تھا لیکن چہرہ دیکھ کر لگ رہا ہے کہ اولڈ مین کچھ کرنے والا تھا۔" قیمتی سیل فون قبضے میں کرتے ہوئے ڈاکو بڑی بدتمیزی سے کہہ رہا تھا۔ مسٹر جارج کا خون کھولنے لگا۔

"یہ بے چارہ کیا کر سکتا ہے......" یہ جملہ ان کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ آج صبح سے لے کر اب تک تین بار یہ ہو چکا تھا کہ انہیں ان کی معذوری کا احساس دلایا گیا۔ تیسری بار تو حد ہی ہو گئی تھی۔ ڈاکو ایک طرف ان کی بے بسی کا مذاق اڑا رہا تھا، دوسری جانب ان کا سیل فون لے کر بدتمیزی بھی کر رہا تھا۔ ان کی مٹھیاں بھنچ رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دونوں ڈاکوؤں کی ہڈیاں پسلیاں توڑ ڈالیں۔ اس اشتعال کے پیچھے ڈاکوؤں کے جرم سے زیادہ ان کی وہ فرسٹریشن تھی جو چند سالوں میں دوسروں کے رحم و کرم پر رہتے رہتے ان کی زندگی کا گویا حصہ بن گئی تھی۔ کچھ بھی کر سکنے کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے مسٹر جارج نے اپنے اشتعال پر قابو پانا شروع کر دیا۔

'جہاں مکمل تندرست اور جوان بے چارے بے بسی

کر سکتا ہے؟ مجھے اپنے اعصاب پر کنٹرول رکھنا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ غصے سے زبان سے کچھ غلط نکل جائے اور ان جرائم پیشہ افراد کے ہاتھوں بینک میں موجود لوگوں کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ کنٹرول کرو جارج خود پر...... کنٹرول کرو۔' خود کو سمجھاتے ہوئے مسٹر جارج ہانپ سے رہے تھے اور ٹام بے بسی سے ان کے سیل فون کا چھینا جانا اور چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ ان کا ہیلپر ہونے کے باوجود ان کی مدد نہیں کر پا رہا۔

اچانک اس کہر آلود موسم میں بینک اور بینک میں محصور کر دیے گئے، یرغمال بنائے گئے افراد کے لیے امید کی کرن پیدا ہونے لگی۔ ہوا یہ کہ دو پولیس والے کچھ فاصلے سے بینک کی جانب آتے دکھائی دیے۔ یہ پرامن اور پرسکون علاقہ تھا اس لیے یہاں پولیس کو گشت وغیرہ میں بار بار ماحول چیک کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔ آج خلافِ معمول دو پولیس اہلکاروں کو دیکھ کر کیشیئر کو امید بندھی کہ اب بینک لٹنے سے بچ جائے گا اور لوگوں کو بھی بچا لیا جائے گا۔ ڈاکو نے ایک نظر باہر اور دوسری نظر بیگ میں رقم ڈالتے کیشیئر پر ڈالی جس کے چہرے پر امید نظر آنے لگی تھی۔

"رکو۔" اس نے تیزی سے کیشیئر کو رقم ڈالنے سے منع کرتے ہوئے کہا اور خود قریب ہی کراہتے گارڈ کو بڑی بے دردی سے گھسیٹ کر کاؤنٹر کے پیچھے کر دیا۔

"منہ بند رکھنا ورنہ سیدھا دل میں فائر کروں گا اور نیچے جھکے رہو۔" اس نے درشتی سے کہا اور اپنے ساتھی کو شیشے کی جانب دیکھنے کا اشارہ کیا۔

وہ چونکا۔ سامنے دو پولیس والوں کو دیکھ کر وہ فوراً ساری صورت حال سمجھتے ہوئے دبی آواز میں بولا۔ "سب معمول کے انداز میں کام پر لگ جائیں ورنہ میرے پاس کھڑا یہ لڑکا اور میرے ساتھی کے نشانے پر موجود کیشیئر جان سے جائیں گے۔" دونوں ڈاکو تیزی سے اس طرح چھپ گئے کہ ایک کاؤنٹر کی سائڈ پر خود کو چھپا کر ایک لڑکے کو نشانے پر رکھے ہوئے تھا اور دوسرا سیف کے پیچھے کیشیئر کے سینے کا نشانہ باندھے ہوئے تھا۔ پولیس والے اندر داخل ہوئے اور سیکیورٹی گارڈ کی عدم موجودگی کا بالکل بھی نوٹس نہ لیتے ہوئے سیدھے کیشیئر کے پاس جا کر کوئی ضروری بات کرنے لگے۔ بینک میں موجود افراد کی شدید خواہش تھی کہ پولیس والے خود ہی صورت حال جان کر حالات اپنے قابو میں کر لیتے۔ ان کی یہ خواہش، خواہش ہی رہ گئی اور وہ

دونوں جلدی سے بات ختم کر کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ جاتے جاتے ان میں سے ایک رکا اور رسمی سے انداز میں کہا۔ "سب اوکے ہے نا؟"

"یس سر! آل از اوکے۔"

دونوں پولیس اہلکار تیز تیز قدموں سے باہر جا چکے تھے اور بینک میں ان کی آمد سے پہلے کی سچویشن پیدا ہو چکی تھی۔ "چلو اب جلدی سے رقم بیگ میں ڈالو۔ ان بدبختوں نے آ کر دیر کروا دی۔" ڈاکو کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔ کیشیئر نے انتہائی مایوسی سے بیرونی دروازے کی جانب دیکھا۔ گویا کسی مدد کا منتظر ہو اور رقم تیزی سے ڈالنے لگا۔

مسٹر جارج پر فرسٹریشن کا دورہ سا پڑ چکا تھا۔

'میں کچھ نہیں کر سکتا...... میں کچھ نہیں کر سکتا...... میں...... کچھ......' وہ سوچے سوچے، کڑھتے رہے۔

'میں...... میں جارج...... میں کچھ...... کچھ تو کر سکتا ہوں...... ہاں میں کر سکتا ہوں...... میں کروں گا...... یہ صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔' انہوں نے خود کو یقین دلاتے ہوئے اس آئیڈیے پر عمل کرنے کی ٹھانی جو چند لمحے پہلے ان کے ذہن میں آیا تھا اور انہوں نے اسے ناقابل عمل سمجھتے ہوئے رد کر دیا تھا لیکن اب پھر اسی کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔

کیشیئر نے تقریباً ساری رقم ڈال دی تھی۔ بیگ چند لمحوں میں ڈاکو کے ہاتھ میں جانے والا تھا کہ اچانک مسٹر جارج پر کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا اور ساتھ ہی ان کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ وہ بیک وقت اپنے گلے اور سینے پر ہاتھ رکھ کر ہانپنے لگے۔ "پلیز...... پلیز میری...... ہیلپ

کرو۔" انہوں نے کیشیئر کے پاس کھڑے ڈاکو کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی لجاجت و بے بسی سے کہا جو ان سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ ڈاکو چونکا اور مڑ کر ان کی جانب دیکھا۔
"پلیز! مجھ پر...... رحم...... کرو...... میرا انہیلر...... میری جیب......" ان کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ سب کی توجہ بشمول دونوں ڈاکوؤں کے، ان پر مبذول ہو گئی۔
"میری...... جیب...... سے...... انہیلر...... نکال دو...... میرا...... سانس......" وہ یہ مشکل الفاظ ادا کر رہے تھے۔ ڈاکو کو شدید تاؤ آ گیا۔
"شٹ اپ۔ آرام سے بیٹھو۔ ہمارے جانے کے بعد نکلوا لینا کسی سے انہیلر۔" وہ درشتی سے بولا۔
"تم اتنا...... تو کر...... ہی سکتے......" وہ ہانپتے ہوئے ڈاکو سے مسلسل مدد کی درخواست کر رہے تھے جبکہ ان کا ملازم ٹام بہت حیران اور اس سے بھی زیادہ پریشان ہو کر ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔
مجرمانہ ذہنیت والا ڈاکو طیش میں ان کی جانب پورا مڑا اور محض دو تین قدموں کے فاصلے پر موجود اکھڑی سانسوں والے مسٹر جارج کے قریب آ کر بولا۔ "تم خاموش ہوتے ہو یا......" اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ بینک میں موجود افراد نے ناقابل یقین، حیرت انگیز نظارہ دیکھا۔ جو ڈاکو مسٹر جارج کے قریب آیا، انہوں نے اپنا وہ ہاتھ جو اس ڈاکو کی جانب تھا، بڑھا کر اس کا بایاں ہاتھ پکڑا اور اس کا پورا جسم اپنی کرسی کے بائیں جانب گرا دیا۔ نتیجتاً کرسی الٹ گئی اور مسٹر جارج اور ڈاکو دونوں اوپر نیچے کرسی کے ساتھ گر گئے۔ اس کی گن بھی چھوٹ گئی تھی۔ مسٹر جارج کی کمال ہوشیاری کا نتیجہ دیکھتے ہی کیشیئر نے کاؤنٹر کے اوپر سے چھلانگ لگائی اور اس ڈاکو کی گری گن اٹھا کر اس ڈاکو کی گردن سے لگا دی اور وہ جو گالیاں دیتے ہوئے مسٹر جارج کو دھکیل کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، وہیں بیٹھ گیا۔ مسٹر جارج کے کھانسنے، ہانپنے اور پھر کرسی سمیت گر جانے، ڈاکو کو گرا دینے سے دوسرے ڈاکو کی توجہ تو پہلے ہی اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ اب ساتھی کی گردن پر گن دیکھ کر اس کے باقی ہوش بھی جاتے رہے۔ اس نے کچھ اپنی سی کوشش کرنا چاہی لیکن باقی لوگوں نے اس پر قابو پا لیا۔ ٹام تقریباً بھاگتا ہوا مسٹر جارج کے پاس پہنچا جو زمین پر گرے ہوئے تھے۔
"سر! آپ ٹھیک تو ہیں؟ سر تو فرش سے نہیں ٹکرا گیا؟" ٹام انہیں وہیل چیئر پر بٹھاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔
"نہیں...... کچھ نہیں ہوا مجھے...... میں بہت زیادہ ٹھیک ہوں۔" مسٹر جارج کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اسی دوران پولیس کو بلا لیا گیا۔ دونوں ڈاکو قابو میں آ گئے تھے۔ جب پولیس کو پتا چلا کہ یہ کام وہیل چیئر پر بیٹھے مسٹر جارج کا ہے تو وہ بھی ششدر رہ گئے۔
"کیسے کیا یہ سب مسٹر جارج آپ نے؟" انہوں نے حیران ہو کر سوال کیا اور جواباً تفصیل سن کر وہ اس معذور شخص کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔
"آپ کو ڈر نہیں لگا کہ نتیجہ آپ کی توقع کے برعکس بھی ہو سکتا ہے؟" ایک اہلکار نے سوال کیا۔
"ہاں، خدشہ تھا کہ اگر میں اسے کھینچ کر گرانے میں کامیاب نہ ہوا تو وہ مجھے گولی مار دے گا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کے باوجود باقی لوگ خود کو بچانے میں کامیاب ہو جائیں گے کیونکہ میرے گڑبڑ کرنے کے دوران سب کو اس وقت سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل جائے گا۔ اس لیے میں نے "جو ہوگا، دیکھا جائے گا" سوچ کر یہ سب کر ڈالا۔"
"یعنی آپ کو کھانسی کا دورہ وغیرہ نہیں پڑا تھا؟ سانس کی پرابلم نہیں ہوئی تھی؟ آپ نے ڈراما کیا تھا؟"
"ہاں، اچانک ہانپنے، کھانسنے کا ڈراما کیا تھا۔ دراصل آج مجھے صبح میری کیئر ٹیکر مس روزی نے پھر میرے ہیلپر ٹام نے اپنے اپنے الفاظ میں میری معذوری کا احساس دلایا تھا۔ حالانکہ اس سے ان کا مقصد میری مدد کرنا تھا اور میں جانتا ہوں یہ ہرگز مجھے تکلیف دینا یا میرا دل نہیں دکھانا چاہتے تھے لیکن نہ جانے کیوں مجھے یہ چبھتا سا لگا پھر یہاں آ کر ڈاکو کے اپنے بارے میں ترحم و تضحیک بھرا جملہ سنا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یقین مانیے میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس ڈاکو کا منہ نوچ لوں لیکن میں بے بس سا بیٹھا رہا اور پھر میرے اشتعال نے مجھ سے یہ سب کروا دیا۔" مسٹر جارج بتا رہے تھے۔ ان کے لیے چائے منگوائی گئی تھی۔ بات ختم کر کے وہ چائے پینے لگے۔ پولیس آفیسر نے ان کے کندھے پر تھپکی دی اور بولا۔
"ویسے آپ کا انہیلر محفوظ تو ہے نا آپ کی جیب میں......؟ میرا مطلب ہے اس سارے معاملے میں کہیں گر گیا ہو تو پھر......"
"آفیسر......! میرا کوئی انہیلر نہیں ہے کیونکہ مجھے کوئی ایسی پرابلم ہے ہی نہیں جس میں مجھے اسے استعمال کرنا پڑے۔" نرمی سے بات کاٹتے ہوئے مسٹر جارج نے انکشاف کیا۔ ان کے چہرے پر گہری مسکراہٹ تھی۔ ٹام کا چہرہ بھی مسکراہٹ سے بھرا ہوا تھا۔
"یعنی...... یعنی اول سے آخر تک سارے کا سارا ناٹک تھا؟" آفیسر اور اس کے دیگر ساتھی مزید حیران و خوش ہوئے۔
"ہاں بھئی میں جسمانی طور پر معذور ہوں، ذہنی تو نہیں ہوا۔ میرا ذہن تو کام کرتا ہے نا۔ اس لیے میں نے وہ کچھ کر ڈالا جس کا مجھے بھی یقین نہیں آ رہا۔" جارج نے متانت سے کہا۔
"سر جارج جب ہانپتے ہوئے انہیلر کے لیے مدد مانگ رہے تھے تو میں حیران ہوا کہ ان کے ساتھ یہ پرابلم تو ہے ہی نہیں تو پھر یہ جیب سے کیا نکلوانا چاہتے ہیں...... پھر ان کے چہرے کے الگ سے تاثرات دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ کچھ کر کے دکھانے والے ہیں۔ میں شدید پریشان ہو گیا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو مسٹر جارج اپنا دفاع نہیں کر پائیں گے لیکن تھینکس گاڈ ایسا کچھ نہیں ہوا اور سب ٹھیک ہو گیا...... وہ بھی حیرت انگیز انداز میں۔" ٹام نے شیشے کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔ موسم گہرا ہو رہا تھا۔
"ویسے ایک ڈاکو بھی مجھ سے زبردستی امید لگا بیٹھا تھا۔ یاد ہے ٹام! میرا سیل فون نکالنے والا کیسے کہہ رہا تھا 'لگ رہا ہے اولڈ مین کچھ کرنے والا تھا' میں نے سوچا چلو پھر کچھ کر ہی ڈالیں۔" مسٹر جارج ہلکا سا ہنسے۔ باقی سب بھی ہنس دیے۔ سب کے چہروں پر ان کے لیے زبردست داد و تحسین کے رنگ تھے۔ زخمی گارڈ کو طبی امداد کے لیے لے جایا جا چکا تھا۔ دونوں ڈاکو پولیس کسٹڈی میں تھے اور مسٹر جارج کو اپنا سیل فون واپس مل گیا تھا۔ سب بینک سے نکلنے لگے اور عملہ اپنی اپنی جگہ پر چلا گیا۔ مسٹر جارج اور ٹام باہر نکلے تو پولیس و بینک عملے نے زوردار تالیاں بجا کر انہیں رخصت کیا۔ گھر پہنچنے تک موسم مزید گہرا ہو گیا تھا۔ بڑے عرصے بعد مسٹر جارج لاؤنج میں بیٹھے اور ٹی وی آن کر کے اسپورٹس چینل لگا دیا۔
"کیا واقعی مسٹر جارج...... آپ نے چیئر پر بیٹھے بیٹھے بینک کو لٹنے سے بچایا؟" روزی کو ٹام نے پورا قصہ سنایا تو وہ خوشگوار حیرت سے تقریباً چلا اٹھی۔
"ہاں...... مس روزی اور اس بہت بڑے کام کے پیچھے تمہارا اور ٹام کا بہت اہم کردار ہے۔ ٹام! تم نے بتایا اسے؟" انہوں نے ہنس کر بات کرتے ہوئے ٹام سے سوال کیا۔ ٹام نے سر اثبات میں ہلایا۔
"جی سر! مجھے پتا چلا ہے کہ نادانستگی میں، میں نے آپ کے جذبات مجروح کر دیے تھے۔ میں آئندہ خیال رکھوں گی۔" روزی کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔
"ارے یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" مسٹر جارج تیز لہجے میں بولے۔
"بھئی تم دونوں نے آج مجھے اپنا آپ دکھانے، اپنی صلاحیتیں دکھانے پر گویا دھکا مار کر مجبور کیا اور میں تقریباً اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا...... نہیں مس روزی! تم آئندہ ہرگز دھیان نہیں رکھو گی بلکہ کوشش کرنا کہ میرے اندر کے صحت مند انسان کو بیدار کرتی رہو جسے بظاہر نظر آنے والی معذوری نے زندگی سے دور کر دیا تھا۔" مسٹر جارج نے گویا اسے ہدایات دیں کہ کیسے ان کی صحت کا خیال رکھنا ہے۔ روزی سر ہلا کر جانے لگی تو مسٹر جارج نے اسے روک کر کافی اور سینڈوچ لانے کا کہا۔
"صبح ناشتا ڈھنگ سے نہیں کیا تھا، اب بھوک محسوس ہو رہی ہے۔"
"اوکے سر۔" کہہ کر روزی کچن میں چلی گئی اور مسٹر جارج ٹی وی دیکھنے لگے۔
مسٹر جارج اپنے کمرے میں اپنی پسندیدہ جگہ یعنی کھڑکی کے قریب اپنی مخصوص چیئر پر بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ باہر برف باری ہو رہی تھی۔ آج انہوں نے کھانا بھی اپنا پسندیدہ بنوایا تھا۔ آج انہیں برف باری میں صرف دو سرا ہٹ ہی نہیں بلکہ رونق نظر آ رہی تھی۔ ان کی رکی زندگی انہیں چلتی نظر آنے لگی تھی۔ تلی ہوئی مچھلی کا قتلہ انہوں نے پلیٹ میں رکھا اور باہر دیکھتے ہوئے خوشی سے چلائے۔ برف باری ان کی مخاطب تھی۔
"فرینڈ......! دیکھا تم نے......؟ آج میں نے بینک کو لٹنے سے بچایا ہے کیونکہ میں معذور...... نہیں ہوں۔" ان کے کانوں میں پولیس آفیسر کے الفاظ گونجے۔
"سر! آپ نے وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے وہ کر ڈالا جو مکمل تندرست آدمی نہ کر پائے...... سر! اس کا مطلب آپ معذور نہیں ہیں۔"
انہیں واضح لگا کہ برف کے گالے انہیں مسکرا کر "ویل ڈن" کہہ رہے ہیں۔ اب ان کے سونے کا وقت ہو گیا تھا۔ ٹام اندر آیا اور اس معذور شخص کو بیڈ تک پہنچنے، لٹانے میں مدد دینے لگا جس نے آج دو مسلح ڈاکوؤں پر قابو پا کر ڈکیتی کی واردات ناکام بنا دی تھی۔

※※※

محفلِ شعر و سخن

❁ مہوش ...... کراچی
گیت ملن کے پنچھی گائیں برکھا اور بہار
اس موسم میں کیسے آؤں ساجن تورے دوار

❁ مجاہد حسین ...... خوشاب
دل کو حصارِ رنج و الم سے نکال بھی
کب سے بکھر رہا ہوں مجھے اب سنبھال بھی
سب اپنی اپنی موجِ فنا سے ہیں بے خبر
میرا کمال شاعری، تیرا جمال بھی

❁ مہتاب احمد ...... حیدرآباد
سانجھ ہوئی تو اڑتے پنچھی لاتے ہیں پیغام
تو بھی گھر جا پاگل لڑکی ہوگئی اب تو شام

❁ آمنہ شیخ ...... ملتان
کیا عشق ایک زندگی مستعار کا
کیا عشق پائیدار سے ناپائیدار کا

❁ شوکت علی ...... بہاولپور
آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

❁ محمود احمد ...... آزاد کشمیر
جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمہی منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا

❁ فرحانہ ممتاز ...... کوئٹہ
تیرے حسن ہے دل مجروح کا لہو
چھینٹے پڑے تو بن گئیں تصویریں عشق کی

❁ یسریٰ یوسف ...... اسلام آباد
اک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہیں
ان ترستی ہوئی آنکھوں کو بجھادے کوئی

❁ صنم بلوچ ...... ڈی جی خان
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

❁ اویس خان ...... کراچی
خود کو سبز ہی رکھا آنسوؤں کی بارش میں
ورنہ ہجر کا موسم کس کو راس آتا ہے

❁ ثاقب کمال ...... حیدرآباد
یہ قفس ہی مجھ کو عزیز ہے یہاں جی تو لوں گا قرار سے
مجھے تم چمن میں نہ لے چلو میں ڈرا ہوا ہوں بہار سے

❁ نعیم احمد ...... کراچی
خانہ جنگ ہی میں رہتا ہے
جب سے دل درد کی سپاہ میں ہے
نہیں وہ خواہش نجات میں بھی
جو کشش دامنِ گناہ میں ہے

❁ حوریہ بٹ ...... گوجرانوالہ
پھر چھیڑ کے ان چاندنی راتوں کا فسانہ
سوئی ہوئی امید میرے دل کی جگا دی

❁ ایم خلیل ...... ملتان
کچھ اہلِ ستم کچھ اہلِ حشم میخانہ گرانے آئے تھے
دہلیز کو چوم کے چھوڑ دیا دیکھا کہ یہ پتھر بھاری ہے

❁ ظہیر اختر ...... بی
وہ مجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آجاتا

❁ غلام مرتضیٰ ...... خانپور
میری زندگی میں طرب نہیں مجھے آسروں کی طلب نہیں
میں ازل سے سوختہ بخت ہوں مجھے شاعروں میں تلاش کر

❁ رخسانہ کنول ...... [illegible]
اک نقش ہو نہ پائے ادھر سے ادھر مرا
جیسا تمہیں ملا تھا میں، ویسا جدا کرو

❁ رفیق الدین ...... مری
بنتے بنتے ڈھے جاتی ہے دل کی بستی
خواہش کے بہروپ میں شاید قسمت ہے
سائے لرزتے رہتے ہیں شہروں کی گلیوں میں
رہتے تھے انسان جہاں اب وحشت رہتی ہے

❁ منیر شگفتہ ...... [illegible]
ملتی نہیں ہے پیار کی منزل انہیں کبھی
وہ لوگ سمندر میں جو اترا نہیں کرتے

❁ نصیر بلوچ ...... خیرپور
چاند بھی ڈوب گیا بجھ گئے تاروں کے دیے
اس کی یادوں کا چراغ ہم نے بجھایا ہی نہیں

❁ طاہر علی ...... ملک وال
[illegible] نہیں کبھی گزرے ترے خیال کی رو
مرے گمان کے طائر شکار کرتے ہوئے
کہیں چھپائے مرے سامنے کے سب منظر
مجھے، کبھی مجھی آشکار کرتے ہوئے

❁ محمد عاصم ...... لاہور
اِک رنگ سی کمان ہو، خوشبو کا اک تیر
مرہم کی واردات ہو اور زخم کھاؤں میں

❁ طفیل ملک ...... چکوال
راہبروں کے ضمیر مجرم ہیں ہر مسافر یہاں لٹیرا ہے
معبدوں کے چراغ گل کردو قلبِ انسان میں اندھیرا ہے

❁ ایوب خان ...... راولپنڈی
یہ خاموشی تو میرے دل کی دیواریں گرادے گی
محبت ہو نہ ہو پر لب ہلا، آہستہ آہستہ!

❁ روبینہ نفیس ...... کراچی
میں اس کو دیکھتا رہتا ہوں فاصلے سے فقط
وہ میرا خواب ہے اور خواب ٹوٹ جاتا ہے

❁ جنید ملک ...... کراچی
کیسے بھول جاؤں لوگوں جیسی باتیں کرتے ہو
صورت تو پھر صورت ہے وہ نام بھی اچھا لگتا ہے

❁ مرزا وقار ...... جہلم
جینے نہیں دیتا کبھی مرنے نہیں دیتا
یہ دل تو کوئی کام بھی ہونے نہیں دیتا

❁ اظہر علی ...... شورکوٹ
وہ مجھ سے بچھڑ گیا تو مجھے یقین آیا
کوئی بھی شخص ضروری نہیں کسی کے لیے

❁ ساجد خان ...... میانوالی
خوشی کی بات نہ کر ان اداس لوگوں سے
یہ سادہ لوگ جو رکھتے ہیں آس لوگوں سے

❁ راشدہ پروین ...... مردان
سراپا آرزو بن کر تصور آشنا ہوکر
رہیں گے ہم انہی کے روبرو ان سے جدا ہوکر

❁ محبت خان ...... ہری پور ہزارہ
وہ پھول توڑتے ہیں اور میں خار چنتا ہوں
بچھڑے جاتے ہیں یوں مجھ سے ہم سفر میرے

❁ سنبل حیات ...... کراچی
پسپائی ہے محال محبت کی راہ سے
اک بار چل پڑو تو سفر چھوڑنا نہیں

❁ فاکہہ فردوس ...... بہاولپور
عمر بھر کون نبھاتا ہے تعلق اتنا؟
اے میری جان کے دشمن تجھے اللہ رکھے

❁ ایم منور ...... ڈیرہ اسماعیل
شبِ فرقت میں سلگتی ہوئی یادوں کے سوا
اور کیا رکھا ہے ہم چاہنے والوں کے لیے

❁ میمونہ عزیز ...... کراچی
ہمارے دوش پہ کھلتی تھی تیری زلف سے ہم
نسیمِ صبح کے لہجے میں گفتگو کرتے

❁ قاسم مجید ...... لاڑکانہ
شرم، دہشت، جھجک، پریشانی، ناز سے کام کیوں نہیں لیتیں
آپ، وہ، جی، مگر یہ سب کیا ہے تم میرا نام کیوں نہیں لیتیں

❁ شگفتہ نور ...... [illegible]
نام لے کر مرا تم اس کو پکارو تو سہی
اس بھرے شہر میں جس شخص کو تنہا دیکھو

❁ امتیاز احمد ...... پھالیہ
بس اتنی بات پہ دشمن بنی ہے گردشِ دوراں
خطا یہ ہے کہ پوچھا کیوں تیری زلفوں کا افسانہ

❁ ...یم اقبال......پنڈ دادن خان
یاد پڑتا ہے کہ کچھ خواب تھے دھندلے دھندلے
وہ امانت میں کہیں بھول گیا ہوں رکھ کے

❁ محمد اکرم......اوکاڑہ
اے آشنائے درد نہ رخ پھیر کر گزر
ایسا نہ ہو پلٹ کے تجھے دیکھنا پڑے

❁ ملک اسلم......فیصل آباد
سُونے آنگن میں مری ماں یہ کھڑی سوچتی ہے
کتنا اچھا تھا کہ اولاد بڑی نہ ہوتی

❁ ممتاز خان......کراچی
کتابِ عمر نہ چھپوا سکا میں آج تلک
کہ ہر ورق پہ تیرے نام کا حوالہ ہے

❁ رانا سہیل......رحیم یار خان
یوں دل کے تڑپنے کا ہے کچھ تو سبب آخر
یا درد نے کروٹ لی یا تونے ادھر دیکھا

❁ عطاالمصطفیٰ......سانگھڑ
مجھ سے پوچھے کوئی کیا دل پہ بیت گئی
اس سے کیا پوچھتے ہو جس کا گھر گیا کچھ نہیں

❁ حنا چودھری......منڈی بہاالدین
چہرے بجے بجے ہیں تو دل بجھے بجھے
ہر شخص میں تضاد ہے دن رات کی طرح

❁ خالد محمود......گوجر خان
تم ترکِ تعلق کا کہیں ذکر نہ کرنا
میں لوگوں سے کہہ دوں گا کہ فرصت نہیں ملتی

❁ اعظم کمال......حیدرآباد
مری طرح سے کوئی ہے جو زندگی اپنی
تمہاری یاد کے نام انتساب کردے گا

❁ نازیہ خان......لانڈھی، کراچی
جہاں ہیں عہد گزشتہ ہی ہیں گریہ بجا
دیارِ یار سے ہم نے مہاجرت لی ہے

❁ رضوان محمود......منگلا کینٹ
مسکراتے موسموں میں کرب کے پیچ بھی دیکھ
جو مقید ہیں حصارِ گل میں وہ آنسو بھی دیکھ

❁ فائزہ نقوی......اسلام آباد
بے تاب ہے دل دردِ محبت کے اثر سے
جس دن سے مرا چاند چھپا میری نظر سے

❁ وقاص عالم......لاہور
ہاتھ اس کے بھی یقیناً ہوئے ہوں گے زخمی
جس نے کانٹے میری راہوں میں بچھائے ہوں گے

❁ ظفر بلوچ......جھنگ سٹی
چاہیے خانہ دل کی کوئی منزل خالی
شاید آجائے کہیں سے کوئی مہمان عزیز

❁ خرم شیرازی......گجرانوالہ
کیسے منزل آشنا ہوتے قدم!
تھک کے جو اپنے ہی گھر میں رہ گئے

❁ رؤف تبسم......ساہیوال
وہ جس کی یاد خون کی گردش کے ساتھ تھی
کتنی اذیتوں سے بھلانا پڑا مجھے

❁ چودھری افضال......ضلع گجرات
ماضی کے بیاباں میں جو گم ہوگیا مجھ سے
میں حال کے جنگل میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں

❁ عظمت خان......پشاور
گلوں کے پیرہن میں یہ نخن محبوس ہوتی ہے
محبت کی نہیں جاتی صرف محسوس ہوتی ہے

❁ سعید ہاشمی......قصور
تیرے بغیر کسی چیز کی کمی تو نہیں
تیرے بغیر طبیعت اداس رہتی ہے

❁ سکندر جمیل......مظفرگڑھ
تعجب ہے علامت بن گئے وہ بھی محبت کی
جنہیں یہ بھی نہیں معلوم تہذیبِ وفا کیا ہے

❁ نعمان ارشد......راولپنڈی
تہلکہ ڈال دیتی ہے فضائے آسمانی میں
محبت جب خدا کا نام لیتی ہے جوانی میں

❁ راجا ضیاء الحسن......ملتان
لگ جائے زمانے کی ہوا جانے اسے کب
وہ شخص بھی انسان ہے کچھ کہہ نہیں سکتے

تماشاگاہ

فاطمہ حسام

ایک ایسی تماشا گاہ کا احوال جس میں تماشائی خود تماشا بن کر رہ گئے......

حرص و ہوس چاہے جس عمر میں دلوں میں گھر بنائے... سمجھو گویا تباہی کے راستے بھی کھل گئے... وہ جوڑا جس نے زندگی کی دھوپ چھاؤں کے کئی سال ایک ساتھ گزار دیے... جانے کیسے ایک دوسرے کے لیے بوجھ بنتے چلے گئے... جو کبھی محبت میں جان دینے کے لیے تیار رہتے تھے پھر یوں ہوا کہ محبت کے نقاب چڑھا کر جان لینے کی تیاری کرنے لگے... اور پھر وہ کچھ ہو گیا جس کی کسی کو توقع نہ تھی...

جھٹ پٹا اور وہ بھی ساحل سمندر کا، بڑا ہی دلفریب اور سحر انگیز ہوتا ہے۔ اسی طلسماتی ماحول نے ہیرولڈ کے حواس کو اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔
وہ ساحل کے ساتھ چلتے چلتے یکا یک رک گیا۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنے دونوں پاؤں گیلی ساحلی ریت میں گاڑ دیے۔ دو چار گہری سانسیں لینے کے بعد وہ الجھن زدہ انداز میں بڑبڑایا۔
"اوہ......پھر وہی سایہ......!"
اس سائے نے ہیرولڈ کو بہت زیادہ پریشان کر رکھا تھا۔ اس نے کئی بار خود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ محض اس کی آنکھوں کا دھوکا ہے جو اسے اپنے آس پاس سایہ سا دکھائی دیتا ہے۔ دراصل سورج کے غروب ہونے کے بعد بہت تیزی

سے اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

دوسروں کو سمجھانا بہت آسان ہوتا ہے لیکن جب یہ مرحلہ اپنی ذات کے ساتھ ہو تو کافی مشکل پیش آتی ہے۔ ہیرولڈ بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے اپنے سینے کو دبا کر طوفانی رفتار سے دھڑکنے والے دل کو نارمل کرنے کی کوشش کی اور واپسی کا قصد کیا۔

اسے ہر روز انسانی سائز اور ساخت کے سایوں سے جنگ کرنا پڑتی تھی جو گھر کے اندر اور ساحل پر اسے دکھائی دیتے تھے۔ ان میں ایک نظارہ یہ بھی تھا کہ جیسے کسی انسان کو گیلی ساحلی ریت پر بے دردی سے گھسیٹا گیا ہو۔ ایسے سمجھ میں نہ آنے والے مناظر اس کے دل کی دھڑکن کو خطرناک حد تک بڑھا دیا کرتے تھے۔ وہ پہلے ہی دل کے عارضے میں مبتلا تھا۔ ایسی کیفیت میں ہیرولڈ کو یوں محسوس ہونے لگتا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ ہر بار وہ خود کو یہی تسلی دیتا تھا۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو میں دیکھتا ہوں۔ یہ ایک سراب اور کھلی آنکھوں کا خواب ہے۔''

اسے ساحل، جھٹ پٹے اور ان بے معنی سایوں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ یہ سلسلہ کوئی تین ہفتے پہلے بالکل بھی نہیں تھا۔ ہیرولڈ کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس کا آغاز بیٹی کی ضد کے بعد ہی ہوا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔

''ہیرولڈ! جب رات میں سمندر کی موجیں جوش جنون میں شور و مستی کر رہی ہوں تو ہمیں ساحل کی گیلی ریت پر واک کرنا چاہیے۔'' اس کی بیوی بیٹی نے اصراری لہجے میں کہا تھا۔ ''یہ ساحل، یہ سمندر اور وہاں کی فضا ایک دم فری ہے۔ اس نائٹ واک پر ہمارا ایک ڈالر بھی خرچ نہیں ہوگا۔'' پھر اس نے بڑی حسرت اور ذومعنی الفاظ میں اضافہ کر دیا تھا۔

''ہیرولڈ! ہم یہ عیاشی تو افورڈ کر ہی سکتے ہیں نا؟''

''یہ بہت خطرناک ہوگا بیٹی!'' ہیرولڈ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ''ساحل پر اس وقت بہت اندھیرا ہوتا ہے اور سمندر کی سرکش لہروں کا شور خاصا ہیبت ناک ہوتا ہے۔ تم جانتی ہی ہو، میں دل کا مریض ہوں۔ تمہارا آئیڈیا بہت رسکی ہے بیٹی!''

''رسکی...... کس کے لیے؟'' بیٹی نے پوچھا تھا۔

''مجھے اپنی تو زیادہ پروا نہیں ہے۔'' وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں ڈرتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہ ہو جائے۔ ہم اس عمر میں کوئی معمولی سا حادثہ بھی برداشت نہیں کر پائیں گے۔''

''مجھے کیا ہونا ہے ہیرولڈ!'' وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ ''اگر ساحل پر چہل قدمی کرتے ہوئے کوئی خطرہ سامنے آ بھی گیا تو تم مجھے اس سے بچا لینا۔ تم سے اچھا میرا محافظ بھلا اور کون ہو سکتا ہے۔''

''میں......!'' وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''میں تو اس دل کی بیماری کے باعث خود مجبوروں جیسی زندگی گزار رہا ہوں۔ کسی دوسرے کی کیا خاک حفاظت کر پاؤں گا۔''

ہیرولڈ کا روکھا پھیکا جواب سن کر بیٹی کا چہرہ اتر گیا تھا۔ یہ دیکھ کر ہیرولڈ کو بہت دکھ ہوا تھا۔ اس کے مقابلے میں بیٹی کی خواہشات لامحدود تھیں۔ ہیرولڈ کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ بیٹی کی خوشیوں کا کماحقہ خیال رکھ سکے۔ وہ اپنی سوشل سیکیورٹی پر زندہ تھا اور اس قلیل رقم میں وہ جتنا افورڈ کر سکتا تھا، اس سے آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا مگر بیٹی کی اداسی بھی اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ سو، اس نے اپنی بیوی کی ضد کے سامنے سپر ڈال دی تھی۔

وہ ہر رات سمندر کی سیر کو جانے لگے۔

وہ بیٹی کی خوشی کی خاطر اس واک کے لیے راضی ہوا تھا لیکن اس کے دل میں ساحل کے لیے موجود نفرت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اسے گیلی ریت، ریت کی سطح کے اندر دھنسی ہوئی سیپیاں اور سر تک بلند ہوتی سمندر کی موجیں بالکل پسند نہیں تھیں۔ دن کی روشنی میں ساحلی سیر اتنی مہلک ثابت نہیں ہوتی تھی جتنی کہ شام کے دھندلکے اور رات کی تاریکی میں۔

اب ہیرولڈ نے رات کے علاوہ صبح میں بھی ساحلی سیر شروع کر دی تھی مگر بالکل اکیلے کیونکہ بیٹی کو ایمرجنسی میں کہیں جانا پڑ گیا تھا اور وہ اس کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے اس عمل کو تسلسل سے کیے جا رہا تھا۔ وہ اس بات پر حیران بھی تھا کہ پچھلے دنوں میں سمندر نے ساحل پر ایسی کوئی چیز نہیں پھینکی تھی جسے ہیرولڈ ناپسند کرتا ہو یا وہ کسی بھی حوالے سے اس کے لیے کسی نئی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہو۔

انہی خیالات کے ساتھ ہیرولڈ ساحل کے کنارے بنے ہوئے عمدہ مکانات کے سامنے سے گزر کر ہائی وے پر آیا اور پھر ان کے عقب میں واقع گلی کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کا گھر تھا۔

اب وہ اپنے گھر میں بالکل تنہا تھا، سوائے ان ناقابل فہم پراسرار ہیولوں کے جو کسی بھی طور اس کا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آتے تھے۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ''پومپانو'' بیچ سے گھر واپس آنے کے بعد ہیرولڈ نے اپنی دوا کی دو گولیاں کھائی تھیں۔ یہ ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوا کی ڈبل خوراک تھی۔

ڈاکٹر نے اسے صرف ایک گولی کی خوراک لینے کی ہدایت کر رکھی تھی مگر دو گولیاں کھانے کے باوجود بھی اس کے دل کی دھڑکن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی اس کیفیت کے باعث سو بھی نہیں پا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا دل سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ طبیعت کی خرابی تو اپنی جگہ تھی ہی، اس پر مستزاد وہ سائے تھے جو بیڈ روم کی دیواروں پر بڑے بھیانک انداز میں رقص کر رہے تھے۔

اس کی بھوک، پیاس اور نیند...... سب کچھ اڑ چکا تھا۔

ایک اچھوتے خیال کے زیر اثر ہیرولڈ نے اپنے بیڈ روم کی تمام لائٹس آن کر دیں۔

اس کی خواب گاہ گویا روشنی میں نہا گئی۔ ایسا لگتا تھا، بیڈ روم میں سورج نکل آیا ہو۔ اس چکا چوند میں وہ آسیبی سائے تو غائب ہو گئے تھے تاہم احساس زیاں نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک ساتھ اتنی زیادہ لائٹس آن کرنے کا مطلب تھا، کئی گنا زیادہ بجلی کا استعمال اور ہیرولڈ اتنی شاہ خرچی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے طوفانی رفتار سے دھڑکتے ہوئے دل کو تھام کر رات بھر ان منحوس سایوں کے ساتھ جنگ لڑتا رہا۔

اگلی صبح طلوع آفتاب نے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔ اس کے گھر میں قدرتی روشنی نے ٹھکانا کر لیا تھا اور دن کے اجالے میں وہ ناقابل فہم کیفیات خود بخود ختم ہو گئی تھیں۔

ایک فوری خیال کے تحت اس نے ٹی وی آن کر لیا۔ اس نے گزشتہ شام ساحل سمندر پر جو پراسرار مناظر دیکھے تھے، وہ ابھی تک پوری طرح اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئے تھے۔ وہ ان مناظر کی حقیقت سے واقف تھا اور یہی واقفیت اسے بے قرار کیے ہوئے تھی۔ اس اندوہناک واقعے کے بعد سے وہ سکون کی سانس بھی نہیں لے پا رہا تھا۔

وہ ٹی وی کے سامنے سے اٹھا اور کچن میں گھس گیا۔ وہ رات کو بھی کچھ کھا نہیں پایا تھا اس لیے اب اسے زور کی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ ناشتے کے نام پر اس نے اپنے لیے ایک کپ چائے بنائی اور ایک مفن (کپ کیک) بھی ٹرے میں رکھ کر وہ دوبارہ ٹی وی کے سامنے آ بیٹھا۔ تمام نیوز چینلز کے نیوز بلیٹن دیکھنے کے بعد اسے حیرت ہوئی تھی۔ کسی ایک چینل نے بھی پومپانو بیچ کے حوالے سے کوئی چھوٹی یا بڑی خبر نشر نہیں کی تھی۔ اس نے ٹی وی آف کیا اور گھر سے باہر بنے ہوئے چبوترے پر کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔

حرارت بخش دھوپ ہیرولڈ کی بوڑھی ہڈیوں میں جاگزیں ٹھنڈک کو نکال باہر کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھی۔ آئندہ چند روز تک وہ باقاعدگی سے ساحل سمندر پر جاتا رہا اور ٹی وی پر نیوز چینلز بھی دیکھتا رہا لیکن اس کی توقع پوری نہیں ہوئی۔ وہ سفاک توقع جس نے اس کا دن کا چین اور رات کی نیند چھین لی تھی۔ وہ واقعہ اس کی زندگی کا سب سے ہولناک حادثہ تھا۔

ہیرولڈ اور بیٹی اپنے بڑھاپے کے دن پومپانو نامی فلوریڈا کے ساحل پر گزار رہے تھے۔ اس بیچ کے ساتھ موجود چٹانوں کے اوپر عالیشان مکان بنے ہوئے تھے۔ ہیرولڈ کا گھر ان عالیشان مکانات کے عقب میں واقع ایک اسٹریٹ پر تھا۔ وہ ایک دو منزلہ مکان تھا مگر انہی کی طرح خستہ حال اور عمر رسیدہ۔ اس پٹی کے تمام مکان کچھ ایسی ہی حالت کے حامل تھے جن میں سے بعض تو سیلن زدہ کھنڈر نظر آتے تھے۔

وہ محدود خواہشات رکھنے والا ایک قناعت پسند شخص تھا لیکن بیٹی اس کے برعکس دولت کو بہت زیادہ اہمیت دیتی تھی اور وہ بھی امیر بننا چاہتی تھی۔ اس نے عمدہ مکان میں رہنے والی ایک بوڑھی پھوس عورت جوزفین سے دوستی بھی کر لی تھی۔ ان دونوں کا مشترکہ شوق ''برج'' نامی تاش کا ایک کھیل تھا۔ بیٹی برج کی بازی لگانے [illegible] جایا کرتی تھی اور واپس آ کر وہ ہیرولڈ کو جوزفین کی دولت [illegible] اور [illegible] رات کے قصے سنایا کرتی تھی۔ ہیرولڈ [illegible] جوزفین کے نام ہی سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ وہ بیٹی کا دل رکھنے کے لیے اس کی باتیں سن لیا کرتا تھا مگر گہری سوچ بچار کے بعد بھی وہ یہ راز سمجھ نہیں پایا تھا کہ بیٹی نے جوزفین کو اپنی دوست بنانے کے لیے کون سی سائنس استعمال کی تھی کیونکہ بظاہر ایسا ہونا ناممکنات میں سے تھا۔

اس واقعاتی معاملے کے حوالے سے ہیرولڈ کے ذہن میں کئی سوالات تھے جن کے جوابات حاصل کرنے کے لیے اس نے پابندی سے پومپانو بیچ جانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے وہاں جو پراسرار مناظر دیکھے تھے، ان کی توجیہہ نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ معاملے کی تہ تک رسائی حاصل کیے بغیر سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

پچھلے چند روز سے ہیرولڈ اکیلا ہی ساحل سمندر کی سیر کو جا رہا تھا۔ ایک دوپہر وہ واپس لوٹا تو اس کے سیل فون پر ایک کال موصول ہوئی۔ وہ بیٹی کی اسی فربہ دوست جوزفین کا فون تھا۔

''ہیلو!'' اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹی کئی روز سے برج کھیلنے میرے پاس نہیں آئی۔'' جوزفین نے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔ ''اور وہ تمہارے ساتھ بیچ کی طرف جاتی بھی دکھائی نہیں دی۔ وہ ہے کہاں؟''

سے اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

دوسروں کو سمجھانا بہت آسان ہوتا ہے لیکن جب یہ معاملہ اپنی ذات کے ساتھ ہو تو کافی مشکل پیش آتی ہے۔ ہیرولڈ بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے اپنے سینے کو دبا کر، طوفانی رفتار سے دھڑکنے والے دل کو نارمل کرنے کی کوشش کی اور واپسی کا قصد کیا۔

اسے ہر روز انسانی سائز اور ساخت کے سایوں سے جنگ کرنا پڑتی تھی جو گھر کے اندر اور ساحل پر اسے دکھائی دیتے تھے۔ ان میں ایک نظارہ یہ بھی تھا کہ جیسے کسی انسان کو گیلی ساحلی ریت پر بے دردی سے گھسیٹا گیا ہو۔ ایسے سمجھ میں نہ آنے والے مناظر اس کے دل کی دھڑکن کو خطرناک حد تک بڑھا دیا کرتے تھے۔ وہ پہلے ہی دل کے عارضے میں مبتلا تھا۔ ایسی کیفیت میں ہیرولڈ کو یوں محسوس ہونے لگتا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ ہر بار وہ خود کو یہی تسلی دیتا تھا۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو میں دیکھتا ہوں۔ یہ ایک سراب اور کھلی آنکھوں کا خواب ہے۔"

اسے ساحل، جھٹ پٹے اور ان بے معنی سایوں سے نفرت سی ہوگئی تھی۔ یہ سلسلہ کوئی تین ہفتے پہلے بالکل بھی نہیں تھا۔ ہیرولڈ کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس کا آغاز بیٹی کی ضد کے بعد ہی ہوا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔

"ہیرولڈ! جب رات میں سمندر کی موجیں جوش جنون میں شور و مستی کر رہی ہوں تو ہمیں ساحل کی گیلی ریت پر واک کرنی چاہیے۔" اس کی بیوی بیٹی نے اصراری لہجے میں کہا تھا۔ "یہ ساحل، یہ سمندر اور وہاں کی فضا ایک دم فری ہے۔ اس نائٹ واک پر ہمارا ایک ڈالر بھی خرچ نہیں ہوگا۔" پھر اس نے بڑی حسرت اور دو معنی الفاظ میں اضافہ کر دیا تھا۔

"ہیرولڈ! ہم یہ عیاشی تو افورڈ کر ہی سکتے ہیں؟"

"یہ بہت خطرناک ہوگا بیٹی!" ہیرولڈ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "ساحل پر اس وقت بہت اندھیرا ہوتا ہے اور سمندر کی سرکش لہروں کا شور خاصا ہیبت ناک ہوتا ہے۔ تم جانتی ہی ہو میں دل کا مریض ہوں۔ تمہارا آئیڈیا بہت رسکی ہے بیٹی!"

"رسکی...... کس کے لیے؟" بیٹی نے پوچھا تھا۔

"مجھے اپنی تو زیادہ پروا نہیں ہے۔" وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔ "میں ڈرتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہ ہو جائے۔ ہم اس عمر میں کوئی معمولی سا حادثہ بھی برداشت نہیں کر پائیں گے۔"

"مجھے کیا ہونا ہے ہیرولڈ!" وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ "اگر ساحل پر چہل قدمی کرتے ہوئے کوئی خطرہ سامنے آ بھی گیا تو تم مجھے اس سے بچا لینا۔ تم سے اچھا میرا محافظ بھلا اور کون ہو سکتا ہے۔"

"میں......!" وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میں تو اس دل کی بیماری کے باعث خود مجبوروں جیسی زندگی گزار رہا ہوں، کسی دوسرے کی کیا خاک حفاظت کر پاؤں گا۔"

ہیرولڈ کا روکھا پھیکا جواب سن کر بیٹی کا چہرہ اتر گیا تھا۔ یہ دیکھ کر ہیرولڈ کو بہت دکھ ہوا تھا۔ اس کے مقابلے میں بیٹی کی خواہشات لامحدود تھیں۔ ہیرولڈ کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ بیٹی کی خوشیوں کا کماحقہ خیال رکھ سکے۔ وہ اپنی ملازمت کی پنشن پر زندہ تھا اور اس قلیل رقم میں وہ جتنا افورڈ کر سکتا تھا، اس سے آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا مگر بیٹی کی اداسی بھی اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ سو، اس نے اپنی بیوی کی ضد کے سامنے سپر ڈال دی تھی۔

وہ ہر رات سمندر کی سیر کو جانے لگے۔

وہ بیٹی کی خوشی کی خاطر اس واک کے لیے راضی ہوا تھا لیکن اس کے دل میں ساحل کے لیے موجود نفرت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اسے گیلی ریت، ریت کی سطح کے اندر دھنسی ہوئی سیپیاں اور سر تک بلند ہوتی سمندر کی موجیں بالکل پسند نہیں تھیں۔ دن کی روشنی میں ساحلی سیر اتنی مہلک ثابت نہیں ہوئی تھی جتنی کہ شام کے دھندلکے اور رات کی تاریکی میں۔

اب ہیرولڈ نے رات کے علاوہ صبح میں بھی ساحلی سیر شروع کر دی تھی مگر بالکل اکیلے کیونکہ بیٹی کو ایریزونا جانا پڑ گیا تھا اور وہ اس کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے اس عمل کو مسلسل کیے جا رہا تھا۔ وہ اس بات پر حیران بھی تھا کہ پچھلے دنوں میں سمندر نے ساحل پر ایسی کوئی چیز نہیں پھینکی تھی جسے ہیرولڈ ناپسند کرتا ہو یا وہ کسی بھی حوالے سے اس کے لیے کسی نئی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہو۔

انہی خیالات کے ساتھ ہیرولڈ ساحل کے کنارے بنے ہوئے عمدہ مکانات کے سامنے سے گزر کر ہائی وے پر آیا اور پھر ان کے عقب میں واقع گلی کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کا گھر تھا۔

اب وہ اپنے گھر میں بالکل تنہا تھا، سوائے ان ناقابل فہم پراسرار ہیولوں کے جو کسی بھی طور اس کا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آتے تھے۔

☆☆☆

رات [illegible] سے زیادہ گزر چکی تھی۔ "پومپانو" بیچ سے گھر واپس آنے کے بعد ہیرولڈ نے اپنی دوا کی دو گولیاں کھائی تھیں۔ یہ ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوا کی دوگنی خوراک تھی۔ ڈاکٹر نے اسے صرف ایک گولی کی خوراک لینے کی ہدایت کر رکھی تھی مگر دو گولیاں کھانے کے باوجود بھی اس کے دل کی دھڑکن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی اس کیفیت کے باعث سو بھی نہیں پا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا دل سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ طبیعت کی خرابی تو اپنی جگہ تھی ہی، اس پر مستزاد وہ سائے تھے جو بیڈروم کی دیواروں پر بڑے بھیانک انداز میں رقص کر رہے تھے۔

اس کی بھوک، پیاس اور نیند...... سب کچھ اڑ چکا تھا۔ ایک اچھوتے خیال کے زیر اثر ہیرولڈ نے اپنے بیڈروم کی تمام لائٹس آن کر دیں۔

اس کی خواب گاہ گویا روشنی میں نہا گئی۔ ایسا لگتا تھا، بیڈروم میں سورج نکل آیا ہو۔ اس چکاچوند میں وہ آسیبی سائے تو غائب ہو گئے تھے تاہم اس خیال نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک ساتھ اتنی ساری لائٹس آن کرنے کا مطلب تھا، کئی گنا زیادہ بجلی کا بل اور ہیرولڈ اتنی شاہ خرچی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ وہ اپنے طوفانی رفتار سے دھڑکتے ہوئے دل کو تھام کر رات بھر ان منحوس سایوں کے ساتھ جنگ لڑتا رہا۔

اگلی صبح طلوع آفتاب نے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔ اس کے گھر میں قدرتی روشنی نے ٹھکانہ کر لیا تھا اور دن کے اجالے میں وہ ناقابل فہم کیفیات خود بخود ختم ہو گئی تھیں۔

ایک فوری خیال کے تحت اس نے ٹی وی آن کر لیا۔ اس نے گزشتہ شام ساحل سمندر پر جو پراسرار مناظر دیکھے تھے، وہ ابھی تک پوری طرح اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئے تھے۔ وہ ان مناظر کی حقیقت سے واقف تھا اور یہی واقفیت اسے بے قرار کیے ہوئے تھی۔ اس اندوہناک واقعے کے بعد سے وہ سکون کی سانس بھی نہیں لے پا رہا تھا۔

وہ ٹی وی کے سامنے سے اٹھا اور کچن میں گھس گیا۔ وہ رات کو بھی کچھ کھا نہیں پایا تھا اس لیے اب اسے زور کی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ ناشتے کے نام پر اس نے اپنے لیے ایک کپ چائے بنائی اور ایک مفن (کپ کیک) بھی ٹرے میں رکھ کر وہ دوبارہ ٹی وی کے سامنے آ بیٹھا۔ تمام نیوز چینلز کے نیوز بلیٹن دیکھنے کے بعد اسے حیرت ہوئی تھی۔ کسی ایک چینل نے بھی پومپانو بیچ کے حوالے سے کوئی چھوٹی یا بڑی خبر نشر نہیں کی تھی۔ اس نے ٹی وی آف کیا اور گھر کے باہر بنے ہوئے چبوترے پر کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔

حرارت بخش دھوپ ہیرولڈ کی بوڑھی ہڈیوں میں جا گزیں [illegible] کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھی۔ آئندہ چند روز تک وہ باقاعدگی سے ساحل سمندر پر جاتا رہا اور ٹی وی پر نیوز چینلز بھی دیکھتا رہا لیکن اس کی توقع پوری نہیں ہوئی۔ وہ سفاک توقع جس نے اس کا دن کا چین اور رات کی نیند چھین لی تھی۔ وہ واقعہ اس کی زندگی کا سب سے ہولناک حادثہ تھا۔

ہیرولڈ اور بیٹی اپنے بڑھاپے کے دن پومپانو نامی فلوریڈا کے ساحل پر گزار رہے تھے۔ اس بیچ کے ساتھ موجود چٹانوں کے اوپر عالیشان مکان بنے ہوئے تھے۔ ہیرولڈ کا گھر ان عالیشان مکانات کے عقب میں واقع ایک اسٹریٹ پر تھا۔ وہ ایک دو منزلہ مکان تھا مگر انہی کی طرح خستہ حال اور عمر رسیدہ۔ اس پٹی کے تمام مکان کچھ ایسی ہی حالت کے حامل تھے جن میں سے بعض تو سیلن زدہ کھنڈر نظر آتے تھے۔

وہ محدود خواہشات رکھنے والا ایک قناعت پسند شخص تھا لیکن بیٹی اس کے برعکس دولت کو بہت زیادہ اہمیت دیتی تھی اور وہ بھی امیر بننا چاہتی تھی۔ اس نے عمدہ مکان میں رہنے والی ایک بوڑھی کھوسٹ عورت جوزفین سے دوستی بھی کر لی تھی۔ ان دونوں کا مشترکہ شوق "برج" [illegible] کھیل تھا۔ بیٹی برج کی بازی لگانے [illegible] کرتی تھی اور واپس آ کر وہ ہیرولڈ کو جوزفین کی دولت [illegible] اور [illegible] حیرات کے قصے سنایا کرتی تھی۔ ہیرولڈ [illegible] جوزفین کے نام ہی سے چڑی ہوئی تھی۔ وہ بیٹی کا دل رکھنے کے لیے اس کی باتیں سن لیا کرتا تھا مگر گہری سوچ بچار کے بعد بھی وہ یہ راز سمجھ نہیں پایا تھا کہ بیٹی نے جوزفین کو اپنی دوست بنانے کے لیے کون سی سائنس استعمال کی تھی کیونکہ بظاہر ایسا ہونا ناممکنات میں سے تھا۔

اس واقعاتی معاملے کے حوالے سے ہیرولڈ کے ذہن میں کئی سوالات تھے جن کے جوابات حاصل کرنے کے لیے اس نے پابندی سے پومپانو بیچ جانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے وہاں جو پراسرار مناظر دیکھے تھے، ان کی توجیہہ نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ معاملے کی تہہ تک رسائی حاصل کیے بغیر سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

پچھلے چند روز سے ہیرولڈ اکیلا ہی ساحل سمندر کی سیر کو جا رہا تھا۔ ایک دوپہر وہ واپس لوٹا تو اس کے سیل فون پر ایک کال موصول ہوئی۔ وہ بیٹی کی اسی قریبی دوست جوزفین کا فون تھا۔

"ہیلو!" اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹی کئی روز سے برج کھیلنے میرے پاس نہیں آئی۔" جوزفین نے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔ "اور وہ تمہارے ساتھ بیچ کی طرف جاتی بھی دکھائی نہیں دی۔ وہ ہے کہاں؟"

"بیٹی اٹلانٹا گئی ہوئی ہے۔" ہیرولڈ نے پہلے سے تیار کیا ہوا جواب دیا۔

"اچھا..... لیکن اس نے مجھ سے تو ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔"

"وہاں اٹلانٹا میں اس کی فیملی میں کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے۔" ہیرولڈ نے میکانکی انداز میں کہا۔ "اس کا فوری طور پر جانا ضروری تھا۔ شاید اسی لیے تمہیں بتا نہیں سکی۔"

ہیرولڈ نے اس حادثے کے بعد اس بیان کی خوب اچھی طرح ریہرسل کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ بیٹی کی عدم موجودگی کے حوالے سے اسے بہت سارے لوگوں کو جواب دینا پڑے گا۔

"بیٹی کو ڈرائیو کرنا پسند نہیں، یہ میں جانتی ہوں۔" جوزفین نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "پھر وہ اکیلی اتنی لانگ ڈرائیو پر کیسے چلی گئی؟"

"وہ بس سے گئی ہے۔"

"بس؟" جوزفین نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "ہیرولڈ! تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔ پومپانو (فلوریڈا) سے اٹلانٹا (جارجیا) کے لیے کوئی بس سروس نہیں ہے۔"

"میامی سے اٹلانٹا تک تو ہے نا.......!" ہیرولڈ نے ہر متوقع سوال کا جواب خوب اچھی طرح رٹ رکھا تھا۔ "میں کار میں بیٹی کو میامی تک چھوڑنے گیا تھا۔ جب وہ اٹلانٹا جانے والی بس میں سوار ہوگئی تو اس کے بعد ہی میں واپس آیا تھا۔"

"تم اسے اٹلانٹا ہی پہنچا دیتے۔" جوزفین نے جھلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ "اس کی فیملی میں اگر کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے تو تمہیں اس کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ یہاں فالتو بیٹھے تم کون سا نیا امریکا دریافت کرنے میں لگے ہوئے ہو؟"

"میری صحت اس قابل نہیں ہے کہ میں....."

ہیرولڈ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سیلولر رابطہ منقطع ہوگیا۔ دوسری جانب موجود دولت مند بڑھیا جوزفین نے خفگی بھرے انداز میں لائن کاٹ دی تھی۔

ہیرولڈ، جوزفین کو سخت ناپسند کرتا تھا اور اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ بیٹی کا دماغ خراب کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ بیٹی کے اندر دولت مند بننے کی تمنا موجود تھی لیکن ہیرولڈ کے خیال میں جوزفین کی باتوں اور مشوروں نے بیٹی کی اس تمنا کو بھوک میں بدل دیا تھا۔

☆☆☆

ہیرولڈ اپنی تیار کردہ کہانی جوزفین کو سنانے کے بعد مطمئن ہوگیا تھا مگر لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد اس کا یہ اطمینان غارت ہو کر رہ گیا۔ ڈور بیل کی آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دوسری گھنٹی پر اس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک دراز قامت، چاق و چوبند شخص کھڑا تھا جس کی عمر پچاس کے قریب تھی اور شکل بڑی حد تک جیمز بانڈ سیریز کے ایک ہیرو شان کونری سے ملتی تھی۔ ہیرولڈ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔

"میں پولیس ڈیٹیکٹو پیرس ہوں۔ ایک سنجیدہ معاملے کے حوالے سے مجھے مسٹر ہیرولڈ سے چند سوالات کرنا ہیں۔"

"میں ہی ہیرولڈ ہوں۔" اس نے لہجے سے خود کو پُراعتماد ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ "آفیسر! وہ سنجیدہ معاملہ کس نوعیت کا ہے اور اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟"

"معاملہ تمہاری بیوی بیٹی کا ہے۔" پولیس کے سراغ رساں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "کیا ہم اندر بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟"

پولیس کی آمد اور بیٹی کے ذکر نے ہیرولڈ کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تاہم اس نے خود کو مضبوطی سے بظاہر سنبھالے رکھا۔ پیرس نے اسے اپنی سروس آئی ڈی دکھائی تو ہیرولڈ کے پاس انکار کی گنجائش باقی نہ رہی۔ وہ پولیس ڈیٹیکٹو کو اپنے گھر کے اندر آنے سے نہ روک سکا۔

"تمہاری بیوی کہاں ہے؟" وہ آمنے سامنے بیٹھ چکے تو پیرس نے پوچھا۔

"بیٹی کی فیملی میں کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے۔" ہیرولڈ نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کرتے ہوئے بتایا۔ "وہ اٹلانٹا گئی ہے۔"

"بیٹی کی کسی دوست نے ہمارے چیف کو فون کیا تھا۔" پیرس نے معتدل انداز میں کہا۔ "اس نے بتایا ہے کہ تمہاری بیوی اس کے ساتھ برج کھیلا کرتی تھی لیکن اب وہ دکھائی نہیں دے رہی۔"

"اوہ..... تو یہ جوزفین کا کام ہے۔" ہیرولڈ نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "اس موٹی بڑھیا کو دنیا کے ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کا شوق ہے۔ گھنٹا بھر پہلے اس نے مجھے بھی فون کیا تھا۔ وہ مجھ سے بیٹی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ میں نے اسے بھی وہی بتایا تھا جو ابھی آپ کو بتایا ہے۔"

بات کے اختتام پر ہیرولڈ نے اپنے ہاتھ جیبوں میں ٹھونس لیے تھے تاکہ وہ سراغ رساں اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو نہ دیکھ سکے۔

"میڈم جوزفین کو تمہاری سنائی ہوئی کہانی پر یقین نہیں آیا اسی لیے اس نے ہمارے چیف کو فون کر دیا۔" پیرس نے کہا۔ "جوزفین کو شک ہے کہ بیٹی اٹلانٹا نہیں گئی۔ وہ چاہتی

ہے کہ ہم اسے تلاش کریں۔"

"بیٹی میری بیوی ہے اور اس کی فکر موٹی بڑھیا کو نہیں بلکہ مجھے ہونا چاہیے۔" ہیرولڈ نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ "بہرکیف..... آفیسر! آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

اس نے سراغ رساں کے سامنے خود کو مضبوط اور پُراعتماد ظاہر کرنے کے لیے اپنی تمام تر ہمت کو مجتمع کر لیا تھا لیکن اس کے اندرون میں ہر طرف بے چینی اور سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔

"کیا میامی سے اٹلانٹا کی جانب سفر کے دوران میں بیٹی نے تم سے رابطہ کیا تھا؟" پیرس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں۔" ہیرولڈ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ہم میاں بیوی سوشل سیکیورٹی کی محدود رقم پر بمشکل گزر بسر کر رہے ہیں۔ ہم دو فون افورڈ نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی سیل فون ہے۔" پھر اس نے اپنا لرزیدہ ہاتھ جیب سے باہر نکالا اور آفیسر کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ رہا ہمارا اکلوتا سیل فون۔"

"تمہارا ہاتھ کیوں کپکپا رہا ہے؟" پیرس نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ "کیا تم میری آمد سے نروس ہو رہے ہو؟"

"ایسی بات نہیں ہے آفیسر!" وہ دوسرا ہاتھ بھی جیب سے باہر نکال کر پیرس کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "میں بعض پیچیدہ ذہنی امراض کا شکار ہوں جنہوں نے میرے دل کو بھی بری طرح متاثر کر رکھا ہے۔ میرے دل کی طوفانی دھڑکن اور ہاتھوں کی تھرتھراہٹ کسی خوف یا ڈر کے باعث نہیں ہے۔ یہ خالصتاً ایک میڈیکل پرابلم ہے جسے میں کافی عرصے سے جھیل رہا ہوں۔"

"کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟" پیرس نے شک زدہ لہجے میں سوال کیا۔

"ڈاکٹر کا علاج تو مسلسل چل رہا ہے۔" ہیرولڈ نے بیزار کن لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن چند روز سے دوائیاں خاطر خواہ اثر نہیں کر رہیں۔ بیٹی واپس آجائے تو میں ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا تاکہ وہ میرے نسخے پر نظرثانی کر سکے۔"

"پومپانو، فلوریڈا کا ساحل ہے۔" پیرس نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ "فلوریڈا کی ساحلی پٹی کے باسیوں کو سنگترے کا استعمال باقاعدگی سے کرنا چاہیے۔" پھر اس نے ہیرولڈ کے لرزتے ہوئے ہاتھ میں دبے سیل فون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"یہ بہت عمدہ فلپ فون ہے..... بڑے نمبروں والا۔ ڈائلنگ میں کافی آسانی رہتی ہے..... ہے نا؟"

"بالکل، ایسا ہی ہے۔" ہیرولڈ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس فون کا یہی پہلو مجھے پسند ہے۔"

"اگرچہ کسی لاپتا انسان کے کیس کے حوالے سے یہ خاصا جلدی ہے۔" پیرس اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "لیکن ہم پر اوپر سے بہت دباؤ ہے اس لیے میں فوراً ہی یہاں تم سے پوچھ تاچھ کرنے چلا آیا ہوں۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں آفیسر!" ہیرولڈ نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"میں پھر آؤں گا۔" پیرس نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ "اور اس وقت تک آتا رہوں گا جب تک تمہاری بیوی کا سراغ نہیں مل جاتا۔ ایک سراغ رساں ہونے کے ناتے یہ میری ڈیوٹی ہے اور ہاں....." لمحاتی توقف کر کے اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایک سنگترہ روزانہ یہ تمہارے اعصاب کو تقویت دے گا۔"

پیرس کے جانے کے بعد ہیرولڈ نے چند گہری سانسیں لے کر خود کو اعصابی سکون پہنچایا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ پولیس ڈیٹیکٹو بیٹی کی گمشدگی کے سلسلے میں اسی کو قصوروار ٹھہرائے گا لیکن پیرس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اسے ہیرولڈ پر شک ہے تاہم اس کے بار بار آنے کے عزم نے ہیرولڈ کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

ہیرولڈ کا ذہن اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ جب تمام نیوز چینلز پومپانو بیچ کے حوالے سے خاموش تھے تو پھر پولیس اتنی سرگرمی کیوں دکھا رہی تھی۔

☆☆☆

موسم سرما، بوڑھی ہڈیوں اور گھر پر پولیس کی آمد نے ہیرولڈ کی کپکپاہٹ میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ وہ بیڈروم میں پہنچا۔ وارڈروب میں اس کے دو گرم سوئیٹر رکھے ہوئے تھے۔ وہ ان لمحات میں کسی ایسی شے کی ہی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ڈریسر کی دراز کھول لی۔ اگلے ہی لمحے اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔

اس کے دونوں سوئیٹر دراز میں اوپر نیچے رکھے ہوئے تھے اور ان کے بیچ میں سے ایک ڈاکیومنٹ اس طرح جھانک رہا تھا جیسے سمندر میں ڈوبنے والی کسی عورت کا ہاتھ پانی کی سطح پر نمودار ہو کر مدد کے لیے پکار رہا ہو۔

وہ اس ڈاکیومنٹ کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ ان دونوں میاں بیوی کی مشترکہ انشورنس پالیسی تھی جو بیٹی کے اصرار پر ہی لی گئی تھی اور اس لائف پالیسی کا اماؤنٹ نصف ملین یعنی

پانچ سو ہزار (پانچ لاکھ) ڈالرز تھا۔ کم و بیش چھ ماہ پہلے بینی نے یہ آئیڈیا دیا تھا۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو ہیرولڈ کو لفظ بہ لفظ یاد تھی۔

"ہیرولڈ! ہم عمر کے جس حصے میں پہنچ چکے ہیں، ہمیں لائف انشورنس ضرور کرانا چاہیے۔" بینی نے چند پیپرز اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ "ہم دونوں کو ایک ایک پالیسی خرید لینا چاہیے۔"

"نصف ملین ڈالرز کی ایک پالیسی......!" ہیرولڈ نے ان کاغذات کا مطالعہ کرنے کے بعد عجیب سے لہجے میں جواب دیا تھا۔ "دو پالیسیز کا اماؤنٹ ہوگیا پورے دس لاکھ ڈالرز اور...... اور تم نے اس کا پریمیم دیکھا ہے؟ ہم اتنی رقم کیسے ادا کیا کریں گے؟" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنے اعتراض کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ان پالیسیز کا پریمیم (قسط) ادا کرنے کے لیے ہمیں گھر فروخت کر کے کسی سیلن زدہ کھنڈر میں جا کر رہائش اختیار کرنا پڑے گی اور ایسے کہنہ سال ویران مکان اس ساحل پر آسانی سے مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں سینما، میکڈونلڈ، مفن، چائے اور کھانے پینے کی دیگر اشیا میں بھی حد درجہ کمی لانا پڑے گی۔ تم سمجھ رہی ہو نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"تمہارا ہوگیا نا......!" بینی گہری سنجیدگی سے بولی۔ "میں نے اگر لائف انشورنس پالیسی لینے کے بارے میں سوچ لیا ہے تو میں یہ کام کر کے ہی چین سے بیٹھوں گی۔ ویسے میں تمہارے تحفظات کو دور کر سکتی ہوں۔"

"کون سے تحفظات؟" ہیرولڈ نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"پریمیم!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ہماری قسط کی رقم کم بھی ہو سکتی ہے۔"

ہیرولڈ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "وہ کیسے؟"

"جس طرح ہم نے الگ الگ کے بجائے جوائنٹ سوشل سیکیورٹی لے رکھا ہے، ویسے ہی جوائنٹ انشورنس پالیسی بھی لے سکتے ہیں۔" بینی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اگر ہم پانچ سو ہزار ڈالرز کی ایک مشترکہ بیمہ پالیسی خرید لیں تو اس پر ہمیں کافی کم پریمیم ادا کرنا پڑے گا اور فائدہ یہ ہوگا کہ ہم میں سے کسی کے بھی گزر جانے کے بعد دوسرے کو پانچ لاکھ ڈالرز مل جائیں گے۔"

ہیرولڈ اپنی بیوی کی ہوشیاری بھری ذہانت کا قائل تھا۔ بینی نے جوزفین جیسی مغرور اور خرانٹ مال دار بڑھیا کو اپنی دوست بنا رکھا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ چند لمحات کی سوچ بچار کے بعد ہیرولڈ نے بینی کی جوائنٹ انشورنس پالیسی والی بات مان لی تھی۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے [illegible] ذہن سے گزرے اور اس نے شکر ادا کیا کہ پیرس [illegible] وارنٹ کے ساتھ وہاں نہیں آیا تھا ورنہ اگر اس کے پاس تلاشی کا وارنٹ ہوتا تو یہ بیمہ پالیسی اس کے ہاتھ لگ جاتی جس کا سیدھا سا ایک مطلب یہ بھی نکالا جاسکتا تھا کہ ہیرولڈ نے پالیسی کی رقم نصف ملین ڈالرز کے حصول کی خاطر اپنی بیوی بینی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اس کے [illegible] جانے کی کہانی گھڑی تھی۔

ہیرولڈ جیل کے تصور ہی سے لرز کر رہ گیا۔ اس نے جوائنٹ انشورنس پالیسی کو ایک محفوظ مقام پر چھپا دیا اور دل ہی دل میں بینی کو کوسنے بھی لگا۔

"اتنی اہم چیز کو بھلا کوئی ایسے ہی کپڑوں والی دراز میں رکھتا ہے۔ بعض اوقات تم ایک بے وقوفی کی حرکتیں کر جاتی ہو، لگتا ہے کہ تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہوئی ہے۔"

اس نے ایک گرم سویٹر پہنا اور بیڈروم سے باہر نکل آیا۔

اب ہر روز اسے ایک نئے ذہنی صدمے سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اس کی اپنی پریشانیاں کم نہیں تھیں کہ اوپر سے پیرس کی آمد و جامد شروع ہوگئی تھی اور خرابی کی بات یہ کہ اس سراغ رساں کے آنے کا کوئی وقت مخصوص نہیں تھا۔ وہ کبھی بھی آ دھمکتا تھا اور اس کے بعد سوالات کا ایک نیا دروازہ کھل جاتا تھا۔

ہیرولڈ کے ساتھ پیرس کا رویہ ایسا تھا کہ جسے دوستانہ کہا جاسکتا تھا اور نہ ہی دشمنانہ۔ اس نے بینی کی گمشدگی کے حوالے سے ایک بار بھی براہ راست اس پر اپنے شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کے سوالات کرنے کا انداز ہمدردانہ ہوتا تھا لیکن اس دوران میں وہ ہیرولڈ کو متجسس نظر سے گھورتا بھی تھا تاکہ وہ ہیرولڈ کے چہرے کے تاثرات سے کوئی ایسا اشارہ پکڑنے میں کامیاب ہو جائے جو بینی کی پراسرار گمشدگی کا معمہ حل کرنے میں معاون ثابت ہو۔ وہ ہیرولڈ کی جانب سے کسی غلطی کا منتظر تھا۔

"بینی کی کوئی خبر......؟" یہ پیرس کا پسندیدہ سوال تھا۔

ہیرولڈ نے بھی مستقل مزاجی سے اس سوال کا ایک ہی جواب دیا تھا۔ "نہیں!"

پانچ دن تک ان کے بیچ ٹام اینڈ جیری کا کھیل جاری رہا پھر ہیرولڈ کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے پیرس سے جان چھڑانے کے لیے دروغ گوئی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ چھٹے روز اس نے سراغ رساں کے اس پسندیدہ سوال کے جواب میں مدلل انداز میں کہا۔

"اس نے مجھے فون کیا تھا۔ میں نے بینی کو بتایا کہ اس کے اچانک چلے جانے سے اس کے دوست بہت فکرمند ہیں۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اپنے دوستوں سے رابطہ کر کے انہیں اپنی خیریت سے مطلع کرے گی۔"

"کیا بینی اٹلانٹا پہنچ چکی ہے؟" پیرس نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"نہیں......!" ہیرولڈ بے ساختہ بول اٹھا۔

"کمال ہے......!" پیرس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اتنے دنوں میں تو کوئی بس پورا امریکا گھوم کر واپس آسکتی ہے اور تمہاری بیوی میامی سے اٹلانٹا تک نہیں پہنچی۔ کیا وہ بس سے اتر کر پیدل ہی چل پڑی ہے؟"

ہیرولڈ کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا لیکن اس غلطی کو دور کرنے کے لیے وہ ایک بڑی غلطی کر بیٹھا۔ "میں نہیں جانتا۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "بینی نے اس بارے میں مجھے کچھ بتایا نہیں۔"

"کیا میں ابھی بینی سے بات کر سکتا ہوں؟" پیرس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے وہ نمبر بتاؤ جس سے بینی نے تمہیں فون کیا تھا۔ میں اسے کال کرنا چاہوں گا۔"

"وہ نمبر مجھ سے ڈیلیٹ ہوگیا ہے۔" ہیرولڈ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنے کی روش پر چل نکلا۔ "بینی نے بتایا تھا کہ ان کی بس کسی موٹیل پر رکی ہوئی ہے اور وہ وہیں سے مجھے فون کر رہی ہے۔"

"موٹیل کا نام؟" پیرس نے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔

وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "اس موٹیل کا نام بینی نے بتایا اور نہ ہی میں نے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی۔ میرے اطمینان کے لیے یہ کافی تھا کہ وہ خیریت سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔"

"لیکن میرے اطمینان کے لیے یہ کافی نہیں ہے مسٹر ہیرولڈ!" پیرس نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اگر کسی کی فیملی میں کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو وہ بس پکڑنے کے بجائے میامی سے اٹلانٹا کی فلائٹ لے گا۔ ایمرجنسی کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آپ ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرنے کے لیے بس میں بیٹھ کر سفر کریں اور تمہاری بیوی تو شاید پومپانو سے اٹلانٹا تک پیدل سفر کر کے کوئی انوکھا ریکارڈ قائم کرنے والی ہے۔"

پیرس کا آخری جملہ طنز اور تمسخر کا پیامبر تھا۔ جواب میں ہیرولڈ نے کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ اپنے لرزہ زدہ ہاتھوں کو تک رہا تھا جن کی کپکپاہٹ میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔

"تمہیں آرام کی ضرورت ہے اور دوا کی بھی۔" پیرس اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں پھر آؤں گا۔ اپنی صحت کا خیال رکھنا......!"

ہیرولڈ نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"اور ہاں......!" رخصت سے پہلے اس نے پوچھ لیا۔ "تم روزانہ سنگترہ تو لے رہے ہو نا؟"

"کبھی کھا لیتا ہوں اور کبھی ناغہ ہو جاتا ہے۔" ہیرولڈ نے بتایا۔

"ناغہ اچھی چیز نہیں ہے مسٹر ہیرولڈ!" پیرس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "جب سے مجھے تمہاری بیوی کو ڈھونڈنے کا ٹاسک ملا ہے، میں روزانہ تمہارے پاس آتا ہوں...... بلاناغہ!"

آئندہ پانچ روز بھی پیرس نہایت ہی پابندی کے ساتھ ہیرولڈ سے ملنے آتا رہا اور اپنے پچھلے والے سوالات کو نئے انداز میں پوچھ کر ہیرولڈ کو توڑنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ تاہم اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں یہ چور خیال کسی جگنو کے مانند ٹمٹما رہا تھا...... یہ سراغ رساں میرے دماغ کو کھود کر کچھ نہ کچھ ضرور برآمد کر لے گا......!

☆☆☆

آج ہیرولڈ خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ بینی کے جانے کے بعد وہ صبح و شام دو مرتبہ ساحل سمندر کی سیر کو جانے لگا تھا لیکن پیرس سے اس کی ملاقات ہمیشہ گھر پر ہی ہوئی تھی۔ اسے یہ خاصا عجیب لگتا تھا کہ وہ پولیس ڈیٹیکٹو کبھی ایسے وقت اس سے ملنے نہیں آیا جب وہ گھر سے باہر بیچ پر ہو۔ اس سے ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ پیرس نے اسے مسلسل اپنی نگرانی میں رکھا ہوا تھا پھر بارھویں دن ہیرولڈ کو اس کا ثبوت بھی مل گیا۔

وہ حسب معمول بیچ پر ٹہل رہا تھا۔ ساحل سمندر کی سیر دراصل ایک بہانہ تھا۔ وہ روزانہ ان آثار اور نشانات کا جائزہ لینے جاتا تھا جو اس نے پہلی شام وہاں جھٹ پٹے میں دیکھے تھے۔ اس کے بعد ہی اسے پومپانو بیچ کے حوالے سے کسی سنسنی خیز خبر کا انتظار رہنے لگا تھا۔

آج بھی سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ گزشتہ روز چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کی سینڈل کے مخصوص نشانات گیلی ساحلی ریت پر موجود تھے۔ وہ چھوٹا سا گڑھا بھی اپنی جگہ پر ویسا ہی نظر آ رہا تھا جیسا اس نے پہلی شام دیکھا تھا۔ مذکورہ گڑھے کے بعد

ریت پر کسی وزنی شے کو گھسیٹنے کے نشانات تھے۔ انہیں دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا جیسے کسی لاش کو گھسیٹ کر سمندر سے ساحل کی طرف لایا گیا ہو...... کسی انسانی لاش کو......!

"ہیلو......!"

اپنے عقب میں ایک جانی پہچانی آواز سن کر وہ چونک اٹھا اور اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پیئرس سبک قدموں سے اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

جب سے ادویات نے ہیرولڈ پر اثر کرنا چھوڑ دیا تھا، اس کے دل کی دھڑکن قابو سے باہر ہی رہتی تھی تاہم آج کا دن نسبتاً بہتر تھا اور وہ صبح ہی سے خاصا ریلیکس محسوس کر رہا تھا مگر پیئرس پر نگاہ پڑتے ہی اس کا اطمینان غارت ہو گیا تھا۔ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ اس سراغ رساں نے مسلسل ہیرولڈ کو اپنی نظر میں رکھا ہوا تھا۔ اس تصدیق نے اس کے دل کی دھڑکن کو خطرناک حد تک بڑھا دیا تھا۔

پیئرس کے قریب آنے پر ہیرولڈ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "آفیسر! کیا آپ بھی ساحلِ سمندر کی سیر سے لطف اندوز ہونے آئے ہو؟"

پیئرس نے گول مول جواب دیا۔ "میں تو بس اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوں۔" پھر ہیرولڈ کے چہرے پر نگاہ جما کر اضافہ کر دیا۔ "اور تم......؟"

"میں تو بس ایسے ہی ٹہلنے آیا ہوں۔"

"کیا واقعی!" پیئرس نے ذومعنی انداز میں کہا۔ "بس ایسے ہی......؟"

ہیرولڈ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ وہ گیلی ریتیلی زمین کو گھورنے لگا۔ وہ زمین جہاں چھوٹا سا گڑھا نظر آ رہا تھا۔ اس گڑھے کی دوسری جانب پیئرس کھڑا تھا۔ یکایک ہیرولڈ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا حلق کسی صحرا کے مانند خشک ہو گیا ہو۔

پیئرس کی نگاہوں نے ہیرولڈ کی نظر کا تعاقب کیا اور مذکورہ گڑھے تک پہنچ گئی۔ سمندر کی لہروں نے اس کی گہرائی کو کم کرنے کے بعد اسے خاصا پھیلا دیا تھا تاہم اسے دیکھ کر بخوبی سمجھ میں آ جاتا تھا کہ کسی بھاری شے کو یہاں سے گھسیٹ کر ساحل کی طرف لے جایا گیا تھا۔ اس گڑھے ہی سے کسی باڈی کو گھسیٹنے کے وہ مخصوص نشانات شروع ہوتے تھے۔ ہیرولڈ کا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ سمندر کی موجوں نے اتنے دن گزر جانے کے باوجود بھی "گھسیٹے جانے" کے ان مخصوص نشانات کو مٹایا کیوں نہیں تھا؟

یہ سب سوچتے ہوئے ہیرولڈ کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو جائے گا۔ پیئرس اپنے سوال کے جواب میں مسلسل اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ ہیرولڈ کو یقین ہو گیا کہ جواب دیے بغیر وہ اس کی جان نہیں چھوڑنے والی۔ اس نے اپنی بچی کھچی ہمت کو مجتمع کیا اور خود کو پُراعتماد ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں بالکل۔ بس ایسے ہی...... میں ساحل سمندر کی سیر سے خود کو بہت بہتر محسوس کرتا ہوں۔ یہ میری صحت کے لیے ایک ٹانک کی طرح ہے...... شکتر سے کہیں زیادہ مفید......!"

ہیرولڈ کی اس چوٹ پر پیئرس معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "جب سے تمہاری بیوی بقول تمہارے کسی فیملی ایمرجنسی کے سلسلے میں اٹلانٹا گئی ہے، تم نے دن میں دوبار سمندر کی سیر شروع کر دی ہے لیکن میں تمہاری صحت میں کوئی مثبت فرق نہیں دیکھ رہا۔" وہ ہیرولڈ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

ہیرولڈ نے اس کے آخری سوالیہ جملے کا جواب نہیں دیا اور ناپسندیدہ نظر سے چٹانوں کے اوپر بنے ہوئے ان مکانات کو دیکھنے لگا جو انتہائی خوشنما اور عالیشان تھے اور جوزفین انہی میں سے ایک مکان میں رہتی تھی۔ ان قیمتی مکانات کی قطار کے آخری سرے پر ایک دو منزلہ ویران، کھنڈر سا سیلن زدہ مکان بھی تھا جہاں کوئی نہیں رہتا تھا بلکہ کوئی اس طرف جانا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ ہیرولڈ نے موٹی بڑھیا جوزفین کے مکان کی طرف دیکھنے کے بعد پیئرس کے استفسار کے جواب میں کہا۔ اس کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھا۔

"میرے روزانہ دو مرتبہ اُدھر آنے کی اطلاع بھی اسی ہتھنی جوزفین نے تمہارے چیف کو دی ہو گی ڈیٹیکٹو پیئرس......؟"

"میڈم جوزفین نے ہمارے چیف کی بیوی کو فون کیا تھا۔" پیئرس نے معتدل انداز میں کہا۔ "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ جوزفین ہمارے چیف کی بیوی کی کزن ہے اور وہ بیٹی کے غیاب کو لے کر تم سے زیادہ تمہاری بیوی کے لیے فکر مند ہے۔"

"میں اس بکواس بات کو نہیں مانتا۔" ہیرولڈ نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "بیٹی کی فکر اس دنیا میں مجھ سے زیادہ اور کسی کو نہیں ہو سکتی۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے دو چار گہری سانسیں لیں پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ میں جانتا ہوں کہ جوزفین کے تمام دوست اور رشتے دار اونچی جگہوں پر بیٹھے ہوئے ہیں اور مجھے یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ پولیس بااثر افراد کے اشارے پر کس طرح حرکت میں آ جاتی ہے۔"

"پولیس کی خدمات ہر طاقتور اور کمزور شخص کے لیے ایک جیسی ہیں مسٹر ہیرولڈ!" پیئرس نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "تمہیں اپنے ذہن سے اس غلط فہمی کو نکال دینا چاہیے کہ میری یہ جاب کسی امیر خاتون کی خوشنودی کی خاطر ہے۔ میں تو پوری دیانت داری سے اپنا کام کر رہا ہوں اور...... میرا کام ہے، ایک غریب عورت بیٹی کی پُراسرار گمشدگی کا سراغ لگانا۔ سمجھ گئے نا؟"

اس صورتِ حال نے ہیرولڈ کے دل کی دھڑکن کو اس حد تک بڑھا دیا تھا کہ اب اس کی ٹانگیں بھی کپکپانے لگی تھیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ان لمحات میں اس کے پورے بدن پر لرزہ طاری تھا۔ اسے گولیوں کی اشد ضرورت تھی۔ وہ گولیاں جو پچھلے چند روز سے بالکل اثر نہیں کر رہی تھیں۔

"اوہ...... آج تو تمہارے پاؤں بھی بری طرح تھرتھرا رہے ہیں۔" پیئرس نے اس کی ٹانگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں آرام کی ضرورت ہے مسٹر ہیرولڈ!"

"میں ٹھیک ہوں ڈیٹیکٹو!" ہیرولڈ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں خون کی روانی کو برقرار رکھنے کے لیے نہیں اپنی مرضی سے حرکت دے رہا ہوں۔" وہ سراغ رساں کے سامنے ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ "میں ساحل کے ساتھ ساتھ ایک لمبی واک لوں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔"

اپنی بات کے اختتام پر وہ ایک جانب بڑھ گیا۔ عقب سے پیئرس کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "میرا بھی یہی خیال ہے مسٹر ہیرولڈ کہ مجھے بھی اب چلنا چاہیے۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

ہیرولڈ نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی اور میانہ رفتار سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ ان لمحات میں اس کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ وہ گھر جا کر آرام کرے۔ اپنی دوا کی ڈبل اور ٹرپل خوراک لے کر وہ خود کو نارمل کرے لیکن ابھی اس نے پیئرس کے سامنے خود کو تارزن ثابت کرنے کے لیے کافی اونچی باتیں کر دی تھیں۔ اگر وہ سمندر کے ساحل کو چھوڑ کر گھر کی راہ لیتا تو اس کا یہ اقدام پیئرس سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔

وہ گہری سانسیں لیتے ہوئے آگے بڑھتا رہا اور بوٹ چینل کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ستانے کے لیے بوٹ چینل کے نزدیک بیٹھ کر لائٹ ہاؤس کا نظارہ کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کی طبیعت بحال ہو گئی۔ اس نے واپسی کا قصد کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے چاروں جانب نگاہ دوڑا کر قرب وجوار کا جائزہ لیا۔ پولیس ڈیٹیکٹو پیئرس اسے دور دور تک کہیں دکھائی نہیں دیا۔

وہ گھر سے یہ سوچ کر نکلا تھا کہ آج ریت پر کسی وزنی شے کو گھسیٹے جانے کے راز کی تہہ تک پہنچ کر ہی رہے گا۔ وہ واپس اس گڑھے کے پاس پہنچ گیا جہاں سے گھسیٹے جانے کے نشانات کا آغاز ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ گڑھا اب کسی باقاعدہ گڑھے کی شکل کا نہیں رہا تھا۔ سمندر کی موجوں نے اس کے آس پاس کی ریت کو خاصی حد تک ہموار کر دیا تھا۔ بہر حال، وہ ان مخصوص نشانات کے تعاقب میں چل پڑا جو سمندر سے شروع ہو کر ساحل کی طرف جا رہے تھے۔

دراصل وہ ایک لگ بھگ ڈیڑھ فٹ چوڑی لکیر تھی۔ بالکل ویسے ہی نشانات جیسے کسی انسان کی لاش کو گیلی ریت پر گھسیٹا گیا ہو۔ اس نے مذکورہ لکیر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے خودکلامی کی۔

'یہ تو ممکن نہیں ہے کہ اتنے دن گزر جانے کے بعد کوئی سمندر سے زندہ نکل آیا ہو۔ یقیناً یہ لکیر اس لاش کو گھسیٹنے سے ہی بنی ہے۔ مجھے سراغ لگانا ہو گا کہ اس کی لاش کو کہاں پہنچایا گیا ہے اور...... اور یہ کام کس نے کیا ہے؟'

انہی پریشان کن سوچوں سے نبرد آزما وہ چپ چاپ آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کے ذہن میں مختلف خیالات کی پیداوار کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

'یہ تو اچھا ہوا کہ ڈیٹیکٹو پیئرس کی اس موٹی لکیر پر نظر نہیں پڑی حالانکہ مجھ سے بات کرتے ہوئے وہ اس کے نزدیک ہی کھڑا تھا۔' اس نے شکر ادا کرنے والے انداز میں سوچا۔ 'اگر اسے شک ہو جاتا تو وہ اس لکیر کا تعاقب کرتا۔ اس کے بعد وہ مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتا...... میں روزانہ دن میں دوبار یہاں کیوں آتا ہوں؟ اس گڑھے اور لکیر سے میرا کیا تعلق ہے؟...... وغیرہ ہم!'

وہ اس پُراسرار لکیر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ان چٹانوں کے قریب پہنچ گیا جن کے اوپر بنے ہوئے چند لگژری، فینسی مکانات صاحبِ ثروت لوگوں کے استعمال میں تھے۔ ان میں سے ایک مکان میں بیٹی کی دولت مند دوست جوزفین رہتی تھی۔ اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے دو انسانی آنکھیں اسے گھور رہی ہوں۔ اس نے بے ساختہ گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔

اس کی نگاہیں جوزفین سے چار ہوئیں۔ وہ اپنے فینسی مکان کی کھڑکی میں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہیرولڈ کو

اپنی جانب متوجہ ہوتے دیکھ کر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی تھی۔
"کمینی بدذات عورت۔۔۔۔۔!" وہ نفرت بھرے لہجے میں بڑبڑایا۔ "جاسوسی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ بنی کے حوالے سے تنگ کرنے کے لیے اسے ایک میں ہی ملا تھا۔"
اس نے جوزفین پر لعنت بھیجی اور اس پراسرار تکبیر کا پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اس کے سفر کا اختتام ایک ایسے گھر کے سامنے ہوا جو فینسی مکانات سے تھوڑے فاصلے پر بنا ہوا تھا۔ ایک آسیب زدہ، پراسرار مکان جہاں کوئی نہیں رہتا تھا۔ سمندر کے اندر سے جو کوئی بھی نکلا یا جس کسی کو بھی نکالا گیا تھا اور ریت پر گھسیٹ کر اس طرف لایا گیا تھا، اس کی آخری منزل یہی وحشت کا سامان کھنڈر مکان تھا جس کے حوالے سے ایک سے ایک خوفناک کہانیاں گردش میں تھیں۔ علاقے کا کوئی بھی شخص ادھر کا رخ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔
ہیرولڈ وہاں تک پہنچ تو گیا تھا مگر اب اس کی حالت دگرگوں تھی۔ دل کسی بھی طور سنبھلنے کو تیار نہیں تھا اور ہاتھ پاؤں سے جیسے جان نکلی جا رہی تھی۔ اس کی طبیعت کی ناسازی اپنی جگہ مگر اس بھوت بنگلے میں جانے سے اسے جو چیز سب سے زیادہ روک رہی تھی، وہ تھا دن کا اجالا۔ وہ کسی کی نظر میں آئے بغیر اس دو منزلہ مکان میں داخل ہو کر حقیقت حال جاننا چاہتا تھا اور یہ سردست ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پولیس ڈیٹیکٹو پیرس ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور وہ چڑیل جوزفین بھی برابر اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ حالات کی سنگینی کے پیش نظر وہ گھر لوٹ آیا۔
گھر پہنچ کر اس نے چار گولیاں ایک ساتھ نگل لیں۔ یہ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی ڈوز سے چار گنا زیادہ دوا تھی مگر پھر بھی بے اثر ثابت ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ موت اس سے چند قدموں کی دوری پر کھڑی ہے۔ گھبرا کر اس نے اپنے ڈاکٹر کو فون کیا۔ دوسری جانب نرس نے کال اٹینڈ کی۔ وہ اپنا تعارف کروانے کے بعد بے چارگی سے بولا۔ "میری ڈاکٹر سے بات کرائیں۔"
"ڈاکٹر ایک مریض کے ساتھ مصروف ہے۔" نرس نے بتایا۔ "تم اپنی پرابلم مجھے بتا دو یا پھر ڈاکٹر کے فارغ ہونے کا انتظار کرو۔"
"ڈاکٹر نے مجھے جو دوا لکھ کر دی ہوئی ہے، وہ بالکل کام نہیں کر رہی۔" ہیرولڈ نے بتایا۔ "میں ایک کی جگہ چار، چار گولیاں کھا رہا ہوں مگر بے سود۔ کوئی فائدہ، کوئی اثر نہیں ہو رہا۔"
"تم اوور ڈوز لے رہے ہو جو کہ بہت خطرناک ہے۔" نرس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "اس سے تمہاری موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔"
نرس کی اس فکرمندی کے جواب میں ہیرولڈ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر گہری سانسیں لینے لگا۔ ان کٹھن لمحات میں بنی کا چہرہ اس کی نگاہ میں گھوم گیا۔ وہ اپنی بیوی کے خیالوں میں کھو گیا۔
بنی سے ہونے والی آخری ملاقات کا ایک ایک لمحہ اس کی آنکھوں میں قید تھا۔ وہ یادوں کے دریچے سے ماضی قریب میں جھانکنے لگا۔
☆☆☆
بنی برے موڈ میں گھر آئی تھی۔ وہ شام کا وقت تھا۔ ہیرولڈ کو معلوم تھا کہ وہ اپنی دوست جوزفین کے ساتھ برج کھیلنے کے بعد لوٹی ہے۔ وہ جب بھی جوزفین کے گھر میں وقت گزار کر آتی تو اس کا موڈ ایسا ہی مخمور اور لاابالی ہوتا تھا۔ جوزفین اسے اچھا کھانے کو دیتی تھی اور کھیل کے دوران میں ڈرنک تو ایک لازمی شے تھی۔ علاوہ ازیں جوزفین کی امارت اور تعلقات کے قصے بنی کا دماغ خراب کر دیا کرتے تھے۔ ہیرولڈ ان چیزوں کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔
"تم چل رہے ہو نا؟" گھر کے اندر قدم رکھنے کے دو منٹ بعد اس نے ہیرولڈ سے پوچھا۔
بنی کے اس سوال میں "کہاں، کب، کیوں" جیسی کوئی وضاحت موجود نہیں تھی پھر ہیرولڈ کا جواب سنے بغیر وہ زور سے دروازہ بند کرتے ہوئے گھر سے نکل گئی جیسے اسے یقین ہو کہ ہیرولڈ کو سب معلوم ہے کہ اس وقت انہیں کہاں جانا ہے۔
اور یہ سچ بھی تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ جھٹ پٹے کے وقت پومپانو بیچ کی سیر کو جا رہے تھے۔ ہیرولڈ نے جلدی سے سینڈل پہنی جو بنی کے جوتوں کے مقابلے میں بہت پرانی تھی اور وہ فرمانبردار شوہروں کی طرح اپنی بیوی کے پیچھے گھر سے نکل گیا۔ اس دوران میں بنی نے اچھا خاصا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ ہیرولڈ اپنے دل کے عارضے کے باعث دوڑ لگا کر بنی تک نہیں پہنچ سکتا تھا چنانچہ وہ لوگ پانچ چھ منٹ کے فرق سے بالآخر ساحل سمندر تک پہنچ ہی گئے تھے۔
"مجھے اس بات پر بہت شرمندگی ہوتی ہے۔" ہیرولڈ جب ہانپتے کانپتے ہوئے بنی کے نزدیک پہنچا تو اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے اپنے بوڑھے شوہر سے کہا۔ "کہ۔۔۔۔۔۔ کہ ہم اتنے غریب ہیں۔ ہماری زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہے۔"
"اپنی آواز کو دھیما رکھو بنی!" ہیرولڈ نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "غریب ہونا کوئی گالی نہیں ہے جو تمہیں اس پر ندامت محسوس ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں، وہی موٹی بڑھیا تمہارے دماغ میں یہ زہر بھر رہی ہے۔ تم جب بھی اس کے گھر سے ہو کر آتی ہو تو اسی قسم کی دل جلانے والی باتیں کرتی ہو۔"
"جوزفین میری دوست ہے۔ اس نے کبھی میرے کان بھرنے کی کوشش نہیں کی۔" بنی نے تیکھے انداز میں جواب دیا۔ "لیکن میں اندھی نہیں ہوں۔ مجھے امیری اور غریبی کا فرق اچھے سے دکھائی دیتا ہے۔ جوزفین نے کبھی مفن، چائے اور کھانے کی دیگر اشیا کی قیمت کا حساب نہیں رکھا اور نہ ہی فون اور بجلی کے استعمال کی وہ پروا کرتی ہے۔ وہ ہماری طرح گھٹ گھٹ کر نہیں جی رہی۔ سمجھے تم؟"
آخری جملہ بنی نے چیخ سے مشابہ آواز میں ادا کیا تھا جو کسی تیز دھار خنجر کے مانند سیدھا جا کر ہیرولڈ کے جگر میں پیوست ہوا تھا۔ اسے ان لمحات میں ہیرولڈ کی بیماری کا بھی بالکل احساس نہیں تھا۔
"جوزفین ایسی عیش و عشرت کی زندگی گزار سکتی ہے کیونکہ اس کے مرحوم شوہر نے اس کے لیے بہت کچھ چھوڑا ہے۔" ہیرولڈ نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ دلیل دی۔ "اس کینڈی کا مستقبل محفوظ ہے۔ وہ ہماری طرح سوشل سیکیورٹی کی رقم پر گزارہ نہیں کر رہی۔ تم اس کے ساتھ اپنا موازنہ کرنا چھوڑ دو۔"
ہیرولڈ کی سانس بری طرح الجھ رہی تھی۔ اب اس سے مزید بولا نہیں جا رہا تھا۔ دل کی دھک دھک سینے پر ایسے محسوس ہو رہی تھی جیسے کوئی لوہار وزنی ہتھوڑے کی مدد سے فولاد کو کوٹ رہا ہو۔
"اگر تم نے زندگی میں کوئی ڈھنگ کا کام کیا ہوتا تو آج ہمارے پاس بہت کچھ اپنا ہوتا۔" بنی پانی کی جانب بڑھتے ہوئے شاکی لہجے میں بولی۔ "سوشل سیکیورٹی کی رقم سے تو انسان ڈھنگ سے مر بھی نہیں سکتا اور تم جینے کی باتیں کرتے ہو ہیرولڈ!"
"بنی! ناشکرا پن اچھا نہیں ہوتا۔" ہیرولڈ بھی اس کے پیچھے پانی میں اتر گیا۔ "تم اپنے جوتوں کو دیکھو۔۔۔۔۔۔ اپنے موزوں کو دیکھو۔۔۔۔۔۔ یہ کتنے قیمتی ہیں اور تم انہیں پانی میں بھگو کر خراب کر رہی ہو۔"
"قیمتی جوتے۔۔۔۔۔۔!" وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ "جنہیں تین سال پہلے ایک کلیئرنس سیل میں خریدا گیا تھا۔ مسلسل استعمال کے بعد ان کی شکل ایسی بھیانک ہو گئی ہے کہ اگر کوئی چھوٹا بچہ انہیں دیکھ لے تو مارے خوف کے رونا شروع کر دے۔"
"فلوریڈا جیسی اسٹیٹ میں ہمارے پاس اپنا گھر ہے۔" وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بنی کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "ہم پومپانو بیچ پر رہائش پذیر ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"
"اپنا گھر۔۔۔۔۔۔!" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "قابل فخر کباڑ خانہ۔۔۔۔۔۔!" وہ اپنی ہی دھن میں آگے بڑھتی چلی گئی۔
"وہ دیکھو۔۔۔۔۔۔ ادھر چٹانوں کے اوپر۔" وہ انگلی سے فینسی مکانات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے خوابناک لہجے میں بولی۔ "انہیں کہتے ہیں گھر۔۔۔۔۔۔ جہاں آرام اور آسائش میسر ہے۔ جہاں جینے کا ایک اپنا ہی مزہ ہے۔ تم کیا جانو ہیرولڈ! تمہارے پاس یہ سب سوچنے کے لیے دماغ کہاں ہے۔ تم سسک سسک کر جینے میں لطف محسوس کرتے ہو مگر میں مزید تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی اسی لیے۔۔۔۔۔۔ میں نے ایک حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔"
بنی کے آخری الفاظ نے ہیرولڈ کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ وہ جب بھی برج کھیلنے جوزفین کے گھر جاتی تھی تو اپنی دوست کے ساتھ بیٹھ کر ڈرنک ضرور کرتی تھی۔ واپسی پر اس کا لہجہ ایسا ہی مدہوشی لیے ہوتا تھا۔ وہ بہکی بہکی باتیں کرتی تھی جن سے ہیرولڈ کو ذہنی اذیت پہنچتی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کی مفلسی اور ناداری کا کھلم کھلا مذاق اڑا رہی ہو مگر یہ سارا ڈراما گھر کے اندر ہوتا تھا جسے ہیرولڈ کسی نہ کسی طور برداشت کر لیا کرتا تھا کیونکہ وہاں یہ سب کرتے ہوئے بنی کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا لیکن اس وقت وہ سمندر میں تھی اور وہ بھی کمر تک گہرے پانی میں۔۔۔۔۔۔!
"رک جاؤ بنی۔۔۔۔۔۔!" وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ "آگے گہرا پانی ہے۔ آؤ گھر چلتے ہیں۔ تم نے جو بھی فیصلہ کیا ہے، گھر میں سکون سے بیٹھ کر ہم اس پر بات کریں گے۔ ایسا کوئی مسئلہ نہیں جس کا کوئی حل موجود نہ ہو۔"
وہ اس کی جانب پلٹتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولی۔ "تمہارے پاس میرے کسی مسئلے کا حل نہیں ہے ہیرولڈ! تم ایک نکمے اور ناکارہ انسان ہو۔" وہ اس کے اور قریب آ گئی اور اس کے کان کے نزدیک سنسنی خیز سرگوشی کی۔ "میں نے مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرے تمام مسائل کا یہی واحد حل ہے۔۔۔۔۔۔!"
بات ختم کرتے ہی وہ پلٹ گئی۔ اس کے سامنے

خا تھیں مارتا ہوا گہرا اور انتہائی خطرناک سمندر تھا۔ ہیرولڈ نے اسے روکنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ وہ اس کے کندھے کو اپنے ہاتھ کی گرفت میں لینا چاہتا تھا مگر بیٹی اتنی برق رفتاری سے گری تھی کہ اس کا شانہ ہیرولڈ کی پکڑ میں نہ آسکا بلکہ بیٹی کو ہیرولڈ کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے ایک دھکا سا لگا تھا۔

بیٹی اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ وہ گر کر تیک پانی کے اندر گئی تھی۔ نشے کے باعث اس کے حواس بھی قابو میں نہیں تھے۔ ہیرولڈ کے ہاتھ سے لگنے والے دھکے نے اسے پانی کے اندر گرا دیا۔ یہ ہیرولڈ کے دھکے سے زیادہ بیٹی کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ تھی جو وہ پانی کے اندر جا گری تھی۔ اس مقام پر پانی بھی گہرا نہیں تھا کہ انسانی جان کے لیے ہلاکت خیز ثابت ہوتا مگر موت بھی دستک دے کر نہیں آتی۔ جیسے ہی بیٹی پانی کے اندر گری، ایک تند سمندری لہر نے ان دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے بعد ہیرولڈ کو کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ اس حادثے نے اسے ہوش وحواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو گیلی ریت پر پڑے پایا۔ وہ اپنی بیماری کو بھول کر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔ اسے بیٹی کہیں بھی نظر نہ آئی۔ وہ دیوانوں کی طرح اسے ساحلی پٹی پر یہاں سے وہاں تک تلاش کرنے لگا۔ اسی تلاش میں وہ کئی بار گرا بھی۔ اب پوسپانو کے ساحل پر اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ موسم سرما کے باعث لوگ شام ہی وہاں سے رخصت ہو چکے تھے۔ وہ خود کو بالکل تنہا اور بے یارومددگار محسوس کرنے لگا۔ یہی وقت تھا جب اس نے پہلی بار اس پراسرار سائے کو دیکھا تھا۔

وہ انسانی قد وقامت اور ساخت کا ایک ہیولا تھا جو سمندر سے نکل کر اس کی سمت بڑھا تھا۔ ہیرولڈ نے ریتیلی زمین پر کسی باڈی کے گھسیٹے جانے کے نشانات بھی دیکھے تھے۔ اس وقت ہیرولڈ کا ذہن پریشانی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس کی سب سے بڑی اذیت یہی تھی کہ وہ بیٹی کو کھو بیٹھا تھا۔

"کاش! میں نے بیٹی کو روکنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے نہ بڑھایا ہوتا ۔۔۔۔" وہ گلوگیر انداز میں خود کو کوسنے لگا۔ "میرا ارادہ اسے دھکا دینے کا نہیں تھا مگر وہ نشے میں تھی اس لیے اسے میرے ہاتھ کا دھکا لگا اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھی ۔۔۔۔ پھر وہ سمندری موج ہم دونوں پر حاوی آگئی۔ اس نے مجھے تو بے دردی سے ساحل کی ریت پر اچھال دیا اور بیٹی کو اپنے ساتھ لے گئی ۔۔۔۔ گہرے سمندر کے پیٹ میں ۔۔۔۔!"

اس نے بیٹی کو مارنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی نیت صاف تھی۔ وہ تو اسے بچانا چاہتا تھا۔ [illegible] انداز میں گھر لے جانا چاہتا تھا لیکن [illegible] قطری ہی آج پوسپانو بیچ پر آئی تھی۔ بیٹی کے [illegible] ساعت [illegible] ہتھوڑے برسانے لگے۔

"تمہارے پاس میرے مسئلے کا حل [illegible] ہیرولڈ ۔۔۔۔!" بیٹی نے زہریلے لہجے میں کہا تھا [illegible] اور ناکارہ انسان ہو۔ میں نے مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے [illegible] نے ہیرولڈ کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ "میرے [illegible] بھی واحد حل ہے۔"

وہ بیٹی کی یاد میں ساحل پر بیٹھا زار و قطار رو رہا [illegible] کے ہاتھ ماتمی انداز میں گیلی ریتیلی زمین کو کرید [illegible] بار بار سمندر کی جانب بھی دیکھتا رہا کہ جیسے کوئی معجزہ [illegible] اور بیٹی صحیح سلامت پانی سے باہر آجائے گی۔ ایک بار اس نے تاریکی میں ڈوبے ہوئے اس کھنڈر نما آسیب زدہ گھر کو بھی دیکھا تھا جہاں کوئی جانے کا تصور نہیں کرتا تھا۔ ان لمحات میں اس کے ذہن میں یہ سوچ تھی کہ کہیں کوئی بھٹکی ہوئی روح بیٹی کو اٹھا کر اس بھوت گھری میں تو نہیں لے گئی۔

کوئی امید بر آئی اور نہ ہی کوئی معجزہ رونما ہوا۔ تھک ہار کر وہ بوجھل قدموں اور اداس دل کے ساتھ اپنے گھر آ گیا تھا۔ اس سوچ کے ساتھ کہ اس نے بیٹی کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔

اگلی صبح سے اس نے نیوز چینلز کو توجہ سے دیکھنا شروع کر دیا تھا مگر پوسپانو بیچ کے حوالے سے کہیں سے ایک خبر بھی نشر نہیں ہوئی تھی پھر اس نے صبح شام ساحل سمندر کی سیر کے لیے جانا شروع کر دیا تھا اور بیٹی کی عدم موجودگی کے حوالے سے اغوا والی ایک کہانی بھی گھڑلی تھی۔

ہیرولڈ، بیٹی کو پیش آنے والے حادثے کا ذمے دار نہیں تھا مگر حالات و واقعات اور تمام شواہد اسی کو قصور وار ٹھہرانے پر تلے ہوئے تھے۔

اس دوران میں ہیرولڈ کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ اسے پولیس کو سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا۔ وہ غوطہ خور ٹیم کو سمندر میں اتار کر بیٹی کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے لیکن یہ خیال اسے خاصی تاخیر سے آیا تھا۔ اس سے پہلے وہ جوزفین کو بیٹی کے اغوا ہو جانے کے بارے میں بتا چکا تھا اور اب پچھلے بارہ دن سے پولیس ڈیٹیکٹو پیرس ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

نرس نے ہیرولڈ کو تھوڑا انتظار کرنے کے لیے کہا تھا لیکن اس کی طبیعت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جارہی تھی۔ چند سیکنڈ کا انتظار ہیرولڈ کے بس سے باہر تھا۔ وہ اپنے طوفانی رفتار سے دھڑکتے دل کو تھام کر بیٹھا ہوا تھا کہ پیرس [illegible] قفس کی قفل سے نفرت سی ہونے لگی [illegible] ہیرولڈ کو اس [illegible] اس نے پیرس کی دستک کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا فلپ سیل فون اٹھا لیا اور فوراً سے پیشتر اپنے میڈیکل سینٹر کال ملائی۔ فون اسی نرس نے اٹینڈ کیا اور ہیرولڈ نے [illegible] "ڈاکٹر سے میری بات کرا دو۔"

"ہیلو ڈاکٹر!" ڈاکٹر کی آواز سنتے ہی ہیرولڈ نے بے قراری لہجے میں کہا۔ "آپ نے مجھے جو دوا لکھ کر دی ہے وہ کام نہیں کر رہی۔ میں ایک ہی جگہ چار، چار، چھ چھ گولیاں لے رہا ہوں مگر کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔ لگتا ہے آپ نے مجھے کوئی غلط دوا دے دی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔"

"دوا غلط نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے ٹھہرے [illegible] لہجے میں کہا۔ "پہلے بھی میڈیسن تم پر اثر کر رہی تھی۔ مجھے لگتا ہے کوئی دوسرا معاملہ ہے۔"

"پھر اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟" ہیرولڈ نے بے چارگی سے جواب چاہا۔

"تمہیں دو کام کرنا ہیں۔" ڈاکٹر نے وضاحت [illegible] میں کہا۔ "نمبر ایک ۔۔۔۔ میں نے تمہاری دل کی بیماری کے لیے جو دوا لکھ کر دی ہوئی ہے، اس کی ایک وقت میں ایک ہی گولی کھانا ہے۔ اگر یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی تو پھر تم بہت جلد [illegible] موت کے منہ میں چلے جاؤ گے۔ نمبر دو ۔۔۔۔ کسی روز [illegible] کلینک آکر مجھ سے ملو۔ میں تمہارے چند ضروری ٹیسٹ کرانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہی فیصلہ ہوگا کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

"او، آج ۔۔۔۔!"

ہیرولڈ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ دوسری جانب ڈاکٹر نے ریسیور رکھ دیا تھا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری دوائیاں۔" ہیرولڈ نے غائبانہ طور پر اپنے معالج کو کھری کھری سنا ڈالی۔ "میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تم مجھے کل پر ٹال رہے ہو۔ تم ڈاکٹر نہیں، کوئی قصاب ہو!"

اس نے اپنے فلپ فون کو ایک طرف رکھا اور پیرس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی پیرس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"مجھے تمہاری طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب لگ رہی ہے۔"

جواب میں ہیرولڈ نے اسے ڈاکٹر سے ہونے والی حالیہ [illegible] گفتگو کے بارے میں بتانے کے بعد پوچھا۔ "میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے آفیسر! تم بتاؤ اس وقت کیسے آنا ہوا؟"

پیرس چند لمحات تک اسے تولتی ہوئی نظر سے دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "آئی ایم سوری مسٹر ہیرولڈ! میں بار بار تمہیں تنگ کرنے آجاتا ہوں مگر یہ میرے فرائض کا حصہ ہے۔"

"اٹس اوکے، ڈیوٹی از ڈیوٹی!" ہیرولڈ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تم اپنے فرض کی ادائیگی جاری رکھو۔۔۔۔ تو آج کے سوالات ۔۔۔۔؟"

ہیرولڈ نے آخری جملہ زہر میں بجھے اور طنز میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں ادا کیا تھا مگر پیرس نے اس کا برا نہیں منایا۔

"آج تم نے ساحل سمندر پر بہت عجیب حرکتیں کی ہیں مسٹر ہیرولڈ!" پیرس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

ہیرولڈ اس کی بات پر توجہ دیے بغیر بولا۔ "میری دوا بالکل اثر نہیں کر رہی۔"

"میں دوا کی نہیں تمہاری حرکتوں کی بات کر رہا ہوں۔" پیرس نے ایک ایک لفظ پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں نے غور نہیں کیا تھا۔" ہیرولڈ کو ڈیٹیکٹو کی جانب متوجہ ہونا ہی پڑا۔ "تم میری کن عجیب حرکتوں کا ذکر کر رہے ہو آفیسر؟" اس نے سپاٹ آواز میں پوچھا۔

"تم نے آج صبح پوسپانو بیچ پر کافی وقت گزارا ہے۔" پیرس نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم ساحلی ریت پر گردن جھکائے ایک سمت چلتے رہے اور اس بلاکڈ ہاؤس کے سامنے پہنچ کر رک گئے تھے۔ تم بڑی دلچسپی اور انہماک سے اس ویران آسیب زدہ مکان کو گھورتے رہے تھے جیسے اس کے اندر گھسنے کا ارادہ ہو جبکہ میری معلومات کے مطابق اس سیلن زدہ سنسان کھنڈر کا رخ کرتے ہوئے لوگ گھبراتے ہیں۔"

"کیا یہ چغلی بھی اسی دولت مند جوزفین نے کھائی ہے؟" ہیرولڈ نے خفگی بھرے لہجے میں پوچھا۔ "جب میں اس ڈارک ہاؤس کی طرف جا رہا تھا تو وہ اپنے فینسی مکان کی کھڑکی میں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ کیا وہ پولیس کی انفارمر ہے؟ اسی لیے اس نے مجھ پر گہری نظر رکھی ہوئی ہے۔"

پیرس نے اس کے سوالات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "مسٹر ہیرولڈ! تم دل کے مریض ہو۔ تمہیں اتنی زیادہ دیر تک واک نہیں کرنا چاہیے جبکہ تمہاری میڈیسن بھی کام نہیں کر رہی۔ میں یہ سب تمہاری بھلائی کے

لیے پوچھ رہا ہوں۔“

ہیرولڈ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ڈیٹیکٹو کی بات کے جواب میں کیا کہے۔ اس کے الفاظ سے تو ہمدردی اور خلوص ظاہر ہوتا تھا۔ ہیرولڈ فیصلہ نہ کر پایا کہ پیرس واقعتاً اس کا خیر خواہ تھا یا یہ اس کی کوئی چال تھی۔

ہیرولڈ کی متذبذب خاموشی کو دیکھتے ہوئے پیرس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”بینی کی کوئی خیر خبر......؟“

”ابھی تک کچھ بھی نہیں۔“ ہیرولڈ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بس، وہی ایک فون کال جو اس نے کسی موٹیل سے کی تھی۔ میں اس بارے میں تمہیں بتا چکا ہوں۔“

”کیا تم نے بھی اسے کال کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ٹھہری ہوئی ہے۔“ ہیرولڈ نے بیزاری سے کہا۔

”حالانکہ وہ ایک فیملی ایمرجنسی کے سلسلے میں اٹلانٹا گئی ہے۔“

”اگر میرے پاس بینی کا نمبر ہوتا تو میں ضرور اس کی خیر خیریت پوچھتا۔“ ہیرولڈ نے بے مروتی سے کہا۔

”اگر کوئی شوہر یہ کہے کہ وہ نہیں جانتا اس کی بیوی کہاں ہے، مزید برآں اس کے پاس اپنی بیوی کا کوئی کانٹیکٹ نمبر بھی نہ ہو تو پولیس کی نظر میں وہ شوہر مشکوک ٹھہرتا ہے۔“ پیرس نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا پھر پوچھا۔ ”کیا میں غلط کہہ رہا ہوں مسٹر ہیرولڈ؟“

ہیرولڈ کے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کرے لہٰذا اس نے معنی خیز چپ سادھ لی۔

”میں کل پھر آؤں گا۔“ پیرس اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”ٹھنڈے دل سے میری باتوں پر غور کرنا۔“

”میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ تمہاری ان واہیات باتوں پر غور کروں۔“ پیرس کے جانے کے بعد ہیرولڈ نے بیزاری سے خود کلامی کی۔ ”اور وہ بھی ٹھنڈے دل سے...... اونہہ!“

پھر وہ ”منڈنائٹ ونچر“ کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ یہ مہم اس کی زندگی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔

☆☆☆

رات نصف سے زیادہ سفر طے کر چکی تھی۔ ہیرولڈ نے اپنے مشن کے لیے خاص طور پر اس وقت کا انتخاب کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے اس ویران دو منزلہ مکان کی جانب جاتے اور اس کے اندر داخل ہوتے دیکھے۔ وہ موٹی جوزفین تو بالکل نہیں جو بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنانے میں خصوصی مہارت رکھتی تھی۔

ہیرولڈ نے گھر سے نکلتے ہوئے ایک سلم ٹارچ بھی جیب میں رکھ لی تھی۔ ”دن ہو یا شام، وہ ڈارک ہاؤس ہمیشہ تاریکی میں ڈوبا رہتا ہے۔“ اس نے خود سے کہا۔ ”اور اس وقت تو رات کا گھپ اندھیرا ہے۔ یہ ٹارچ میرے بہت کام آئے گی۔“

اگرچہ وہ پچھلے کئی روز سے یہ دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی دوا اس پر ذرا سا بھی اثر نہیں کر رہی تھی اس کے باوجود بھی اس نے پوری چھ گولیاں ایک ساتھ اپنے معدے میں اتار لی تھیں۔ یہ اس کی ایک نفسیاتی حرکت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس مشن کے دوران میں اس کا دل کوئی گڑبڑ کرے۔ وہ ہر قیمت پر اس موٹی لکیر کا راز جاننا چاہتا تھا جو کسی بالائی ریخ پر کھینچے جانے کے باعث وجود میں آئی تھی اور سیدھی اس ہانٹڈ ہاؤس تک پہنچی تھی۔ اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ زندہ یا مردہ کسی بھی حالت میں بینی اس آسیب زدہ مکان میں پہنچی تھی یا پہنچائی گئی تھی۔

وہ ساحلی چٹانوں کے زیریں حصے کے ساتھ ساتھ محتاط قدموں چلتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچ گیا۔ وہ دو منزلہ کھنڈر مکان رات کی تاریکی میں کچھ اور بھی بھیانک اور پراسرار نظر آ رہا تھا۔ اس نے تین چار گہری سانسیں لیں اور ایک عزم کے ساتھ مذکورہ گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

مکان کے اندر قدم رکھتے ہی وہ چونک اٹھا۔ بالائی منزل پر اسے روشنی سی نظر آئی تھی۔ اس نے ٹارچ جلانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

”یہ کیسی روشنی ہے؟“ وہ حیرت بھرے لہجے میں بڑبڑایا۔ اس کی آواز بس اتنی ہی بلند تھی جسے وہ صرف خود ہی سن سکتا تھا۔ ”یہاں تو دن میں بھی اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ مجھے اوپر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہیے۔“

ہیرولڈ نے اس مکان کے حوالے سے بہت سی ڈراؤنی کہانیاں سن رکھی تھیں جیسے وہ سیلن زدہ مکان بھوتوں کا مسکن ہے۔ ابلیسی قوتوں نے وہاں بسیرا کر رکھا ہے وغیرہ وغیرہ! ان کہانیوں سے دل میں پیدا ہونے والے خوف نے اسے ہمیشہ ادھر آنے سے باز رکھا تھا لیکن اس وقت اس کا دل و دماغ ہر ڈر اور اندیشے سے خالی تھا۔ اس نے جو سوچ لیا تھا، اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ یہ بینی کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔

وہ بالائی منزل تک پہنچانے والے زینے کی طرف آ گیا۔ اس چوبی زینے کے پاس سے اوپری منزل کا ایک حصہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ ہیرولڈ نے فوراً سے پیشتر اس روشنی کے ماخذ کا سراغ لگا لیا جو اسے اس مکان میں داخل ہوتے ہی نظر آئی تھی۔

بالائی منزل پر اس کی نگاہ کے سامنے ایک لالٹین روشن تھی۔ وہ لالٹین ایک میز کے کونے پر رکھی تھی۔ میز کی ایک جانب کوئی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اس کا چہرہ ہیرولڈ کی طرف نہیں تھا اس لیے وہ اسے پہچان نہیں سکا تھا تاہم اس کے وجود پر پڑنے والی لالٹین کی روشنی نے ہیرولڈ کو بتا دیا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے جو اس کی سمت پیٹھ کیے بیٹھی ہے۔

”کہیں یہ بینی تو نہیں......؟“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

اس اضطراری استفسار میں حیرت، تجسس اور خوشی ایک ساتھ شامل تھے اور ہیرولڈ کی آواز بھی خاصی بلند ہو گئی تھی۔ یہ اس کا ایک فطری اور بے اختیاری ردِعمل تھا۔

”ہیلو......!“ ایک شناسا آواز ہیرولڈ کی سماعت سے ٹکرائی۔

وہ ہونقوں کے مانند گردن اٹھا کر چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ آواز بالائی منزل کی جانب سے آئی تھی۔ اسی میز پر سے جہاں ایک روشن لالٹین رکھی ہوئی تھی اور ایک کرسی پر کوئی عورت براجمان تھی۔

”یہ...... میری بیوی کی آواز ہے۔“ اس نے ہیجانی لہجے میں خود کلامی کی۔ ”میں بینی کی آواز کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا۔“ پھر اس نے کرسی پر بیٹھی ہوئی مذکورہ عورت سے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

”بینی! یہ تم ہی ہو نا......؟“

ہیرولڈ کے استفسار میں یقین اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت پائی جاتی تھی۔ وہ عورت اس کے سوال کے جواب میں بولتی چلی گئی۔

”ہیرولڈ! مجھے یقین تھا کہ تم مجھے تلاش کر لو گے۔ میں یہاں بیٹھی تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اس مکان پر قابض شیطانی قوتوں نے مجھے ادھر قید کر رکھا ہے لیکن اب مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ تم مجھے تلاش کرتے ہوئے بالآخر یہاں پہنچ ہی گئے ہو...... تم نے مجھے ڈھونڈ لیا ہے...... آؤ...... اور مجھے اپنے ساتھ گھر لے چلو۔ میں تم سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ اس وقت وہ شیطان کہیں باہر گیا ہوا ہے...... یہ اچھا موقع ہے...... تم آ رہے ہو نا؟“

ان لمحات میں ہیرولڈ کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ وہ بینی کو زندہ اور باتیں کرتا دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گیا تھا۔ بینی کے سوال کے جواب میں اس نے توانا لہجے میں کہا۔

”بینی! میں آ رہا ہوں۔“

بات کے اختتام پر وہ چوبی زینے کی طرف بڑھا پھر آندھی اور طوفان کی رفتار سے وہ بالائی منزل تک پہنچنے کی تگ و دو میں لگ گیا۔

☆☆☆

دوپہر اپنی مخصوص رفتار سے سہ پہر کی جانب گامزن تھی۔ پیرس ایک مرتبہ پھر ہیرولڈ کے گھر میں بیٹھا ہوا تھا لیکن اب کی بار وہ معمول کی پوچھ تاچھ کے لیے وہاں نہیں آیا تھا بلکہ اس کے چیف نے ایک نئی ڈیوٹی سونپ کر اسے وہاں بھیجا تھا۔ چند گھنٹے پہلے بینی نے پولیس اسٹیشن فون کر کے اطلاع دی تھی کہ اس کا شوہر ہیرولڈ لاپتا ہے۔ اس نے پولیس سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے شوہر کی گمشدگی سے بہت پریشان ہے لہٰذا اسے جلد از جلد تلاش کیا جائے لہٰذا اب پیرس بینی کے سامنے بیٹھا تھا۔

ان دونوں کے علاوہ وہاں ایک اور خاتون بھی موجود تھی۔ پیرس مذکورہ خاتون کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اس کے چیف کی بیوی کی کزن مسز جوزفین تھی۔ پیرس نے جوزفین کو ادب سے سلام کیا اور اپنی نوٹ بک کھول کر بینی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”تم اٹلانٹا سے کب واپس آئی ہو؟“

”آج صبح تین بجے بس نے مجھے میامی پہنچایا تھا۔“ بینی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”میں نے ہیرولڈ کو کئی بار فون کیا کہ وہ مجھے پک کرنے آ جائے لیکن اس نے میری کال اٹینڈ نہیں کی۔ مجبوراً میں نے اپنے ایک دوست سے درخواست کی اور اس نے مجھے طلوعِ آفتاب کے وقت پومپانو بیچ پر چھوڑ دیا۔ میں نے گھر میں قدم رکھا تو ہیرولڈ غائب تھا۔ میں نے کچھ دیر اس کا انتظار کیا۔ جب وہ نہیں لوٹا تو میں نے پولیس اسٹیشن فون کر دیا۔“

پیرس اپنے قلم سے نوٹ بک میں اہم پوائنٹس درج کرتا جا رہا تھا اور بینی سے بات چیت بھی جاری تھی۔ ”مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ ہیرولڈ نے تمہاری کال اٹینڈ کیوں نہیں کی؟“ پیرس نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ”جبکہ وہ اپنے سیل فون کو ایک لمحے کے لیے بھی خود سے جدا نہیں کرتا۔ میں پچھلے بارہ دن سے یہاں اس سے پوچھ تاچھ کرنے آ رہا ہوں۔ کل شام تک تو وہ اس گھر میں موجود تھا۔

"جوزفین نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے میرے غیاب کے حوالے سے تمہارے چیف کی بیوی کو فون کیا تھا۔" بینی، پیرس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ "میں جوزفین کو اپنے جانے کے بارے میں بتا نہیں سکی تھی اور اسے ہیرولڈ کی سنائی ہوئی کہانی پر یقین نہیں آیا تھا اسی لیے اس نے اپنی کزن یعنی تمہارے چیف کی بیوی کو فون کیا تھا۔ میں جوزفین سے معذرت کر چکی ہوں کہ اسے میری وجہ سے پریشان ہونا پڑا۔ اگر میں اپنی دوست کو بتا دیتی کہ کہاں جا رہی ہوں تو تمہیں بار بار یہاں آنے کی زحمت نہ کرنا پڑتی۔ باقی جہاں تک ہیرولڈ کے میری کال اٹینڈ نہ کرنے کا معاملہ ہے تو......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"وہ ایسا ہی غیر ذمے دار تھا...... میرا مطلب ہے، غیر ذمے دار ہے۔ اس نے کبھی میرا خیال نہیں رکھا۔"

"کیا تم اس دوران میں ہیرولڈ سے رابطہ کرتی رہی ہو؟" پیرس نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہماری روزانہ بات ہوتی تھی۔" بینی نے بتایا۔ "آپ چاہو تو اس کے فلپ سیل فون کا کال ریکارڈ چیک کر لینا۔"

"میں یہ سوال اس سے کئی بار کر چکا ہوں۔" پیرس نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن ہر بار اس نے ایک ہی جواب دیا ہے کہ تم نے صرف ایک مرتبہ کسی ہوٹل سے فون کر کے اسے اپنی خیریت سے آگاہ کیا تھا۔"

"ہیرولڈ کو جھوٹ بولنے کی عادت تھی۔" بینی نے بے ساختہ کہا۔ "میرا مطلب ہے دروغ گوئی اس کی فطرت میں شامل ہے۔ وہ شوقیہ جھوٹ بولتا ہے۔"

"اسی لیے تو میں نے اس کی سنائی ہوئی کہانی پر یقین نہیں کیا تھا۔" جوزفین نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "وہ کئی بار پہلے بھی مجھ سے غلط بیانی کر چکا ہے۔"

"وہ اپنی نوعیت کا ایک انوکھا نمونہ تھا۔" بینی نے روانی میں کہہ دیا پھر فوراً ہی تصحیح کرتے ہوئے بولی۔ "میرا مطلب ہے ہیرولڈ بڑی عجیب و غریب شے ہے۔ میں سالہا سال سے اس بندے کو بھگت رہی ہوں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہیرولڈ کو جھوٹ بول کر کیا ملتا ہے۔" پیرس نے الجھن زدہ نظر سے بینی کی طرف دیکھا۔ "وہ اپنی شکل اور بات چیت سے تو ایسا نہیں لگتا۔"

"بعض لوگ تفریحاً جھوٹ بولتے ہیں۔" جوزفین نے کہا۔ "دوسروں کو بے وقوف بنا کر وہ لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہیرولڈ کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں ہوتا ہے۔"

"اس کی دروغ گوئی کے بارے میں تم [illegible] سوالات اسی سے کرنا۔" بینی نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ "جب تم اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤ [illegible] اتنا طویل سفر کر کے واپس آئی ہوں۔ میں تو توقع کر رہی تھی وہ گھر پر میرا انتظار کر رہا ہوگا مگر وہ تو مجھے انتظار کی [illegible] ڈال گیا ہے۔"

پیرس نے اپنی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی [illegible] ہوئے لہجے میں بینی سے پوچھا۔ "کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہیرولڈ کہاں جا سکتا ہے؟"

بینی نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"میں گزشتہ شام اسے اسی گھر میں چھوڑ کر گیا تھا۔" پیرس نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "اس کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی۔ وہ کہاں جا سکتا ہے......؟" پھر وہ جوزفین کی طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"میڈم! آپ کو اس بارے میں کچھ آئیڈیا ہے؟"

"میرے اپارٹمنٹ کی دو کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی ہیں۔" بوڑھی جوزفین نے توانا لہجے میں بتایا۔ "میں روزانہ ہیرولڈ کو بیچ کی جانب جاتے اور وہاں ٹہلتے دیکھتی ہوں۔ جہاں تک گزشتہ روز کی بات ہے تو میں نے کل دو بار اسے وہاں دیکھا تھا۔ پہلی دفعہ صبح جب وہ ڈارک ہاؤس کے سامنے کھڑے ہو کر عجیب و غریب حرکتیں کر رہا تھا۔ میں نے اس بارے میں تمہیں بتا دیا تھا۔"

"ہاں۔" پیرس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "میں نے اس حوالے سے کل شام اس سے پوچھا تھا اور اس نے یہ کہہ کر مجھے ٹال دیا تھا کہ دوا اس پر اثر نہیں کر رہی اسی لیے وہ پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر بھٹکتا رہتا ہے۔ اس نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ وہ ہاونٹڈ ہاؤس کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ [illegible] آپ اپنے فینسی مکان کی کھڑکی میں سے اسے دیکھ رہی ہیں۔" پھر اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے جوزفین سے استفسار کیا۔

"دوسری مرتبہ آپ نے اسے کب دیکھا تھا؟"

"آدھی رات کے وقت......!" وہ [illegible] انگیز لہجے میں بولی۔ "میں ایسے ہی اتفاق سے اپنی کھڑکی پر آئی تو میں نے ہیرولڈ کی قامت کے سائے کو چٹانوں کے ساتھ ساتھ اس آسیب زدہ گھر کی سمت بڑھتے دیکھا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے میں اس کی صورت تو نہیں دیکھ پائی مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ہیرولڈ ہی ہوگا۔ وہ پراسرار انداز میں چلتے ہوئے اس ڈارک ہاؤس کے اندر داخل ہو گیا تھا۔"

"وہ ہیرولڈ ہی تھا۔" بینی نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا پھر قدرے سنبھلتے ہوئے بولی۔ "میرا مطلب ہے وہ ہیرولڈ کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔"

"اور تمہارے اس دعوے نما یقین کا سبب کیا ہے؟" پیرس نے بینی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "وہ ہیرولڈ کے سوا اور کوئی کیوں نہیں ہو سکتا؟ تم تو گزشتہ رات یہاں تھی بھی نہیں پھر تمہیں اتنا وثوق کیسے ہے؟"

"اس کا سبب ہیرولڈ کا جنون ہے آفیسر!" بینی نے معتدل انداز میں کہا۔ "اس کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی تھی کہ وہ اس ڈارک ہاؤس میں جا کر شیطان سے ملاقات کرے اور اس سے ایسی قوت حاصل کرے جس سے اس دنیا کی زندگی کو پرآسائش بنا کر عیش سے جیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ناکام انسان تھا اور اپنی ناکامیوں سے بھرپور زندگی سے نجات چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ ہاونٹڈ ہاؤس کی طرف گیا تھا...... میرا مطلب ہے جا سکتا ہے!"

پیرس نے نہایت توجہ اور انہماک سے بینی کی وضاحت سنی۔ چند لمحات تک وہ چپ چاپ اسے تکتا رہا پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

"میں خواہ مخواہ اتنے دن تک تمہارے شوہر کا ٹرائل کرتا رہا۔ ہر وقت بے وقت یہاں آ کر اس سے مختلف سوالات کرتا تھا اور اس تفتیش کا ایک ہی مقصد تھا...... تمہیں ڈھونڈ نکالنا۔ اگر ہیرولڈ مجھے سب کچھ سچ بتا دیتا تو مجھے اپنا قیمتی وقت برباد کرنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی اسے تنگ کرنے کا کوئی فائدہ۔"

"بعض لوگ اپنی تفریح کے لیے دوسروں کو اذیت دیتے ہیں جس کے بدلے میں وہ خود بھی مشکلات کا شکار رہتے ہیں۔" بینی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ہیرولڈ بھی ایک ایسا ہی انسان تھا۔"

"اوہ...... واقعی......!" پیرس نے سرسری انداز میں کہا اور اپنی نوٹ بک کو بند کرنے کے بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں ہیرولڈ کی تلاش کا کام شروع کر رہا ہوں۔" اس نے بینی سے کہا پھر جوزفین کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ "میں ایک پولیس پارٹی کو ڈارک ہاؤس کی جانب بھی روانہ کروں گا تاکہ پتا تو چلے کہ ابلیس نے اسے اپنی مریدی میں لے لیا ہے یا وہ کسی بھٹکی ہوئی بدروح کے مانند اسی آسیب زدہ مکان میں چکراتا پھر رہا ہے۔"

دونوں خواتین نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ مستعدی سے قدم اٹھاتے ہوئے اس گھر سے نکل گیا۔

☆☆☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ پیرس کے جانے کے بعد دونوں خواتین ایک دم ریلیکس ہو گئیں۔ ان کے چہروں پر فکر، پریشانی اور بے اطمینانی کے لیے ذرا سی بھی جگہ نہیں تھی۔ جوزفین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"بینی! کہیں یہ نہ سمجھنا کہ سب ختم ہو گیا۔ وہ ڈٹیکٹو دوبارہ تمہارے پاس آئے گا اور طرح طرح کے سوالات کرے گا۔ خصوصاً ڈارک ہاؤس کے اندر سے ہیرولڈ کی لاش برآمد ہونے کے بعد۔ تمہیں ہر قسم کی صورت حال کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا ہوگا۔"

"پچھلے کئی روز سے میں وہی کرتی چلی آ رہی ہوں جو تم نے مجھ سے کہا۔" بینی احسان مندانہ نظر سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "سمندر سے نکلنے کے بعد میں تمہارے گھر میں چھپ گئی تھی۔ آئندہ بھی تم مجھے جو کرنے کو کہو گی، میں ضرور کروں گی۔ جب میں نے تمہیں گرو مان لیا ہے تو پھر تمہاری بات سے انکار کیسے کر سکتی ہوں۔"

"میں تمہاری گرو نہیں، دوست ہوں۔" جوزفین نے کہا۔ "تم نے مجھ سے امیر بننے کا طریقہ پوچھا تھا اور میں نے تمہیں طریقہ نمبر ایک بتا دیا۔ چند روز بعد تم پانچ لاکھ ڈالرز کی مالک بن جاؤ گی۔ یہ امارت کی جانب تمہارا پہلا قدم ہوگا۔ اگر تم آئندہ بھی میری ہدایات پر عمل کرتی رہو گی تو بہت جلد ملٹی ملینیئر بن جاؤ گی۔ ایک بات کا خیال رکھنا!"

"کون سی بات کا؟" بینی نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"جب تک ہیرولڈ کی لاش دریافت نہیں ہو جاتی، اس وقت تک نصف ملین والی اس لائف انشورنس پالیسی کا کسی سے ذکر نہیں کرنا۔"

"سمجھ گئی۔" بینی اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "امید ہے انشورنس کی رقم حاصل کرنے کے لیے مجھے اتنا انتظار نہیں کرنا پڑے گا جتنا ہیرولڈ کی موت کا کیا ہے۔"

"یہ انتظار اس لیے طوالت پکڑ گیا کہ وہ گدھا ہیرولڈ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔" جوزفین نے بیزاری سے کہا۔ "مجھے کتنے دن تک ایک بوری میں ریت بھر کر اسے سمندر سے ساحل تک ریت پر گھسیٹنا پڑا کہ گیلی ریت پر ایسے نشانات بن جائیں جیسے کسی انسان کی لاش کو گھسیٹ کر وہاں سے کہیں لے جایا گیا ہے۔ وہ منحوس روزانہ دو بار اس موٹی لکیر جیسے

نشان کو دیکھا ضرور تھا مگر اس نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اس نشان کا اختتام کہاں پر ہوتا ہے۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"بالآخر کل وہ اس نشان کا تعاقب کرتے ہوئے اس ڈارک ہاؤس تک پہنچ ہی گیا اور اس نے وہاں اچھا خاصا وقت بھی گزارا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ اس آسیب زدہ مکان کے اندر ضرور جائے گا تاکہ یہ معلوم کر سکے کہ کس زندہ یا مُردہ انسان کو گھسیٹ کر کھنڈر مکان تک پہنچایا گیا تھا۔ وہ تمہیں سمندر میں ڈوبتے ہوئے دیکھ چکا تھا لہٰذا اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ گیلی ریت پر گھسیٹی جانے والی وہ وزنی شے زندہ یا مُردہ حالت میں تم ہی ہو۔ چنانچہ گزشتہ روز جب اس نے گھسیٹے جانے کے نشانات کی آخری منزل دیکھ لی تو پھر اس نے ہانٹڈ ہاؤس میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا......!"

"ایک منٹ......!" بیٹی قطع کلامی کرتے ہوئے متعجب ہوئی۔ "جب ہیرولڈ نے کل دن ہی میں اس مکان کے اندر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا تو پھر تمہیں یہ اندازہ کیسے ہوا کہ وہ آدھی رات کے بعد ہی ادھر کا رخ کرے گا؟"

"کیونکہ یہ میرے اسکرپٹ کا حصہ تھا۔" جوزفین نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔ "اپنے پروگرام کے مطابق میں ہیرولڈ کی موت کو ایسا ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ یہی سمجھا جائے کہ کسی شیطانی طاقت نے رات کی تاریکی میں اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے میں نے کچھ ایسا ماحول بنایا کہ ہیرولڈ کو لگے، میں دن بھر اپنے گھر کی کھڑکی میں کھڑی نہ صرف اس کی نگرانی کرتی رہتی ہوں بلکہ اس کی حرکات و سکنات کے بارے میں پولیس کو رپورٹ بھی کرتی ہوں۔ میری یہ ترکیب کارگر رہی اور اس نے رات کی تاریکی میں ادھر کا رخ کیا جہاں ہم اس کے "فقیدالمثال" استقبال کے لیے موجود تھے۔"

بات کے اختتام پر جوزفین نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ اس اظہارِ مسرت میں بیٹی نے بھی دل کھول کر اپنی دوست کا ساتھ دیا پھر گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "تم نے اس سالخوردہ چوبی زینے کے بالائی آخری حصے کو ایسا خطرناک بنا دیا تھا کہ اس پر ذرا سا بھی دباؤ پڑتا تو دباؤ ڈالنے والا بلندی سے زمین پر جا گرتا اور پچھلی رات ایسا ہی ہوا بھی۔ ہیرولڈ زینے کی ٹوٹی ہوئی لکڑیوں سمیت نیچے گرا اور ایک سانس لیے بغیر موت کے منہ میں چلا گیا لیکن فرض کرو کہ اگر [illegible] اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"اگر میری آواز سننے کے بعد ہیرولڈ زینے پر چڑھنے کے بجائے خوفزدہ ہو جاتا اور وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا تو......؟"

"ایسے کیسے کوشش کرتا۔" جوزفین نے سفاکی سے کہا۔ "میں اس کھنڈر کے داخلی دروازے کے نزدیک ہی ایک ستون کے پیچھے تاریکی میں بیس بال کا بیٹ تھامے "پلان بی" پر عمل کرنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔"

"پلان بی......؟" بیٹی نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "مگر تم نے اس بارے میں مجھے تو کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"تم اس فیلڈ میں نئی ہو اس لیے میں نے تمہیں "پلان اے" تک ہی باخبر رکھا تھا کہ کہیں تم آسرے میں رہ کر اپنے کردار سے انصاف کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کر دو۔" جوزفین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اگر ہیرولڈ ڈر کر بھاگنے کی کوشش کرتا تو میں بیٹ کے ایک ہی وار سے اس کی کھوپڑی کا حشر نشر کر ڈالتی۔"

"کیا تم نے اپنے شوہر سے نجات حاصل کرنے کے لیے بھی......؟" بیٹی نے شک زدہ نظر سے اپنی دوست کو گھورا۔

"وہ ایک طویل کہانی ہے۔ کبھی فرصت میں تمہیں سناؤں گی۔" جوزفین نے خوابناک لہجے میں کہا اور پوچھا۔ "کیا تم نے رات والے گرد آلود لباس کو ٹھکانے لگا دیا؟"

"ہاں...... وہ دھلائی کے بعد اب میری وارڈ روب میں رکھا ہے۔"

"اور ہیرولڈ کی میڈیسن کا تم نے کیا کیا؟"

"میں نے اس رنگ اور سائز کی وٹامنز کی گولیاں بوتل میں ڈال کر اصلی میڈیسن کو اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا اسی لیے وہ دوا ہیرولڈ کے دل کی تکلیف میں فائدہ نہیں کر رہی تھی۔" بیٹی نے بتایا۔ "میں نے اصلی دوا کو دوبارہ بوتل میں ڈال دیا ہے اور وٹامنز والی گولیوں کو ضائع کر دیا ہے۔"

"تم بہت ترقی کرو گی بیٹی!" جوزفین نے ستائش بھرے انداز میں کہا۔ "چلو، اسی خوشی میں مجھے چائے پلاؤ اور مفن بھی لانا اگر تمہارے کنجوس شوہر نے تمہاری جدائی کے غم میں ختم نہ کر ڈالے ہوں۔"

بیٹی خوشی سے معمور ایک قہقہہ ہوا میں اچھال کر کچن کی جانب بڑھ گئی [illegible] دن [illegible]

☆☆☆

چائے ختم کرنے کے بعد جوزفین اپنے گھر جانے کے لیے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ بیٹی اسے دروازے تک چھوڑنے کے لیے ساتھ چل پڑی۔ قبل اس کے کہ وہ دونوں دروازے تک پہنچ پاتیں، ڈور بیل نے کسی کی آمد کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی تیز دستک کی آواز بھی سنائی دی۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟" بیٹی نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" جوزفین نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "پورے اعتماد کے ساتھ دروازہ کھولو۔ جو بھی ہوگا، دیکھ لیں گے۔"

بیٹی نے اپنی دوست کی ہدایت پر عمل کیا۔ دروازہ کھلا تو سامنے ڈیٹیکٹو پیرس کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ دو اور پولیس والے بھی تھے۔ دونوں دوستوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"آئی ایم سوری لیڈیز!" پیرس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "میں دوپہر میں یہاں اپنا پین بھول گیا تھا۔ وہی لینے آیا ہوں۔"

بیٹی اور جوزفین نے سکون کی سانس خارج کی اور پیرس کے ساتھ اسی کمرے میں آ گئیں جہاں تھوڑی دیر پہلے پیرس نے ایک صوفے پر بیٹھ کر ان سے گفتگو کی تھی۔

"مگر یہاں تو کوئی پین نہیں ہے۔" بیٹی نے میز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

"تمہیں دکھائی نہیں دے گا۔" پیرس نے سرسری انداز میں کہا۔ "میں جانتا ہوں، میں نے اسے کہاں رکھا تھا۔"

پیرس کی یہ بات ان دونوں کے پلے نہ پڑی لیکن قبل اس سے کہ ان میں سے کوئی کچھ کہتی، پیرس نے صوفے کے پائے کی اندرونی جانب ہاتھ ڈال کر اپنا وہ پین برآمد کر لیا پھر مذکورہ پین کو انہیں دکھاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔

"اس پین کے کیپ میں ایک حساس مائیکروفون فٹ ہے جو زمین پر گرنے والی سوئی کی آواز کو بھی کیچ کر لیتا ہے اور ہاتھ کے ہاتھ اسے میری ریکارڈنگ ڈیوائس تک بھی پہنچا دیتا ہے جہاں اس آواز کو سننے کے علاوہ محفوظ بھی کیا جا سکتا ہے۔" پھر اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے واکی ٹاکی کی شکل کا ایک آلہ نکال کر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں نے پچھلے آدھے گھنٹے میں یہاں جو بھی گفتگو کی ہے، میں نے [illegible] بلکہ اسے اپنے چیف کو بھی بھیج دیا ہے اور...... اور وہ اس ڈیوائس میں تو محفوظ ہے ہی۔"

"آفیسر! تم ایک سنگین جرم کے مرتکب ہوئے ہو۔" جوزفین نے برہمی سے کہا۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس طرح کسی کی باتوں کو ریکارڈ کرنا بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ اس حرکت پر تم معطل بھی ہو سکتے ہو۔"

"میڈم! میں اپنے ملک کے قوانین کو تم سے زیادہ بہتر جانتا ہوں۔" پیرس نے دبنگ انداز میں کہا۔ "میرا یہ جرم تم دونوں کے جرائم سے زیادہ شرمناک اور سنگین نہیں ہے۔ جب کسی انسان کی زندگی اور موت کا معاملہ ہو تو ہم پولیس والے قانون اور قاعدے کی پروا نہیں کرتے۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے بیٹی کی طرف دیکھا پھر زہر خند لہجے میں کہا۔

"جب تم نے میرے سوالات کے جواب میں ہیرولڈ کے لیے کئی بار ماضی کا صیغہ استعمال کیا تھا اور اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی حال میں لوٹ آئی تھیں تو میں اسی وقت کھٹک گیا تھا لیکن میں نے تمہیں محسوس نہیں ہونے دیا اور حقائق کی تہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے یہ پین صوفے کے نیچے چھپانا پڑا۔"

"تم آگ سے کھیل رہے ہو آفیسر!" جوزفین نے پیرس کو اپنی دھونس میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ "یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں تمہارے چیف کی بیوی کی کزن ہوں۔"

"تیر کمان سے نکل چکا ہے میڈم۔" پیرس نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "پولیس کی سرچ ٹیم ڈارک ہاؤس کی جانب روانہ کر دی گئی ہے اور باہر کھڑے [illegible] پولیس والے آپ کی گرفتاری کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔"

"تمہیں [illegible] اندازہ نہیں کہ تم [illegible]......"

"مجھے اندازہ کرنا بھی نہیں ہے۔" پیرس نے اس کی بات کاٹ کر چٹانی لہجے میں کہا۔ "اگر اس سچویشن میں تمہاری جگہ امریکا کی خاتونِ اول بھی ہوتیں تو میں اپنے فرض میں غفلت نہیں برت سکتا تھا۔"

جوزفین اور بیٹی کے چہروں پر مردنی چھا گئی۔ ان کی گرفتاری کے وقت پر پیرس نے واشگاف الفاظ میں کہا۔

"یہ دنیا ایک تماشا گاہ ہے۔ تماشائی بنے رہنے ہی میں انسان کی بھلائی ہے۔ جب کبھی بھی، کسی انسان نے اس تماشے کا حصہ بننے کی کوشش کی تو پھر اسے اس کے کردار کے مطابق جزا اور سزا بھی لازمی ملی ہے۔"

⌘⌘⌘

جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط :8

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عیرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان
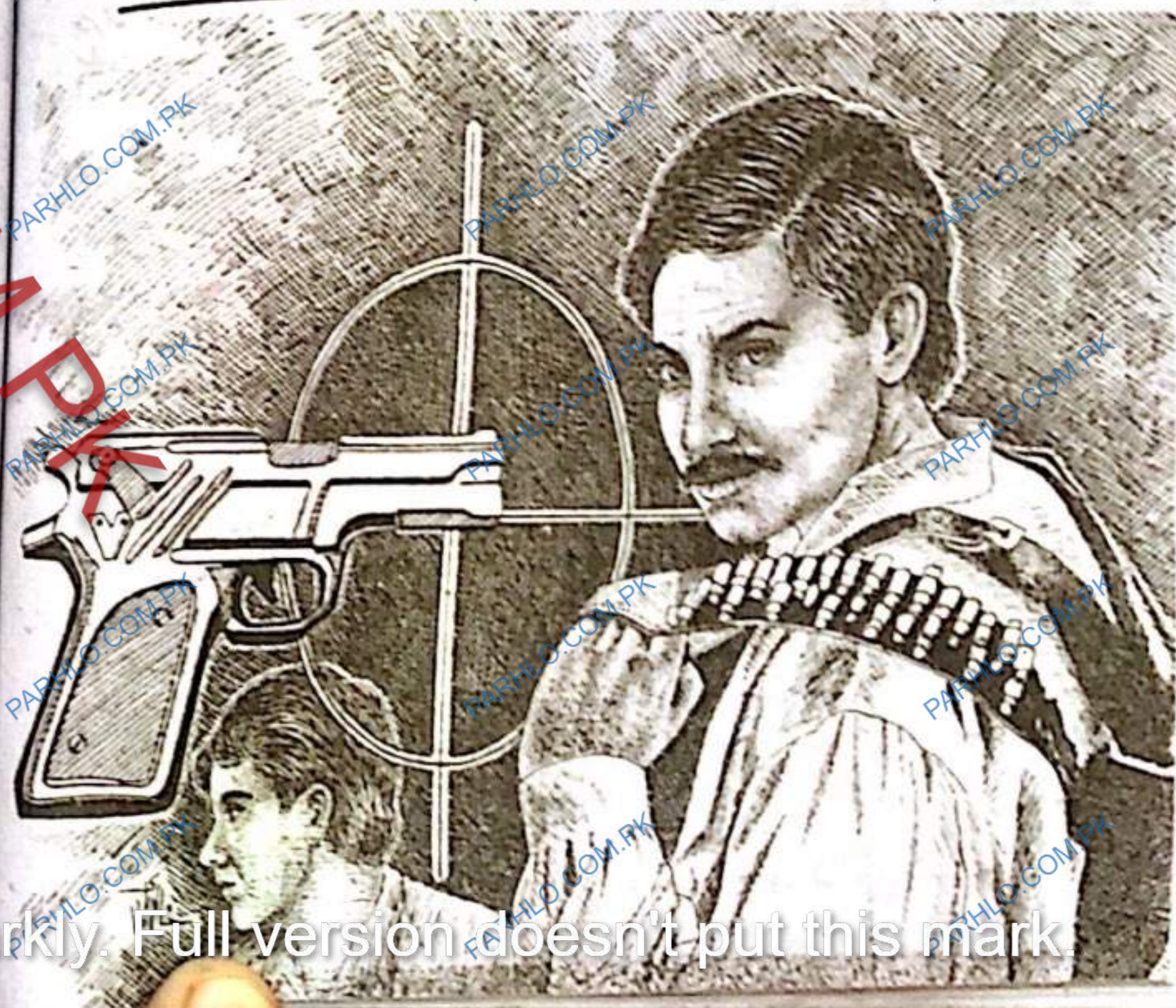
بختیار نے فوزیہ کو اپنی بہن کہا تو اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ کیونکہ ماجد کے بعد بختیار نے اسے بھائی ہونے کا احساس دلایا تھا۔ فوزیہ کے رونے پر بختیار ہی نہیں، نادو بھی پریشان سے ہوگئے بلکہ نادو تو اٹھ کر اس کے قریب جا بیٹھی اور خود سے لگا کر اسے کسی بڑی بہن کی طرح پیار کرنے لگی۔

"کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟" بختیارے بے چارہ اپنی سادگی میں پریشان ہو کے بولا تو میں نے کہا۔

"نہیں بختیار بھائی! تم نے اسے بھائی ہونے کا اتنا بڑا مان دے دیا۔ یہ پگلی اس پر جذبات سے رو پڑی ہے۔ دراصل اس کا ایک بھائی تھا۔ وہ اب دنیا میں نہیں رہا۔ تمہاری شکل میں اسے شاید اس کی یاد آگئی۔"

بختیارے نے یہ سنا تو کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تب ہی اس نے جھولے میں پڑی ایک اجرک کی چادر اٹھائی اور وہ آگے بڑھ کر فوزیہ کے سر پر اوڑھا دی پھر بولا۔

"نہ رو میری بہنا! اب یہ تیری آنکھوں میں، میں نے آخری بار آنسو دیکھے ہیں، دوبارہ نہیں دیکھوں۔ بس، اتنا کہوں گا کہ میری بات پر یقین کر۔"

فوزیہ نے یکدم اپنا اشکبار چہرہ اٹھا کر بختیارے کی طرف دیکھتے ہوئے اسی لہجے میں کہا۔

"بھائی! کیا میرے آنسو اس بات کی گواہی نہیں کہ مجھے آپ پر ایک بھائی جیسا ہی بھروسا ہے۔"

"بے شک...... بے شک۔" وہ بولا۔ "بہنا! میں نسلی ماں باپ کا جنا ہوں۔ تیرے ایک آنسو پر اپنی جان قربان کردوں گا۔"

مجھے نادو اور بختیارے پر پورا بھروسا ہونے لگا لیکن بھولے مرحوم سے متعلق نادو کے سلسلے میں میرے اندر ابھی تک پھانس مجھے نامعلوم سی بے چینی میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔

نادو کی تیز نگاہوں نے شاید میرے اندر کی بے چینی تاڑ لی تھی۔ پھر وہی ہوا۔ ایسے میں جب بھی میں چور نظروں سے نادو کی طرف دیکھنے لگتا تو وہ بڑی اسرار بھری مسکراہٹ سے مجھے یوں تکنے لگتی جیسے وہ میری اس "الجھن" یا "اڑچن" سے حظ اٹھانے کی کوشش کررہی ہو۔

بڑی بات تو یہ تھی کہ مجھے ابھی تک اس بات کا موقع ہی نہ مل سکا تھا کہ نادو سے اس سے متعلق کوئی بات کروں یا پھر حالات ہی ایسے رہے تھے۔

مجھے بہرحال ان کی باتوں سے حوصلہ ہوا۔ فوزیہ بھی مطمئن تھی۔ راحیلہ کی طرف سے اسے بھی فکر و تشویش تھی۔ وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ پہلی کوشش راحیلہ کی تلاش ہونی چاہیے۔ اس کے بعد آگے کہیں بڑھنے کا سوچا جاتا۔

لیکن اب میں اس سے پہلے اپنے اندر کی بے کلی دور کرنا چاہتا تھا لہٰذا پھر ایک ذرا موقع ملتے ہی میں نے بے اختیار نادو سے یہ شکوہ کر ہی ڈالا، بولا۔

"نادو......! مجھے تمہاری ایک حرکت پر ہمیشہ بہت افسوس رہے گا۔"

"وہ کیا؟" نادو چونک کر بولی۔

"تم نے بے چارے بھولے کو اپنے مفاد اور ذاتی غرض کی خاطر دھوکا دیا تھا نا؟"

میری بات سن کر نادو نے ایک دو لمحے اپنی کشادہ آنکھوں کی گھنیری چلمنیں گرادیں اور ایک گہری سانس لی۔ اس کے بعد ہولے سے بولی۔

"مجھے معلوم تھا تمہارے اندر بہت دیر سے یہی کچھ پکے جارہا ہے۔ تم ایک دن مجھ سے یہ ضرور کہو گے۔"

"تو کیا غلط کہہ رہا ہوں میں؟" میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا اور آگے بولا۔ "بے شک بھولے سے میرا تعلق کچھ گھنٹوں کا سہی مگر میں نے اسے اتنے وقت میں بھی بہت اچھا اور جاں نثار پایا لیکن تم اسے دھوکے میں کیوں رکھے ہوئے تھیں؟"

"اور مجھے تم نے اب تک کیسا پایا؟" نادو نے اک ادائے دلربانہ سے میری جانب تکتے ہوئے پوچھا۔

"تم بھی ٹھیک ہو مگر بھولے کے حوالے سے میرے دل میں تمہارے لیے ایک پھانس ہے اور رہے گی۔" میں نے صاف گوئی سے جواب دیا تو وہ ایک رنجیدہ سی سنجیدگی سے بولی۔

"سہراب! جب کوئی بے بس پنچھی پنجرے میں قید ہو یا کوئی دریا میں جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو تو کیا اسے تنکے کے سہارے کی بھی امید نہیں کرنی چاہیے؟ میں بھی ایک ایسی ہی پنچھی تھی۔ مجھے بھی تنکے کا سہارا چاہیے تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ بھولے نے مجھ سے محبت کی تھی۔ ہم سیلابی صورتِ حال سے لٹے پٹے تباہ حال صادق آباد کے اس گاؤں میں پہنچے تھے۔ وہیں بھولے سے میری جان پہچان ہوئی۔ اسی کے باپ نے ہماری مدد کی تھی۔ بھولا مجھ سے محبت کا دم بھرنے لگا مگر میرے دل میں بختیارا بسا ہوا تھا۔ بختیارے کی بھی شادی ہوچکی تھی۔ ہمارے خاندان کے بیچ نہیں بنی تھی۔

"میں خود مایوس تھی۔ تباہ حال خاندان کی فرد تھی۔ اس سے منگنی کرلی مگر بھولے کو دل میں نہ بسا سکی پھر [illegible]

نے زبردستی مجھ سے شادی کرلی۔ مجھ پر ظلم بھی کرنے لگا اور بیوی کے نام پر باندی بنا ڈالا مجھے۔ ایسے میں بھولے نے پھر میری مدد کی۔" اتنا بتا کر نادو چپ ہوگئی مگر میں اس کی درد بھری داستان دلستاں سے بالکل بھی متاثر نہ ہوا اور ملامتی لہجے میں بولا۔

"اگر فرض کرو بھولا نہ مرتا اور تم درحقیقت پہلے ہی یہاں آنا چاہتی تھیں کیونکہ تمہیں بعد میں اس حقیقت کا علم بھی ہوچکا تھا کہ بختیارے کی بیوی بھی دنیا میں نہیں رہی ہے تو پھر تم کیا کرتیں؟ تم بھولے اور بختیارے میں سے کس کو اپناتیں؟"

نادو نے سر جھکا لیا۔ وہ شاید لاجواب ہورہی تھی لیکن ایسا نہیں تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنا سر اٹھا کر [illegible]

"میں...... بھولے کو ہی اپناتی کیونکہ اسی نے میری مدد کی تھی۔"

"جھوٹ، سفید جھوٹ۔" میں نے [illegible] سے کہا۔ "اگر تم بھولے کے ساتھ سچی ہوتیں تو یہاں کا رخ کیوں کرتیں؟"

"اس لیے کہ میں [illegible] اور بھولے کو چودھری جی برادران سے بچانا چاہتی تھی۔ یہاں ہم محفوظ رہتے۔" نادو نے کہا۔

نیتوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ اسی لیے میں نے مزید کوئی بحث نہ کی اور چپ سادھ لی۔ نادو کو بھی احساس ہوگیا تھا کہ میں اس کی تاویلات اور توجیہات سے بالکل بھی متاثر نہیں ہوا ہوں۔

بہرکیف، اب ہم سردست جس محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں تھے، وہ ہمیں میسر آچکا تھا۔ تاہم نادو کی یہ بات میں نے رد کردی تھی کہ وہ میرے ساتھ ہوگی کیونکہ میں راحیلہ کو خود ہی اور اکیلا تلاش کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میں نے نادو کو تاکید کردی تھی کہ وہ فوزیہ کو بالکل تنہا نہ چھوڑے۔ یوں بھی فوزیہ کا دل بہلانے کے لیے بختیار کی نوعمر بیٹی بھی موجود تھی۔

بختیار کی بیوی کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہوچکا تھا۔ اس نے پھر دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اب یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ نادو کے ساتھ اس کی "دوستی" کب سے اور کیسے پروان چڑھی تھی۔ ممکن تھا کہ یہ بھولے سے اس کی "شناسائی" سے پہلے کی بات ہو کیونکہ بہرحال یہ دونوں ایک ہی علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور جیسا کہ نادو اتنا بتا چکی تھی مجھے کہ وہ بھی پہلے ادھر ہی رہتے تھے لیکن سیلابی صورتِ حال کی وجہ سے بیشتر لوگوں کی طرح ان کا خاندان بھی نقلِ مکانی [illegible]

علاقہ چھوڑتے ہوئے بالآخر صادق آباد جا بسے تھے۔

بختیار ایک بڑے بھینسوں کے باڑے کا مالک تھا اور گاؤں میں ہی کھاد کی دکان بھی کرتا تھا۔ اچھا کھاتا پیتا آدمی تھا۔

راحیلہ کی تلاش سے متعلق میں نے ایک لائحہ عمل ترتیب دے دیا تھا۔ جیسا کہ فوزیہ نے مجھے بتایا تھا کہ راحیلہ اس سے کس مقام پر جدا ہوئی تھی۔ میں سب سے پہلے اسی علاقے سے اس کا اتا پتا کرنا چاہتا تھا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ راحیلہ کے متعلق مجھے ذرا سا بھی کوئی کلیو مل جاتا تو میں اس تک پہنچنے میں ذرا دیر نہیں لگانے والا تھا جس طرح میں نے فوزیہ کو تلاش کیا تھا۔

اس لائحہ عمل سے مجھے نادو تو کسی قدر مطمئن نظر آرہی تھی مگر فوزیہ غیر یقینی کا شکار اور غیر مطمئن تھی۔ اسی لہجے میں بولی۔

"راحیلہ تو بھلا ان وحشیوں سے گنے سے لدے ایک نامعلوم ٹرک میں سوار نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچی ہوگی اور تم دوبارہ اپنے دشمنوں کے علاقے میں اسے ڈھونڈنے جارہے ہو؟"

"میں وہاں نہیں جارہا ہوں۔" میں نے پورے سکون سے کہا۔ "تم بس میری کامیابی کی دعا کرو...... میرا دل کہتا ہے کہ میں راحیلہ کو جلد تلاش کرلوں گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" فوزیہ دعائیہ لہجے میں بولی تو میں نے بھی ہولے سے آمین کہا۔

"تم نے سدرہ سے کوئی رابطہ کیا؟" اچانک فوزیہ نے سوال کر ڈالا۔ "ہمارے اب تک سیالکوٹ نہ پہنچنے پر وہ بھی فکرمند تو ہورہی ہوگی۔"

میں نے قدرے چونک کر فوزیہ کی طرف دیکھا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسے وقت اور حالات میں فوزیہ کا یہ سوال بے محل تو محسوس ہوا تاہم نفی میں سر ہلاتے ہوئے اور پھیکی سی مسکراہٹ کے جواب میں بولا۔

"نہیں، بھلا کیسے رابطہ کرتا۔ موقع ہی نہیں ملا۔"

"کم از کم تمہیں اسے فون پر رابطہ کرکے بات کرلینی چاہیے تھی۔ کیا خبر وہی ہماری کچھ مدد کرسکے۔" فوزیہ کی اس بات پر اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور میں غور کرنے والے انداز میں فوزیہ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ نادو بھی سدرہ کے نام پر ذرا چونکی تھی کیونکہ اس کے لیے یہ نام اجنبی ہی تھا، بولی۔

"یہ سدرہ کون ہے؟"

"یہ ہماری کوئی جاننے والی ہے۔ کراچی میں رہتی [illegible]

"یہ تمہیں اچانک سدرہ کیوں یاد آ گئی؟"
"اس لیے کہ یہ سارا معاملہ اسی سے تو تعلق رکھتا ہے۔ کیا بھول گئے، تم نے اس کی مدد کرنے کا بیڑا جو اٹھا رکھا ہے۔" کہتے ہوئے وہ بھی ہولے سے مسکرائی۔ ایک بات پر سدرہ اور فوزیہ کے درمیان ہلکی پھلکی تلخی ہو گئی تھی۔ بلکہ سدرہ بے چاری سے کیا ہوتا تھی، فوزیہ ہی ذرا جذباتی ہو گئی تھی۔ اگرچہ پھر بعد میں میرے اور راحیلہ کے سمجھانے بجھانے پر اس نے سدرہ سے معذرت کر لی تھی۔
"مجھے پورا یقین ہے کہ یہ بھی اسی کے دشمنوں کی کوئی چال ہوگی۔ بھلا ہمارے نئے دشمن کیونکر پیدا ہونے لگے۔" فوزیہ نے دوبارہ کہا۔
"مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے۔" میں ہمدردانہ بولا۔ "ویسے تم نے مجھے ٹھیک ہی مشورہ دیا ہے۔" کہتے ہوئے میں نے نادو کی طرف دیکھا جو ابھی تک میری جانب مستفسرانہ نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔
"نادو! کیا یہاں فون دستیاب ہو سکتا ہے؟"
"ہو جائے گا، پر یہ سدرہ آخر ہے کون؟ کیا تمہاری دشمن ہے؟" اس کی بات پر فوزیہ اور میں مسکرا دیے۔ میں نے کہا۔
"نہیں، وہ بے چاری خود دکھوں کی ماری ہے۔ ہم نے تو اس کی مدد کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ بہت لمبی کہانی ہے یہ، پھر کبھی بتا دوں گا۔"
"لیکن ابھی تو تم دونوں کہہ رہے تھے کہ یہ سب اسی کی وجہ سے ہوا ہے؟" نادو بدستور مصر رہی۔ تب میں نے اسے مختصراً سدرہ کے اور کراچی کے حالات کے بارے میں آگاہ کر دیا۔ یہ سن کر اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، بولی۔
"ہائے ربا! تو یہ ہے سارا معاملہ۔ تب پھر یہ بات سو فیصدی درست ہی ہوگی کہ تمہارے کراچی والے دشمنوں نے ہی یہ جال پھیلایا ہوگا۔ وہاں سے اس کے گماشتے تمہارے پیچھے لگ گئے ہوں گے۔ یقیناً پھر چودھری جی برادران سے بھی ان کے پکے تعلقات ہوں گے۔"
نادو نے جس بات کا اندازہ قائم کیا تھا وہ پہلے ہی سے میرے ذہن میں تھا لہٰذا میں نے اس کی بات پر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی اور اس سے دوبارہ ٹیلی فون کی سہولت کے بارے میں استفسار کرتے ہوئے بولا۔
"ذرا رازداری اور تنہائی میں بات کرنا پڑے گی مجھے۔"
نادو کچھ سوچنے کے بعد بولی۔ "بختیار سے پوچھتی ہوں۔ مجھے امید ہے وہ اس کا بندوبست کر دے گا۔"
بختیار سے پوچھا گیا تو اس نے فوراً اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا۔
"ٹیلی فون تو ہے پر وہ میری دکان میں لگا ہوا ہے۔"
اس میں کیا مشکل تھی۔ میں فوراً اس کی کھاد والی دکان پر جا پہنچا۔ وہاں میں نے دھڑکتے دل سے سدرہ کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ بڑی ٹرنک کال تھی بڑی مشکل سے ملی۔ دوسری طرف بیل جاتی رہی پھر میری توقع کے عین مطابق کسی نے ریسیور اٹھایا تو میرا دل یکبارگی دھڑکا۔ مجھے خیال آیا کہ اس کا مشکوک (بلکہ یقیناً) ماموں سجاد بیگ جو در پردہ گینگسٹر اقبال کا ہی آدمی تھا، اس نے باتیں سننے کے لیے ٹیلی فون سیٹ پر کوئی ٹیپ ریکارڈر وغیرہ نہ لگا یا ہو یا پھر فون کال ریکارڈ نہ ہوتی ہو۔
"ہیلو...... کون؟"
میں یہ سب سوچتا رہ گیا اور دوسری جانب سے کسی نے کہا۔ آواز پہچانتے ہی میرا دل بے اختیار زور سے دھڑکا۔ میں یہ آواز پہچان چکا تھا۔ یہ سدرہ کی تھی۔
"ہیلو، مس...... سدرہ صاحبہ......؟" میں نے دانستہ اتنا ہی کہا۔ دوسری جانب یکلخت چند لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی اور پھر سدرہ جیسے چلائی۔
"مسٹر...... سہراب! تم......! کدھر ہو؟ کہاں اور کیسے ہو......؟ تم ابھی تک سیالکوٹ نہیں پہنچے۔ میں نے پتا کروایا تو یہی معلوم ہوا کہ تم لوگ ابھی تک پہنچے ہی نہیں وہاں۔"
وہ ایک سانس میں ہی کہتی چلی گئی۔ میں نے اسے پہلے پرسکون رہنے کا کہا اور بولا۔
"اب میری بات غور سے سنیں پلیز۔" وہ میرے مرحوم مالک کی بیٹی تھی اسی لیے میں نے اس کے منع کرنے کے باوجود اپنے اور اس کے درمیان ایک احترام کی حد قائم کر رکھی تھی۔
اس کے بعد میں نے مختصراً اسے اب تک کے سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔ یہ سب سن کر سدرہ کو چند لمحوں کے لیے پھر چپ لگ گئی۔ اس کے بعد بولی۔
"او مائی گاڈ! ان لوگوں کا جال اس قدر پھیلا ہوا ہے۔ یہ تو بہت بڑے گینگ کے لوگ ہیں اور......"
"سدرہ صاحبہ!" میں نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔ "یہ وقت دشمنوں کی طاقت پر تبصرے کا نہیں ہے۔ میرا مقصد فقط آپ کو یہی بتانا تھا تاکہ آپ پریشان نہ ہوتی رہیں اور وہاں پوری طرح احتیاط سے کام لیں۔ مجھے تو بعد میں اس خدشے کا خیال آیا کہ کہیں آپ کے ٹیلی فون

سیٹ پر ریکارڈر وغیرہ نہ لگا دیا گیا ہو۔"
"یہ ممکن ہے کیونکہ ماموں سجاد بیگ بھی اسی گھر کے فرد کی حیثیت رکھتا ہے اور پاپا کے انتقال کے بعد اس کا کچھ زیادہ ہی ادھر آنا جانا رہنے لگا ہے بلکہ اکثر وہ بہانے بہانے مجھ سے تمہارے بارے میں بھی پوچھتا رہتا ہے مگر میں ہر بار تمہاری طرف سے لاعلمی کا اظہار کرتی رہتی ہوں۔ تاہم سجاد بیگ کو یقین کی حد تک اس بات کا شبہ ہو چکا ہے کہ ممّا پر نہیں تو مجھ پر تم نے اس کی اصلیت آشکار کر دی ہے۔"
"یہ تو بڑی تشویشناک بات ہے۔ آپ بہرحال محتاط رہنا اس سے۔ اسے شبہ نہ ہونے دینا کہ میں نے آپ پر اس کی حقیقت آشکار کر دی ہے۔ بیگم صاحبہ (سدرہ کی والدہ) کو بھی مطلق کچھ نہیں بتانا۔ بھائی کی محبت بہرحال ہر بات پر غالب آجاتی ہے۔"
میں نے کہا پھر فکرمندی سے بولا۔ "لیکن اب کیا ہوگا؟ اگر آپ کا فون ریکارڈ ہوا تو کیا ہوگا؟"
"اس کی فکر مت کرو۔ میں اپنے ذریعے سے معلومات کر لوں گی۔ فون بھی چیک کروں گی۔ مشتاق اور زیدی اس کام کے ماہر ہیں۔" سدرہ نے ازراہِ تشفی کہا۔
زیدی کے ذکر پر تو نہیں البتہ مشتاق کے ذکر پر مجھے یاد آ گیا کہ یہ وہی آدمی تھا جو مرحوم سیٹھ سکندر کا بیک وقت باڈی گارڈ اور پی اے تھا۔ ایک اور آدمی محمود قریشی بھی مجھے یاد آیا جو سارا فیکٹری کا نظام سنبھالے ہوئے تھا۔
یہ تینوں افراد سیٹھ سکندر کے وفادار تھے۔ مشتاق کے ساتھ پہلی بار میں کار میں بیٹھ کر سیٹھ سکندر کی کلفٹن والی کوٹھی پر ان سے ملنے گیا تھا۔ اس وقت دوسرا آدمی بھی ساتھ تھا۔ شاید وہ زیدی تھا۔
"یہ کام ضرور کرنا۔ بس اب تم راحیلہ کے بارے میں دعا کرو۔ اسے ڈھونڈ لینے کے بعد ہم فوراً سیالکوٹ کا رخ کریں گے۔" کہنے کے بعد میں نے مختصراً پوچھا۔
"اور کوئی خاص بات ہو تو بتاؤ؟"
"کوئی خاص بات نہیں ہے۔" سدرہ بولی۔ "فی الحال سب ٹھیک ہے۔ انہیں شاید تمہاری تلاش ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔ میں نے یہاں فیکٹری اور پاپا کے دیگر کاروباری معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے اور اپنی سیکیورٹی بھی بڑھا دی ہے۔ مشتاق اور زیدی ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔ انکل محمود قریشی بھی فیکٹری میں میرے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ سجاد بیگ پر بھی کڑی نظر ہے۔ مجھے تو تمہاری فکر رہتی ہے......"
"تمہارا اللہ مالک ہے سدرہ صاحبہ!" میں نے کہا۔ "میں شاید اب دوبارہ بہت دنوں بعد آپ سے رابطہ کروں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔"
"ہم...... مجھے یہ نمبر تو دے دو جہاں سے تم فون کر رہے ہو تاکہ تم لوگوں کی خیر خیریت معلوم کرتی رہوں۔ خدا کرے راحیلہ بھی جلد مل جائے۔" وہ ایک دم بولی۔ میں نے اسے بختیار کی مدد سے دکان کا نمبر نوٹ کروا دیا۔
"تم کوشش کر کے رابطے میں رہنا۔ میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کروں گی۔ ایک نمبر نوٹ کرو۔ یہ سیف لائن ہے۔ اس پر بے دھڑک بات کر لینا۔ میری ایک گہری سہیلی کا ہے جو قریب ہی کوٹھی میں رہتی ہے۔ احتیاط کے پیش نظر آئندہ اسی پر رابطہ کر لینا لیکن ضروری ہو تو ہمارے ہی نمبر پر بھی فون کر سکتے ہو۔"
میں نے وہ نمبر نوٹ کر لیا اور جب اسے خدا حافظ کہنے لگا تو وہ بولی۔
"سہراب! تم ایک عظیم انسان ہو۔ پہلے پاپا کی خاطر تم نے کس قدر مشکلات، پریشانیاں اور دکھ اٹھائے اور اب میری خاطر......" شدتِ جذبات سے اس کی آواز رندھ گئی۔ ایک ذرا تھم کے دوبارہ بولی۔
"میں تو تمہارا احسان ساری زندگی نہیں اتار سکتی۔ اب بھی تم اپنے سیٹھ صاحب کے نمک کا حق ادا کرتے ہوئے کس قدر کٹھن حالات کا شکار ہو۔ خدا تمہاری مدد کرے۔ میں بھی کچھ کرتی ہوں۔"
میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ سدرہ کو فون کر کے مجھے کچھ تسلی ہو گئی تھی۔ اس سے دورانِ گفتگو میں نے یہ احتیاط ضرور رکھی تھی کہ اسے نام اور مقام اشارتاً ہی بتائے تھے۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی۔
اب سوال یہ تھا کہ بھلا سدرہ کراچی میں رہتے ہوئے ہماری کیا مدد کر سکتی تھی؟ وہ تو خود بے چاری مدد کی طلبگار تھی جس کے لیے میں پہلے کوشش کر ہی رہا تھا۔
اس نے آخر میں مجھ سے رقم وغیرہ کے پہنچانے کے لیے بھی کہا تھا جس پر میں نے "ضرورت پڑی تو کہہ دوں گا" بول دیا تھا۔
القصہ...... میں راحیلہ کی تلاش کی "مہم" پر روانگی کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔
میرے چہرے پر پہلے ہی بہت گھنی ڈاڑھی مونچھیں نکل آئی تھیں اور میں نے انہیں ترشوایا نہیں تھا۔ سر کے بال بھی میں نے [illegible]

اس جا کر میں نے اپنے سر کے بالوں کی سیٹ کٹنگ ضرور مختلف اسٹائل کی کروائی تھی۔ داڑھی مونچھوں کو ویسے ہی نے نادو کے کہنے پر سیاہ سے ڈارک براؤن کروالیا تھا۔ فوزیہ کو میں نے تسلی دی۔ نادو نے میری کامیابی کی دعا کے ساتھ تاکید کی اگر میں خدانخواستہ ناکام رہوں تو جلد واپس لوٹ آؤں تاکہ پھر کچھ اور سوچا جاسکے۔ تاہم میں نے دونوں کو ہی اس بات کی تسلی کروادی تھی کہ اگر راحیلہ کی تلاش کی مدت طویل ہونے لگی تو موقع ملا تو میں یہاں آتا رہوں گا وغیرہ۔

میں صبح سویرے ہی اپنی مہم پر نکل پڑا تھا۔

☆☆☆

نادو کو اپنے ٹھکانے اور فوزیہ کو محفوظ جگہ چھوڑ کر میں قدرے مطمئن تھا۔ میں نے بختیار کا دیا ہوا ایک نیا شلوار کرتہ، پیروں میں پشاوری چپل، ایک دیہاتی طرز کی چادر (جو کبھی کبھی منہ اور چہرہ چھپانے کے لیے کام آتی) رکھ لی تھی۔

ایک تیز دھار خنجر بھی بختیار نے مجھے رکھنے کو دے دیا تھا جو میری دائیں پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ سر پر ٹوپی تھی۔ چادر کاندھوں پر ڈال کر میں ایک ناپختہ سے راستے پر چلا جارہا تھا۔

میں پیدل تھا۔ بختیار میرے لیے موٹر سائیکل کا بھی بندوبست کرسکتا تھا لیکن اس میں خوامخواہ نظروں میں آنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ پیدل یا لاری وغیرہ میں سفر کافی حد تک محفوظ اور مناسب تھا۔ باقی بختیار نے میری راہنمائی کردی تھی جس کے مطابق جمال دین والی کا تقریباً دو سے اڑھائی گھنٹوں کا سفر پڑتا جو کوٹ مٹھن (راجن پور) سے ایک سو پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس سے آگے بھٹاوان پڑتا اور مجھے انہی درمیانی علاقوں میں راحیلہ کا کھوج لگانے کے لیے سڑک گردی کرنا تھی۔

لہٰذا میری پہلی منزل جمال دین والی تھی۔ وہاں سے بھٹاوان۔ میں گاؤں کی نہر والی اس جگہ پر جا پہنچا جدھر سے اندرون دیہات چلنے والی سوزوکیاں چلا کرتی تھیں۔

روانگی کے لیے تیار ایک سوزوکی میں، میں سوار ہوگیا۔ وہ روانہ ہوئی اور اس نے نصف گھنٹے میں مجھے دریا پار ایک مین روڈ پر پہنچا دیا۔

میں اتر کر سڑک کے کنارے کھڑا ہوگیا۔ یہاں قطار در قطار دور تک سڑک کے کنارے کنارے درختوں کی بہتات تھی۔ نشیب میں جھاڑیاں اور پھر کھیتوں کھلیانوں کا سلسلہ تھا۔ دائیں بائیں سڑک کے کنارے کنارے لدی ہوئی ٹریکٹر ٹرالیاں کھڑی تھیں۔

سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ ان میں کاروں کے علاوہ مسافر لاریاں، بار بردار ٹرک اور ٹریکٹر ٹرالیاں بھی تھیں۔ جلد ہی مجھے ایک بونٹ والی مسافر لاری آتی دکھائی دی۔ میں نے ہاتھ دیا۔ وہ رکی اور میں اس میں سوار ہوگیا۔ وہ آگے چلی اور میں ایک سیٹ میں پھنس پھنسا کر بیٹھ گیا۔

لاری اپنی ڈھیلی ڈھالی مخصوص رفتار سے چلی جارہی تھی۔ میں کن انکھیوں سے اندر بیٹھے مسافروں کے چہروں پر بھی نظر بس ڈالتا رہا۔ ان میں بوڑھے، جوان، بچے بھی سوار تھے۔ اگلی نشستوں پر خواتین تھیں۔ بس میں کسی لوک فنکار کا مقامی گیت گونج رہا تھا۔

لگ بھگ دو گھنٹے بعد بس جمال دین والی رکی۔ مسافر چڑھنے اترنے لگے۔ میں بھی اتر گیا۔ بس جس اسٹاپ پر رکی تھی، یہاں چھپرا ہوٹل بھی تھا۔ دوپہر ہو چلی تھی۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ دھوپ تیز تھی۔ شکر تھا کہ ہوا میں بادسموم کا اثر نہ تھا۔ مجھے بھوک اور پیاس لگی ہوئی تھی۔

میں ہوٹل میں گیا اور وہاں سے بیس منٹ میں کھانے پینے سے فارغ ہوکر پھر اسی طرف آگیا۔ اب میں گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے مٹرگشت کرنے لگا۔ مجھے یہاں سے بھٹاوان تک راحیلہ کی تلاش میں سرگرداں رہنا تھا۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق مجھے بھٹاوان اور جمال دین والی کے درمیان میں ہی راحیلہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہوسکتا تھا۔ تاہم یہ بھی ضروری نہ تھا وہ ادھر ہی کہیں مل بھی جاتی۔ ممکن تھا وہ آگے نکل گئی ہو لیکن اغلب امکان یہی تھا کہ ٹرک میں فوزیہ کو غائب پاکر راحیلہ نے بھی جلد ہی کہیں نہ کہیں موقع پاتے ہی ٹرک سے اترنے کی کوشش کی ہوگی۔ تھا تو یہ ایک ”جوا“ ہی مگر قریب ترین قیاس کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی نہ کوئی کلیو ملنے کی امید ضرور رہتی ہے۔

اب مجھے یہاں سے بھٹاوان تک راحیلہ کو تلاش کرنا تھا یا اس سیاہ ڈرائیونگ کیبن والے ٹرک کے بارے میں پتا چلانا تھا۔

دھوپ تیز نکلی ہوئی تھی۔ آسمان صاف تھا اور دھوپ کی شدت سے اور زیادہ چمک رہا تھا۔ گرمی بہت پڑ رہی تھی اور ہر کوئی سایہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اردگرد بسیں موجود تھیں۔ چند ایک ٹرک بھی کھڑے نظر آئے۔

میں ان کے درمیان سے گزرتا ہوا مین روڈ کے کنارے چلنے لگا۔ یہاں پنکچر لگانے والے اور موٹر مکینک، چھپرا ہوٹل والے موجود تھے۔ کچھ فرنیچر وغیرہ کے ٹھیلے بھی دکھائی دیے۔ درختوں کی قطاریں کنارے پر ایستادہ غنیمت ہی نظر آئیں۔

مجھے قریب ایک پیٹرول پمپ کے ساتھ بڑا سا ٹرک اسٹاپ نظر آیا۔ میں اسی طرف بڑھ گیا۔ یہ سڑک کے دوسری جانب تھا۔ سڑک پر ٹریفک کی آمد و رفت جاری تھی۔ میں بچ بچا کر دوسری جانب آگیا۔

پیٹرول پمپ سے ہوتا ہوا ٹرک اسٹاپ کے کھلے میدان میں آتے ہی میں نے گردوپیش میں نظر دوڑائی۔ یہاں بھی ایک مستطیل سی سرخ اینٹوں والی قدرے بڑے ہوٹل کی عمارت تھی جس کے اوپر کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ شاید سرائے نما ہوٹل تھا۔ یہاں ٹرک ڈرائیور اپنی نیند وغیرہ پوری کرنے کے لیے رکتے تھے۔

اندر بھی چارپائیاں، لکڑی کی بینچیں اور کرسیاں نظر آئیں۔ کچھ ٹرک ڈرائیورز اور دیگر لوگ بھی وہاں بیٹھے تھے۔ میں بھی ان کے درمیان میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جلد ہی نوجوان لڑکا میری طرف پانی کا جگ اور گلاس لیے آن پہنچا۔ کھانا تو میں کھا ہی چکا تھا۔ میں نے اسے دودھ پتی چائے کا آرڈر دے دیا۔

تھوڑی دیر بعد میں چائے پیتے ہوئے میدان میں کھڑے مختلف ٹرکوں کو دیکھنے لگا۔ ان میں دس وھیلر اور راکٹ ٹرک (چھوٹے سائز کا ٹرک) کے علاوہ ہیوی ٹریلر ٹرک بھی موجود تھے۔

چائے پینے کے بعد میں نے بل ادا کیا اور میدان میں آگیا۔ قریب میں ایک راکٹ ٹرک کا بونٹ اٹھائے، بمپر پر چڑھا ہوا.... آدمی نیچے اترا تو میں نے اسے دیکھ کر سلام کیا۔

اس نے سلام کا جواب دیا تو میں نے اس سے پوچھا۔

”بھائی! کیا یہاں کوئی ایسا آدمی مل سکتا ہے جو ٹرکوں کے آنے جانے کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہو یا کچھ بتا سکے؟“

میری بات سن کر اس نے دائیں جانب دیکھا اور اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”اس طرف ایک کارگو آفس ہے۔ حاجی عثمان نامی آدمی کا ایک منشی امان اللہ موجود ہوگا۔ وہی تمہیں بتا سکتا ہے۔ وہ وہیں بیٹھا نظر تو آرہا ہے۔ جا کر معلوم کرلو۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس سمت بڑھ گیا۔ ایک وسیع احاطے میں ”حاجی گڈز“ کا آفس نظر آیا۔ میں قدم اٹھاتا ہوا وہاں پہنچا۔ باہر چھپر تلے دو کرسیاں اور دو مونڈھے دھرے پڑے تھے۔ ان پر ایک ہی شخص بیٹھا نظر آیا۔

میں نے اس کے قریب پہنچ کر سلام کیا۔ وہ ملیشیے کے کپڑوں میں تھا اور [illegible] کے پنچے میں [illegible] تھی۔ اس کی گود میں ایک رجسٹر کھلا پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر موٹے سیاہ فریم کی عینک لگی ہوئی تھی۔ میں نے اسے سلام کیا تو اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

”مجھے آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔ آپ شاید حاجی صاحب کے منشی ہیں؟“ میں نے کہا۔

اس نے غور سے میرا سرتاپا جائزہ لینے کے بعد مجھے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

”کیا پوچھنا ہے؟ کوئی مال وال لے جانا ہے؟“ اس نے کہا۔

”نہیں، مجھے ایک ٹرک کی تلاش ہے۔“ میں نے فوراً مطلب کی بات کر ڈالی۔ ”دس وھیلر ٹرک ہے، سیاہ کیبن والا—— جو تھوڑے ہی دنوں پہلے یہاں سے گزرا ہوگا۔“ کہتے ہوئے میں اس کا چہرہ غور سے تکنے لگا۔ وہ بولا۔

”بھائی! تم ہو کون اور اس ٹرک کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”میرا مال ابھی تک نہیں پہنچا۔“ مجھے اس سوال کی توقع تھی اسی لیے فوراً جواب دیا تھا۔ ”تین من کماد اور بیس فروٹ کی پیٹیاں آنا تھیں گھر سے۔“

”اچھا!“ اس کے منہ سے برآمد ہوا۔ ”بلٹی یا کوئی رسید وغیرہ ہے؟“ اس نے دریافت کیا۔

”وہ تو نہیں ہے۔ میرے بڑے بھائی صاحب کے پاس ہے۔ انہوں نے ہی کہا تھا کہ کسی قریبی گڈز سے پتا کرلوں۔“

”نہیں بھائی! ایسے نہیں پتا چلے گا۔“ منشی نے نفی میں سر ہلا کر صاف کہہ ڈالا۔ ”بلٹی نمبر بتاؤ۔ رسید بک کا سیریل نمبر دیکھ کر ہی بتایا جاسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ کسی اور گڈز سے گیا ہو۔“ اس کے لہجے سے ہی نہیں، اب چہرے سے بھی بیزاری ٹپکنے لگی تھی۔

”اچھا جی پھر میں بھائی صاحب سے لے کر آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دوبارہ اپنی گود میں رکھے رجسٹر پر جھک گیا۔

میں ذرا دور چلا گیا۔ ادھر اُدھر دیکھنے لگا پھر ایک قریب کھڑے دس وھیلر ٹرک کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں ایک میری عمر کا لڑکا بمپر پر چڑھا ٹرک کی ونڈ اسکرین چمکانے میں

مصروف تھا۔ اس ٹرک کا ڈرائیونگ کیبن سرخ رنگ کا تھا۔

"او بھائی! ذرا نیچے اترو گے۔ ایک بات پوچھنا تھی۔" میں نے اس سے کہا۔ اس کا ہاتھ رک گیا اور مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا پھر بولا۔

"ہاں ..... ہاں، بولو...... کیا بات ہے؟ میں سن رہا ہوں۔" وہ بدستور ونڈ اسکرین پر کپڑا پھیرتے ہوئے بولا۔

میں نے اسی طرح اپنا چہرہ اوپر کیے ہوئے اس سے وہی دریافت کیا جو تھوڑی دیر پہلے منشی سے کیا تھا۔

اس نے بھی نفی میں سر ہلا دیا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ دو تین اور ٹرک ڈرائیورز وغیرہ سے اس سیاہ کیبن والے ٹرک کے بارے میں دریافت کیا مگر سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

اس پر میں قدرے مایوسی کا شکار ہونے لگا۔

میں نے ذہن پر زور دیا کہ یہ بھی ضروری نہ تھا کہ راحیلہ، فوزیہ سے بچھڑنے اور ٹرک کے روانہ ہوتے ہی جاگ گئی ہو۔ کیا خبر وہ کافی دیر گئے تک سوئی رہ گئی ہو اور بھٹاوان اور جمال دین والی سے آگے ہی جا کر کہیں اس کی آنکھ کھلی ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ٹرک کے ڈرائیور نے ہی اسے سوتے میں دھر لیا ہو۔ بہت سی باتیں ایسی تھیں جنہیں خارج از امکان نہیں کیا جا سکتا تھا۔

لہٰذا یہ ضروری بھی نہ تھا کہ راحیلہ کا بھٹاوان اور جمال دین والی کے درمیان میں ہی کہیں پتا لگ سکتا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے بھوسے میں سوئی تلاش کرنا۔ اگرچہ ٹرک کا کلیو کسی حد تک مل گیا تھا۔ امکانی خدشات بھی سامنے تھے۔

اسی لیے پہلے میں بھٹاوان اور جمال دین والی کے درمیان راحیلہ کو تلاش اور سیاہ کیبن والے دس وھیلر ٹرک کی بابت اچھی طرح پوچھ گچھ کر لینا چاہتا تھا۔ اس کے بعد ہی آگے کا رخ کرتا۔

میں نے اللہ سے اپنی کامیابی کی دل ہی دل میں دعا مانگی اور پھر ایک لاری میں سوار ہو کے بھٹاوان کی جانب روانہ ہو گیا۔ نصف گھنٹے میں بھٹاوان کے قریب پہنچ کر میں اتر گیا۔

اس کے بعد کچھ طویل سفر یہاں سے پھلاں وتی اور چک جھمرہ کی جانب تھا اور پھر صادق آباد کا وہی علاقہ شروع ہو جاتا جو چودھری جی برادران کی جاگیر تھا۔

بھٹاوان میں میں نے پیٹرول پمپ، گیراج، چھپرے ہوٹل، روڈ سائڈ سرائے نما ہوٹل کے علاوہ سب چھان مارا۔ سیاہ کیبن والے ٹرک کے بارے میں پوچھا مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ البتہ ایک پمپ بوائے نے مجھے سیاہ کیبن والے ٹرک کے بارے میں اتنا ضرور بتایا کہ ایک دس وھیلر سیاہ کیبن والا ٹرک ڈیزل بھروانے کے بعد فوراً ہی آگے روانہ ہو گیا تھا۔ اس کا رخ جمال دین والی روڈ کی جانب تھا۔

اس کی بات سن کر امید کے بجائے میری مایوسی بڑھنے لگی۔ ظاہر ہے میں جمال دین والی سے ہی تو آ رہا تھا۔ وہاں سے اس ٹرک کا کوئی کلیو نہیں ملا تھا۔ اب درمیان میں کوئی ایسا دیہات یا اڈا یا ایسی کوئی جگہ دیکھنے میں مجھے نہیں آئی تھی کہ جدھر ٹرک کے رکنے اور راحیلہ کے موقع تاک کر اتر جانے کی امید ہوتی۔ ماسوائے بھٹاوان اور جمال دین والی کے۔

یہ بھی ممکن تھا کہ بھٹاوان میں راحیلہ ٹرک سے نہ اتر سکی ہو۔ وہ سوئی رہی ہو کیونکہ فوزیہ کے مطابق جب وہ فطری حاجت کے لیے تھوڑی دیر کے لیے ٹرک سے نیچے اتری تھی تو راحیلہ بہت گہری نیند سو رہی تھی۔ ٹرک بھی ذرا دیر کے لیے ہی پھلاں وتی کی بیرونی حدود میں کہیں ویرانے میں رکا تھا۔ اس کے بعد وہ اچانک روانہ ہو گیا تھا اور فوزیہ اس میں دوبارہ سوار نہ ہو سکی تھی۔ یوں وہ پھلاں وتی میں بھٹکتی رہ گئی۔

اسی مذکورہ پمپ بوائے سے میں نے سیاہ کیبن والے ٹرک کے بارے میں کرید کرید کر یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ یہاں سے ڈیزل بھروانے کے بعد کتنی دیر رکا تھا یا اس نے سرائے ہوٹل میں اسٹے وغیرہ کیا تھا؟ اس نے نفی میں سر ہلا کر پورے یقین سے بتایا تھا کہ ٹرک ڈیزل بھرواتے ہی فوراً آگے روانہ ہو گیا تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ ٹرک جمال دین والی میں بھی نہیں رکا تھا اور سیدھا آگے روانہ ہو گیا تھا ورنہ جمال دین والی میں مجھے اس کے بارے میں ضرور پتا چلتا۔

یہاں راحیلہ کی موجودگی خارج از امکان جاننے کے بعد میں دوبارہ جمال دین والی جانے والی مسافر لاری میں سوار ہو گیا۔

تھکا ہارا میں دوبارہ جمال دین والی اترا تو اب شام سر پہ آ چکی تھی۔ میں نے ہوٹل میں چائے پی اور تھوڑی دیر بیٹھ کر سفر کی تکان اتاری۔

اب میرا بار بار یہاں آنا بھی کسی کو خوامخواہ ہی شبے میں ڈال سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے خود کو ذرا سڑک کی دوسری جانب والے حصے میں محدود رکھا تھا۔

یہاں سے میں نے کسی سے پوچھا کہ جمال دین والی سے آگے کون سے قریبی اور چھوٹے بڑے علاقے پڑتے ہیں تو معلوم ہوا پہلا دیہات کوٹ نظام آتا ہے۔ اس کے

بعد ایک بڑا علاقہ بہاالدین قریشیاں اور پھر یہی سڑک آگے چلی جاتی ہے۔

ظاہر ہے، مزید مجھے کسی بھلے مانس آدمی نے بڑی اہم بات بھی بتائی۔ یہ ایک ٹائر پنکچر شاپ والا عمر رسیدہ آدمی تھا۔ جب اس نے مجھ سے یہ پوچھا۔

"باؤ جی! آخر آپ کو اس ٹرک کی تلاش کیوں ہے؟ کیا اس کا ڈرائیور کوئی ایکسیڈنٹ کر کے بھاگا ہے؟"

"نہیں چاچا! یہ بات نہیں۔" میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ مجھے اس کا انداز اچھا لگا تھا اسی لیے میں نے اسے قریب ترین بات بتاتے ہوئے کہا۔

"اس ٹرک کا ڈرائیور تو آپ کی طرح ہی ایک بھلا مانس آدمی تھا۔ اس نے مجھے لفٹ دی تھی۔ میرے ساتھ میرا نوعمر بھتیجا بھی تھا۔ کسی وجہ سے میں نیچے اترا تو وہ اسی میں رہ گیا۔ اب سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ میں اسے کیسے اور کہاں تلاش کروں؟"

"اوہ یہ بات ہے۔" عمر رسیدہ آدمی کچھ سوچ کر بولا۔ "پھر میرا پکا خیال ہے کہ وہ ٹرک اگر نہیں رکا تو پھر آگے کوٹ نظام میں تو ضرور ہی رکا ہو گا۔"

"یہ آپ کیسے اتنے یقین سے کہہ سکتے ہیں؟"

"اس لیے باؤ جی کہ وہ تو ایک چھوٹا سا قصبہ اور یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں۔ یہی کوئی پندرہ سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہو گا۔ وہاں دراصل ایک بڑا ٹرک اسٹاپ ہے جدھر کانٹا (باربرداری والا وزن اسکیل) بھی ہے۔ تمام ٹرک زیادہ تر اور کافی دیر کے لیے وہیں رکتے ہیں۔ کیا خبر وہاں سے تجھے اس سیاہ کیبن والے دس وھیلر کا کچھ اتا پتا مل جائے کیونکہ وہ ٹرک جمال دین والی میں نہیں رکتے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ کافی دیر پھر ادھر ضرور رکتے ہیں۔"

مجھے اس کی بات اور قیاس آمیز مشورے پر بڑی امید بندھی۔ وہ ایک بڑا پرانا پنکچر لگانے والا تجربہ کار شخص تھا۔ وہ ان گاڑیوں کی آمدورفت اور ان کے معمولات کے بارے میں ٹھیک ٹھیک اندازہ رکھ سکتا تھا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ پہلے میرا ارادہ آج کی رات ادھر ہی گزارنے کا تھا اور صبح ہی کچھ کرنے کو تھا لیکن ایک کلیو ملتے ہی مجھ سے پھر بیٹھا نہ گیا۔ میں اسی وقت روانہ ہو گیا۔

رات سر پر تھی اور اس وقت کوئی مسافر لاری تو نہ ملی البتہ قریب دیہاتوں اور قصبات میں چلنے والی ویگنیں اور سوزوکی گاڑیاں ضرور چلا کرتی تھیں۔ میں ان میں سے ایک میں سوار ہو کے بالآخر نصف گھنٹے میں کوٹ نظام پہنچ ہی گیا۔

رات پوری طرح اتر چکی تھی۔ یہ واقعی ایک چھوٹا دیہاتی علاقہ تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ روڈ سائڈ کا علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں کچھ معمولات کی شبینہ رونقیں نظر آ رہی تھیں۔ باقی اندر آبادی تاریکی میں مستغرق نظر آتی تھی۔

روڈ سائڈ کے چند ایک چھپرا اور سرائے ہوٹل کھلے تھے۔ سرائے ہوٹل بھی کیا تھے، اینٹوں اور گارے مٹی سے بنی بوسیدہ عمارت جس کے میدانی احاطے میں لکڑی کی میزیں اور بنچیں رکھی تھیں۔ کچھ چارپائیاں بھی بچھی نظر آئیں۔ اندر برآمدہ تھا۔ پیچھے بڑا سا مستطیل ہال اور اندر دری بچھائی گئی تھی۔ اس پر پرانے بستر ڈال دیے گئے تھے اور تکیے تھے۔ ٹرک ڈرائیورز اور دیگر لوگ یہاں رات گزار کے صبح دم آگے بڑھ جاتے تھے۔

بتانے کا مقصد یہ تھا کہ میں تسلی کر لینا چاہتا تھا کہ رات گزارنے کا یہاں خاطر خواہ نہ سہی گزارے لائق بندوبست تھا یا نہیں۔ اب یہ دیکھ کر تسلی ہو گئی تھی۔

روڈ پر ہونے کے سبب ہلکے اور بھاری ٹریفک کی... آمدورفت جاری تھی۔ ایک پیٹرول پمپ، قریب ایک مسجد اور چھپرا سرائے ہوٹل...... سڑک کی دوسری جانب ایک وسیع و عریض میدان میں مجھے بڑا سا ٹرک اڈا دکھائی دیا۔ وہاں کہیں کہیں دائیں بائیں کونوں میں ایک جانب فروٹ کی پیٹیاں، بوریاں اور کینوس تھیلوں کے ڈھیر رکھے نظر آئے۔

لگ بھگ کوئی سات آٹھ کے قریب باربرداری کے ٹرک بھی کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے اس طرف قدم بڑھا دیے۔ جب ذرا نزدیک پہنچا تو ایک ٹرک جو ذرا آخر میں اور کچھ فاصلے پر پیچھے کی جانب کھڑا تھا، اسے دیکھتے ہی میں بری طرح چونک پڑا۔

وہ سیاہ کیبن والا دس وھیلر ٹرک تھا......

☆☆☆

اپنے مطلوبہ ٹرک کو دیکھتے ہی یکلخت میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ یہ وہی سیاہ ڈرائیونگ کیبن والا دس وھیلر ٹرک تھا جس کی تلاش میں، میں صبح سے خوار ہو رہا تھا جو بالآخر مجھے مل گیا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اس پنکچر والے کا شکریہ ادا کیا تھا جس نے اپنے ٹھیک ٹھیک تجربے کی روشنی میں مجھے درست راہ سجھائی تھی۔

میں نے چند لمحے وہیں کھڑے ہو کر اطراف کا جائزہ لیا۔ اڈے پر رات کا سناٹا طاری تھا۔ چند ایک آوارہ کتے ادھر ادھر مٹرگشت کر رہے تھے۔

اسی وقت سڑک کی جانب سے دو گاڑیوں کی تیز ہیڈ لائٹس ابھریں۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا اور ذرا سائڈ پر ہو گیا۔ ایک کار اور دوسری جیپ تھی۔
کار کو تو دیکھتے ہی میں جیسے اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ اس کار کو میں پہچان گیا تھا۔ یہ قرمزی رنگ کی ٹویوٹا پلاٹز تھی۔ شالاجی کے بھائی دراب جی کی گاڑی...... جبکہ دوسری جیپ اس کے پیچھے تھی۔ اس میں اس کے مسلح گماشتے بیٹھے تھے۔ جیپ چونکہ بغیر ہڈ کی تھی اور اس میں چار پانچ افراد بیٹھے دور سے ہی نظر آرہے تھے البتہ کار کے اندر بیٹھے افراد کی تعداد کا اندازہ یہی ہو پایا کہ اس میں تین آدمی تھے۔ تاریکی اور کچھ فاصلے کی وجہ سے میں ان کی شکلیں صحیح طور پر نہ دیکھ پایا تھا البتہ دراب جی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ کار میں ڈرائیور کے برابر والی نشست پر براجمان تھا۔
وہ دونوں گاڑیاں سڑک کی دوسری جانب بنے چھپر چائے خانے کی جانب مڑ گئی تھیں۔
دشمنوں کے گویا ایک پورے "دستے" کو یہاں موجود پاکر میرے دل کی دھڑکنیں یکدم تیز ہو گئی تھیں۔ ان لوگوں کو یقیناً میرے سلسلے میں کوئی کلیو یا ایسا سراغ ملا ہوگا کہ انہیں میری یہاں آس پاس موجودگی کی اطلاع ملی ہو یا پھر ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ ابھی ادھر ہی ذرا ٹھہرنے اور چائے وغیرہ پینے کے بعد آگے نکل جائیں۔
میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کسی طرح ان کے قریب پہنچ کر ان کی گفتگو سنی جائے۔ کام خطرناک اور رسکی تھا۔ اس پر ابھی میں غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک ایک تیز سی مردانہ آواز پر میں چونکا۔ آواز عقب سے ابھری تھی۔
"کون ہو بھائی؟ یہاں کیوں کھڑے ہو؟"
میں پلٹا تو سامنے ہی ایک لمبا مگر چھریرے جسم کا آدمی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹارچ اور ایک ڈنڈا تھا۔ شانوں پر چادر، سر پر ٹوپی، چہرے پر گھنی مونچھیں اور ہلکی داڑھی تھی۔ اس کی عمر پینتیس چالیس سال معلوم ہوتی تھی۔ یہ شاید یہاں چوکیدار تھا۔
میں نے اسے سلام کیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور مجھے بدستور استفسار طلب نظروں سے گھورتا رہا۔ گویا جلد اپنا جواب چاہتا ہو۔
"بھائی! میں ایک مسافر ہوں۔ بہت پریشان حال۔ کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟"
"مدد...... کیسی مدد؟" وہ مجھے گھور کر سوالیہ بولا۔
"مجھے اس ٹرک کے ڈرائیور سے ملنا ہے۔" میں نے مطلوبہ ٹرک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ "وہ جو...... ذرا پیچھے کی جانب کھڑا ہے، سیاہ رنگ کا......"
چوکیدار نے سرسری سی نظر اس ٹرک پر ڈالی پھر اسی طرح شک بھری نظروں سے دوبارہ مجھے گھورتے ہوئے سوالیہ بولا۔
"اس وقت سارے ڈرائیور سوئے پڑے ہیں۔ تم یہاں سے جاؤ۔ میں یہاں چوکیداری کرتا ہوں۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو کسی بھی الزام میں تمہیں پکڑ لوں گا۔" اس کا لہجہ آخر میں درشت ہو گیا۔
"بھائی! غصہ کیوں کرتے ہو؟" میں نے ذرا نرم ہو کر کہا۔ "میں نے بتایا نا میں ایک پریشان حال مسافر ہوں۔ مجھے اس ٹرک کے ڈرائیور سے بہت ضروری ملنا ہے۔"
"اوئے، تارے! وہاں کیا کر رہا ہے؟ تیری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ آجا جلدی......" اچانک دائیں جانب لگے ایک چھپر تلے سے آواز ابھری۔ ہم دونوں نے بیک وقت اس طرف دیکھا۔
وہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اینٹوں کے عارضی سے چولہے پر ایک شخص جست کی بڑی سی کیتلی اٹھا کر چارپائی کے قریب پڑے لکڑی کے اسٹول پر رکھ رہا تھا۔
"آؤ، میرے ساتھ۔" تارے نامی اس چوکیدار نے مجھ سے کہا اور اسی جانب چل دیا۔ میں اس کے پیچھے ہو لیا۔
اس نے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"یہ کون ہے؟" کیتلی والے نے تارے سے پوچھا۔ وہ آگ بجھا چکا تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر تارے ٹمٹمارہے تھے۔ موسم اچھا تھا۔
"کہتا ہے، ایک ڈرائیور سے ملنا ہے، بہت ضروری۔ آج صبح سے اس کی تلاش میں ہے۔" تارے نے اسے بتایا۔ کیتلی والے نے میری طرف دیکھا پھر لکڑی کے اسٹول پر رکھی دو پیالیوں میں چائے انڈیلتے ہوئے بولا۔
"اس ڈرائیور کا کوئی نام تو ہوگا؟"
"نام بھی اسے معلوم نہیں اور کبھی اسے دیکھا بھی نہیں۔" تارا ہلکی طنزیہ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے کیتلی والے سے بولا۔ "وہ سامنے والا ٹرک ہے نا، بس یہی اسے یاد ہے۔" اس نے آخر میں سیاہ کیبن والے ٹرک کی جانب اشارہ کیا۔
کیتلی والے نے اس طرف دیکھا پھر بولا۔ "یہ تو چھیمے کا ٹرک ہے۔ وہ اس کے اندر ہی سو رہا ہے۔"
"اچھا!" میرے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ وہ دونوں چائے پینے لگے اور میری جانب بھی تکنے لگے۔
"آخر معاملہ کیا ہے صاحبو؟" کیتلی والے نے میری جانب دیکھ کر پوچھا۔
بالآخر میں نے انہیں بھی وہی آدھے سچ اور آدھے جھوٹ والی کہانی سنادی جو چھپر والے کو سنائی تھی۔ ادھر مجھے دوسری جانب دشمنوں کی موجودگی کی بھی فکر کھائے جارہی تھی مگر یہ کام بھی ضروری تھا۔
"اوہ...... یہ تو بڑا او کھا معاملہ لگتا ہے۔" چوکیدار تارا بولا۔ اس کا لہجہ اور انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ جان بوجھ کر معاملے کو حساس اور پریشان کن بنانے پر تلا ہوا ہو۔
اس پر کیتلی والے دوست نے ہنستے ہوئے اسے جھڑک دیا۔ "اوئے تارے! یہ بے چارہ پہلے ہی پریشان ہے۔ کیوں اس نوجوان کو پریشان کرتا ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے دوستانہ لہجے میں بولا۔
"اوئے نوجوانا! ذرا صبر کر۔ چائے پی لے۔ میں خود چھیمے کو ادھر ہی بلا لاتا ہوں۔ خود ہی تم پوچھ لینا۔"
"تمہارا بہت شکریہ بھائی!" میں نے ممنون بھرے لہجے میں اس سے کہا۔ اس نے جلدی جلدی اپنی چائے ختم کی اور پیالی جھٹک کر کیتلی سے گرما گرم چائے دوبارہ اس میں انڈیل کر میری جانب بڑھا دی۔
"لے پی۔ پریشان نہ ہو بھائی! میں ابھی اسے لاتا ہوں۔" کہتے ہوئے وہ اٹھ کر ٹرک کی جانب بڑھ گیا۔ میں چائے پینے لگا۔
مجھے تارے چوکیدار سے زیادہ بھلا مانس لگا یا پھر شاید چوکیدار اپنی ڈیوٹی کے تئیں مجھ سے ایسا سلوک روا رکھے ہوئے تھا کیونکہ ابھی تک اس نے مجھے کچھ خاص پریشان تو نہیں کیا تھا۔
چائے پیتے ہوئے میری نظریں اسی جانب اٹھی رہیں۔ میں نے دیکھا، وہ بھلا مانس آدمی سیاہ کیبن والے ٹرک کے قریب پہنچا۔ پہلے ٹرک کے دروازے پر ہتھڑ مار کر اسے بجایا اور ساتھ ہی آوازیں بھی دینے لگا۔
"چھیمے...... اوئے چھیمے......! ذرا باہر آ۔"
ذرا دیر بعد ہی کیبن کا دروازہ کھلا۔ اکثر کسی ٹرک کی سیٹ کے عقب میں قدرے اوپر سونے کے لیے ایک برتھ بنی ہوتی ہے۔ چھیما شاید وہیں سو رہا تھا۔ چھیما نامی وہ آدمی نیچے اتر کر اس بھلے مانس شخص سے ذرا دیر تک جماہیاں لیتے ہوئے کچھ باتیں کرتا رہا۔ وہ بھلا آدمی جس کا نام بعد میں مجھے شکورا معلوم ہوا، میری جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے کچھ بتاتا رہا۔
پھر وہ دونوں اسی طرف بڑھنے لگے۔ ڈرائیور بہت ہی دبلا پتلا اور درمیانے قد کا آدمی تھا۔ چہرہ لمبوترا اور قوی ڈھیلے ڈھالے تھے حالانکہ اس کی عمر زیادہ نہ تھی۔
مجھے حیرت ہوئی کہ اس قدر دبلا پتلا آدمی بھلا اتنے بھاری بھرکم دس وہیلر ٹرک کو چلاتا کیسے ہوگا؟
وہ دونوں قریب آچکے تھے۔ چوکیدار تارا چلا گیا تھا۔ اب چھیما، شکورا اور میں...... ہم تین ہی رہ گئے۔
شکورے نے چھیمے کو بھی چائے پیش کر دی۔ وہ آدھی پیالی بچی تھی۔ چھیما میری جانب عجیب عجیب نظروں سے گھورے جاتا اور ابھی تک مجھ سے کچھ بولا بھی نہیں تھا تاہم میں نے ہی پہل کرتے ہوئے اس سے ذرا اسلام دعا کی اور اس کے آرام میں خلل پر معذرت کرنے کے بعد اپنا مطمح نظر بیان کر دیا۔
مجھے اس کی کیفیات بھانپنے کی ضرورت ہی نہ پڑی جو اس قدر واضح تھیں کہ وہ چونکے بنا نہ رہ سکا تھا بلکہ اس کے ہاتھ میں تھمی ہوئی چائے کی پیالی بھی تھوڑا لرزی تھی۔
"کیا؟ میرے ٹرک میں کوئی چوری سے سوار ہوا تھا؟" چھیمے نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور میری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اس کا جوابی ردعمل ہی ایسا تھا کہ اسے واقعی کچھ نہیں معلوم تھا اور اب پتا چلا تو اس کے جیسے فرشتے کوچ کر گئے تھے۔
وجہ ظاہر تھی کہ کوئی بھی ڈرائیور یہ نہیں پسند کرتا کہ اس کے باربرداری والے ٹرک میں کوئی چوری چھپے سوار ہو۔ اس میں چوری کا خطرہ ہوتا ہے۔
"اوئے چل اسے چھوڑ، اب یہ بتا اس کڑی کو دیکھا تھا تو نے یا نہیں؟" شکورے نے اسے ٹوک دیا۔
"دیکھ لیتا تو ادھر ہی اس کی گردن نہ دبوچ لیتا۔" چھیما مجھے تلخ نظروں سے گھورتے ہوئے شکورے سے بولا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا کہ اسے اپنی پڑ گئی تھی۔
"اوئے شکورے! اسے تو پکڑ کے رکھ...... میں ذرا ایک فون کر کے پوچھ لوں کہ جو مال میں نے جاگیردار اللہ وسایا کے ڈیرے پر اتارا ہے وہ پورا ہے کہ نہیں۔"
"او بیٹھ ادھر آرام نال......" شکورے نے اسے ڈانٹ دیا۔ اس کا بازو پکڑ کر چارپائی پر بٹھا دیا۔ "بھولا رہے ذرا۔ چوری کی ہوتی تو اب تک ڈیرے پر ہاں ہاں ہو چکی ہوتی۔"
اب میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا تھا لیکن میں پھر بھی ضبط سے کام لے رہا تھا اور اس سے تحمل مگر ٹھنڈی ہوئی

شناخت سے بولا۔

"دیکھو، چھیما بھائی! نہ میں چور ہوں نہ میری بہن۔ وہ مصیبت کی ماری بھاگی تھی۔ میں اس کی تلاش میں ہوں۔ تم مجھے بتاؤ گے کہ پھلاوتی اور چک جھورا کے بعد تم کہاں رکے تھے؟"

"ابھی بتایا تو ہے، نظام کوٹ میں زمیندار اللہ وسایا کے ڈیرے پر۔" اس نے چاروناچار جواب دیا۔

"ابھی تمہارا ٹرک خالی ہے؟"

"ہاں، وہاں کوئی نہیں۔"

"اللہ وسایا کا ڈیرا کتنی دور ہے یہاں سے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے مجھے بتادیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اسی دوران چھیمے نے ایک اور انکشاف کیا۔

اس نے مجھے بتایا کہ جب وہ اللہ وسایا کے ڈیرے پر مال "ان لوڈ" کروا رہا تھا تو اسے ڈالے کے اندر سے ایک زنانہ جوتی ملی تھی۔ جس پر اسے حیرت تو ہوئی تھی مگر اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی تھی۔

میں نے فوراً بے چینی سے اس سے وہ جوتی دکھانے کی درخواست کرڈالی۔ وہ سستی دکھا رہا تھا مگر بھلا ہو شکورے کا۔ اس نے اسے وہ جوتی لانے کا کہا۔ چھیما چلا تو میں بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ ڈالے میں گیا اور جوتی اوپر سے ہی میری جانب پھینکی جسے میں نے فوراً اپنے دونوں ہاتھوں سے کیچ کرلیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ جوتی کو ذرا روشنی میں کرکے بغور اس کا جائزہ لیا تو بری طرح چونک پڑا۔

راحیلہ کی جوتی میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میں نے شدید کرب سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ گویا راحیلہ کوٹ نظام میں ہی کہیں موقع پاکر اتر گئی تھی۔ بالخصوص اس وقت جب ٹرک زمیندار اللہ وسایا کے ڈیرے پر ان لوڈ ہو رہا تھا۔

چھیما بڑبڑاتا ہوا اپنے ٹرک کی جانب چلا تو میں نے شکورے سے کہا۔

"یار بھائی! کیا میں تھوڑی دیر اس منجی پر بیٹھ سکتا ہوں؟"

"او باؤ جی میری اکھاں ٹھار ہوں (میری آنکھیں ٹھنڈی ہوں) ضرور بو جی۔" شکورے نے فوراً دوستانہ محبت سے کہا اور میں اس بھلے مانس آدمی کا شکریہ ادا کرکے بیٹھ گیا۔

"میرا تو خیال ہے کہ تمہاری بہن ٹرک سے اتر کر اللہ وسایا کے ڈیرے پر ہی کہیں اتر گئی ہوگی اور پھر وہیں کہیں اس نے پناہ لے لی ہوگی۔" شکورے نے مشورہ دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ جوتی والے معاملے پر اس نے بھی وہی اندازہ لگایا جو میرا تھا۔

"میرا تو خیال ہے تو فوراً پولیس کو خبر کردے۔" وہ بولا۔

اب میں اسے کیا بتاتا کہ پولیس اور دشمنوں سے تو ہم خود بچتے بچاتے پھر رہے ہیں۔ تاہم میں نے اس کے مشورے اور اس کے حسنِ سلوک کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے مجھے یہی کرنا پڑے گا۔ تیری وڈی مہربانی یارا!"

میں اٹھ کر سڑک کی طرف آگیا۔ راحیلہ کا سراغ مل گیا تھا۔ وہ اللہ وسایا کے ڈیرے کے کہیں آس پاس ہی تھی مگر کہاں؟ کس گھر میں پناہ لے رکھی تھی اس نے؟ اس کا مجھے پتا چلانا باقی تھا۔

یہی میرے لیے بڑی خوشی کی بات تھی کہ اس کا کہیں سے تو تقریباً ٹھیک ٹھیک سراغ ملا تھا مجھے۔

اسی وقت میرا دھیان ایک بار پھر دشمن کی ان دونوں گاڑیوں کی طرف چلا گیا جو مین روڈ سے اتر کر چھپرنما چائے خانے کی جانب مڑ گئی تھیں۔

میرا ارادہ پہلے اسی وقت رات کی تاریکی میں اندر آبادی کی جانب رخ کرنے کا تھا جو کھیتوں کے ایک وسیع سلسلے کے پار قائم تھی اور وہیں زمیندار اللہ وسایا کا ڈیرا تھا لیکن اب چونکہ مجھے کسی حد تک تسلی ہو چکی تھی اسی لیے سوچا، پہلے ضروری یہ تھا کہ دشمنوں کی یہاں آمد اور روانگی کے بارے میں تسلی کرلی جائے۔

یہ سوچ کر میں سڑک پار کرکے سامنے کے رخ پر آنے کے بجائے کچی پکی دیواروں کے عقب سے قدرے کچے میں، جدھر ہینڈ پمپ، مسجد اور چھوٹی موٹی عمارتوں کی دیواریں قائم تھیں، ان کی آڑ لیتا ہوا چائے خانے کے قریب آیا تو یہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا کہ کار تو غائب تھی مگر بغیر ہڈ والی جیپ ہنوز وہیں کھڑی نظر آئی۔

وہیں نہیں احاطے میں بچھی دو چارپائیوں پر چار افراد بھی بیٹھے دکھائی دیے۔ وہ چائے پی چکے تھے اور اب بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ دو نے گاؤ تکیے رکھ کر پشت ٹکا رکھی تھی۔

مجھے ان میں گگل کی موجودگی کا خدشہ تھا مگر وہ نہ تھا جبکہ اس کا ساتھی منیرا تو نادو کی فائرنگ سے ہلاک ہو گیا تھا اور گگل بری طرح زخمی...... وہ یقیناً ابھی بسترِ علالت پر ہوگا جس طرح ان کا گرو گھنٹال شالا جی تھا مگر اس کا چھوٹا بھائی دراب جی موت کے فرشتے کی طرح اپنے گماشتوں سمیت میری تلاش میں یہاں تک بھی آ پہنچا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ راجن پور نہ پہنچ جائے جدھر نادو اور فوزیہ تھیں۔ اگرچہ

میں نے دونوں کو ہی وہاں بھی محتاط رہنے کی سختی سے تاکید کر رکھی تھی۔ بختیارے کو بھی اس سلسلے میں، میں نے ہدایت دے رکھی تھی۔

یہ چاروں بے شک دراب جی کے گماشتے سہی لیکن میرے دیکھے بھالے نہیں تھے...... لیکن نہیں میں غلطی پر تھا۔ دو کی وضع قطع میں پہچان کر اس بری طرح ٹھٹکا تھا کہ میری رگوں میں گردش کرتا خون یکلخت جیسے تھم گیا۔ گویا ایک لمحے کی سی کیفیت تھی میں ان چاروں میں سے دو اپنے جیسے نوجوان ٹاپ لڑکوں کو دیکھتا رہ گیا۔ یہ بھی بھلا بیٹھا کہ اگر ان کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو مجھے اس طرح اپنی طرف یک ٹک گھورتا پاکر وہ چونک تو ضرور جاتے۔ اگرچہ فوری طور پر مجھے وہ دونوں شاید میرے چہرے سے پہچاننے سے قاصر ہی رہتے۔

وہ دونوں...... سلیم چھالیا اور راجو بوری تھے......

☆☆☆

ان دونوں خبیثوں کی ان کے ساتھ موجودگی نے میرے بدترین اندیشوں کی تصدیق کرڈالی کہ جرائم پیشہ تنظیم کے باس اقبال اور "چودھری بی برادران" ایک ہی موجوڑ کے مالک تھے۔

دراب جی تو شاید کہیں نکل گیا تھا اور اپنے گماشتوں کو یہاں چھوڑ گیا تھا۔ اب یہ لوگ کس نیت سے یہاں رکے تھے، نیز سلیم چھالیا اور راجو بوری کا کراچی سے یہاں پہنچ جانا چہ معنی دارد؟ یہ مجھے دیکھنا تھا۔

تاہم ان دونوں کو یہاں پاکر میرے لیے خطرات میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ تب میں نے بھی فیصلہ کرلیا کہ یہ دونوں اب میرے سامنے آئے تو میں انہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔ جنگ ہے تو جنگ سہی۔

رات اور لوگوں کی غیر موجودگی کے سبب میں ان کے قریب نہیں بیٹھ سکتا تھا ورنہ دیگر عام مقامی لوگ بھی ہوتے تو میں ان میں رل مل کر بیٹھ کر ان کی گفتگو سن سکتا تھا۔ یہ کام اب مجھے چھپ کر کرنا پڑ رہا تھا۔

رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں چھپرے کے بانس تلے ایک ایسی آڑ میں آگیا جدھر سے کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑسکتی تھی اور میں ان کی بچھی ہوئی چارپائیوں کے قریب بھی تھا۔

ایک نے کھانستے ہوئے کہا۔ "سویرا ہونے میں ابھی دو ڈیڑھ گھنٹا باقی ہے۔ کیوں نہ جب تک ایک ایک پیالی چائے اور پراٹھا بنوا کر کھا لیا جائے؟"

دوسرے نے اس کی تائید کرڈالی اور ساتھ ہی بولا۔ "ان دونوں سنگی ساتھیوں سے پوچھ لو، کیا دل چاہ رہا ہے ان کا؟"

اس کا اشارہ ساتھ بیٹھے سلیم چھالیا اور راجو بوری کی طرف تھا۔

"جو دوستوں کی مرضی لیکن سچی بات ہے، اس وقت میرے دل و دماغ میں بس یہی سمایا ہوا ہے کہ سہراب کی ایک ذرا جھلک نظر آجائے مجھے اور میں اس کا ادھر ہی قصہ پاک کرڈالوں۔"

سلیم چھالیا کی آواز آخری جملہ ادا کرتے ہوئے ایک بھیڑیے جیسی غراہٹ میں بدل گئی تھی۔

"جب سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہمارا ازلی دشمن سہراب علی ادھر ہی کہیں موجود ہے، خود مجھے بھی چین نہیں مل رہا۔" یہ راجو بوری تھا۔ اس کا لہجہ بھی مجھے آتشِ انتقام اور دشمنی کی آگ میں تپا ہوا محسوس ہوا۔

"ہمیں جیسے ہی باس نے بتایا کہ شالا جی کا فون آیا تھا تو انہوں نے ہمیں فوراً صادق آباد روانہ کردیا تھا۔"

"یہ سہراب لگتا ہے تم لوگوں کا بڑا ہی خطرناک دشمن ہے؟" دراب جی کے ایک گماشتے نے پوچھا۔

"خطرناک بھی اور غدار بھی۔ باس (اقبال) کا حکم ہے کہ اسے دیکھتے ہی گولی ماردی جائے۔" سلیم چھالیا ان سے کہہ رہا تھا۔

"پر شالا جی اور دراب جی تو سہراب کو زندہ پکڑنا چاہتے ہیں۔ بڑا لمبا حساب کتاب نکلتا ہے اس پر اپنے چودھری صاحبان کا۔" دوسرے گماشتے نے کہا۔

سلیم یا راجو نے کوئی تبصرہ نہ کیا تو پہلا والا گماشتہ بولا۔

"ویسے ایک ہی بات ہے۔ اپنے چودھری برادران بھی اسے کہاں زندہ چھوڑیں گے۔ تڑپا تڑپا کر اور ایک ایک بوٹی الگ کردیں گے اس کی۔"

"ہوں......" سلیم چھالیا کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔

اتنے میں چائے والا آگیا۔

ان کی باتیں سن کر میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھری۔

"تم دونوں کی اپنی موت تمہیں کراچی سے یہاں کھینچ لائی ہے سلیم......! وہ وقت جلد آنے والا ہے۔" میں اندر ہی اندر غضبناک انداز میں بڑبڑایا تھا۔

یہاں جتنے بھی روڈ سائڈ ہوٹل ہوتے ہیں، خواہ وہ چھپر ہی ہوں، بیشتر رات گئے تک کھلے رہتے ہیں کیونکہ یہاں ٹرکوں کی آمد و رفت ہر وقت جاری رہتی ہے اور ڈرائیور حضرات یہاں تھوڑی دیر کھانے پینے کو رکتے ہیں۔

انہوں نے بیرے کو چائے پراٹھے تیار کرنے کا کہا۔

"یار کاکے! یہاں کی آبادی تو بہوتی (بہت) لگتی ہے۔ کئی دستیاں (بستیاں) اور گاؤں ملے جلے ہیں۔ آخر ہم ان کو کہاں تک اور کب تک تلاش کریں گے؟"

"یہی میں بھی سوچ رہا تھا۔" دوسرے نے نیم تائیدی انداز میں کہا۔ "اب دیکھو نا، خود چھوٹا چودھری بستی کالا روالی اور کسی کام تک گیا ہے۔ وہاں سے وہ پھر ادھر کا رخ کریں گے۔ جب تک ہمیں ان دونوں سروں کا کوئی نہ کوئی سراغ لگا لینا چاہیے۔"

"اوئے، ہمارے پاس کوئی جادو کا چراغ تھوڑا ہی ہے کہ رگڑیں گے اور جن بابا حاضر ہو کر ہمیں سب بتا دے گا۔" پہلے والے کی طنزیہ آواز ابھری۔

"پر اب چھوٹے چودھری کو ادھر ہی کا سراغ لبھا (ملا) ہے۔ وہ اب یہاں پورے علاقے کو کھنگال کر ہی چھوڑے گا۔"

اسی وقت کہیں سے ایک آوارہ کتے کی جوڑی اٹکھیلیاں کرتی اس طرف آ گئی اور مجھے دیکھ کر وہ بھونکنا شروع ہو گئے۔ میں فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔

میں ان کی گفتگو سے بہت سی باتوں کا اندازہ لگا چکا تھا۔ بات وہی تھی جو میں پہلے ہی وراب جی کو دیکھ کر سمجھ چکا تھا کہ انہیں میری یہاں کہیں موجودگی کے کچھ شواہد ملے تھے اور اب مزید ان کی باتوں سے مجھے یہی اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کا ابھی کچھ دن ادھر ہی ڈیرا ڈالے رہنے اور تلاش وغیرہ کا سلسلہ جاری رہے گا۔

بہرحال یہ میرے لیے تشویش کی بات تھی کیونکہ ایسے میں جبکہ راحیلہ کی ادھر موجودگی کا مجھے سراغ بھی مل گیا تھا، یہ لوگ بھی یہاں منڈلانے چلے آئے تھے۔

کوئی میں یا راحیلہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ سکتے تھے۔ یوں اب میں ایک طرح سے دہری پریشانی کا شکار ہونے لگا تھا۔ راحیلہ کو بھی مجھے اسی جگہ تلاش کرنا تھا اور یہ لوگ بھی ادھر ہی موجود تھے۔ گویا بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔

میں اگرچہ بھیس بدل کر اپنا چہرہ کافی حد تک تبدیل کر چکا تھا اور فوری طور پر یہ لوگ مجھے پہچاننے سے قاصر رہتے مگر ظاہر ہے ایسا زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا تھا۔

مجھے سویرا پھیلنے کا انتظار نہیں کرنا تھا لہٰذا یہی سوچ کر میں بالآخر اندھیرے میں آبادی کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

ہر سو گھور تاریکی اور دم بخود سناٹے کا راج تھا۔ رات کے آخری پہر کی بھی اپنی اسراریت ہوتی ہے اور پھر دور دراز دیہات کا یہ نیم جنگلی علاقہ...... اس پر مستزاد خطرناک اور جانی دشمن بھی سر پر آن پہنچے تھے۔

اب ہر قدم مجھے پھونک پھونک کر رکھنا تھا۔ دشمنوں میں ہماری یہاں موجودگی کی بھنک پڑ چکی تھی۔ یہ کم تشویش ناک بات نہ تھی۔

میں کھیتوں کے درمیان بنے بل کھاتے پگڈنڈی نما راستے پر چلا جا رہا تھا۔ تاروں بھرے چمکتے آسمان کی روشنی اتنی پڑ رہی تھی کہ مجھے آگے بڑھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں تھا۔ رات کے ایسے پہر اور وقت میں کسی آبادی کا رخ کرنا عجیب ضرور تھا لیکن یہ میری مجبوری تھی ورنہ تو میں نے یہی سوچا تھا کہ سویرا ہوتے ہی آبادی کا رخ کروں گا مگر اب دشمنوں کو ٹرک کی جانب پا کر میں وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ وہاں میری نظروں میں آ جانے کا خطرہ ہوتا۔

کھیتوں سے ہوتا ہوا ایک آدھ میل پیدل چلتے ہوئے بالآخر میں آبادی میں پہنچ گیا۔ پو پھٹنے لگی تھی۔ لوگ بیدار ہونے لگے تھے۔ کچے پکے گھروں کے صحن سے دھواں اٹھتا دکھائی دیا۔

موٹر سائیکلوں پر دودھ کے کنستر لٹکائے ہوئے چند سوار گزرے اور مجھے دیکھ کر دیہات کے روایتی ماحول کے پیش نظر بہ آواز بلند "السلام علیکم" کہہ کر آگے بڑھ جاتے۔ میں بھی جواب دے دیتا۔

گدھا گاڑیاں اور بیل گاڑیاں بھی دکھائی دینے لگی تھیں۔ قریب کہیں مسجد میں مؤذن کے اذان دینے کی روح پرور آواز گونجنے لگی۔ ساتھ ہی چکی کی مخصوص روایتی آوازیں بھی ابھریں۔

اطراف میں کچھ کچھ سویرا پھیلنے لگا تھا۔ نو دمیدہ سپیدی لیے آسمان پر کہیں کہیں ٹمٹماتے تارے عجیب اور طلسماتی منظر پیش کر رہے تھے۔ خوشگوار سی نرم ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ غرضیکہ صبح بڑی شد و مد کے ساتھ بیدار ہونے لگی تھی۔ گاؤں کافی گھنا تھا یعنی درختوں، جنگل، جھاڑیوں اور کھیتوں کی بھرمار نظر آتی تھی۔ پختہ و نیم پختہ گھروں کی بے ترتیب قطاروں کے درمیان میں بل کھاتے کچے دھول اڑاتے کچھ تنگ سے راستے تھے۔

میں نے روایتی انداز کی دیہاتی چادر کو اچھی طرح اپنے کاندھوں پر اس طرح ڈال رکھا تھا کہ بہ وقت ضرورت دشمن نظر آتے ہی چہرہ چھپا سکوں۔ اگرچہ میں نے اپنا

بہروپ بدل رکھا تھا پھر بھی احتیاط کا تقاضا یہی تھا۔

پینٹ شرٹ تو میں نے مختیارے کے گھر پر ہی چھوڑ دی تھی اور اس کی جگہ شلوار قمیص پہن لی تھی جو میرے لمبے چوڑے وجود پر بھلی لگ رہی تھی۔

میں آبادی میں پہنچ چکا تھا۔ میرا ارادہ زمیندار اللہ وسایا کے ڈیرے پر جانے کا تھا کیونکہ بقول جھیمے کے، ٹرک وہیں رکا تھا اور وہیں اسے راحیلہ کی گری ہوئی جوتی ملی تھی۔

دیہاتی طرز کی دکانیں بھی کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ ایسے ہی ایک دکان والے سے میں نے اللہ وسایا کے ڈیرے کا راستہ پوچھا تھا اور اب میں اسی طرف کو چلا جا رہا تھا۔

ایک سائیکل سوار قریب سے گزرا تو اس بھلے مانس نے مجھے پیچھے کیریئر پر بیٹھنے کی اخلاقاً دعوت دے ڈالی۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے اچھل کر بیٹھ گیا۔ اس بے چارے کو میرے وزن کے سبب زیادہ زور لگانا پڑا تو میں راستے میں اتر گیا۔ ڈیرا آبادی سے ذرا ہٹ کر جنوبی سمت میں تھا۔ اس طرف مجھے سرخ پختہ اینٹوں کے کشادہ گھروں کی تعداد زیادہ نظر آئی۔ یہ شاید چھوٹے موٹے زمینداروں کے گھر تھے۔ باہر چند جیپیں اور موٹر گاڑیوں کے علاوہ گھوڑے بھی بندھے نظر آئے۔ کہیں کہیں نئے ماڈل کی موٹر سائیکلیں بھی کھڑی تھیں۔

ایک بل کھاتا راستہ کاٹ کر میں کشادہ جگہ پر آ گیا۔ سامنے نظر پڑی۔ وہاں ایک بڑی سی مستطیل عمارت نظر آئی جس پر تازہ تازہ رنگ کیا ہوا محسوس ہوا۔ وہاں ایک ٹریکٹر، ٹرالی سمیت موجود تھا۔ بلیڈز بھی رکھے نظر آئے۔ ایک پرانے ماڈل کا ٹرک بھی کھڑا تھا۔ تین چار چارپائیاں اور سرکنڈوں کے مونڈھوں پر چند ایک لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

میں ان کے قریب جا پہنچا اور سلام کیا۔ ان لوگوں نے خوش اخلاقی سے جواب دیا اور مجھے بیٹھنے کے لیے مونڈھا پیش کر دیا پھر چائے کا پیالا تھمایا اور کھانے پینے کو پوچھا تو میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا اور بولا۔

"مجھے ٹرک ڈرائیور جھیمے کی تلاش تھی۔ سنا ہے وہ یہاں آیا تھا؟" میں نے دانستہ اس کا ذکر کیا۔

"آہو، آیا تو تھا۔" ایک نے کہا۔ "پر وہ تو راتی (رات کو) مال اتار کر چلتا بنا تھا۔"

"اوہ اچھا......!" میں نے چونکنے اور پریشان ہونے کی ایکٹنگ کی۔

"تم ایسا کرو، وہ ابھی سڑک والی سرائے میں ٹھہرا ہوا ہوگا۔ وہیں اسے ڈھونڈو ورنہ نکل جائے گا آگے۔" پہلے والے نے مشورہ دیا۔

"اوہ...... اچھا ٹھیک ہے۔ آپ کا شکریہ۔"

میں نے کہا اور واپس ہو لیا۔ میں نے اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ جھیما یہاں آیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اگر راحیلہ ان لوگوں کو نظر آئی ہوتی تو یہ ضرور اس کا ذکر مجھ سے کرتے۔

میں کسی امید پر دو تین چکر ڈیرے کے آس پاس لگاتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔

راحیلہ اسی گاؤں میں موجود تھی۔ کہاں اور کس کے پاس اس بے چاری نے بے سروسامانی کے عالم میں پناہ لے رکھی تھی، اس کا پتا چلانا مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں۔

دن دھیرے دھیرے طلوع ہو رہا تھا۔ دھوپ نکلنے لگی تھی۔ زندگی پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ بیل گاڑیاں اور دو ایک تانگے بھی آتے جاتے دکھائی دیے۔

میں گھروں کی درمیانی گلیوں میں بظاہر بے مقصد اور کسی آوارہ گرد کی طرح گھومتا پھر رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک گلی سے شور شرابے کی آواز سنائی دی۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ شادی کا ہنگامہ تھا۔

اس شور و شغب میں ڈھول اور نفیریوں کی بھی آوازیں نمایاں تھیں اور کبھی ایک آدھ بار کسی مسافر لاری کے ہارن کی بھی آواز سنائی دے جاتی۔

میں اس گلی سے نکل کر بازو والی گلی کی جانب مڑ گیا۔ وہاں ایک بڑے سے گھر کے سامنے چمک والی گول ڈبا بس کھڑی تھی۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔

لڑکے والوں کی برات لگتی تھی اور شاید دلہن لینے کے لیے دوسرے شہر یا دیہات جانے کے لیے تیار تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے خوشیاں مناتے اور گانے گاتے بس میں سوار ہو رہے تھے۔ کچھ افراد بس کی چھت پر بھی چڑھ رہے تھے۔

بس روانگی کے لیے تیار تھی۔ لگتا یہی تھا کہ سفر لمبا ہے ورنہ اتنی صبح روانگی کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ گھر کو بھی رنگ برنگی جھنڈیوں اور برقی قمقموں سے سجایا گیا تھا۔

بس کے آگے ایک رنگین جھنڈیوں سے بھی سنوری ہوئی بڑی سی کار بھی کھڑی تھی۔

میں سر جھٹک کر ابھی آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک چونک پڑا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ اطراف میں کھڑے دیگر مقامی دیہاتیوں کے ہجوم سے ایک جوان سی لڑکی برآمد ہوئی۔ اس نے سر پر بڑی سی چادر اوڑھ رکھی تھی جو خاصی میلی کچیلی ہو رہی تھی اور یہی نہیں، اس کے لباس کی بھی کم و بیش یہی

حالت تھی۔

وہ تیزی سے برات والے ہجوم میں شامل ہو کر بس میں سوار ہونے لگی تو ایک موٹی سی زرق برق لباس میں ملبوس عورت نے اسے سخت جھاڑ پلاتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

''اے فقیرنی! تُو کیوں سوار ہو رہی ہے؟ دیکھ نہیں رہی ہے کہ یہ براتیوں کی بس ہے۔ چل دفع ہو۔ جو مانگنا ہے باہر کھڑی ہو کر مانگ۔''

میں جب تک یہ عجیب تماشا دیکھنے کے لیے قریب آ چکا تھا۔ لڑکی نے منہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔ اس سے بولی۔

''میں بھکارن نہیں ہوں۔ مصیبت کی ماری ہوں۔ خدا کے لیے مجھے بس میں سوار ہو لینے دو۔''

مجھے یہ آواز سن کر ایک جھٹکا لگا۔ ہاں، میں اس آواز کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ راحیلہ تھی۔

''اری چل، تُو، تو اپنے حلیے سے ہی بھکارن نظر آتی ہے یا گھروں میں کام کرنے والی مائی...... چل ادھر سے......'' وہ بڑی بی خاصے غصے وار لہجے میں ہاتھ نچا کر راحیلہ سے بولی اور اسے دھکا بھی دیا۔

تب تک میرے قدم راحیلہ کی جانب بڑھ چکے تھے۔ جس طرح کا میں نے اپنا حلیہ بنا رکھا تھا، مجھے یقین تھا وہ مجھے فوری طور پر نہیں پہچان پائے گی۔ ساتھ ہی مجھے بڑی بی پر غصہ بھی آیا۔ جی تو کیا کہ اسے کھری کھری سناؤں مگر وہاں براتیوں کا پُرجوش ہجوم تھا۔ وہ سب میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے اور فی الوقت میں ایسے نازک حالات میں خواہ مخواہ ہی مقامی لوگوں سے پنگے بازی کے موڈ میں نہیں تھا۔

''راحیلہ......! میرے ساتھ آؤ۔'' میں اس کے قریب آتے ہی بولا اور ساتھ ہی اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ وہ میری آواز پہچان کر ایک لمحے کے لیے سن سی ہو کر رہ گئی۔ خود میری اپنی کیفیت دگرگوں تھی۔ یہی کیفیت راحیلہ کی مجھ سے سامنا کر کے ہوئی۔

وہ بے اختیار ''سہراب'' کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ لوگوں نے سرسری نگاہ ہم پر ڈالی تھی اور اس بڑی بی نے بھی...... اس کے بعد وہ اپنے ہنگامے میں مشغول ہو گئے۔

میں راحیلہ کو جلدی سے ہجوم سے دور لے گیا۔

''تم...... مجھے یقین نہیں آ رہا ہے، سہراب! یہ تم ہی ہو نا؟'' وہ ہانپنے والے انداز میں بولی۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔

''ہاں، راحیلہ! یہ میں ہی ہوں اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمہیں بالآخر میں نے ڈھونڈ نکالا ہے۔'' میں نے اس سے ازراہِ تشفی کہا۔ ''لیکن راحیلہ! اب تم جلدی سے خود کو سنبھالو کیونکہ اس وقت بھی ہم شدید قسم کے خطرے سے دوچار ہیں۔''

میں نے خبردار بھی کیا۔ وہ بولی۔ ''میں ٹھیک ہوں لیکن فوزیہ......؟''

''اسے بھی ڈھونڈ چکا ہوں......'' اور پھر میں نے مختصر ترین لفظوں میں اسے سب بتا دیا۔

ہم براتی ہجوم سے کافی فاصلے پر ایک کیکر کے درخت کے نیچے کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک میں نے وہی بغیر ہڈ والی جیپ دیکھی جس پر سوار ہو کر دراب جی، اس کے دو گماشتے اور سلیم چھالیا وغیرہ یہاں تک آئے تھے۔ میرا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔

وہ لوگ جیپ کے اندر بیٹھے بیٹھے ہی ان سے کچھ پوچھ رہے تھے اور تب ہی اسی بڑی بی نے ہاتھ کے اشارے سے ہماری جانب اشارہ کر دیا۔

یکلخت میری رگوں میں دوڑتا ہوا لہو سیماب بن گیا۔

''بھاگو راحیلہ......!'' کہتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ دبوچ لیا اور ایک جانب دوڑ لگا دی۔

اس کے ساتھ ہی مجھے عقب میں جیپ کے زوردار ایکسلریٹر دینے کی آواز بھی سنائی دی۔ وہ ہمارے پیچھے لگ چکے تھے۔ میرے پاس ان چاروں ہتھیار بند خطرناک دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے فقط ایک چاقو تھا۔ میں اور راحیلہ دیہات کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں دوڑتے رہے۔ جیپ مسلسل ہمارے تعاقب میں تھی۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم اب ان کے نرغے سے زیادہ دیر تک نہیں بچے رہ سکتے تو میں نے بالآخر پینترا بدلنے کا ارادہ کیا۔

ہم اب کیکر اور سرکنڈوں کے جنگل میں آ نکلے تھے۔ یہاں درمیان میں پگڈنڈی نما راستہ تھا۔ یہ اندازہ ضرور تھا کہ کوئی بھی گاڑی اس پر سے بہ آسانی گزر سکتی تھی۔

اسی وقت ایک فائر ہوا۔ راحیلہ کے حلق سے چیخ نکلی۔ میں دہل گیا مگر شکر تھا کہ وہ ٹھیک تھی۔ گولی ہوا ہو گئی تھی۔ میں یکدم مٹی کے تودہ نما ٹیلے کی آڑ میں راحیلہ کو لے کر آ گیا اور خود چاقو نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

''اب یہاں سے بالکل حرکت مت کرنا۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں ٹیلے کی ڈھلوانی آڑ لیتا ہوا اس جگہ پر آیا جدھر سے مجھے اندازہ تھا کہ جیپ یہاں آ کر رکے گی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ ان لوگوں نے ہمیں اس ٹیلے کی آڑ لیتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔

جیپ رکی اور وہ چاروں دھڑ دھڑاتے ہوئے نیچے اتر آئے۔ گماشتوں کے ہاتھوں میں تو رائفلیں تھیں جبکہ سلیم چھالیا اور راجو بوری کے ہاتھوں میں پستول نظر آ رہے تھے۔

وہ چاروں یکدم ٹیلے کو گھیرے میں لینے کے لیے تیزی سے پھیلنے لگے۔ راحیلہ کو اب ان کے شکنجے میں جانا ہی تھا لیکن بہرحال مہلت مجھے بھی درکار تھی کہ یہ لوگ ایک دوسرے سے، خواہ تھوڑے ہی فاصلے سے جدا ہوں تو میں ان میں سے ایک پر قابو پا سکوں۔ کچھ سوچ کر ہاتھ میں پکڑا ہوا چاقو میں نے دوبارہ اپنی پنڈلی میں لگا دیا۔

یوں میرا فوری طور پر سامنا ایک گماشتے سے ہوا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنی رائفل سیدھی کرنا چاہی تو میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اسے نیچے گراتے ہی میں نے اس کی گن پر قبضہ جما لیا۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ وہ ابھی اس کی کوشش میں ہی تھا کہ میں نے رائفل لاٹھی کی طرح گھما کر اس کا بٹ گماشتے کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ اس نے وہیں اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔

اسی وقت مجھے راحیلہ کی چیخ سنائی دی۔ میں چونک پڑا۔ یہ لوگ میرے جانی دشمن تھے۔ میں جانتا تھا کہ ایک بار ان کی گرفت میں چلا گیا تو مجھ سے زیادہ یہ لوگ راحیلہ کا برا حشر کریں گے۔

بھی ...... کہ راحیلہ کی چیخ نے مجھے مزید غضبناک کر ڈالا تھا۔ میں طوفانی ...... کی طرح اس جانب پلٹا ہی تھا کہ چونک پڑا۔ ...... سامنے راجو بوری اور ایک گماشتہ ہتھیار ...... تھے۔

''ہتھیار پھینک دو۔'' گماشتے نے غراتے ہوئے مجھ سے کہا۔ راجو بوری کے چہرے پر سناٹے اترے ہوئے تھے۔ کسی حوالے سے وہ بھی شاید پہچان چکا تھا کہ میں ان کا وہی بچپن کا پرانا یار سہراب ہوں جس نے کبھی ان کی طرح جرائم کی راہ اختیار کرنے کی کوشش کی تھی مگر پھر ان سے میں نے اپنی راہیں جدا کر لی تھیں۔ انتقام، دکھ اور ایک ناقابلِ بیان تاسف ہم دونوں کی آنکھوں میں جیسے ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔

''ہرگز نہیں۔'' میں نے بھی خونی نظروں سے ان کی جانب گھورتے ہوئے کہا۔ ''میرے راستے میں آنے کا تم حشر دیکھ چکے ہو۔''

''مگر اب کوئی فائدہ نہیں اس کا، سہراب!'' اچانک ایک شناسا آواز میرے دائیں جانب سے ابھری۔ میں ان

دونوں پر کڑی نظریں جمائے ہوئے، گن تانے چند قدم پیچھے ہٹا تو وہ میرے سامنے آگیا۔

سلیم چھپا ہوا تھا اور اس نے راحیلہ کو دبوچ رکھا تھا۔ ساتھ ہی اپنے پستول کی خوفناک نال بھی اس مردود نے راحیلہ کی کنپٹی کے ساتھ چپکا رکھی تھی۔

"سلیم......!" میں حلق کے بل چیخا۔ "راحیلہ کو چھوڑ دے ورنہ تیرا بہت برا حشر کروں گا۔" میں نے اس کی طرف لہو رنگ نظروں سے گھورتے ہوئے تنبیہ کی۔

وہ ایک شیطانی قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا۔ "تیرے خون کی بو سونگھتا ہوا تو میں کراچی سے یہاں تک پہنچا ہوں سہراب! تم بے بس ہو چکے ہو اب۔ ہتھیار پھینک دو ورنہ راحیلہ کا بھیجا پار کر ڈالوں گا۔"

مجھے سلیم کے خونخوار لہجے میں انتقام کی تپش ہی نہیں بلکہ زخمی سانپ کی پھنکار بھی صاف محسوس ہوئی۔ وہ جو کہہ رہا تھا، کر بھی سکتا تھا۔ میں نے گن پھینک دی۔ اس کے مکروہ چہرے پر بڑی زہرخند مسکراہٹ ابھری۔

وہ اپنی فتح اور میری شکست خوردگی پر حظ اٹھانے والے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں نے پہلے ہی باس اقبال سے کہہ دیا تھا کہ تمہیں صرف میں ہی قابو کر سکتا ہوں۔"

"راحیلہ کو چھوڑ دے سلیم!" میں نے سپاٹ مگر ایک بڑے طوفان کی آمد والے سکوت زدہ لہجے میں کہا۔

"چھوڑنا تو تم دونوں کو نہیں ہے۔ اب یہ بتاؤ اس لکو کی بہن اور تمہاری محبوبہ فوزیہ کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟"

میری خونی نظریں بدستور اس پر جمی ہوئی تھیں۔ راحیلہ اس کے شکنجے میں دبی ہوئی تھی۔ میں نے استہزائیہ مسکراہٹ سے کہا۔

"اتنے بھولے مت بنو سلیم! صادق آباد میں تمہارے باس کی دوست جماعت چودھری برادران نے ہمارا راستہ کھوٹا کیا تھا۔ یہ دونوں تب سے ہی غائب کر دی گئی تھیں اور میں انہیں تلاش کرتا رہا تھا۔" میں نے کچھ جھوٹ اور سچ کا سہارا لیا۔

"کیا مطلب؟" وہ الجھ گیا۔

"راحیلہ کے بعد مجھے فوزیہ کی تلاش میں دوبارہ صادق آباد کے اس علاقے کا رخ کرنا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"تو فوزیہ تمہارے ساتھ نہیں ہے؟" سلیم نے غیر یقینی لہجے میں کہا۔

"ہوتی تو میرے ساتھ تمہیں نظر آجاتی۔"

"یہ جھوٹ بول رہا ہے سلیم بھائی!" وڈا صاحب کے گماشتے نے فیصلہ کن لہجے میں میری جانب گھورتے ہوئے اس سے کہا۔ "وہ لڑکی یا اس کا کوئی اور ساتھی ابھی تک ہماری گرفت میں نہیں آئے بلکہ الٹا انہوں نے وڈے چودھری کے گھر پر سیندھ لگانے کا ناقابلِ معافی جرم کیا ہے۔"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر زہرخند لہجے میں بولا۔ "اوئے یہ بتا، وہ چڑیل نادو کدھر ہے؟ وہ تو تیرے ساتھ ہی تھی۔ اپنے بھولے کے مرنے کے بعد تو ہی اسے لے کر بھاگا تھا۔"

"میرا اس سے کیا تعلق تھا بھلا؟" میں نے بے پروا انداز میں جواب دیا۔ "بعد میں میرے اور اس کے راستے جدا ہو گئے تھے۔"

"بکواس کرتا ہے کتے کے......" وہ میرے جھوٹ پر طیش کے مارے اچھل پڑا اور چند قدم آگے بڑھ کر اپنی گن کا بٹ میرے سر پر رسید کر دیا۔ تکلیف کے مارے میرے منہ سے اذیت ناک چیخ خارج ہوئی اور میں نے دانستہ خود کو لڑکھڑاتے ہوئے سلیم کے قریب قدموں میں گرا لیا اور جان بوجھ کر درد سے کراہنے لگا۔ راحیلہ نے مجھے تکلیف میں دیکھ کر چیخنا شروع کر دیا۔

سلیم فیصلہ کن لہجے میں اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا تھا کہ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ حرکت کی اور سلیم کی ٹانگ پکڑ کر زور سے کھینچی۔ وہ گرا اور میں نے اسی بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ چاقو نکال کر لیٹے لیٹے ہی اس کی دھار سلیم کی شہ رگ پر رکھ دی اور غرا کر اس کے ساتھیوں سے بولا۔

"خبردار......! کسی نے کوئی حرکت کی تو ذبح کر ڈالوں گا اسے۔" میرے لہجے کی گھن گرج نے راجو بوری اور گماشتے کو گویا یک ساکت کر کے رکھ دیا۔

ایک گماشتہ تو ابھی تک زمین پر انٹا غفیل پڑا ہوا تھا۔

"سہراب! استاد کو چھوڑ دے ورنہ بہت پچھتائے گا۔" راجو بوری غراتے ہوئے بولا مگر اس کی آواز میں بے بسی کا عنصر غالب تھا کیونکہ بھلا اس سے زیادہ میری خطرناکی کا اور کون اندازہ کر سکتا تھا۔

"بکواس بند کر راجو اور ہتھیار پھینک دے۔ مجھے اور راحیلہ کو یہاں سے نکلنا ہے اور بس۔" میں نے اس سے خطرناک لہجے میں کہا۔ "ورنہ تو جانتا ہے مجھے میں خون خرابے سے بھی اپنا مطلب نکالنے میں ذرا دیر نہیں لگاتا۔"

"کوئی اس کی بات نہ مانے۔" سلیم نے میرے نرغے میں دبے ہوئے ہونے کے باوجود کہا اور مجھے اس کی ڈھٹائی پر اپنی جنگ باز فطرت کی توہین محسوس ہوئی۔

"آہ......" سلیم کے حلق سے درد بھری کراہ خارج ہوئی۔ میں نے چاقو کی دھار اس کی گردن پر ہلکے سے چلا دی تھی۔ وہاں سے خون کی پتلی دھار نکل کر بہنے لگی۔

"اب بس، آخری موقع ہے۔" میں جنونی انداز میں اس بری طرح غرایا کہ راجو بوری کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس نے نہ صرف خود بلکہ گماشتے کو بھی گن پھینک دینے کا کہہ دیا۔ سلیم کو دوبارہ ڈھٹائی دکھانے کی جرأت اور ہمت نہ ہو سکی تھی۔

"اب دس قدم پیچھے چلے جاؤ......" میں نے انہیں دوسرا حکم صادر کیا۔ وہ پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے راحیلہ کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ بھی اب کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ اس نے لپک کر ان کی گنیں اٹھالیں۔ میں نے سلیم کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھے ہانپنے لگا۔ بے بسی اور طیش کے مارے اس کا چہرہ بری طرح مسخ ہو رہا تھا۔ میں نے اسے اسی طرح زمین پر لیٹے رہنے کا حکم دے رکھا تھا۔ اس نے پھر بھی ذرا حرکت کر کے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اپنا پیر اس کی گردن پر رکھ دیا۔ اس تذلیل پر وہ خونی بھیڑیے کی طرح غرا کر رہ گیا۔

میں راحیلہ کو لے کر فوراً ان کی جیپ کی طرف بڑھا۔ حسبِ توقع چابی اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اسٹارٹ کیا اور گیئر ڈال کر طوفانی رفتار سے دوڑاتا چلا گیا۔

راحیلہ میرے برابر میں سیٹ پر براجمان تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟" میں نے ونڈ اسکرین کے سامنے نیم پختہ راستے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ وہ کافی ہراساں تھی مگر اب خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ایک جگہ میں نے راحیلہ سے دونوں گنیں پھینک دینے کو کہا۔ وہ نہر کی پلیا تھی، جدھر سے گزرتے ہوئے راحیلہ نے دونوں گنیں پانی میں اچھال دیں۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" راحیلہ نے پوچھا۔

"راجن پور۔" میں نے جواب دیا اور رفتار بڑھا دی۔ جلد ہی ہم پختہ سڑک پر آ گئے اور میں نے راستے کا تعین کرتے ہوئے جیپ کی رفتار مزید بڑھا دی۔

میں جانتا تھا کہ دشمنوں کی یہ جیپ انہیں ہماری طرف متوجہ کرنے کا سبب بن سکتی تھی اسی لیے دریا والے پل سے پہلے میں نے جیپ ایک سنسان جگہ پر کیکروں کے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے ایک گڑھے میں لڑھکا دی۔

اب میں اور راحیلہ وہاں سے پیدل چلتے ہوئے دریا والے پل کی طرف آگئے جہاں سوزوکیاں اور تانگے کھڑے تھے۔ میں نے ایک تانگے کا انتخاب کیا اور سہ پہر تک ہم دونوں راجن پور میں تھے۔

☆☆☆

مختیارا گھر پر نہیں تھا۔ نادو اور فوزیہ موجود تھیں۔ مختیارے کی نو عمر بیٹی سوہنی بھی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی فوزیہ اور نادو خوشی سے کھل اٹھیں۔ فوزیہ اور راحیلہ تو ایک دوسرے سے لپٹ کر شدتِ جذبات سے رو پڑیں۔

"بڑا پالا مارا ہے تو نے شہزادے......!" نادو چہکتے ہوئے مسکرا کر مجھ سے بولی۔ اس کی آنکھوں میں توصیف اور لگاوٹ تھی۔

"ہمیں اب فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کہاں جاؤ گے تم تینوں؟" نادو نے سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

"سیالکوٹ۔" میں نے مختصراً کہا۔

"کچھ دن یہاں رہ لیتے، سوچنے سمجھنے کا وقت بھی تمہیں مل جاتا اور کیا خبر کوئی اور اس سے اچھا مشورہ مل جاتا۔"

"ہماری منزل شروع میں بھی وہی تھی اور اب بھی وہی ہے۔" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔

راحیلہ اور فوزیہ کا بھی یہی خیال تھا کہ اب ہمیں اپنی پرانی منزل کی جانب فوراً کوچ کر جانا چاہیے۔ نادو نہیں چاہتی تھی کہ ہم اتنی جلدی یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ اس کے خیال میں شاید چند دن رکنے سے کوئی اور اس سے زیادہ اچھی تجویز سجھائی دے جاتی لیکن اپنے حالات کا مجھ سے زیادہ اور کسے اندازہ ہو سکتا تھا لہٰذا اسی دن ہم روانگی کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ ہماری یہاں سے فوری روانگی کا یقین ہو جانے کے بعد نادو نے دکان سے مختیارے کو بلا لیا۔ اس نے بھی وہی کہا جو نادو ہم سے کہہ چکی تھی اور میرا جواب بھی وہی تھا۔

"لیکن دشمن اور پولیس تمہیں تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ تم ان کے ہتھے چڑھ سکتے ہو۔" مختیار تفکر سے بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ جو پولیس مجھے تلاش کر رہی ہے،

روڈی ہے۔" میں نے تلخ اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ بختیارا الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے مزید کہا۔

"وہ پولیس چودھری جی برادران سے ملی ہوئی ہے۔ خود چودھری جی برادران اپنے گھناؤنے جرم سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ مجھے کسی اور علاقے کی پولیس کے ہتھے چڑھنے نہیں دیں گے۔ ان کا مقصد اپنے علاقے کی پولیس کی مدد سے ہمیں پکڑوا کر جیل یا عدالت نہیں بلکہ چودھری جی برادران کے ہاں پہنچانا ہے۔"

چند لمحے توقف کے بعد پھر بولا۔ "اور پھر بختیار بھائی! ہم جب تک یہاں رہے، خود بھی خطرے سے دوچار رہیں گے اور بلاوجہ تمہارے اور نادو کے لیے بھی خطرات کا سبب بنے رہیں گے۔ تم بس ایک مہربانی اور کرو...... ہماری کسی طرح سیالکوٹ محفوظ روانگی کا بندوبست کردو۔ ہمیں آج ہی نکلنا ہوگا۔"

بختیارے اور نادو کو میری بات پر صاد کرنا پڑا تھا۔ گویا انہیں بھی حالات کی نزاکت اور فوری فیصلے کی ضرورت کا احساس ہو چلا تھا۔

میرا ارادہ اب ٹرین کے ذریعے جانے کا نہیں تھا بلکہ بائی روڈ کسی مسافر لاری پر سفر کرنا مجھے زیادہ بہتر اور قدرے محفوظ لگ رہا تھا لیکن نادو اور بختیارے کا مشورہ تھا کہ ہمیں موٹر کار کے ذریعے مظفر گڑھ اور پھر وہاں سے ملتان روڈ پر سفر کرتے ہوئے سیالکوٹ روانہ ہونا چاہیے۔ کچھ سوچ کر میں نے ان کی تجویز سے اتفاق تو کرلیا مگر اب مسئلہ کار کا تھا۔

"پھر تو کرائے کی کار یا ٹیکسی کا بندوبست کرنا پڑے گا؟" میں نے استفساریہ کہا۔

"نہیں، گاڑی اپنی ہونی چاہیے اور تم خود ڈرائیو کرکے اسے لے جاؤ گے۔" بختیارے نے کہا۔ شاید وہ اور نادو ہماری محفوظ روانگی کے سلسلے میں پہلے ہی ایک پلان بنا چکے تھے۔

"اپنی گاڑی؟" میں نے پھر سوالیہ نظروں سے بختیارے کی جانب دیکھا۔

"ہاں! ایک پرانے ماڈل کی کرولا ڈالسن کار گیراج میں کھڑی ہے۔ میرے استعمال میں بہت کم ہی رہتی ہے۔" وہ بولا۔ "مجھے ذرا ایک گھنٹا دو، میں اسے ورکشاپ لے جاکر تیار کروائے دیتا ہوں۔"

"لیکن اس کی واپسی؟"

"کوئی مسئلہ نہیں، زندگی رہی اور میرا یا میرے کسی آدمی کا سیالکوٹ آنا ہوا تو منگوا لوں گا۔ نہ بھی منگوائی تو خیر ہے۔ وہ کون سی لاکھوں کی گاڑی ہے۔ یہ [illegible] کی تو ہے۔"

"تمہاری بڑی مہربانی بختیار بھائی۔" میں نے اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اس نے مسکرا کر سر جھٹکا اور قریب موجود نادو سے بولا۔

"تم ایسا کرو ان کے سفر کے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان تیار کردو، میں تب تک مکینک کے پاس سے ہوکر آتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ نادو ہمارے لیے کھانے پینے کی چیزیں تیار کرنے لگی۔ فوزیہ اس کی مدد کررہی تھی۔ راحیلہ اور میں [illegible] سے بیٹھے آپس میں آئندہ کے لائحہ عمل پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔

گزرتا ہوا ایک ایک پل اندیشوں کی دھمک دیتا بیت رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی زلزلہ یا سیلاب آنے والا ہو۔ چودھری جی برادران کے گماشتے اور اب سلیم چھالیا اور راجو بوری کی آمد، حالات کو خطرناکی کی جانب ہی لے جاتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔

وہ ہمارا کھرا پاسکتے تھے۔ اس سے پہلے ہی میں فوزیہ اور راحیلہ کو یہاں سے نکال لے جانا چاہتا تھا۔

گھنٹے بھر بعد بختیارا گاڑی لے آیا اور اس کی چابی مجھے تھماتے ہوئے بولا۔

"پرانی ہونے کے سبب رفتار تو سے اور سو سے زیادہ تو نہیں مگر انجن ٹائٹ ہے۔ باقی میں نے انجن آئل اور فیول فل کروادیا ہے۔ یاد رہے، یہ ڈیزل انجن کی گاڑی ہے اور مضبوط باڈی ہے اس کی۔ ٹیوننگ وغیرہ بھی کروالی ہے، آگے رب راکھا۔"

نادو بے چاری نے ہمارے لیے پانی کی بڑی سی چھاگل نما بوتل بھردی تھی اور راستے کے لیے قیمے پراٹھے تیار دیے تھے۔

اتنے سے وقت میں یہ سب تیار کرنا بھی کم نہ تھا بلکہ بہت تھا۔ ہم ان دونوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے شام سات بجے روانہ ہونے لگے تو نادو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے باری باری بڑی محبت سے راحیلہ اور فوزیہ کو گلے لگایا اور پھر میرے قریب آگئی...... پھر میرے بھی گلے لگی۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی اپنا عزیز رشتے دار ہو۔

"رب سوہنا تم سب کی حفاظت کرے اور خیر خیریت سے تم لوگوں کو اپنی منزل تک پہنچائے۔ زندگی رہی تو دوبارہ ملیں گے۔"

"آمین۔" میں زیرلب بولا۔

"اور ہاں، سیالکوٹ پہنچتے ہی خیریت سے پہنچنے کی اطلاع کرنا مت بھولنا۔" نادو نے آخر میں کہا۔

اگلے بیس منٹ بعد ہم تینوں اس پرانی مگر جاندار کار میں راجن پور سے روانہ ہو چکے تھے۔

☆☆☆

میں نے دانستہ صادق آباد اور رحیم یار خان والا روٹ نہیں اپنایا تھا بلکہ انڈس ریور کے دوسری جانب راجن پور سے ڈیرہ غازی خان اور پھر اس کے بعد انڈس ریور کو مظفر گڑھ سے پار کرکے ملتان اور پھر سیالکوٹ کی جانب گامزن ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔

یہ اس احتیاط کے پیش نظر تھا کہ اول الذکر روٹ پر ہمارا دشمنوں سے مڈبھیڑ ہونے کا خطرہ نسبتاً زیادہ تھا۔ یہ ایک برانچ روٹ ہونے کے سبب [illegible] روڈ تھا۔ اسی لیے ٹریفک کم ہی تھا۔ راستے میں جنوبی پنجاب کے چھوٹے چھوٹے دیہات پڑتے تھے۔

صادق آباد اور رحیم یار خان والے روڈ سے سفر کرنا ہمارے لیے خطرے سے خالی نہ تھا۔ اسی لیے ہم نے یہ برانچ روٹ اختیار کیا تھا۔ اس کا مشورہ مجھے اس بھلے مانس آدمی بختیارے نے دیا تھا۔

ہم سات بجے روانہ ہوئے تھے۔ اب ایک گھنٹا بیت چکا تھا۔ کار کو میں درمیانی رفتار سے ہی چلا رہا تھا۔ راحیلہ میرے برابر والی سیٹ پر اور فوزیہ عقبی نشست پر براجمان تھی۔ وہ خاموش تھی البتہ میں اور راحیلہ موجودہ حالات پر تبادلہ خیال کرتے جارہے تھے۔ کبھی کبھی درمیان میں فوزیہ بھی شامل ہوجاتی۔

سیالکوٹ پہنچتے ہی ہمارا ارادہ سب سے پہلے سدرہ سے رابطہ قائم کرنے کا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے ہم نے دوران سفر قیمے کے پراٹھے رول کرکے کھائے اور پانی پیا۔

نو بجے چائے کی طلب ہوئی۔ ڈیرہ غازی خان کے ایک روڈ سائڈ ہوٹل میں کار روک کر ہم نے چائے پی۔ میں نے کار میں ڈیزل بھروایا اور پہیوں میں ہوا بھروائی۔ اس کے بعد ہم تقریباً پونے دس بجے روانہ ہوگئے۔ یہاں سے لگ بھگ پون گھنٹے بعد ہم نے انڈس ریور کو غازی گھاٹ برج سے پار کیا اور آگے روانہ ہوئے۔

گیارہ بجنے والے تھے اور فوزیہ عقبی نشست پر لیٹ چکی تھی۔ راحیلہ بھی تھوڑی دیر بعد کار کی نشست پر ذرا ایزی کرکے سوگئی۔

میں جنوبی پنجاب کے اندرونی دیہاتوں میں گاڑی چلانے کے ابتدائی تجربات سے ہی گزر رہا تھا۔

میں ابھی مظفر گڑھ کے قریب ہی تھا اور غازی گھاٹ سے گزر رہا تھا۔ یہاں آس پاس تاریکی اور اندھیروں میں ڈوبے جنگلاتی و نیم صحرائی علاقے تھے۔ کبھی کسی مسافر لاری یا باربردار ٹرک کا گزر ہو جاتا تھا۔

گل والا کے قریب کار کا ٹائر برسٹ ہوگیا۔ شکر تھا کہ اسپیئر وہیل موجود تھا۔ وہ میں نے پندرہ سے بیس منٹ میں تبدیل کرلیا اور پھر روانہ ہوگیا۔

اب میرا کہیں بھی رکنے کا ارادہ نہ تھا۔ سفر لمبا تھا اور میری کوشش تھی کہ جلد سے جلد آگے ہی نکلتا رہوں۔ یہاں تک کہ ... پانچ بجے وقت فجر میں خانیوال پہنچ گیا۔

یہاں اب میرا ابھی تھکن اور نیند سے برا حال ہورہا تھا۔ گاڑی پرانی تھی اس لیے بھی زیادہ ہی تھکن کا احساس ہورہا تھا۔

میں نے فوزیہ اور راحیلہ کو جگایا اور شہر کے وسط میں درمیانے درجے کا ہوٹل تلاش کرکے ایک بڑا سا فیملی روم لے لیا۔

میں ناشتا کرکے سوگیا۔ دن چڑھے جاگا تو راحیلہ اور فوزیہ مجھ سے پہلے جاگ چکی تھیں اور آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔

ہم نے دوپہر کا کھانا کمرے میں ہی منگوا کر کھایا۔ آگے ہمارا سفر طویل تھا، یعنی سیالکوٹ تک قریباً پانچ گھنٹے کا...... لیکن چونکہ ہمارے پاس گاڑی پرانی تھی اس لیے میں نے چھ سے سات گھنٹے کا اندازہ لگایا۔

چار بجے چائے پی کر ہم خانیوال سے روانہ ہوگئے۔ شکر تھا کہ موسم خوشگوار تھا ورنہ بغیر اے سی والی اس پرانی گاڑی میں ہمارا چار بجے سفر کرنا محال تھا۔

میں زیادہ سے زیادہ وقت بچانا چاہتا تھا اور رات تک سیالکوٹ پہنچ جانے کی دھن سوار تھی۔

رات ساڑھے دس بجے بالآخر ہم سیالکوٹ پہنچ گئے۔ سدرہ نے جس گھر کا ہمیں پتا بتایا ہوا تھا، ہم وہیں پہنچے تھے۔ مکان اچھا خاصا کشادہ نظر آرہا تھا اور بڑی سی گلی میں واقع تھا۔ دروازے پر دستک دینے پر ایک بوڑھے سے آدمی نے دروازہ کھولا۔

اپنے بارے میں بتانے کے بعد اس بوڑھے نے چونکا دینے والا انکشاف کیا۔ وہ یہ کہ سدرہ بھی اندر موجود تھی۔

☆☆☆

پہنچی
"چھوٹی بی بی آج شام ہی کراچی سے پہنچی ہیں۔" بوڑھے نے اندر آ کر بتایا۔ اس کا نام محمد تھا۔ وہ یہاں کا پرانا رکھوالا اور ملازم تھا۔ اس کی بیوی بھی تھی۔ دونوں بے اولاد تھے اور عرصے سے اس گھر کو سنبھالنے کی ذمے داری ان کے سپرد تھی۔ بیوی کا نام جنت تھا۔ وہ بھی ادھیڑ عمر تھی تاہم دونوں میاں بیوی صحت مند تھے اور پڑھے لکھے تھے۔

وہ ہمیں ڈرائنگ روم میں لے آیا تھا۔ اس کی بیوی بھی آ گئی۔ اس نے ہم سے کچھ کھانے پینے کا پوچھا۔ ہم نے تھوڑا بہت کھا پی تو لیا مگر ساتھ ہی سدرہ کے بارے میں بھی پوچھا۔ میرا خیال یہی تھا کہ وہ ہمارے یہاں پہنچنے کی منتظر تھی۔ ہمارے بارے میں شاید ان دونوں ادھیڑ عمر میاں بیوی کو اس نے پہلے ہی بتا رکھا تھا۔

"بی بی جی بہت تھکی ہوئی تھیں اور ان کی طبیعت بھی ٹھیک نظر نہیں آ رہی تھی۔" جنت نے بتایا۔ "آپ کہیں تو میں انہیں جگا دوں؟"

"نہیں، اب صبح ہی مل لیں گے۔" میں نے منع کر دیا۔

وہ رات ہم آرام دہ کمروں میں سوئے۔ صبح ناشتے کی میز پر سدرہ بے چینی سے ہماری منتظر تھی۔ وہی نہیں، ایک اور جانی پہچانی شخصیت کو بھی میں نے وہاں موجود پایا۔ یہ محمود تھا۔ سیٹھ سکندر مرحوم کا وفادار ملازم یا پی اے۔ ان کے اور وفادار آدمی سے بھی میں واقف تھا جس کا نام مشتاق تھا مگر وہ یہاں نہیں تھا۔

میں ہی نہیں راحیلہ اور فوزیہ بھی اسے دیکھ کر چونک گئے بنا نہ رہ پائیں۔ وہ خاصی پریشان اور ژولیدہ خاطر نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں میں تفکر و پریشانی کے سائے جیسے منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔

"شکر ہے خدا کا کہ تم لوگ بالآخر خیریت سے یہاں پہنچ گئے۔" اس نے کہا۔

"لیکن آپ کو کیا ہوا ہے سدرہ صاحبہ؟" میں نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔ ہم ناشتا بھی کرتے رہے اور باتیں بھی۔ محمود بھی چپ چپ سا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ میرے استفسار پر خاموش سی ہو گئی۔ مجھے اس کے چہرے اور آنکھوں سے مترشح تشویش کے سائے مزید گہرے ہوتے محسوس ہوئے۔

"کراچی میں تو سب خیریت ہے نا؟"

"نہیں۔" اس نے ہولے سے کہا۔

"آپ کچھ بتائیں تو سہی..... کافی پریشان اور تشویش زدہ نظر آ رہی ہیں آپ۔" میں نے بہ تشویش اترے اترے اور ستے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ راحیلہ اور فوزیہ بھی خاموشی سے متوجہ تھیں۔

"سہراب! میرا خیال ہے کہ ناشتے کے بعد ہم آرام سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" محمود نے ایک نظر سدرہ کے چہرے پر ڈالتے ہوئے ہلکی بار لب کشائی کی۔ میں چپ ہو رہا۔ میرے اندر ایک عجیب سا پریشان کن سا تجسس بے کل کیے رہا۔ اپنے طور پر پہلے تو یہی قیاس کیا کہ شاید ہمارے ساتھ اب تک پیش آئے ہوئے حالات کے سبب وہ کچھ سہمی ہوئی اور پریشان ہے لیکن تب بھی میری تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔

ناشتے کی میز سے اٹھ کر ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے تو میں سدرہ کے بولنے کا بے چینی سے منتظر رہا۔ اس نے کہنا شروع کیا۔

"سہراب! دشمنوں نے کراچی میں بھی ہمارے لیے انتہا عرصۂ حیات تنگ کر ڈالا ہے لیکن وہ مجھ سے زیادہ تمہیں اپنا جانی اور ازلی دشمن سمجھنے لگے تھے۔ ہم ہمارے خلاف کھلے بندوں تو کچھ نہیں کر پا رہے تھے اس لیے کہ انہوں نے اپنا ایک سانپ پہلے ہی ہمارے گرد حصار رکھا ہے اور وہی ہماری جڑیں کاٹ رہا ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں سدرہ صاحبہ! پلیز، ذرا کھل کر بتائیں۔" میں نے الجھ کر کہا۔

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "وہ زہریلا سانپ ہے جنہیں ماموں کہتے ہوئے مجھے شرم آ رہی ہے لیکن چند دن پہلے ہی مجھے علم ہوا ہے کہ وہ سگے نہیں بلکہ سوتیلا بھائی ہے۔"

"کیا؟" میں اس انکشاف پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ "یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"مما نے ہی بتایا تھا۔" وہ جواب میں بولی۔ "ابھی میری مما سے کچھ تفصیل سے بات ہوئی۔ اگرچہ مجھے یہ تو معلوم ہی تھا کہ نانا جان نے دو شادیاں کی تھیں لیکن یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ پہلی بیوی سے ان کی ایک ہی اولاد تھی، سجاد..... میری مما ان کی دوسری بیوی سے تھیں۔

"سجاد جب اٹھارہ سال کا تھا تو اس کی ماں کی وفات ہوئی۔ وہ اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا پھر اس کا دل نہیں لگا اور وہ چند سالوں کے لیے ملک سے باہر ہی رہا پھر کچھ عرصہ وہاں گزار کر وہ دوبارہ آ گیا۔ مما فطرتاً ایک محبت کرنے والی خاتون ہیں۔ سجاد ماموں کو بھی ان سے سگے بھائیوں والی محبت جتانا شروع کر دی تھی۔ وہ مما سے یہی کہتے تھے کہ زرین! تم مجھے سگی بہنوں کی طرح ہی عزیز ہو۔ ہماری ماں سوتیلی سہی مگر ہمارا باپ تو ایک ہی ہے......

"نانا کے انتقال کے بعد مما خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھیں۔ ڈیڈی ان کے کلاس فیلو تھے۔ وہ ان دنوں دادا جان کے اچانک انتقال کے بعد ان کے چھوٹے موٹے کاروبار کو پروان چڑھانے کے لیے کوشاں تھے اور کامیاب رہے۔

"سجاد ماموں نے ہی مما اور ڈیڈی کی شادی کے سارے انتظامات سنبھالے تھے۔ غرضیکہ مما اور ماموں دونوں اس طرح رہے کہ لوگوں کو احساس ہی نہ ہونے دیا کہ دونوں سگے نہیں بلکہ سوتیلے بھائی بہن ہیں..... بلکہ تو یہ سگے اور سوتیلے کی محبت کی اعلیٰ مثال ہے..... سہراب! اگر تم سجاد ماموں کی اصلیت سے پردہ نہ اٹھاتے تو خود میں بھی انہیں ایک اچھا انسان ہی سمجھتی رہتی۔"

سدرہ اتنا کہہ کر ذرا رکی۔ میری ابھی تک تسلی نہیں ہوئی تھی نہ ہی ہنوز مجھے سدرہ کی پراسرار پریشانی اور تشویش کے بارے میں کچھ اندازہ ہو پایا تھا۔ کم از کم یہ ایسی باتیں نہیں تھیں کہ وہ اس قدر نامعلوم خوف اور سراسیمگی کا شکار ہوتی۔

"اصل بات جو میں بتانے والی ہوں وہ کچھ اور ہے۔" چند لمحے کے توقف کے بعد سدرہ نے بالآخر انکشاف زدہ لہجے میں کہا۔ میں یک ٹک اس کے چہرے کو تکتا رہا پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔

"جب میں نے دیکھا کہ ڈیڈی کے قتل کے بعد مما، سجاد ماموں پر کچھ زیادہ ہی اندھا اعتماد کرنے لگی ہیں تو مجھ سے رہا نہ گیا اور بالآخر میں نے مما کو سجاد ماموں کی اصلیت کے بارے میں دل پر پتھر رکھ کر بتا ڈالا۔ یہ بھی بتایا کہ ایک طرح سے ماموں سجاد بھی ڈیڈی کے قتل میں ملوث ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ایک ماں اپنی بیٹی کی بات پر یقین کرے گی لیکن اس کے برعکس مجھے سخت حیرت اور مایوسی ہوئی جب مما اس بات پر الٹا مجھ پر ہی برس پڑیں۔ مجھے احسان فراموش کہنے لگیں۔ گویا وہ سجاد ماموں کے خلاف کوئی بات ہی نہیں سننا چاہتی تھیں لیکن میں چونکی اس وقت جب مما نے مجھ سے تمہارے ذکر پر کہا کہ اس لمبو بدمعاش نے تمہارا دماغ خراب کر رکھا ہے۔ تمہارے باپ کا اصل قاتل وہی بھتا خور لڑکا ہے جو بظاہر ہمارا خیر خواہ بنتا تھا۔

"مما کی اس بات پر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ میں سمجھ گئی کہ سجاد ماموں نے ہی تمہارے خلاف مما کے کان بھرے ہوں گے۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی مجھ پر انکشاف ہوا کہ ماموں کو کسی طرح یہ علم ہو چکا ہے کہ تم اس کی اصلیت سے خوب واقف ہو چکے ہو۔

"خیر، جب میں مما کو اپنی بات کے ثبوت کے طور پر ڈیڈی کی زندگی کا وہ آخری خط دکھانے لگی جو میں تمہیں بھی پڑھوا چکی ہوں تو مجھ پر بھیانک انکشاف ہوا کہ وہ خط چوری کر لیا گیا تھا۔

"تب میں سمجھ گئی کہ وہ خط ماموں سجاد نے ہی چرایا ہوگا اور یوں انہیں تم سے متعلق ساری باتوں کا علم ہوا لیکن سہراب......! اب میں تمہیں آخر میں جو بات بتانے جا رہی ہوں وہ ان ساری باتوں سے زیادہ سنگین اور خطرناک ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کو رکی اور میری کیفیات دگرگوں سی ہونے لگی کہ جانے اب پردۂ غیب سے "بتدریج" اور کیا برآمد ہونے لگا تھا۔ یہی حال راحیلہ اور فوزیہ کا تھا۔

"ابھی اس بحث مباحثے کو دو روز بیتے تھے کہ مما کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ میں یہی سمجھی کہ شاید میری تلخ باتوں کو انہوں نے دل پر لے لیا ہے۔ مجھے ندامت ہوئی۔ اس دن میں بھی جوش میں آ گئی تھی کہ مما، سجاد ماموں پر کس قدر اندھا اعتماد کیے ہوئے تھیں۔ حالانکہ میں مما سے اور مما مجھ سے بے حد پیار کرتی ہیں۔ ڈیڈی کے انتقال کے بعد بھلا ہم دونوں ماں بیٹیوں کا اور کون تھا دنیا میں ماسوائے اللہ کے۔ اگرچہ بعد میں، میں نے مما سے پیار بھرے انداز میں معافی بھی مانگی تھی اور وقت کا انتظار کرنے کا بھی کہا تھا۔

"میں تو مما کی دیکھ بھال کر رہی تھی مگر ماموں سجاد یہی جتائے جا رہے تھے کہ انہیں اپنی "بہن" کی زیادہ فکر ہے اور وہ ان کا مجھ سے زیادہ خیال رکھنے کی کوشش میں مگن تھے۔

"مما نے بھولپن یا سادگی میں آ کر ان سے بھی یہ بات کہہ ڈالی تھی۔ اس روز ماموں نے مجھے بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ میں خاموش ہو گئی کیونکہ میرے پاس اب کوئی ثبوت نہ تھا۔ میں مزید ان پر کوئی الزام لگا کر مما کا دل اپنی طرف سے اور خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"واقعی کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ یہ عورتیں بھی عجیب ہی ہوتی ہیں۔ ایک بار کسی پر بھروسا کر لیں یا کسی کی انسیت اور محبت کو دل و دماغ سے محسوس کر لیں، خواہ وہ جھوٹی ہی ہو، بس پھر وہ اسی پر کامل بھروسا کرنے لگ جاتی ہیں۔ مما کا بھی ماموں پر کامل بھروسا قائم ہو چکا تھا۔

"ادھر سجاد کو بھی اس حقیقت کا ادراک ہو چکا تھا کہ کم

...کم میں ان کی اصلیت سے خوب اچھی طرح واقف ہو چکی ہوں اور کسی بات کی گنجائش ہی نہ تھی جس کا ثبوت تم نے میرے روابط اور ڈیڈی کا وہ خط تھا۔ لہٰذا انہوں نے دھیرے دھیرے مما کو بھی تمہارے حوالے سے ورغلانا شروع کر دیا کہ میں تمہارے جیسے بدمعاش کے کہنے پر چل رہی ہوں وغیرہ۔

''میں جانتی تھی کہ اب سجاد کے خلاف مما سے کوئی بات کہنا فضول ہی تھا۔ میں وقت اور مناسب موقع کا انتظار پورے صبر سے کر رہی تھی لیکن ادھر ایک نئی پریشانی کھڑی ہونے لگی۔ وہ یہ کہ مما کی طبیعت سنبھل کر نہیں دے رہی تھی۔ سجاد کتنے ہی اچھے اور بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا گیا۔ مجھے شک ہوا کہ ایک تو سجاد خود ہی مما کو لے جاتا تھا۔ میں بھی اگرچہ ساتھ ہوتی ڈاکٹروں کے پاس لے جاتا رہا تھا۔ مگر مجھے کچھ نہیں بتاتا ماسوائے عمومی باتوں کے۔ اس کے بعد گھر پر ہی مما کا علاج ہونے لگا کیونکہ مما اب بالکل بستر سے ہی لگ چکی تھیں اور انہیں ایک ڈاکٹر آ کر دیکھ جاتا۔

''چند ہی روز میں مما کی حالت ایسی ہو گئی جیسے وہ دھیرے دھیرے موت کے منہ میں جا رہی ہوں۔ انہیں دیکھ کر کسی زندہ لاش کا تصور ذہن میں ابھرتا۔ میں یہ دیکھ کر لرز گئی۔

''میں چاہتی تھی کہ کسی دن میں خود مما کو اپنے ساتھ کسی اچھے اسپتال یا ڈاکٹر کو دکھاؤں لیکن مما اب مجھ پر بالکل بھی بھروسا نہیں کرتی تھیں۔ وہ صرف سجاد ماموں کے ساتھ ہی جاتیں۔ یہ دیکھ کر میرا دل اندر سے کٹنے لگا اور جگر چھلنی ہونے لگا تھا۔

''مما دشمن کو خیر خواہ اور خیر خواہ کو دشمن سمجھے ہوئے تھیں۔ تب میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو میں سجاد کی یہ گھناؤنی سازش کامیاب ہونے نہیں دوں گی۔ تب ہی میں نے انکل محمود اور مشتاق کو بلا لیا اور انہیں سب بتایا۔

''مما کو ہم تینوں زبردستی کار میں بٹھا کر ایک اچھے اسپتال لے گئے۔ سجاد نے ایک جاسوس چوکیدار کے بھیس میں چھوڑ رکھا تھا۔ وہ انہیں ہماری ایک ایک پل کی خبر سے آگاہ کرتا تھا۔ بعد میں، میں نے اسے نکال باہر کیا اور پرانے آدمی کو رکھ لیا۔ وہ بھی انکل محمود اور مشتاق کی طرح ڈیڈی کے زمانے کا وفادار ملازم تھا۔ پٹھان تھا اور جاں نثار تھا۔

''میری شہ ملتے ہی اس نے قسم کھائی کہ اب وہ ہمیں خطرے میں چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ وہ تو بے چارہ سجاد کی بلاوجہ کی ڈانٹ پھٹکار سے نوکری چھوڑ گیا تھا جو کہ اس کمینے سجاد کی سازش کا حصہ تھا۔ اس چوکیدار کا نام تو بابو تھا مگر ہم اسے خان چاچا کہتے تھے۔

''اسپتال میں مما کے فوری ٹیسٹ ہوئے اور یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ انہیں سلو پوائزن دیا جا رہا تھا۔ جب مما کو اس کا پتا چلا تو ان کے ہوش ٹھکانے آ گئے اور وہ مجھ سے لپٹ کر رو دیں۔

''مما اب ایک لمحے کے لیے بھی سجاد کو اپنے گھر میں برداشت کرنا تو در کنار، اس کا منہ بھی دیکھنا گوارا نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن انکل محمود اور مشتاق نے جوش کے بجائے ہوش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں ترغیب دی کہ ابھی بظاہر سب کچھ ایسے ہی رہنے دیا جائے اور اس مکار اور سازشی انسان سجاد پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا جائے کہ اس کی گھناؤنی سازش بے نقاب ہو چکی ہے ورنہ وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے گا۔

''ہم نے مما کو اس اسپتال میں داخل کروا دیا اور سجاد سے یہی کہا گیا کہ رات میں مما کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی لہٰذا انہیں مجبوراً اسپتال لانا پڑا۔ ظاہر ہے اور کیا کرتے! اسی لیے سجاد نے بھی مکارانہ خاموشی اختیار کر لی تھی کیونکہ یہ بات وہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ کسی بات پر بضد رہتا تو اس کا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔

''تاہم وہ بار بار مما کو میری غیر موجودگی میں یہی مشورہ دیتا رہا کہ باجی! یہاں اور بیمار ہو سکتی ہیں۔ خوامخواہ اس مہنگے اسپتال کا بل بھی بنتا رہے گا لیکن اب مما اس کی کسی بات پر بھروسا کرنے پر تیار نہ تھیں اور نہ ہی انہوں نے یہ ظاہر ہونے دیا۔

''شکر تھا کہ مما کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ اسپتال میں سیکیورٹی کا انتظام سخت تھا اور کچھ میں نے بھی پرائیویٹ طور پر مما کی سیکیورٹی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ انکل محمود اور مشتاق اس نازک وقت میں میرے کام آئے لیکن میں جانتی ہوں کہ جلد یا بدیر سجاد سے یہ حقیقت چھپی نہیں رہ سکے گی اور وہ بالآخر اصلیت پر اتر آئے گا۔ تب مجھے تمہاری اشد ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جس وقت تمہارا فون آیا تو میں خوشی سے نہال ہو گئی تھی اور پھر جب یہ پتا چلا کہ تم سیالکوٹ پہنچنے والے ہو تو میں فوراً یہاں چلی آئی۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے سمراب! ہمیں آج ہی کراچی لوٹنا ہوگا۔''

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگجو کی خونریز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

ڈبے کا راز

انجم فاروق ساحلی

اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی بڑی آزمائشوں کے مرحلے طے پاجاتے ہیں... جیسے ایک معمولی ڈبے کی اہمیت نے اپنے پرائے رشتوں کی حقیقت کو کھول کر رکھ دیا... کئی چہرے بے نقاب ہوگئے جن پر بناوٹی محبتوں کے پردے پڑے تھے۔

روتے بلکتے جذبات اور ٹوٹے ہوئے دلوں کی عجیب کہانی

مختار صاحب جیسے ہی نئی ٹویوٹا کرولا سے اتر کر اندر داخل ہوئے اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے ڈائننگ ہال تک پہنچے، ان کے بچے عمران، کامران، اسد، فرزانہ اور شبانہ جلدی سے اٹھ کر ان کے اردگرد آ کھڑے ہوئے۔ وہ حیرت، تعجب اور مسرت بھری نگاہوں سے مختار صاحب کے ہاتھوں میں موجود سنہری رنگ کے ایک خوبصورت ڈبے کو دیکھ رہے تھے۔

''ابا جان! اس خوشنما ڈبے میں کیا ہے؟'' اسد نے

سب سے پہلے دلچسپی کا اظہار کیا۔
"کیا اس میں میرے لیے کوئی خوبصورت تحفہ ہے؟" عمران نے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔
"شاید اس میں میرے لیے کوئی امپورٹڈ گھڑی ہے۔" کامران نے تجسس کا مظاہرہ کیا۔
مختار صاحب برابر مسکراتے رہے۔
"ابو کچھ بتایئے بھی۔" فرزانہ اور شبانہ نے ڈبے پر جڑے موتیوں سے پھوٹنے والی چمک کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بلب کی روشنی میں رنگ برنگی شعاعیں فضا میں دلکشی بکھیر رہی تھیں۔ مختار صاحب کی بیگم اور بچوں کی والدہ ممتاز بیگم مسکراتے ہوئے بچوں کے اشتیاق اور دلچسپی کا جائزہ لے رہی تھیں پھر آخر وہ بھی فطری تجسس سے مجبور ہو کر اپنے خاوند کے قریب جا کھڑی ہوئیں۔
"مختار صاحب! اب تو بتا دیں، اس خوبصورت اور رنگین ڈبے کے اندر کون سا تحفہ لائے ہیں؟"
مختار صاحب نے بچوں پر ایک نگاہ ڈالی اور بیگم سے بولے۔ "اس ڈبے میں ایک بہت قیمتی تحفہ ہے جو سب میں برابر تقسیم ہوگا لیکن عیدالفطر والے دن ہی اس ڈبے کو کھولا جائے گا تاکہ سب کی عید کی خوشیاں دوبالا ہو جائیں۔" مختار صاحب نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔
بچوں کے منہ لٹک گئے۔ اسد تو پھٹی پھٹی نگاہوں سے ڈبے کو دیکھنے لگا جیسے وہ اسے بُرا لگنے لگا تھا۔
"ابو! یہ تو بہت لمبا انتظار ہے۔ آج تو خیر سے پہلا روزہ ہے۔" لڑکیوں نے ڈبے کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔
"بچو! صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ یہ تم سب کے لیے عیدالفطر کا تحفہ ہوگا۔ فرزانہ! تمہاری چوری ہونے والی اشیا کا مجھے بے حد دکھ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری محرومی کا ازالہ کر دوں۔"
بچے سوالیہ انداز میں ابو اور پھر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ چہروں پر رنج و ملال، پریشانی اور اضمحلال کی کیفیتیں ابھرنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے شیشے کے محل میں پتھر کھینچ مارا ہو۔
سب چپ چاپ اور افسردہ سے ہو گئے۔ مختار صاحب ڈبا لے کر اپنے کمرے میں آئے اور اسے الماری کے نچلے خانے میں رکھ کر خانے کا دروازہ بند کر دیا۔ چابی ان کے کی رنگ میں تھی۔
مختار صاحب اس بات سے بے خبر تھے کہ دو آنکھیں ان کی پشت پر موجود کھڑکی کے شیشے سے اندر کا ماحول دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

"افسوس کہ ہمارے گھر میں ہی کوئی چور موجود ہے۔ میرا دوست انسپکٹر ارشاد جو مشہور سراغ رساں بھی ہے، اس نتیجے پر پہنچا تھا لیکن میں نے اسے کارروائی کرنے سے روک دیا۔ آخر میں کس طرح اپنے گھر سے کسی کو پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔"
مختار صاحب نے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھاتے ہوئے آخری لقمہ بے دلی سے پلیٹ میں ڈال دیا۔ وہ افسردہ، ملول اور غمزدہ دکھائی دے رہے تھے جیسے ان کی عمر بھر کی ریاضت اور محنت کو داغ لگ گیا ہو۔
"میں نے ساری زندگی محنت اور جدوجہد کی، لگن اور صبر و ہمت سے مسائل کا سامنا کر کے آپ لوگوں کو اس گھر میں زندگی کی سہولیات فراہم کیں لیکن کچھ عرصے سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ دال میں کچھ کالا ہے۔
"میں نے اپنے بچوں کی تربیت کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔ ممتاز بیگم نے بھی بچوں کو صحیح راہ پر چلانے اور معاشرے کا مثبت شہری اور گھر کا بہترین فرد بنانے کے لیے اپنے آپ کو وقف کیا لیکن مجھے انتہائی افسوس اور دکھ ہے کہ کسی گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھائی ہے۔ چور اس گھر میں موجود ہے جس نے میری بڑی بیٹی فرزانہ کے جہیز کی انگوٹھیاں، چوڑیاں اور قیمتی موبائل، نقدی وغیرہ جیسی اشیا چرائی ہیں۔" مختار صاحب کی افسردہ نگاہیں لڑکوں پر جم گئیں۔ وہ قسمیں کھانے لگے۔ ممتاز بیگم کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ ان کا ایک بچہ شاید چور تھا جس نے ان کا مان توڑ دیا تھا۔ اپنی بہن کے جہیز کو لوٹا تھا۔ بھائی بہن تو ایک دوسرے کا سہارا ہوتے ہیں مگر یہاں کسی اپنے نے ہی غضب ڈھایا تھا۔ پولیس ملازموں اور باورچی سے خوب تفتیش کر چکی تھی مگر انہیں چوری شدہ اشیا کا علم ہی نہیں تھا۔ وہ انہیں کس طرح چراتے۔
مختار صاحب بیگم سے کہنے لگے۔ "کسی نے سچ کہا ہے، ماں باپ کی اصل آزمائش تب شروع ہوتی ہے جب اولاد جوان ہو جائے۔ وہ کیا گل کھلاتی ہے؛ یہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔"

☆☆☆

رات کے آنچل پر ستارے جگمگا رہے تھے مگر کسی کے دل میں بُرا ارادہ اور [illegible]

سے اٹھا۔ بستر پر کمبل اسی طرح ڈال دیا جیسے کہ وہ سو رہا ہو۔ وہ عقبی کھڑکی کے پاس آیا۔ اس نے ہاتھوں پر باریک دستانے چڑھا لیے پھر اس نے کمرے سے ملحقہ اسٹور روم میں چھپایا ہوا چابیوں کا گچھا نکالا اور دبے پاؤں کھڑکی کھول کر باہر راہداری میں کود گیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا لیکن وہ اپنے ارادے کا پکا تھا۔ اس نے جیب سے دھاتی سکہ نکالا اور رومال ہاتھ میں لے کر ایک روشن قمقمہ اتار کر ہولڈر میں سکہ رکھ کر اوپر سے جب بلب لگایا تو ایک دھماکے کے ساتھ فیوز اڑ گیا۔
لائٹ آف ہو گئی۔ عمارت اندھیرے میں ڈوب گئی۔ جنریٹر پہلے ہی خراب تھا۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا ایک بڑے بیڈروم کی طرف بڑھنے لگا۔ اندر مختار صاحب بے خبر بستر پر کمبل اوڑھے سو رہے تھے۔
چور نے کھڑکی سے اندر جھانکا۔ دودھ کا گلاس بستر کے قریب بیڈ سائڈ.... پر رکھا ہوا تھا جسے مختار صاحب پی چکے تھے۔ چور نے مسکراتے ہوئے اطمینان سے ماسٹر کی دروازے کے لاک میں ڈالی اور کمرے میں داخل ہو گیا۔
گھر کے افراد اور ملازم وغیرہ لائٹ ٹھیک کروانے میں لگے ہوئے تھے۔ چور بے دھڑک تیزی سے...... الماری کی طرف بڑھنے لگا جس کے خانے میں مختار صاحب نے خوبصورت اور رنگین موتیوں والا دلکش ڈبا چھپا رکھا تھا۔ چور چاہتا تھا کہ وہ ڈبا اس کے ہاتھ آ جائے۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ایک مرتبہ پھر اس کی نگاہ دودھ کے خالی گلاس پر جا پڑی۔ اس نے دودھ کے گلاس میں چالاکی سے نیند کی دوا جو سفوف کی شکل میں تھی، ملا دی تھی جب دودھ کا گلاس کچن میں رکھا ہوا تھا۔
مختار صاحب بے خبر سو رہے تھے۔ چور نے کی رنگ کی ایک ماسٹر چابی منتخب کی اور اسے جیسے ہی چابی کے سوراخ سے لگایا، اسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ وہ اچھل کر پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ اس کے چہرے پر بدحواسی اور پریشانی کے آثار پھیل گئے۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے الماری کے خانے کو اپنی سرخ آنکھوں سے گھورتا ہوا واپس لوٹ آیا۔ اس کا پلان فیل ہو چکا تھا۔ وہ ڈبا چرا کر ڈبے کا راز معلوم نہیں کر سکا تھا۔ مختار صاحب اگرچہ گہری نیند میں تھے مگر انہوں نے لاک میں کرنٹ چھوڑ رکھا تھا۔ چور تلملایا، مرجھایا ہوا جھنجلاہٹ کے عالم میں انگلیاں مروڑتا ہوا اپنے کمرے میں عقبی کھڑکی کھول کر داخل ہوا اور بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا۔
آج قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ ناکام اور نامراد

سوال

بحری جہاز میں پہلی مرتبہ سفر کرنے والی ایک خاتون کافی خوفزدہ تھیں۔ چند گھنٹوں کے سفر کے بعد وہ کیپٹن کے پاس پہنچیں اور تشویش زدہ لہجے میں بولیں۔ "اگر سمندر میں اچانک کوئی چٹان جہاز کے سامنے آجائے تو کیا ہوگا؟"
"کچھ بھی نہیں۔" کیپٹن نے ملامت سے کہا۔ "چٹان معذرت کر کے ایک طرف ہٹ جائے گی۔"

مرسلہ: پرویز بھٹی، بہاولپور

اپنائیت

پاگل خانے میں نئے ڈاکٹر صاحب پاگلوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ معائنہ کرانے کے دوران میں ایک پاگل بولا۔ "سر! آپ پہلے والے ڈاکٹر صاحب سے زیادہ اچھے ہیں۔ یہاں سب لوگ آپ کو بہت پسند کرتے ہیں۔"
"اچھا، وہ کیوں؟" ڈاکٹر صاحب نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔
"سر! آپ ہم میں سے ہی ایک لگتے ہیں۔" پاگل نے جواب دیا۔

☆☆☆

اظہار اطمینان

ہوٹل میں ایک صاحب نے مچھلی فرائی کا آرڈر دیا اور انتظار کرنے لگے۔ انتظار کی گھڑیاں بہت طویل ہوگئیں۔ آخرکار ویٹر ان کے پاس آیا اور خوشخبری سنانے کے انداز میں بولا۔ "بس، آپ کی مچھلی آنے والی ہے۔"
"اچھا، واقعی؟" ان صاحب نے خوشی کا اظہار کیا۔ "یہ تو بتاؤ کہ مچھلی پکڑنے کے کانٹے میں چارے کے طور پر تم لوگوں نے کیا چیز لگائی ہے؟"

مرسلہ: عاصم خان، کراچی

واپس آیا تھا۔ اسے کسی قیمتی شے کی اشد ضرورت تھی۔

☆☆☆

عید بالکل قریب آ گئی تھی۔ بازاروں میں رونق اور گہما گہمی تھی۔ اسی رونق کا حصہ بنے مختار صاحب کے افراد بیگم ممتاز، فرزانہ، شبانہ اور عمران شاپنگ کرکے واپس لوٹ رہے تھے۔ کامران اور اسد اپنے دوستوں کی طرف گئے ہوئے تھے اس لیے وہ ساتھ نہیں آ سکے تھے۔ وہ جیسے ہی اپنے گھر کے قریب ان کی نرسری گراؤنڈ (پرانا باغ) کے سامنے سے چلتے ہوئے اسکول کے پاس پہنچے، اچانک ایک سیاہ لباس والا آدمی نرسری کے گیٹ سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ ان کے جسموں میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔

نقاب پوش بھاری لہجے میں بولا۔ ”خاتون! بیگ میرے حوالے کر دو۔“ ممتاز بیگم نے ریوالور اور چمکتا ہوا خنجر دیکھ کر بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا لیکن یہ جگہ سنسان تھی۔ گزرتے ہوئے موٹر سائیکل سواروں نے کوئی توجہ نہ دی۔ ممتاز بیگم خوف کے مارے کانپتے ہوئے نقدی، موبائل اور چند دوسری قیمتی اشیا والا بیگ اسے تھمانے ہی والی تھیں کہ اچانک آگے بڑھتے چور کا پاؤں اندھیرے میں کسی شے سے ٹکرایا اور وہ گر کر چوٹ کھا بیٹھا۔ پستول اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ عمران نے فوراً ہی ایک لکڑی قریب پڑے کباڑ سے اٹھالی جو نرسری کے باہر پھینکا گیا تھا۔ وہ لکڑی گھماتا ہوا آگے بڑھا۔ چور گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس طرح وہ لٹنے سے بچ گئے۔ عمران نے اپنے موبائل سے انسپکٹر ارشاد کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ انسپکٹر ارشاد نے فوراً اس طرف حسین پولیس فورس کو متحرک کر دیا کہ نرسری باغ کے ارد گرد علاقے میں پھیل جاؤ۔

☆☆☆

اگلے روز سہ پہر کے وقت وہ ایک دعوت پر روانہ ہوئے۔ مختار صاحب کے بچپن کے لنگوٹیے دوست رحمان کی سالگرہ تھی، وہ انکار نہ کر سکے۔ گاڑی مختار صاحب ڈرائیو کر رہے تھے۔ اسد کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ اسے بخار ہو گیا اور الٹیاں بھی آ رہی تھیں۔ وہ اپنے ایک ڈاکٹر دوست کی طرف گیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے ڈرپ لگا دی تھی۔ اس نے مختار صاحب سے کہا کہ وہ بعد میں آ جائے گا۔ اچانک مختار صاحب نے موبائل فون پر کال سن کر گاڑی روک دی۔ انہیں کوئی ضروری کام یاد آ گیا تھا۔

☆☆☆

جیسے ہی چور نے خالی مکان میں مختار صاحب کے روم میں کرنٹ کے تار کاٹ کر ماسٹر کی سے الماری کھول کر بڑے اشتیاق سے خوبصورت ڈبا باہر نکالا اور اسے ایک جھٹکے کے ساتھ کھولا تو دھک سے رہ گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھیں ڈبے اور دیواروں سے ٹکرا کر رہ گئیں۔ ڈبا خالی تھا۔ اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اسی وقت کوئی کمرے میں داخل ہو کر لائٹ آن کی۔ چور کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ عمران، کامران کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

چور ڈرائنگ روم میں مختار صاحب کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ ندامت کے پسینے میں شرابور تھا۔ تمام نظریں اس پر مرکوز تھیں اور سنگ ملامت برسا رہی تھیں۔

”اسد! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چور تم ہو۔“ تم نے اپنی بہن کے جہیز کی قیمتی چیزیں چرا کر باہر [illegible] ہیں۔ انسپکٹر ارشاد کا ایک ماتحت گھر کے سب افراد کی نگرانی کر رہا تھا۔ بے شرم، بے حیا، تم نے ماں کو بھی نہ بخشا۔ شاپنگ کرکے لوٹتے وقت لوٹنے کی کوشش کی۔ آخر تمہارا خون اس قدر گندا اور ذلیل کس طرح ہو گیا؟ نرسری باغ کے ایک کونے میں میک اپ اتارتے ہوئے تمہیں انسپکٹر ارشاد کے اسسٹنٹ فرمان نے دیکھ لیا تھا۔“ مختار صاحب کی گرج سے کمرا کانپ اٹھا۔ اسد بھی ہل کر رہ گیا۔

”ابا جان! مجھے معاف کر دیں۔ برے دوستوں کی صحبت نے مجھے نشے اور جوئے کا عادی بنا دیا تھا۔ میں مقروض ہو چکا ہوں۔ مجھے دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ میں نے قرض اتارنے کے لیے یہ سب کچھ کیا۔ میں اپنے کیے پر نادم ہوں۔“ اسد رخ موڑ کر باپ کے بجائے ماں کے قدموں میں جا گرا۔ ماں کا دل نرم ہوتا ہے۔

اس وقت انسپکٹر ارشاد کمرے میں داخل ہوا اور اس نے مختار صاحب سے کہا۔ ”کہیے مختار صاحب! میری ترکیب کیسی کامیاب ثابت ہوئی۔“

”ہاں میرے یار! تمہارے دماغ کی اس ترکیب نے چور کو پکڑوا دیا اور اب خدا کرے کہ وہ اپنی رسوائی سے سبق حاصل کرے اور برے کاموں سے توبہ کرے۔“ اس وقت ماں نے بیٹے کو معاف کر دیا البتہ مختار صاحب نے منہ موڑ کر پیٹھ اس کی طرف کر لی۔

انسپکٹر ارشاد نے کہا۔ ”آپ بھی معاف کر دیجیے۔ قانونی سزا سے رسوائی ہو گی۔“

دریائے نیل کا تیسرا آبشار سوڈان کے ایک گاؤں حنگ کے قریب واقع ہے۔ سارا سال لوگ اس آبشار کو دیکھنے کے لیے پہنچتے رہتے ہیں۔ انیسویں صدی میں چونکہ پیشے محدود تھے اس لیے عموماً لوگ معروف پیشوں کی طرف راغب رہتے تھے۔ دریائے نیل نے اپنے دونوں کناروں پر رہنے والوں کے لیے جو پیشے مہیا کیے تھے ان میں کشتی سازی کا پیشہ بہت

مہدی سوڈانی

ضیا تسنیم بلگرامی

انیسویں صدی کے آٹھویں عشرے کی وہ شخصیت جس نے سلطنتِ برطانیہ کو بے بس کر دیا تھا۔ بڑے بڑے تجربہ کار اس کے مقابلے میں ناکام رہے۔ ذوقِ یقین کے اس پیکر کا نام تھا محمد احمد جو اچانک مہدی بن گیا اور مصر اور برطانیہ کو سوڈان سے نکال باہر کیا۔ ایک ایسے شخص کے محیر العقول کارنامے جو سو سال پہلے اپنے عزم و حوصلے سے بہت کچھ کر کے رخصت ہو گیا۔ اس کے جھوٹے دعوائے مہدویت کے باوجود اس سے ہمدردی کی گئی اور اس کا نام احترام سے لیا گیا کیونکہ وہ اپنے مقصد میں مخلص تھا لیکن اس نے اپنے جانشین اپنے جیسے نہیں چھوڑے اور اس کا وہی ناخوشگوار انجام ہوا جو متوقع تھا۔

ایک دانا، دین دار اور مخلص انسان کا زندگی نامہ

ام تھا۔ … کے رہنے والے بھی کشتی سازی میں مشغول رہتے تھے۔ پوری آبادی کا مشہور استاد عبداللہ تھا۔ اس کی بیوی کا نام آمنہ تھا۔ ان دونوں میاں بیوی نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ دونوں ناموں کا یہ اتفاق اور ملاپ مستقبل میں … ثابت ہوگا۔

ان گھرانوں کی معاشی حالت کچھ زیادہ بہتر نہ تھی اس لیے عبداللہ ہر وقت نقل مکانی پر آمادہ رہتا تھا۔

1848ء میں ان کے ہاں ولادت ہوئی اور اس نومولود کا نام بالکل غیر ارادی طور پر محمد احمد رکھ دیا گیا۔ … جا رہا تھا تو دونوں میاں بیوی نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ عبداللہ اور آمنہ کے گھر میں پیدا ہونے والا محمد احمد مستقبل میں … سے کہا جانے لگے گا۔

محمد احمد کے کئی اور بھائی بھی تھے۔ بچے کی پرورش ہوتی رہی اور اب عبداللہ نے یہ حتمی فیصلہ کر لیا کہ وہ اس … سے کہیں اور آباد ہو جائے گا۔ ادھر کچھ عرصے سے جزیرہ ابا کے لوگ عبداللہ کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ ان کے جزیرے میں … ہو جائے۔

یہ جزیرہ سوڈان کے دارالخلافہ خرطوم کے شمال میں نیل ابیض پر واقع ہے اور یہاں کشتی سازی کا کام … تھا۔ عبداللہ جزیرہ ابا میں منتقل ہو گیا اور یہاں بھی کشتی سازی کا کام شروع کر دیا۔ جلد ہی اس نے لوگوں کو اپنا گرویدہ … جیسے ہی محمد احمد نے ہوش سنبھالا اور باپ نے اس کو دینی تعلیم دینا شروع کر دی۔ سب سے پہلے محمد احمد کو قرآن حفظ کرنے … گیا۔ قرآن کو حفظ کرنے میں محمد احمد کو کئی سال لگے۔ بارہ سال کی عمر میں اس نے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔

بیوی نے مشورہ دیا کہ بیٹے کو بھی کشتی سازی کا کام سکھایا جائے۔ لیکن بے حد سنجیدہ اور بردبار محمد احمد … تھا۔ معلوم نہیں کیوں باپ اس پر سختی بھی نہیں کر سکتا تھا اور یہ سوچ کر کہ عمر نکلی جا رہی ہے، اس نے فیصلہ کیا کہ محمد احمد کو دوسرے جزیرے شلکہ میں اپنے بھائی شریف الدین کے پاس بھیج دے۔ شریف الدین ذرا سخت مزاج تھا اور عبداللہ کے خیال میں وہی محمد احمد کو کشتی سازی کا کام سکھا سکتا تھا۔

محمد احمد کو اپنے چچا کے پاس جانے میں اعتراض تھا لیکن فرماںبردار بیٹے نے مرضی نہ ہونے کے باوجود جزیرے کا سفر اختیار کیا۔

شریف الدین نے ایک عرصے کے بعد اپنے بھتیجے کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ اس نے تقریباً دس سال پہلے بھتیجے کو دیکھا تھا اور اب وہ بارہ تیرہ سال کا ہو چکا تھا۔

شریف الدین نے محمد احمد کو کشتی سازی کے کام میں لگانا چاہا تو محمد احمد نے عدم دلچسپی ظاہر کی اور کہا۔ "میں … چاہتا ہوں۔"

چچا نے کہا۔ "تم نے اللہ کے کلام کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا ہے۔ اب اس کے بعد بھی کسی علم کی ضرورت رہتی ہے؟"

محمد احمد کو اپنے چچا کی کم علمی پر افسوس ہوا اور کہا۔ "اگر کلام پاک کا حفظ کر لینا ہی علم کی حصولیابی کی معراج ہے تو پھر دینی علوم کے اعلیٰ مدارس کیوں کھلے ہوئے ہیں۔ انہیں بند ہو جانا چاہیے۔"

چچا کو اپنے بھتیجے کی اس دلیل میں گستاخی کا پہلو دکھائی دیا۔ گویا اب بات چیت کا مرحلہ ختم ہو چکا تھا اور چچا کے خیال میں تادیب کی ضرورت تھی اور تادیب میں مار پیٹ کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔ چچا نے بھتیجے کو خوب اچھی طرح مارا پیٹا … جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ "اور زبان لڑائے گا، بکواس کرے گا۔"

محمد احمد نے کسی مزاحمت کے بغیر مار برداشت کر لی لیکن یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ اب اس کو اپنے چچا کے پاس نہیں رہنا ہے۔ سوڈان کا صدر مقام خرطوم زیادہ دور نہیں تھا اور خرطوم میں کئی اعلیٰ درجے کے دینی مدارس تھے جو محمد احمد کی علمی پیاس بجھا سکتے تھے۔

خرطوم پہنچ کر اس نے لوگوں سے معلوم کیا۔ "یہاں سب سے اچھا دینی مدرسہ کون سا ہے؟"

کئی لوگوں نے متفقہ طور پر مدرسہ خوجلی کا نام لیا۔ چنانچہ محمد احمد نے اس مدرسے میں دینی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔

شریف الدین نے اپنے بھائی کو مطلع کر دیا کہ محمد احمد نے اس سے کشتی سازی کا کام نہیں سیکھا اور خرطوم کے ایک مدرسے میں داخلہ لے لیا ہے۔

عبداللہ نے اس کا کوئی خاص اثر نہ لیا اور یہ سوچ کر کہ اگر بیٹا اپنا آبائی ہنر نہیں حاصل کرنا چاہتا اور دینی علم حاصل کرنا

چاہتا ہے تو کوئی حرج نہیں۔

مدرسہ خوجلی میں شمالی افریقہ کے بھی چند لوگ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انہی کے ذریعے محمد احمد کو معلوم ہوا کہ بربر میں مدرسہ خوجلی سے بھی اعلیٰ درس گاہیں موجود ہیں۔

چنانچہ محمد احمد نے مدرسہ خوجلی سے فارغ ہونے کے بعد بربر کا سفر اختیار کیا اور وہاں نہایت لگن سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اسی مدرسے میں لوگوں نے محمد احمد کو بتایا کہ یہ تو پڑھنے پڑھانے کے مدرسے ہیں لیکن عملی علوم کے لیے کسی شیخ طریقت کی صحبت اختیار کرنا چاہیے۔

جستجو پسند محمد احمد نے سوچنا شروع کیا کہ شیخ طریقت کہاں ملے گا اور جب اس سوال کا کوئی جواب نہ ملا تو لوگوں سے پوچھنا شروع کر دیا۔ "آخر یہ شیخ طریقت کہاں ہوتا ہے؟"

لوگوں نے ارواب نامی ایک قصبے کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہاں شیخ نورالدائم نامی بزرگ رہتے ہیں۔

محمد احمد نے ارواب کا سفر اختیار کیا اور شیخ نورالدائم کی مریدی اختیار کر لی۔ یہ نہایت مشہور بزرگ تھے اور پیر طریقت کہلاتے تھے۔ محمد احمد نے یہاں ان سے کچھ عرصے تک علوم باطنی کی تحصیل کی پھر کچھ عرصے بعد خرطوم کی واپسی اختیار کی کیونکہ ارواب میں کسی نے محمد احمد کو بتایا تھا کہ خرطوم میں طریقت سمانیہ کے کامل شیخ محمد شریف موجود ہیں۔

محمد احمد نے خرطوم پہنچ کے شیخ محمد شریف کی مریدی اختیار کر لی۔ اسی دوران ایک عجیب اتفاقی واقعہ پیش آیا۔ شیخ محمد شریف کے بیٹے کی رسم ختنہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ شیخ کے مریدوں نے اس میں حصہ لیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ مارے خوشی کے رقص و سرود میں مبتلا ہو گئے۔

جب یہ ہنگامہ جاری تھا تو محمد احمد اس ہنگامے سے الگ تھلگ کھڑا تھا۔ مریدوں نے اسے بلایا تو محمد احمد نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "افسوس کہ میں خلاف شرع تقریب میں حصہ نہیں لے سکتا۔"

مریدوں نے حیرت سے محمد احمد کو دیکھا اور کہا۔ "جناب! یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں، اس میں … شیخ محمد شریف کی مرضی شامل ہے اور وہ اسے ناجائز نہیں سمجھتے۔"

محمد احمد نے جواب دیا۔ "لیکن میں کہتا ہوں کہ شریعت نے ناجائز فعل کو جائز نہیں قرار دے سکتی اور یہ حق شیخ طریقت کو بھی حاصل نہیں کہ وہ کسی ناجائز فعل کو جائز قرار دے دے۔"

ادھر یہ گرماگرمی جاری تھی، دوسری طرف مریدوں نے شیخ محمد شریف کو محمد احمد کے باغیانہ رویے کی خبر پہنچا دی۔

شیخ کو بے حد غصہ آیا اور اسی وقت محمد احمد کو طلب کر لیا اور پوچھا۔ "یہ تم میرے مریدوں میں کیا بکواس کرتے پھر رہے ہو؟"

محمد احمد نے کہا۔ "آپ میری جن باتوں کو بکواس کہہ رہے ہیں، وہ بکواس نہیں ہیں اور اس معاملے میں، میں حق پر ہوں اور میں آپ کو بھی یہ واضح کیے دیتا ہوں کہ شریعت نے جن افعال کو ناجائز قرار دیا ہے، آپ انہیں کسی طرح بھی جائز قرار نہیں دے سکتے۔"

شیخ شریف نے کہا۔ "تم اپنے رویے کی معافی مانگو ورنہ میں تم کو اپنے مریدوں کی فہرست سے خارج کر دوں گا۔"

محمد احمد نے کہا۔ "بہتر ہے کہ میرا نام آپ کے مریدوں کی فہرست سے خارج ہو جائے بجائے اس کے کہ میرا نام دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے۔"

محمد احمد نے خرطوم چھوڑ دیا اور جزیرہ ابا کی واپسی اختیار کی۔ والدین نے ایک عرصے بعد اپنے بیٹے کو دیکھا تو احساس ہوا کہ یہ بہت بدل چکا تھا اور وہ بھی اپنے بیٹے کی عزت و تکریم پر مائل ہو گئے۔

محمد احمد نے اپنے گرد و پیش اسلام کی حالت زار دیکھی تو اسے بے حد افسوس ہوا۔ اسے کوئی شخص بھی مخلص نظر نہ آیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے مذہب کے نام پر دکانیں کھول دی گئی ہیں اور ہر کوئی دنیا کی کمائی میں مشغول ہو گیا ہے۔ اس کو اپنے ماحول سے کراہت اور نفرت سی ہونے لگی۔ وہ سکون، فکر اور معاشرے کی بیماریوں کی تشخیص کے لیے تنہائی چاہتا تھا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ بظاہر سوڈان مسلمانوں کا ملک ہے اور اس کے صوبوں میں مقامی مسلمان حاکم بھی پائے جاتے ہیں مگر اصل حکومت انگریز کی ہے اور سوڈان کے آقا انگلستان میں رہتے ہیں۔ وہیں سے گورنروں کے عزل و نصب کے احکامات صادر ہوتے ہیں۔

محمد احمد نے ان سارے امور کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک غار میں روپوشی اختیار کی۔ یہاں مختلف خوشبویات کو ندجلا کر فضا کو معطر کر دیا۔

غار میں عبادت اور ریاضت کا سلسلہ جاری تھا اور غار کے باہر لوگوں میں محمد احمد کے زہد و تقویٰ کی داستانیں شہرت پا رہی تھیں۔ اب لوگوں نے غار کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ یہ لوگ محمد احمد کے مرید ہونا چاہتے تھے۔ آخر محمد احمد کی طرف سے ان کو اندر بلوایا گیا اور مریدوں کی تعداد میں دن دوگنا اور رات چوگنا اضافہ ہونے لگا۔ جو [...] حلقۂ مریدین میں داخل ہو گئے۔

ان علاقوں کے پیرانِ طریقت اس نئے پیر سے خائف نظر آنے لگے۔ دوسرے دیندار اور حضرات تھے۔ یہ لوگ اپنے سوا کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کی دولت مندی [...] علاقے کے لوگ سرنگوں [...] بن گئی تھی۔ ابھی تک تو یہ لوگ کسی کے قابو میں نہیں آئے تھے اور کسی پست خاندان والے کی یہ مجال نہیں تھی کہ ان کے خاندان میں رشتے کی بات کرتا مگر یہی بڑے بڑے صاحبِ ثروت شیوخ اپنی بیٹیوں کے رشتے لے کر آنے لگے۔

محمد احمد نے ان رشتوں سے اجتناب اختیار کیا کیونکہ ان کے عزائم ہی کچھ اور تھے۔ اتنے بڑے عزائم کہ بڑی بڑی طاقتور حکومتیں بھی اس طرح سوچتے ہوئے دہشت محسوس کرتیں۔ وہ سوڈان سے انگریزوں کو نکالنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

یہ ساری باتیں خرطوم پہنچ رہی تھیں لیکن اس وقت اس کے ساتھ آدمی تو تھے مگر ہتھیار نہ تھے۔ اسی دوران اس شخص کی ملاقات مولانا جمال الدین افغانی سے ہو گئی۔ جمال الدین افغانی بھی محمد احمد کی شہرت اور تقویٰ کے قائل ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا، محمد احمد سے ملے اور دیر تک حالاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ مولانا کو اس حسنِ اتفاق کا علم تھا کہ محمد احمد کے والد کا نام عبداللہ اور ماں کا نام آمنہ ہے۔ مولانا نے مشورہ دیا۔ ”اس حسنِ اتفاق سے فائدہ اٹھاؤ۔“

شاید محمد احمد کے ذہن میں بھی کوئی ایسی بات تھی۔

محمد احمد نے پوچھا۔ ”میں اس حسنِ اتفاق سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہوں؟“

مولانا افغانی نے مغربی استعمار کا ذکر کیا۔ ”آج کل افریقا اور ایشیا پر مغربی اقوام کا غلبہ بڑھتا جا رہا ہے جس کے نتیجے میں ان کی مشرقیت اور مذہبیت مجروح ہو رہی ہے۔ تم سوڈان سے انگریزی اثرات زائل کر سکتے ہو۔“

محمد احمد نے کہا۔ ”لیکن میرے پاس نہ تو اسلحہ ہے اور نہ فوجی تربیت کا کوئی انتظام۔ ہاں مریدوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ انگریزوں سے ٹکر لینا آسان کام نہیں ہے۔“

مولانا نے کہا۔ ”دروغِ مصلحت آمیز، بہ از راستیٔ فتنہ انگیز۔ تم مہدویت کا دعویٰ کر سکتے ہو۔ اس سے تمہارے مریدوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے گا اور یہ لوگ احیائے دین کے لیے اپنی جانیں قربان کر دینے میں فخر محسوس کریں گے۔“

محمد احمد نے دریافت کیا۔ ”مریدوں کی کثرت ہمیں کیا فائدہ پہنچائے گی کیونکہ ان کے پاس ہتھیار نہیں ہوں گے؟“

مولانا نے کہا۔ ”پہلے تم اپنے مریدوں میں اسلامی روح پیدا کرو۔ ان کی تربیت کرو اور انہیں بتاؤ کہ اسلام کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ جب اس میں کامیاب ہو جاؤ تو ان کو جہاد کی تلقین کرو۔ جہاد فی سبیل اللہ۔“

مولانا تو یہ مختصر سا مشورہ دے کر چلے گئے لیکن اس مشورے میں محمد احمد کے لیے ایک ایسا خاکہ موجود تھا کہ اس سے مکمل تیاری کر کے وہ کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دے سکتا تھا۔

اب محمد احمد نے دین کے ساتھ ساتھ دنیا پر بھی توجہ دینا شروع کر دی۔ اس نے اپنے مریدوں کو بتایا کہ خالص دین کیا ہوتا ہے اور ملاوٹ والا دین کسے کہتے ہیں اور یہ بھی بتایا کہ اکثر شیوخ اور علمائے دین، یہ سب موقع پرست، جاہ طلب اور دنیا دار لوگ ہیں۔ اپنے مطلب کے لیے یہ لوگ دینی امور میں حسبِ منشا تاویلات سے کام لیتے ہیں۔

محمد احمد نے جو زندگی اختیار کی تھی، وہ بہت دشوار تھی۔ مریدوں پر اس کا خاص اثر ہوا اور یہ بھی پیر و مرشد کی طرح بننے کی کوشش کرنے لگے۔

یہ خبریں خرطوم پہنچیں تو خرطوم کے گورنر کو ایک فکر لاحق ہو گئی۔

مئی 1881ء میں محمد احمد نے دلیرانہ قدم اٹھایا۔ ان دنوں سوڈان خدیو مصر کے ماتحت تھا اور مصری حکومت کی طرف سے رؤف پاشا سوڈان کا گورنر تھا اور خدیو مصر سلطنتِ انگلشیہ کا تابعدار تھا۔

محمد احمد نے سوڈان کے تمام ممتاز لوگوں کے نام مراسلات بھیجنا شروع کر دیے۔ ان مراسلات کا مضمون تھا۔

”جناب آپ کو ... جس مہدی کے آنے کی اطلاع دی تھی، وہ میں ہوں۔ مجھے خداوند عالم کی طرف سے بشارتِ کبریٰ عطا ہوئی ہے تاکہ میں دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دوں اور ان تمام خرابیوں کی اصلاح کروں جو لوگوں نے دینِ متین میں پیدا کر دی ہیں اور مجھے حکم ملا ہے کہ تمام عالم میں ایک مذہب، ایک شریعت اور ایک بیت المال قائم کروں اور جو شخص میرے احکام کی تعمیل نہ کرے، اسے بحیرۂ عدم میں غرق کر دوں۔“

یہ مراسلات سوچ سمجھ کر ماہِ رمضان میں جاری کیے گئے تھے۔ گویا مہدی موعود ہونے کا دعویٰ ماہِ رمضان میں کیا گیا جبکہ قرآن کا نزول بھی ماہِ رمضان میں ہوا تھا۔ یہ سوچی سمجھی مطابقت تھی جس کا زبردست اثر ہوا اور قلیل مدت میں سوڈان اور مصر کے طول و عرض میں اس دعوت کا چرچا ہونے لگا۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ سوڈان کے گورنر رؤف پاشا کو خرطوم میں جولائی کے مہینے میں ان مراسلات کی خبر ہوئی۔ گویا دو ڈھائی ماہ بعد۔ رؤف پاشا کو اندازہ تھا کہ یہ خبریں مصر میں بھی پہنچ رہی ہوں گی اور خدیو مصر اس سے اس کا جواب طلب کرے گا۔

رؤف پاشا نے اس جواب طلبی سے پہلے ہی ابو سعود نامی شخص کو اپنا نمائندہ بنا کے محمد احمد کے پاس روانہ کیا۔

ابو سعود کو چار جید علما بھی دیے گئے جو مذہبی معاملات میں محمد احمد سے بحث و مباحثہ کر سکتے تھے۔ ابو سعود کو یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ وہ مہدی سوڈانی کو بہلا پھسلا کے کسی طرح خرطوم لے آئے۔ اس کے بعد حکومت خود اس کی مزاج پرسی کرے گی۔

ابو سعود نے یہ سفر کشتی کے ذریعے کیا اور جزیرہ ابا پہنچ گیا۔

اس نے کشتی سے اترتے ہی بآوازِ بلند پوچھا۔ ”وہ شخص کہاں ہے جس نے مہدویت کا دعویٰ کیا ہے؟“

مریدوں نے مہدی سوڈانی کو اطلاع دی تو یہ شخص خود اپنے چند مریدوں کے ساتھ ساحل پر پہنچ گیا اور کہا۔ ”تو کون ہے اور تجھ کو یہاں کس نے بھیجا ہے؟“

رؤف پاشا کے اس نمائندے کو ایک شاندار ساحلی عمارت میں ٹھہرایا گیا تھا اور جس وقت مہدی سوڈانی، ابو سعود کے سامنے پہنچا تو وہ ایک شاندار مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔

مہدی سوڈانی نے اس کے مرتبے اور مقام کی پروا کیے بغیر یہ جسارت کی کہ نہایت بے تکلفی سے اس کی مسند پر جا بیٹھا۔

”میں ہوں مہدی۔ میرا نام محمد احمد ہے۔ میرے باپ کا نام عبداللہ اور میری ماں کا نام آمنہ ہے۔“

ابو سعود اور اس کے ساتھی چاروں علما نے محمد احمد کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور ابو سعود نے حیرت سے کہا۔ ”یہ تم ہو مہدی سوڈانی؟“

اس کے ساتھ ہی ابو سعود نے اشارہ کیا کہ وہ اس کی مسند سے اٹھ جائے مگر محمد احمد نے اٹھنے سے انکار کر دیا اور کہا۔ ”اے گورنر خرطوم کے نمائندے! مجھے دیکھ کہ میں وہ مہدی ہوں جس کا انتظار کیا جا رہا تھا اور یہ تیرا فرض ہے کہ تو بھی میری مہدویت پر ایمان لائے۔“

ابو سعود کسی حد تک مرعوب ہو چکا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”اس دعوے سے تمہاری غرض کیا ہے؟“

مہدی سوڈانی نے جواب دیا۔ ”خدائے کردگار نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ میں روئے زمین کو عدل و انصاف سے بھر دوں۔ کفر کو سرنگوں اور دینِ حنیف کو تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کروں۔ خدا کی زمین پر خدائے لم یزل کا قرآنی قانون حکمران ہو اور ہر طرف اسلام سربلند دکھائی دے۔“

ابو سعود نے کہا۔ ”مصر کا خدیو اور خرطوم کا گورنر رؤف پاشا بھی مسلمان ہی ہیں اور تم بھی مسلمان ہو تو پھر ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو تبلیغ و تلقین کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟“

مہدی سوڈانی نے کہا۔ ”غلط، بالکل غلط۔ نہ تو خدیو مصر مسلمان ہے اور نہ رؤف پاشا۔ اگر یہ مسلمان ہوتے تو نصاریٰ کو سیاہ و سفید کا مالک نہ بنا دیتے۔ پورے ملک میں جگہ جگہ گرجے تعمیر ہو رہے ہیں اور عیسائیوں کی تبلیغی جماعتیں مسلمانوں کو مرتد بنانے کی کوششوں میں مشغول ہیں۔“

ابو سعود نے مہدی کو سمجھایا۔ ”دیکھو، مصری حکومت اور سلطنتِ انگلشیہ کی مخالفت اچھی بات نہیں۔ تم جو کچھ کر رہے ہو، اسے یہیں روک دو۔ میرے ساتھ خرطوم چلو۔ گورنر رؤف پاشا تمہارا انتظار کر رہا ہے اور جو کچھ تم مجھ سے کہہ رہے ہو، یہی باتیں اس سے کرو۔ اگر وہ قائل ہو جائے گا تو میں بھی خاموش ہو جاؤں گا۔“

"میں وہاں نہیں جا سکتا۔"

مہدی سوڈانی نے جواب دیا۔ "تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ میرے ساتھ خرطوم چلو اور خود کو رؤف پاشا کے حوالے کر دو۔ اگر تم نے میری یہ بات نہ مانی تو جان لو کہ تمہارے خلاف طاقت استعمال کی جائے گی اور انگریزی جنگی جہاز گولہ باری کر کے تیرے اس جزیرۂ ابا کو خاک سیاہ کر دیں گے۔"

ابو سعود نے درشت لہجہ اختیار کیا اور دھمکی دی۔

اس وقت مہدی سوڈانی کے بائیں کمر سے شمشیر لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے شمشیر کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کسی بدبخت کی کیا مجال کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے اور تیری بہتری اسی میں ہے کہ تو یہاں سے فوراً چلا جا اور آئندہ اپنے دل سے یہ خیال نکال دے کہ میں تیرے ساتھ خرطوم جاؤں گا۔"

ابو سعود خوفزدہ ہو گیا۔ اسے افسوس تھا کہ اس کے ساتھ آنے والے چاروں علماء شروع سے آخر تک خاموش رہے تھے اور جب اس نے یہ شکایت ان چاروں سے کی تو عالموں نے جواب دیا۔ "یہ جنونی شخص ہماری کسی دلیل سے قائل نہ ہوتا، اس لیے ہم خاموش رہے۔ کیا آپ نے اس کے تیور نہیں دیکھے۔ ہمیں تو یہ دھڑکا لگ رہا تھا کہ اگر بات زیادہ بڑھی تو یہ جنونی آپ پر اپنی شمشیر سے حملہ آور ہو جائے گا۔"

ابو سعود خرطوم واپس پہنچا اور رؤف پاشا کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

رؤف پاشا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تو نے وہاں کے حالات دیکھے ہیں۔ اب ہمیں مشورہ دے کہ ہم اس فتنے کو کس طرح کچلیں؟"

ابو سعود نے مشورہ دیا۔ "جناب والا! میں نے اس کی قوت کا اندازہ لگا لیا ہے۔ ابھی وہ اتنا طاقتور نہیں ہے کہ ہم اس کے خلاف کوئی بڑی طاقت استعمال کریں۔ آپ ہمیں پچاس جنگجو دے دیں۔ میں اس منافق کو گرفتار کر کے آپ کے حوالے کر دوں گا۔"

لیکن رؤف پاشا کو ابو سعود کے جواب سے اطمینان نہ ہوا۔ اس نے کہا۔ "صرف پچاس سپاہی یا دو چار سو۔ مجھے تو یہ شخص تیرے پچاس سپاہیوں کے بس کا نہیں معلوم ہوتا۔"

ابو سعود نے جواب دیا۔ "میں نے اس خانہ ساز مہدی کی قوت کا اندازہ لگا لیا ہے۔ یہ گرجنے والا بادل کیا برسے گا؟"

رؤف پاشا نے پچاس جنگجو ابو سعود کے حوالے کر دیے اور تاکید کرتے ہوئے کہا۔ "جتنی جلدی ممکن ہو، اس فتنے کو کچل دیا جائے۔ تو نے اگر ہزار پانچ سو سپاہیوں کا مطالبہ کیا ہوتا تو میں ان کا بھی انتظام کر دیتا۔"

ابو سعود پچاس جنگجو اپنے ساتھ لے کر جزیرۂ ابا کی طرف روانہ ہو گیا۔

مہدی سوڈانی کو اس کے آدمیوں نے پہلے ہی سے خبردار کر دیا تھا کہ پچاس جنگجو ان کی سرکوبی کے لیے آ رہے ہیں۔ مہدی نے ساحل کے آس پاس اپنے مریدوں کو چھپا دیا اور حکم دیا۔ "یہ جیسے ہی ساحل پر اتریں، ان کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔"

ابو سعود اپنے خیالوں میں کامیابی کے نشے میں چور معلوم نہیں کیسے کیسے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ابا کے ساحل پر ملک الموت ان سب کا انتظار کر رہا ہے۔

ابو سعود جزیرۂ ابا کے ساحل پر اتر کر اپنے آدمیوں کو ہدایات ہی دے رہا تھا کہ اچانک مہدی سوڈانی کے مریدوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ ذرا سی دیر میں ان سب کا صفایا ہو گیا۔ ان کے ہتھیار مریدوں کے قبضے میں چلے گئے۔

یہ خبریں خرطوم میں رؤف پاشا کو پہنچیں تو وہ سخت پریشان ہوا اور سوچنے لگا کہ ابو سعود تو اپنے پچاس سپاہیوں کے ساتھ مارا گیا۔ اب کیا تدبیر کی جائے کہ اس پر قابو پایا جائے؟

رؤف پاشا نے خدیو مصر کو سوڈان کے حالات لکھ بھیجے اور مشورہ لیا کہ ان حالات میں انہیں کیا کرنا چاہیے؟

خدیو مصر نے بھی حالات کا صحیح اندازہ نہ کیا اور تین سو سپاہی اور دو عدد توپیں ایک جنگی جہاز کے ذریعے جزیرۂ ابا روانہ کرنے کا مشورہ دیا اور امید ظاہر کی کہ اس طرح اس فتنے کو بہ آسانی کچلا جا سکے گا۔

یہ دستہ 11 اگست کی صبح جزیرۂ ابا روانہ کر دیا گیا۔ اس کا کمانڈر علی آفندی تھا۔ یہ فوجی قافلہ جزیرۂ ابا سے کچھ فاصلے پر اترا۔ اس فوجی دستے کی خبر بھی مہدی سوڈانی کو مل چکی تھی اور اس نے بھی اپنے آس پاس بہت سے آدمی جمع کر لیے تھے۔

علی آفندی نے دور سے ایک ہجوم کو دیکھا۔ یہ ہجوم ایک شخص کی سرداری میں علی آفندی کی طرف آ رہا تھا۔ علی آفندی نے ہجوم اور اس کے درمیان معزز شخص کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ شاید یہی شخص مہدی سوڈانی ہے۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اچانک ان پر حملہ کر دیا۔ علی آفندی نے جس شخص کو غلطی سے مہدی سمجھا تھا، اس کو مخاطب کیا۔ "تو نے ملک میں کیوں فساد ڈال رکھا ہے؟"

پھر دوسری طرف سے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی علی آفندی نے اس شخص کو گولی ماردی اور اپنی دانست میں اس فتنے کو ختم کر دیا۔

کردو بار رواں کے ساتھیوں نے اتنی جلدی اور تیزی سے جوابی کارروائی کی کہ علی آفندی اور اس کے تین سو سپاہیوں کو مرنے والے کے سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا اور سبھی مارے گئے۔ مقتولوں کے ہتھیار مہدی سوڈانی کے مریدوں کے ہاتھ آئے۔

اب بھی جہاز پر کچھ سپاہی موجود تھے اور وہ دور سے گولہ باری کر سکتے تھے۔ افسر توپ خانہ نے حکم دیا کہ ان مریدوں کو گولہ باری کر کے نیست و نابود کر دیا جائے مگر توپ چلانے والوں نے مہدی سوڈانی کے مریدوں کی مقدس وضع قطع دیکھی تو ان کے دل جذبۂ احترام سے سرشار ہو گئے اور انہوں نے گولہ باری میں لیت و لعل سے کام لیا۔ جب زیادہ دباؤ بڑھا تو ہوائی فائر شروع کر دیے۔

مہدی سوڈانی نے اپنے مریدوں کو ہدایت کی کہ وہ دونوں جہازوں کے مقابل سے ہٹ جائیں اور یہ لوگ فوراً ہی سامنے سے ہٹ گئے۔

دونوں جہاز سپاہیوں سے محروم ہو چکے تھے اس لیے یہ بھی مریدوں کے اچانک حملے سے خوفزدہ ہو کر بحالت شکست خوردگی خرطوم واپس چلے گئے۔ اس دوسری شکست نے مہدی سوڈانی کی طاقت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا جبکہ مصر کی سرکاری فوج خوفزدہ ہو گئی اور یہ لوگ بھی مہدی سوڈانی کی بزرگی کے قائل نظر آنے لگے۔

مہدی سوڈانی نے اس دوسرے حملے کے بعد جزیرۂ ابا کو مخدوش قرار دے دیا۔ یہاں سے خرطوم بہت قریب تھا اور یہ قربت مہدی کے لیے مستقل خطرے کی علامت تھی۔ اس نے اپنے مریدوں کو جمع کیا اور انہیں بتایا کہ وہ جزیرۂ ابا کو چھوڑ رہا ہے۔ اس نے اپنے ایک مرید خاص احمد مکاشف کو ابا میں اپنا قائم مقام مقرر کیا اور خود کوہ کردو خان چلا گیا۔ اب یہ جگہ اس کا مرکز اور مستقر قرار پائی۔

جزیرۂ ابا کے شمال میں پچاس میل کے فاصلے پر نیل اسٹیشن کے قریب کادانا می مقام پر ایک مصری فوج پہلے سے ٹھہری ہوئی تھی۔ اس فوج میں چودہ سو سپاہی تھے اور اس کا کمانڈر محمد سعید پاشا تھا۔

جب مہدی سوڈانی کوہ کردو خان پہنچا تو اسے اس مصری فوج کے بارے میں بتایا گیا۔ اس نے فوراً کردو خان کے جنوبی حصے کا رخ کیا۔

محمد سعید پاشا نے یہ سوچا کہ اگر وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اچانک مہدی سوڈانی اور اس کی جماعت کا خاتمہ کر دے گا تو بڑی شہرت پائے گا اور مصری حکومت اس کو انعام و اکرام کا مستحق قرار دے گی۔

محمد سعید پاشا نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور کردو خان کے کوہستانی جنگلات میں مہدی سوڈانی اور اس کی جماعت کا پتا لگانے لگا۔ اس جستجو میں وہ خود اور اس کی فوج اصل راستے سے بھٹک گئی۔ اب وہ مہدی سوڈانی کو بھول بھال کے یہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے مگر انہیں راستہ نہیں مل رہا تھا اور یہ بھی عجیب اتفاق کی بات تھی کہ انہیں کوئی مقامی راہنما بھی نہ ملا جس سے وہ راستہ پوچھ کر ان بھول بھلیوں سے باہر نکلتے۔

مہدی سوڈانی جنوبی کوہستانی سلسلے میں اطمینان سے ان چودہ سو سپاہیوں کی پریشانی کا حال سن رہا تھا۔ آخر مصری سپاہ کھانے پینے سے بھی محروم ہو گئی۔ ان کے پاس جو کچھ تھا، وہ راستہ بھٹکتے ہوئے خرچ ہو چکا تھا اور دور دور تک آبادی کا پتا نہ تھا جہاں سے کھانے پینے کا سامان حاصل کیا جاتا۔ اب اس بھوکی پیاسی فوج کو مہدی کے تقدس کا احساس ہوا اور وہ اپنی اس پریشانی کو من جانب اللہ سزا سے تعبیر کرنے لگے۔ انہیں اپنے کمانڈر پر غصہ آ رہا تھا جس نے ان کو بھوک پیاس کی اس وادی میں لا ڈالا تھا۔ ان میں آپس میں جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرا کے آپس میں جنگ شروع کر دی۔ یہ جنگ اس وقت ختم ہوئی جب ان کا ایک ایک سپاہی اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اس جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا کیونکہ بھوک پیاس کی نقاہت نے انہیں لڑنے کے قابل ہی نہ رکھا تھا۔ یہ بھوکے پیاسے اپنی موت آپ مر گئے۔ جو دو چار باقی بچے اور یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے، انہوں نے اپنی یہ داستانِ غم دوسروں تک پہنچائی اور دنیا کو محمد سعید پاشا اور اس کے چودہ سو سپاہیوں کے انجام کا علم ہوا۔

☆☆☆

قاہرہ میں یہ تشویشناک خبریں پہنچیں تو وہاں سے رؤف پاشا کو یہ حکم بھیجا گیا کہ وہ اس فتنے کو مزید ڈھیل نہ دے اور جس طرح بھی ممکن ہو، مہدی سوڈانی کو گرفتار کرلے اور اس کی جمعیت کو منتشر کردے۔

رؤف پاشا کو اپنا اقتدار خطرے میں نظر آنے لگا۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو فوجیں مہدی سوڈانی کے مقابلے کے لیے روانہ کیں۔ اسے یقین تھا کہ یہ دونوں فوجیں یکے بعد دیگرے مہدی پر حملہ آور ہوں گی اور ہمیشہ کے لیے اس فتنے کو ختم کردیں گی مگر یہ دونوں فوجیں بھی حسب سابق ناکام رہیں۔ اب مہدی سوڈانی کے مرید درویش کہلانے لگے تھے۔ ان درویشوں نے رؤف پاشا کی دونوں فوجوں کو نیست و نابود کردیا اور ان کے ہتھیاروں کو انعام الٰہی سمجھ کر ذخیرہ کرلیا۔

اب قاہرہ کی حکومت کے لیے رؤف پاشا کا وجود ناقابلِ برداشت اور فضول سا ہو کر رہ گیا تھا۔

قاہرہ سے رؤف پاشا کے نام ایک سخت فرمان جاری ہوا کہ اب اسے آخری موقع دیا جارہا ہے۔ وہ اپنی ساری توانائی اور دانائی اس فتنے کے خاتمے پر صرف کردے اور اگر وہ اس بار بھی ناکام و نامراد رہا تو اسے معزول کردیا جائے گا اور اس کی جگہ کسی ایسے شخص کو بھیجا جائے گا جو مزید وقت اور فوج ضائع نہیں کرے گا۔

رؤف پاشا پہلے ہی پریشان تھا۔ اب اس سخت فرمان نے اس کے ہوش و حواس خطا کردیے اور وہ مہدی سوڈانی اور اس کے درویشوں کے خاتمے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

اسی غور و فکر کے دوران رؤف پاشا کو حاکم نشودہ رشید بے کا خیال آیا۔ اس شخص کا اپنے کامیاب محاربات کی وجہ سے بڑا شہرہ تھا۔ گورنر ہونے کے باوجود رؤف پاشا نے رشید بے سے درخواست کی کہ وہ اس مہم کے انصرام کی ذمے داری قبول کرے اور اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ خودکشی کرلے گا۔

رشید بے کو رؤف پاشا کی حالتِ زار دیکھ کر افسوس ہوا اور اس نے نہایت ہوشیاری اور دلجمعی سے مہدی سوڈانی کے خلاف جنگ کی منصوبہ بندی کی۔ وہ خود بھی اپنی ناکامی کو باعثِ ذلت سمجھتا تھا۔

رشید بے نے انتہائی احتیاط سے جنگ کی منصوبہ بندی کی اور قطعی فتح حاصل کرنے کے ارادے سے مہدی سوڈانی کے مقابلے پر روانہ ہوگیا۔

مہدی سوڈانی اور اس کے درویشوں کے پاس جذبۂ خلوص اور ایمان کی قوت کے علاوہ کچھ ہتھیار بھی تھے۔ یہ ہتھیار انہوں نے اپنے دشمن سے چھینے تھے۔ ان درویشوں کے پاس بندوقیں بھی تھیں لیکن ان کا سب سے زیادہ کارآمد اور مفید ہتھیار نیزہ تھا۔ یہ اپنے نیزوں کا استعمال بڑے بھرپور انداز میں کرتے تھے۔ یہ نیزے دشمنوں کے حلق میں سوراخ کردیتے تھے اور یہی نیزے پسلیوں کو توڑتے ہوئے دوسری طرف نکل جاتے تھے۔ بازوؤں کو چھیدتے تو ہاتھ بے کار ہوجاتے۔ ٹانگوں کو چھیدتے تو آدمی چلنے پھرنے کے لائق نہ رہ پاتا۔ ان کے دشمن ان کے نیزوں سے بہت گھبراتے تھے۔

رشید بے اپنی فوج لے کر مہدی سوڈانی کے مقابلے میں پہنچا تو اس کا ارادہ یہ تھا کہ یہ مہدی سوڈانی کی آخری جنگ اور آخری شکست ہوگی۔

اس نے اپنے جاسوسوں کو پھیلا دیا تاکہ وہ درویشوں کی منزل و مستقر کی صحیح صحیح خبر دیں لیکن کئی دن کی متواتر کوششوں کے بعد بھی اسے ناکامی ہوئی۔ رشید بے نے جھنجلا کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”میں مزید صبر نہیں کرسکتا اس لیے تم میں سے جو بھی مہدی سوڈانی اور اس کے درویشوں کا ٹھیک ٹھیک پتا لگائے گا، اسے انعام و اکرام بھی دیا جائے گا۔“

ایک بار پھر بڑے پیمانے پر مہدی اور اس کے درویشوں کی تلاش شروع ہوگئی۔

دوسری طرف مہدی نے نہایت حکمتِ عملی سے اپنے درویشوں کو اِدھر اُدھر گھات میں بٹھا دیا تھا کہ وہ جیسے ہی ان کے پاس سے گزریں، ان پر اچانک بے خبری میں حملہ کردیا جائے۔ دشمن کو بندوق چلانے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔

ایک مختصر سی جمعیت کو رشید بے کی فوج کو گمراہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اور اسے حکم دیا گیا کہ وہ افریقا کے گوریلوں کی طرح تیزی سے نمودار ہو کر حملہ کریں، لوٹیں ماریں پھر اِدھر اُدھر روپوش ہوجائیں جن کے عقب میں تازہ دم درویشوں کے گروہ رشید بے کی پیچھا کرنے والی فوج کے پیچھے سے نمودار ہو کر اس کا کام تمام کردے۔

اس تجویز پر نہایت خوبی سے عمل ہوا جس سے رشید بے کو بے حد نقصان پہنچا۔ جب اس جنگ کا خاتمہ ہوا تو پتا چلا کہ تازہ دم درویش کم سے کم نقصان اٹھانے کے بعد اپنے دشمن کی چیزوں پر قبضہ کرتے پھر رہے ہیں۔

[illegible]

درویشوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

اب مہدی سوڈانی کے دشمنوں کا صفایا ہوچکا تھا۔ پہلے جو لوگ اس کی مہدویت کے قائل نہ تھے، اب وہ بھی قائل ہوگئے تھے اور مہدی سوڈانی کے آس پاس اس کے جانثاروں کی تعداد بڑھتی چلی جارہی تھی۔ مقامی لوگ مہدی سوڈانی کا دل سے احترام کرنے لگے تھے۔

جب یہ مہم بھی ناکام ہوئی تو رؤف پاشا کے لیے گورنر کے منصب پر رہنا دشوار ہوگیا۔ قاہرہ کی حکومت کو اب کسی نئے گورنر کی فکر ہوئی۔ ایک ایسا گورنر جو رؤف پاشا جیسا نااہل اور ناکارہ نہ ہو اور جو ایک ہی حملے میں مہدی سوڈانی اور اس کے درویشوں کی طاقت کا خاتمہ کردے۔

کئی نام سامنے آئے لیکن قرعۂ فال عبدالقادر پاشا کے نام نکلا۔ 1882ء کے شروع ہوتے ہی رؤف پاشا کو معزول کردیا گیا اور عبدالقادر پاشا کو سوڈان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس تھوڑے سے وقفے سے مہدی سوڈانی نے بڑا فائدہ اٹھایا اور سوڈان کے کئی حصوں پر قبضہ کرلیا۔ درویشوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوتا جارہا تھا اور جو بھی مہدی سوڈانی کی درویشی اختیار کرتا، حرکت و عمل کا پیکر بن جاتا۔

عبدالقادر پاشا اپنے پیشرو رؤف پاشا کی طرح کوئی کام عجلت میں نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اپنی تقرری کو ذاتی عزت و ناموس کو داؤ پر لگا دینے کے مترادف سمجھتا تھا۔ اس نے خوب سوچ سمجھ کر جنرل شلالی نامی ایک شخص کو اس مہم کے لیے آگے بڑھایا۔ اس شخص کا ماضی بہت تابناک تھا اور اس نے بھی اس مہم کی کامیابی اور ناکامی کو اپنے مستقبل کی روشنی اور تاریکی کا منبع قرار دیا۔ وہ درویشوں کی بے جگری کی داستانیں سن چکا تھا اور اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ درویش گوریلا جنگ کے ماہر تھے اور ان کے نیزے بندوق کی گولیوں سے بہتر کام کرتے ہیں۔

نئے گورنر عبدالقادر پاشا کو بھی مہدی سوڈانی کی قوت کا صحیح اندازہ نہ تھا اور اب تک جو ناکامیاں ہوئی تھیں، انہیں وہ رؤف پاشا کی نااہلی سے منسوب کر رہا تھا۔ جنرل شلالی نے گورنر سے مشورہ کیا کہ مہدی سوڈانی کے خلاف کارروائی کے لیے کتنی فوج کافی ہوگی؟

اس نے مشورہ دیا۔ ”فی الحال یہ فتنے کی ابتدا ہے۔ اگر مہدی سوڈانی پر اچانک حملہ کردیا جائے تو اس کے لیے چھ سات ہزار کی سپاہ کافی ہوگی اور کارروائی کا آغاز ان شہروں سے ہو جنہیں مہدی سوڈانی نے چھوڑ دیا ہے۔ پہلے ان شہروں سے اس کے اثرات مٹائے جائیں اس کے بعد آخری مقابلہ مہدی سوڈانی سے ہو۔“

جنرل شلالی نے چھ ہزار کی ایک فوج مرتب کی اور مئی 1882ء میں یہ فوج [illegible] میں داخل ہوئی اور یہاں سے خشکی کے راستے آگے بڑھی۔

مہدی سوڈانی کو ساری اطلاعات بروقت پہنچتی رہتی تھیں۔ اس نے نہایت ہوشیاری سے اپنے درویشوں کو اپنے خلاف آنے والی فوج کے راستوں میں چھپا دیا تھا۔

7 جون کو جنرل شلالی اپنے خیال میں مہدی سوڈانی کے قریب پہنچ چکا تھا اور وہ حملہ آور ہونے کی حکمت عملی طے کر رہا تھا کہ درویشوں نے اس فوج پر اچانک حملہ کردیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ جنرل شلالی اپنا دفاع بھی نہ کرسکا اور درویشوں نے چند گھنٹوں میں پوری فوج کا صفایا کردیا۔ بس چند ہی سپاہی اپنی جانیں بچا لینے میں کامیاب ہوئے اور اپنی ناکامی کی داستان عبدالقادر پاشا کو سنائی۔

اب تو عبدالقادر پاشا کو بھی یہ احساس ہوا کہ مہدی سوڈانی اور اس کے درویش معمولی لوگ نہیں ہیں اور ان کے لیے صرف فوجی کارروائی کافی نہیں، سیاسی حکمتِ عملیاں بھی اختیار کرنا چاہئیں۔

جنرل شلالی کی شکست نے سوڈان والوں کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ مہدی محمد احمد کے ساتھ تائید ایزدی شامل ہے اور اسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ اس سوچ کا نتیجہ یہ نکلا کہ درویشوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔

گورنر عبدالقادر پاشا نے سیاسی حکمتِ عملی سے کام لینا شروع کردیا تھا۔ اس نے ہزاروں ہینڈ بل چھپوائے اور پوسٹر تیار کروائے۔ ان میں اعلان کیا گیا تھا کہ جو شخص ایک درویش کو قتل کرے گا اسے دو پاؤنڈ بطور انعام دیے جائیں گے اور جو شخص کسی درویش سردار کو قتل کرے گا اس کو اٹھارہ پاؤنڈ بطور انعام ملیں گے۔

[illegible]

ملازمتیں بھی دی جائیں گی۔

انعام و اکرام کے علاوہ بہترین ملازمتیں بھی دی جائیں گی۔ پمفلٹ جزیرہ ابا اور کرودخان کے گھروں میں ڈلوا دیے گئے اور پورے شہر بازاروں اور شاہراہوں کی دیواروں پر چسپاں کروا دیے گئے۔

لیکن مہدی سوڈانی سے حد سے بڑھی ہوئی عقیدت مندی کا یہ حال تھا کہ انہوں نے ہینڈبلوں کو نذرِ آتش کر دیا اور لوگوں نے پوسٹروں کو دیواروں سے الگ کر کے پرزے پرزے کر کے ہوا میں اڑا دیا۔ عبدالقادر پاشا کو اپنی اس حکمتِ عملی سے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔

اس نے بدرجۂ مجبوری فیصلہ کیا کہ اس مسئلے کو فوجی قوت سے ہی حل کرنا چاہیے۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی اس نے فوجی تیاری شروع کر دی۔ تھوڑی عرصے میں بارہ ہزار تربیت یافتہ فوج تیار کر لی۔ کرودخان کا صدر مقام ابیض تھا اور محمد سعید پاشا یہاں کا حکمران تھا۔ گورنر عبدالقادر پاشا نے سوچا کہ اگر درویش کرودخان میں داخل ہو گئے تو وہ ابیض پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اپنے اسی اندیشے کے پیشِ نظر اس نے اپنے ایک ہزار فوجی ابیض روانہ کر دیے اور محمد سعید پاشا کو ہدایت کی کہ وہ مہدی سوڈانی سے اپنے شہر ابیض کو ہر قیمت پر بچائے۔

ان احکام اور ایک ہزار فوجیوں کے پہنچتے ہی محمد سعید پاشا مستعد ہو گیا اور اس نے ابیض میں داخلے کے تمام راستے بند کر دیے لیکن اس غریب کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ابیض کے باشندے ذہنی طور پر محمد احمد کی برتری تسلیم کر چکے ہیں اور ان کی ساری ہمدردیاں محمد مہدی سوڈانی کے حق میں تھیں۔

مہدی سوڈانی نے بھی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اسے کرودخان میں رہنا ہے تو ابیض شہر پر اس کا قبضہ ہونا چاہیے۔ وہ ابیض کی تسخیر کے لیے ابیض شہر کی طرف بڑھا اور اس کے سامنے اپنے درویشوں کے خیمے نصب کر دیے۔

محمد سعید پاشا نے اطراف سے بھی فوج بلوائی تھی۔

ستمبر 1882ء کے شروع میں مہدی سوڈانی نے محمد سعید پاشا کو لکھا کہ وہ ابیض شہر کو اس کے حوالے کر دے۔ مہدی سوڈانی کا یہ فرمان لے کر چند درویش بے دھڑک محمد سعید پاشا کے پاس پہنچ گئے۔

محمد سعید پاشا نے درویشوں کو عزت اور احترام سے ٹھہرایا اور کہا۔ ”میں تمہارے مہدی کے مکتوب کا جواب اپنے اعیان اور ارکانِ سلطنت سے مشورے کر کے دوں گا۔“

درویشوں کے ایک نمائندے نے کہا۔ ”ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے اور ہمیں جواب ہاں یا نہ میں ملنا چاہیے۔ ہاں کا مطلب ہوگا کہ تم شہر ابیض کو ہمارے حوالے کر دو گے اور تمہارے جواب نہ سے ہم یہ سمجھیں گے کہ تم نے ہمارے مہدی کا کہنا نہیں مانا اور جنگ پر آمادہ ہو۔“

محمد سعید پاشا کی مجلسِ مشاورت میں انتظامی اور فوجی ماہرین نے حصہ لیا۔

انتظامی امور کے ماہرین نے مشورہ دیا۔ ”جس طرح بھی ممکن ہو، فی الحال مہدی سوڈانی کو ٹال دیا جائے۔“

لیکن فوجی ماہرین نے رائے دی۔ ”مہدی سوڈانی سے جنگ کی جائے۔“

لیکن چند سنجیدہ اور بردبار سرداروں نے مشورہ دیا۔ ”درویشوں کو یوں ہی واپس کر دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ ہم اس شہر کے مالک نہیں ہیں جو اپنی مرضی سے یہ شہر تمہارے حوالے کر دیں۔ تم یہ درخواست یہاں کے گورنر عبدالقادر پاشا سے کرو، ہم اسی کے تابع ہیں۔ وہ اگر ہمیں یہ حکم دے گا کہ ہم یہ شہر تمہارے حوالے کر دیں تو یہ شہر تمہارے حوالے کر دیا جائے گا۔“

محمد سعید پاشا کو یہ مشورہ پسند آیا اور اس نے وفد کے درویش ارکان سے صاف صاف کہہ دیا۔ ”میں اپنے گورنر کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔“

وفد نے یہ جواب اپنے مہدی کو پہنچا دیا۔ مہدی سوڈانی نے برافروختگی کے عالم میں حکم دیا۔ ”اب اس شہر کا محاصرہ کر لیا جائے۔“

اس فرمان کے ساتھ ہی ابیض کا محاصرہ کر لیا گیا لیکن یہ عجیب محاصرہ تھا اور عجیب شہر بندی تھی کہ شہری نکل نکل کے درویشوں کے پاس آ جا رہے تھے۔

(جاری ہے)

ماخذات

مشاہیرِ مشرق جرجی زیدان۔ معارِبات مت[illegible] سوڈان مطبوعہ دہلی۔ حیاتِ لارڈ کچز، سر جارج آرتھر

یہ حقیقت ہے کہ اللہ رب العزت نے اس کائنات کا بہت سا اختیار انسانوں کے سپرد کر کے بھی ایک خاص مقام تک اسے بے اختیار ہی رکھا... اس کے باوجود انسان اپنی ناقص عقل کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے... افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ ناکامی کے بعد بھی ناکامی کی وجہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔

رزق اور نصیب کے مابین پُرفکر اور عبرت اثر معرکہ آرائی کا احوال

ابتلا

شبینہ گل
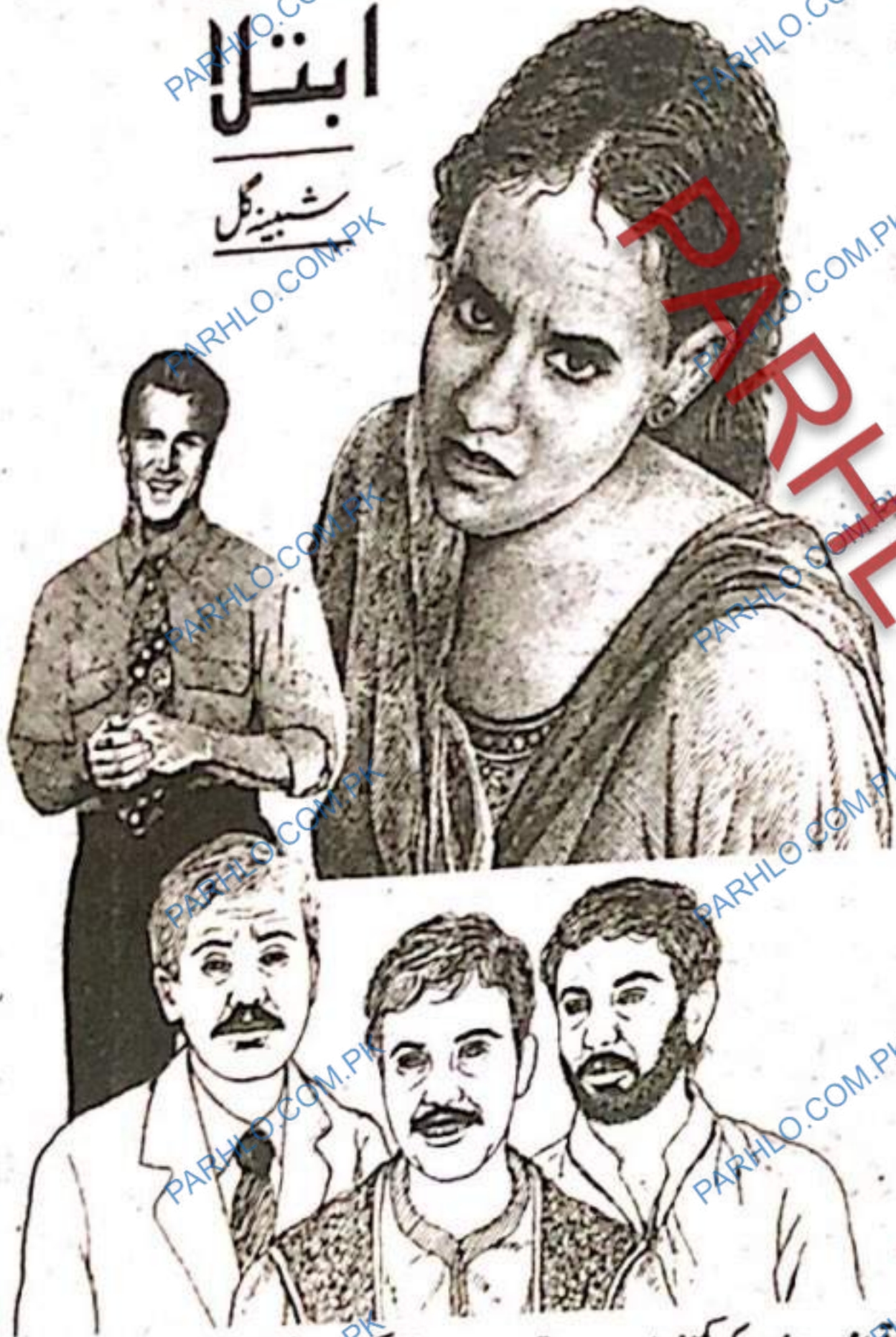
حارث کی ایک بین الاقوامی دواؤں کی کمپنی میں ملازمت پکی ہوئی تھی اور اسی روز اسے نئی نکور، چمچماتی ہوئی بائیک ملی تھی۔ نبیل کو اپنی کمپنی سے اچھی سالانہ کارکردگی پر بونس ملا تھا اور تنخواہ میں اضافہ بھی ہوا تھا۔ سمیر ایک چھوٹی کمپنی سے استعفادے کر بین الاقوامی کمپنی میں منتخب ہو گیا تھا اور عظیم نے حال ہی میں پاکستان کی سب سے بڑی بین الاقوامی دواؤں کی کمپنی کی پرکشش ملازمت کو لات ماری تھی۔ سوانہی خوشیوں کی بنا پر ان چاروں نے موج اڑانے کا سوچا۔ عظیم دراصل منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا۔ یہ پیشہ اس کے باپ دادا کا پیشہ کہا جاتا تو بے جا نہ ہوتا کیونکہ اس کے خاندان کے سبھی مرد اس پیشے سے وابستہ رہے۔ خاصے اثر رسوخ والا مال دار گھرانا تھا، سو کمائی کی فکر

کرنا اس کا دردِ سر کبھی نہیں رہا تھا۔ وہ من موجی زندگی گزار رہا تھا تاوقتیکہ اس کی شادی ہو جاتی۔ گھر والوں کو بھی اس پر ذمے داری ڈالنے کی چنداں فکر نہ تھی کیونکہ وہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور سب سے لاڈلا تھا۔ سو موج اڑانے کے لیے فوڈ اسٹریٹ کا مٹن کڑاہی کا چناؤ عظیم ہی نے کیا اور وہ تینوں ٹھہرے اس کے یار، اس کی مقناطیسی شخصیت، مال و دولت اور فیاضی کے دیوانے۔ وہ تھا ہی یاروں کا یار۔ مٹن کڑاہی کی پیشکش پر تینوں متفق تھے۔ حارث کا خیال تھا کہ سب ل کر اس کے پیسے دیں گے تاکہ مشترکہ ٹریٹ کہلائی جائے لیکن عظیم کی منطق ہمیشہ ہی نرالی ہوتی۔

''یار! میں نے تازہ تازہ نوکری کو لات ماری ہے، آزادی کی سانس لے رہا ہوں۔ میری خوشی زیادہ بڑی ہے اس لیے ٹریٹ بھی میری طرف سے ہوگی۔'' اس بات پر تینوں نے زوردار قہقہہ مارا۔ وہ اتوار کا دن تھا اور چاروں عظیم کے گھر کے قریبی پارک میں اکٹھے ہوئے تھے۔ آگے کا ارادہ چونکہ ہوٹلنگ کے مزے اڑانے کا تھا اس لیے کسی نے بھی کوئی بینچ ڈھونڈ کر بیٹھنے کی زحمت نہیں کی اور گیٹ کے پاس ہی کھڑے کھڑے پروگرام طے کرلیا۔

''چل یار! پھر دیر کس بات کی ہے؟'' نبیل نے ایک دھپ عظیم کے کندھے پر رسید کی تو وہ شہادت کی انگلی میں چابی کی چین گھماتا خود بھی گھوما اور شانِ بے نیازی سے ان تینوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تو پارکنگ میں واپسی کی راہ لینے والوں کا رش بڑھ رہا تھا۔ عظیم اپنی نئی نویلی کار میں بیٹھا تو سمیر نے جھٹ سے اس کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔

''عظیم یار، تیری تو قسمت بھی بڑی عظیم ہے، اور تیرے ابا جی اس سے بھی زیادہ عظیم۔ تو یہ بتا کہ اب تیرا کون سی کمپنی میں رونق افروز ہونے کا ارادہ ہے؟'' یہ سوال سمیر کا تھا جو ہمیشہ عظیم سے مرعوب ہی رہا کرتا تھا۔ عظیم نے مسکراتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھائی اور اے سی آن کرتے ہوئے بولا۔

''اب یہ تو مجھے میرے یار بتائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بیک ویو مرر میں پیچھے بیٹھے حارث اور نبیل کو دیکھا تو وہ اپنی باتیں چھوڑ کر اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔ سمیر اسے اپنی کمپنی میں ہونے والے انٹرویوز کے بارے میں بتانے لگا۔

''سمیر بیٹا! تیری کمپنی ہے تو ملٹی نیشنل لیکن جس اعلیٰ پائے کی کمپنیوں میں عظیم اب تک کام کر چکا ہے، ان کے آگے تیری کمپنی تو پانی بھرتی ہے۔'' نبیل نے پیچھے سے لقمہ دیا تو سمیر جھینپ گیا۔ عظیم نے اس بات پر محض مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ بہت محتاط ڈرائیور تھا اس لیے ڈرائیونگ کے دوران بات چیت بہت ہی کم کرتا تھا اور اپنا پورا دھیان سامنے سڑک پر اور اطراف میں چلتی گاڑیوں پر مرکوز رکھتا تھا۔ چند کلومیٹر آگے ایک انتہائی معروف ترین سگنل تھا جو نوّے سیکنڈ بند رہتا تھا، سو عظیم نے اس سگنل پر گاڑی روکی اور فرصت سے بولا۔

''دیکھو یار! آج میں ذرا کھل کر اپنا مسئلہ تم لوگوں کو بیان کردوں۔ یہ بات تو تم لوگ جانتے ہی ہو کہ میرے پردادا کا شمار پاکستان کی تین سب سے بڑی بین الاقوامی کمپنیوں کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک کمپنی میں میرے بابا سی ای او کا عہدہ سنبھالے بیٹھے ہیں اور دوسری میں میرے چاچا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے اور ندیم بھائی کے کیریئر کا آغاز ہی چوٹی کی کمپنیوں سے ہوا لیکن ندیم بھائی یورپ منتقل ہونے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے تو انہوں نے اپنا ٹرانسفر وہیں کروالیا۔ رہ گیا میں، تو میں جس کمپنی میں بھی جاؤں، وہاں کے میڈیکل ریپس تو کیا، جنرل منیجر تک میری موجودگی میں خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگتے ہیں۔ انہیں مجھ سے ایک عجیب خوف لاحق رہتا ہے جس کی بنا پر نہ وہ میرے ساتھ کام کرنے میں آرام دہ محسوس کرتے ہیں نہ میں ان کے ساتھ۔ میری ہر اچھی کارکردگی کو ناجائز خاندانی حمایت کا نام دیا جاتا ہے اور دیا جاتا رہے گا۔ میں جس کمپنی میں بھی چلا جاؤں، میرے ساتھ یہی مسئلہ ہر جگہ رہے گا اور میرے پاس اس کا کوئی حل نہیں۔ بابا چاہتے ہیں میں سمجھوتا کروں اور تم لوگ جانتے ہو سمجھوتا میرے مزاج کا حصہ نہیں۔ جو چیز مجھے بچپن سے سکھائی ہی نہیں گئی، اب یکدم وہ چیز میں خود میں کیسے پیدا کرلوں۔'' سگنل کھلا اور عظیم نے گاڑی آگے بڑھادی۔ فوڈ اسٹریٹ کی روشنیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی سو اس نے قصہ مختصر کرتے ہوئے دوبارہ لب کشائی کی۔

''میرا یہ مضبوط خاندانی پس منظر میرے کولیگز کے ساتھ ساتھ میرے باسز کو بھی پریشان رکھتا ہے اور ایسے میں مجھے نیچا دکھانے یا اپنے احساسِ کمتری کو تسکین پہنچانے کے لیے جو حرکتیں وہ لوگ کرتے ہیں، وہ سب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہیں۔'' تینوں اس کی بات کی تائید میں سر ہلانے لگے۔ اب وہ فوڈ اسٹریٹ کی معروف ترین پارکنگ میں اپنی گاڑی کے لیے مناسب جگہ تلاش کر رہا تھا جہاں

گاڑیوں کا اتوار بازار لگا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک کونا خالی دیکھ کر عظیم نے گاڑی اس طرف موڑی۔

''تو پھر...... کیا سوچا تو نے؟'' نبیل نے تجسس سے سوال کیا۔

''تو پھر یہ کہ جس چیز کو تم لوگ میری خوش قسمتی سمجھتے ہو وہی میرے لیے مصیبت بن گئی ہے۔ ہر کولیگ مجھ سے حسد کرتا ہے، ہر منیجر اپنی پوسٹ کے خوف میں مبتلا رہتا ہے اور انہی وجوہات کی بنا پر میری ہر کمپنی میں باسز کے ساتھ ٹھن جاتی ہے۔ سو اب میں نے حتمی فیصلہ کرلیا ہے۔'' عظیم نے گاڑی کا اے سی بند کر کے اگنیشن سے چابی نکالی اور دھماکا کرنے والے انداز میں انکشاف کیا تو تینوں چونک گئے۔

''کیا فیصلہ؟'' تینوں نے یک زبان پوچھا تو عظیم پُراسرار انداز میں مسکرایا اور گاڑی سے اتر گیا، اس کے پیچھے وہ تینوں بھی بے تابی سے اتر گئے۔

''میں نے اپنا ذاتی ڈسٹری بیوشن سیٹ اپ بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' یہ خبر واقعی دھماکا خیز ثابت ہوئی، تینوں اچھل پڑے۔

''واہ...... کریں یار...... زبردست......'' نبیل نے داد دینے میں پہل کی۔ سمیر اور حارث نے بھی کاندھا تھپتھپایا اور پُرجوش انداز میں خوش گپیاں کرتے کھلی فضا میں بچھی میزوں کی طرف بڑھنے لگے۔

''واقعی یار! تیرے ساتھ ہمیشہ ہر جگہ زیادتی ہوتی رہی ہے، اس کا یہی حل بروقت اور بہترین ہے۔ زبردست سیٹ اپ بنا کر انہی کمپنیوں کی ڈسٹری بیوشن کھینچنا، پھر دیکھنا کیسے سب تیرے پیچھے دم ہلاتے پھریں گے۔'' یہ حارث کی رائے تھی۔ سمیر چلتے چلتے یکدم ٹھٹک کر رک گیا، تینوں مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے جو سوچ میں گم عظیم کو دیکھ رہا تھا، پھر بولا۔

''اوئے...... تو کیا تو اسی خوشی میں ٹریٹ کا بل اپنی طرف سے دینے کی بات کر رہا تھا؟'' سمیر کی بات پر حارث اور نبیل بھی بری طرح چونکے اور پھر اچھل کر معنی خیزی سے مسکراتے عظیم پر جھپٹ پڑے۔ آس پاس بیٹھے لوگ بھی ان کے شور اور حرکتوں پر متوجہ ہو کر زیرِلب مسکرانے لگے۔ عظیم کمال سکون سے ان تینوں کے گھونسے کھا رہا تھا۔ فوڈ اسٹریٹ میں من چلے نوجوانوں کے ایسے تماشے بروقت دیکھنے کو ملتے ہیں، وہاں بیٹھے سب لوگوں کے لیے یہ عام سی بات تھی۔

''ایک گھنٹے سے فضول کے فلسفے بگھار بگھار کر دماغ

اندازِ فکر

خیر دین نہایت دردمند دل رکھنے والا آدمی تھا۔ اسے اپنے سے زیادہ دوسروں کی فکر پڑی رہتی تھی۔ وہ اپنی پریشانیوں میں بھی دوسروں کے لیے تشویش کا پہلو ڈھونڈ لیتا تھا۔ ایک بار تمام احتیاطوں کے باوجود اس کے کپاس کے کھیتوں پر امریکن سنڈیوں نے یلغار کردی اور ساری فصل چٹ کر گئیں۔

گاؤں کی چوپال میں خیر دین کی ملاقات اللہ دتہ سے ہوئی تو ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اللہ دتہ نے پوچھا۔ ''اور سناؤ خیر دین! فصل کا کیا حال ہے؟''

''بہت برا۔'' خیر دین نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' اللہ دتہ نے تشویش سے پوچھا۔

''بس یار، کیا بتاؤں۔'' خیر دین نے ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''دس لاکھ امریکن سنڈیاں میرے کھیتوں میں پھر رہی ہیں اور بے چاریوں کے کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

مرسلہ: نازیہ جہانگیر، ملتان

آمد آمد

ایک قصبے کے ریلوے اسٹیشن پر ایک مسافر کو ٹرین کا انتظار کرتے کرتے کئی گھنٹے گزر گئے۔ آخر کار وہ مایوس ہو کر کسی اور سواری کی تلاش میں اٹھ کر اسٹیشن سے جانے لگا تو اسٹیشن ماسٹر نے اسے تسلی دی کہ ٹرین اب پہنچنے ہی والی ہے۔ اب جانے کی ضرورت نہیں۔

''کیا آپ کو وائرلیس پر پیغام ملا ہے؟'' مسافر نے ذرا پُرامید ہو کر پوچھا۔

''نہیں، وائرلیس تو ہمارے پاس ہے ہی نہیں۔'' اسٹیشن ماسٹر نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس ٹرین کے آنے کا ہمیں ایک نشانی سے پتا چلتا ہے۔''

''کیسی نشانی؟'' مسافر نے حیران ہو کر پوچھا۔

''دراصل جو ٹرین آنے والی ہے، اس کے گارڈ نے ایک کتا پالا ہوا ہے جو ٹرین پر اس کے ساتھ ہی رہتا ہے۔'' پھر اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''وہ دیکھو، اس وقت وہ کتا دوڑا آرہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کے پیچھے پیچھے ٹرین بھی بس آتی ہی ہوگی۔''

مرسلہ: اویس علی، سرگودھا

پچی کر دیا...... سیدھی بات نہیں کر سکتا تھا تو؟" حارث نے عظیم کی کمر پر آخری دھپ رسید کی اور ایک میز کے گرد کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ عظیم نے ویٹر کو اشارہ کر کے مٹن کڑاہی کا آرڈر دیا تو نبیل نے خوشی اور جشن کا مزہ دوبالا کرنے کے لیے ٹھنڈی جمالی گلابی سپیشل کھیر کا آرڈر بھی ساتھ ہی دے دیا۔ ان چاروں دوستوں میں عظیم اپنی وجاہت، ذہانت اور اعلیٰ خاندانی پس منظر کی وجہ سے منفرد نظر آتا تھا۔ گو کہ ان خصوصیات میں نبیل بھی اس کے ہم پلہ تھا لیکن اس کے مزاج اور انداز میں سادگی کا رنگ تھا جبکہ عظیم کے پہننے اوڑھنے اور اٹھنے بیٹھنے تک میں شاہانہ انداز نمایاں ہوتا۔ عظیم اپنی ڈریسنگ پر پیسا پانی کی طرح بہاتا تھا۔ ان دونوں کی دوستی عظیم کے چاچا کی کمپنی میں اکٹھے ملازمت کے دوران ہوئی تھی، جبکہ حارث، عظیم کا محلے دار تھا۔ بچپن سے دونوں ایک ہی اسکول و کالج میں پڑھے اس لیے طبقاتی فرق کے باوجود ان کی دوستی مثالی تھی۔ بعد میں عظیم نے باپ دادا کا پیشہ اپنایا تو حارث نے بھی اس کی تقلید کی۔ سمیر ان تینوں کا حادثاتی دوست تھا جو ایک... کمپنی میں انٹرویو کے امیدواران کی حیثیت سے ان سے ملا اور پھر ملتا ہی رہا۔ سمیر اور حارث اس انٹرویو میں کامیاب نہ ہو پائے تو وہیں سے اکٹھے دوسری کمپنی میں انٹرویو دینے چلے گئے جہاں وہ دونوں ہی منتخب بھی ہو گئے۔ یوں ان چاروں کا ایک گروپ بن گیا۔

☆☆☆

ویٹر میز پر گرما گرم کڑاہی رکھ کر کولڈ ڈرنکس لانے کے لیے مڑا تو مٹن کڑاہی کی اشتہا انگیز مہک نے ان کی باتوں کو فل اسٹاپ لگا دیا تھا۔ عظیم نے اپنی پلیٹ بنا کر کڑاہی نبیل کے سامنے کی۔ ان کی میز کے پاس ایک بھکارن آ کر کھڑی ہو گئی۔ دیگر بھکاری عورتوں کی طرح اس کا حلیہ بھی کافی خراب تھا البتہ اس نے پھٹی ہوئی اوڑھنی سے اپنا سر اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ ان کی میز کے قریب کھڑی ان کی کڑاہی کو گھورنے لگی، پھر مشینی انداز میں بولی۔

"صاحب! یہ کڑاہی مجھے دے دو...... بھوک لگی ہے۔" سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"بی بی جاؤ......" سمیر نے بیزاری سے کچھ کہنا چاہا مگر عظیم نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ وہ بھکاریوں کے معاملے میں عام امیر زادوں کی طرح منفی اور تلخ رویہ رکھنا پسند نہیں کرتا تھا اور ہر ضرورت مند کی کھلے دل سے مدد کرتا تھا لیکن یہ صورت حال ہی کچھ عجیب سی تھی۔ وہ سب نوالہ ہاتھوں میں لیے کھانے کو تیار بیٹھے تھے، ایسے میں اتنا عجیب و غریب تقاضا ناگوار تو اسے بھی محسوس ہوا تھا مگر اس نے اس کا اظہار نہیں کیا اور نوالہ پلیٹ میں رکھ کر سکون سے ویٹر کو مخاطب کیا۔

"بھائی اس بی بی کو کسی میز پر بٹھاؤ اور ایسی ہی ایک کڑاہی لا دو...... بل مجھے دے دینا۔" پھر اس عورت کی طرف مڑ کر نرمی سے بولا۔

"جاؤ بی بی! کرسی پر بیٹھو۔ دس پندرہ منٹ میں تمہیں پوری کڑاہی مل جائے گی۔" ویٹر سر ہلاتا ہوا مڑ گیا مگر وہ عورت انکار میں سر ہلاتے ہوئے ڈھٹائی سے بولی۔

"نہیں صاحب! مجھے یہی والی چاہیے۔" اس کی اس انوکھی ضد پر وہ چاروں ہی الجھن کا شکار ہو گئے۔ چند لمحوں تک انہیں سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ کیا ردعمل ظاہر کریں۔ پھر عظیم نے ہی سب سے پہلے خود پر قابو پایا اور رسان سے بولا۔

"دیکھو بی بی! میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ تمہارے سامنے ویٹر کو آرڈر دیا ہے۔ تم بے شک ہمارے ساتھ والی میز پر بیٹھ جاؤ، تمہیں اتنی ہی مقدار میں سلاد، رائتے اور کولڈ ڈرنک کے ساتھ کڑاہی مل جائے گی۔ میں سمجھ سکتا ہوں تمہیں شدید بھوک لگی ہوئی ہے لیکن اس کڑاہی سے ہم اپنی پلیٹوں میں کھانا نکال چکے ہیں۔ یوں اچھا نہیں لگتا، تم یہاں آرام سے......"

"میں نے کہا نا مجھے یہی والی چاہیے۔" اس عورت نے عظیم کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی۔

اس کا انداز عجیب تھا اور ضد عجیب ترین۔ ایک عجیب ناقابل فہم اور پراسرار سا تاثر تھا اس کے چہرے پر۔ اب عظیم کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ آ گیا۔ سمیر نے اس عورت کو وہاں سے ہٹانا چاہا مگر عظیم نے روک دیا۔ وہ بھکارن سہی مگر ایک عورت تھی اور عظیم، عورت کی عزت کو ہمیشہ مقدم رکھتا تھا۔ اس نے دوٹوک انداز اپنا کر کہا۔

"یہ نہیں ملے گی۔ انتظار کر سکتی ہو تو بیٹھ جاؤ ورنہ جاؤ۔" یہ کہہ کر عظیم نے کھانے کی طرف توجہ مرکوز کرنی چاہی مگر اسے احساس ہوا کہ وہ عورت ہنوز وہیں کھڑی اسے گھور رہی ہے۔ اس نے گردن موڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اپنی نظروں سے اسے باندھ کر رکھ دے گی۔ اس کی آنکھوں میں اتنا عجیب سا تاثر تھا کہ عظیم کو اپنے حواس جکڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ الجھن کا شکار ہو گیا۔ یکایک اس عورت کے لب اسی مشینی انداز میں ہلے اور الفاظ اس کے لبوں سے

سرسراتی ہوئی ہوا کے مانند نکلے۔

"مجھے دوسری کڑاہی نہیں چاہیے...... یہی والی چاہیے تھی۔" اتنا کہہ کر وہ مڑ گئی۔ ایک لمحے کو ان چاروں کے دل میں تاسف کی لہر دوڑی لیکن جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ چند لمحے وہ چاروں گم صم اپنی اپنی پلیٹوں کو گھورتے رہے پھر سر جھٹک کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اشتہا جھاگ کی طرح بیٹھ چکی تھی، جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا، احساسات عجیب سے ہو چلے تھے۔ سب سے پہلے عظیم نے نوالہ توڑ کر منہ میں ڈالا...... اور پھر...... اسے بڑی زور کا پھندا لگا۔ وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ حتیٰ کہ کھانس کھانس کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نبیل نے پھرتی سے گلاس میں پانی بھر کر اسے تھمایا مگر وہ پانی بھی نوالے سمیت پھنس گیا، اس کی حالت دگرگوں تھی۔

شاید اس نے نوالہ چباتے ہوئے سانس لی تھی اور کچھ ذرات سانس کی نالی میں چلے گئے تھے...... بالآخر اس نے حلق میں انگلی ڈال کر نوالہ اگل کر پھینکا اور پانی کا گھونٹ بھرا تو اس کی سانس بحال ہوئی۔ نبیل نے اسے اس کی حالت پر محمول کر کے افسوس سے سر جھٹکا اور اس کا کاندھا تھپک کر بولا۔

"ریلیکس یار...... ریلیکس......" پھر نبیل نے نوالہ بنا کر منہ میں ڈالا اور اس کا بھی وہی حشر ہوا جو عظیم کا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ حارث نے بھی نوالہ کھایا اور وہ بھی بری طرح کھانسنے لگا۔ سمیر جو نوالہ بنا کر منہ میں ڈالنے ہی لگا تھا، ہکا بکا ان تینوں کو دیکھنے لگا۔

"کیا یار...... ٹینشن لے لی تم لوگوں نے تو......" اس نے سر جھٹک کر نوالہ منہ میں ڈالا اور اس کا بھی وہی حال ہوا۔ اب وہ تینوں بری طرح کھانس رہے تھے اور ارد گرد میزوں پر بیٹھے لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ جب تک ان تینوں نے بھی عظیم کی طرح نوالے اگل کر پھینک نہیں دیے تب تک انہیں چین نہیں ملا۔ بے تحاشا کھانس کھانس کر ان تینوں کے چہرے سرخ ہو چلے تھے۔ چاروں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، خوف اور سراسیمگی نے ان چاروں کو بیک وقت اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ یہ اس عورت کی ٹینشن نہیں تھی، یہ نوالہ چبانے کی بے احتیاطی بھی نہیں تھی...... یہ کچھ اور ہی تھا۔ پھر بھی سمیر نے اپنی لاابالی طبیعت کے پیش نظر اس سارے قصے کو محض اتفاق قرار دیتے ہوئے دوسرا نوالہ توڑا اور ان تینوں نے اس کی تقلید کی مگر ایک بار پھر نتیجہ وہی نکلا۔ ان کے نوالے بری طرح حلق میں پھنس گئے۔ ویٹر گھبرا کر بھاگا چلا آیا۔ پورا پنڈال ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کئی لوگ ان کی میز کے گرد جمع ہونے لگے۔ عظیم نے پرس سے چند نوٹ کھینچ کر میز پر پھینکے اور عجلت میں بولا۔

"اٹھو، ابھی اٹھو فوراً۔ چلو میرے ساتھ اور اس عورت کو ڈھونڈو۔" اور پھر وہاں موجود سب لوگوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ وہ چاروں اٹھ کر چار اطراف میں دوڑ پڑے۔ ویٹر نوٹ ہاتھ میں تھامے ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ ان چاروں نے فوڈ اسٹریٹ کے تمام ریسٹورنٹس، فیملی ہالز، کوکنگ ایریا، کاؤنٹرز، حتیٰ کہ واش رومز اور پارکنگ ایریا تک چھان مارے لیکن وہ عورت گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھی۔ بالآخر عظیم نے گاڑی نکالی اور آس پاس کی تمام سڑکیں بلکہ پورا علاقہ دیکھ لیا۔ راہ گیروں سے پوچھ لیا لیکن اس عورت کا نام و نشان تک نہ ملا۔ اس عورت کے پلٹ کر واپس جانے کے بعد ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس سارے تماشے میں محض پانچ منٹ ہی صرف ہوئے ہوں گے۔ ان پانچ منٹوں میں وہ عورت کہاں غائب ہو سکتی تھی؟ یہ سوال ان چاروں کے دماغوں کو شل کیے دے رہا تھا۔ جشن، خوشی، ٹریٹ، اشتہا، بزنس کی خوشی...... سب خیالات ہوا ہو چکے تھے۔ کچھ باقی رہ گیا تھا تو بس خوف، دہشت اور پریشانی جس کے زیر اثر وہ تینوں فل اے سی والی کار میں بھی پسینے میں شرابور بیٹھے تھے۔ اس عورت کو نہ ملنا تھا، نہ ملی۔

ایسے کتنے ہی لقمے ہوتے ہیں جو لوگوں کے حلق میں پھنس جایا کرتے ہیں لیکن جس لقمے کی بدولت وہ مسائل اٹھتے ہیں اس کی جانب کسی کا دھیان بھی نہیں جاتا کہ آخر وہی لقمہ کیوں؟ آخر ایسا ہی کیوں؟ وہ چاروں اس کڑاہی کا ایک لقمہ بھی اپنے حلق سے نیچے اتارنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ چاروں سڑک کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھے اپنی اپنی سوچوں میں غلطاں تھے کہ وہ عورت کون تھی؟

کوئی درویش؟ کوئی جن زادی؟ کوئی نیک روح؟ یا کوئی ابتلائے ربی...... جس پر وہ پورا نہیں اتر سکے......

کیونکہ ایک بات تو طے تھی کہ وہ کڑاہی اس عورت کی خواہش تھی، سو وہ ان چاروں پر حرام ہو گئی تھی۔ وہ ساری رات بھی لقمے بناتے رہتے مگر ایک بھی حلق سے اتار نہ پاتے۔ رہ رہ کر بس یہی سوال ان کے دماغوں میں ابھر رہا تھا جس کا جواب ڈھونڈنے سے وہ سب قاصر تھے کہ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ اور اب کہاں روپوش ہو گئی تھی؟

⌘⌘⌘

پلان بی

نشور بادی

جب خواہشیں بے شمار اور حسرتوں کا انبار ہو تو زندگی بے زار ہو ہی جاتی ہے... کہاں تک ارادوں کا ٹوٹنا اور خوابوں کا بکھر جانا کوئی برداشت کر سکتا ہے... وہ بھی ایک ایسی ہی ڈگر پر چل نکلی تھی... جس پر وہ چلنا نہیں چاہتی تھی مگر پیروں کے سفر نے اسے نہ سمت بدلنے دی اور نہ منزل کے پاس آنے دیا... پھر اچانک وہ کچھ ہو گیا جس کی اس نے خواہش تو کی تھی مگر... اس کا حصول متوقع ہرگز نہ تھا...

مکروفریب کے جال میں پھنسنے والی حسینہ کا عجیب وغریب انتقام......

بوڑھے باپ پر بیٹی نکل گر پڑی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو بیٹی؟" بوڑھے جمیل خاں نے پریشان نظروں سے فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہی کہہ رہی ہوں بابا! کہ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔ ابھی استعفا دے کر آرہی ہوں۔" فرزانہ نے جواب دیا۔

جمیل خاں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"آپ اتنے پریشان نہ ہوں۔" فرزانہ نے کہا۔ "میں جلد ہی کوئی دوسری ملازمت ڈھونڈ لوں گی۔"

جمیل خاں نے فرزانہ کی طرف دیکھا اور مایوسانہ انداز میں بولا۔ "فاسٹ فریڈرز سے اچھی ملازمت تمہیں اب شاید ہی ملے۔ اتنی اچھی تنخواہ ملنے لگی تھی تمہیں کہ تین ہی مہینوں میں گھر کے حالات بہت بہتر ہوگئے تھے۔ میرے لیے سب سے اہم یہ تھا کہ تمہاری دائم المریضہ ماں کے لیے ہر ماہ دوا لانے کی پریشانی ختم ہوگئی تھی۔"

"مجھے کیا خیال نہیں ہے امی کا؟ یہ لیجیے۔" فرزانہ نے ایک شاپر باپ کی طرف بڑھایا۔ "امی کی اس مہینے کی دوا تو آ ہی چکی ہے۔ اب دو مہینے تو ان کی دوا کی فکر نہیں رہے گی نا۔ انہی دو مہینوں میں یا شاید ایک ہی مہینے میں مجھے کوئی اور ملازمت مل جائے گی۔"

"تنخواہ دینے میں ہر ادارہ اتنا فراخ دل نہیں ہوتا۔ ضروری نہیں کہ تمہیں کسی بڑی کمپنی کے مالک کی پی اے کی جگہ مل جائے اور تنخواہ بھی اتنی معقول ہو۔"

"جو بھگت لیں گے اب جو بھی ہو۔" فرزانہ نے جھنجلا کر کہا۔

جمیل خاں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"فرزانہ!" اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔

"جی!" فرزانہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم نے پہلے کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی۔" جمیل خاں نے کہا۔

"مجھے معاف کردیجیے بابا!" فرزانہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جمیل خاں کے قدموں میں بیٹھ گئی پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں پریشانی میں آپ سے نہ جانے کس لہجے میں بول گئی۔ پلیز! مجھے معاف کردیجیے۔"

جمیل خاں نے اسے بازو پکڑ کر اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا کر گھمبیر لہجے میں بولا۔ "کاش! میں اتنا مجبور نہ ہوتا کہ تمہیں ملازمت کرنا پڑتی۔"

"میں جانتی ہوں بابا! میں نے کہا نا آپ اتنے فکرمند نہ ہوں۔ مجھے ضرور کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی۔"

"جاؤ، آرام کرو۔" جمیل خاں نے کہا۔

فرزانہ اپنے کمرے میں آگئی اور کپڑے تبدیل کیے بغیر بستر پر گر گئی۔ اب اس کے چہرے پر کچھ غصے کے آثار بھی تھے۔ جمیل خاں کے سامنے اس نے اپنے غصیلے جذبات کو چھپائے رکھا تھا۔

جمیل خاں دو سال ہوئے اپنی ملازمت سے ریٹائر ہوا تھا۔ اپنی تنخواہ سے تھوڑا تھوڑا پس انداز کر کے تین کمروں کا مکان بنوا لیا تھا اور اسی تنخواہ سے فرزانہ کو ایک اعلیٰ درجے کے اسکول اور کالج میں تعلیم دلوائی تھی۔ ریٹائر ہونے کے بعد اس کے گھر میں پریشانیوں نے ڈیرا ڈال لیا تھا۔ عالیہ بانو ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ کھا کر بستر پر لیٹ گئی تھی۔ جمیل خود بھی ریٹائرمنٹ کے بعد ایک ایسی بیماری کا شکار ہو چکا تھا کہ چھوٹی موٹی کوئی دوسری ملازمت کرنا بھی اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ فرزانہ کی شادی کے لیے پس انداز کیا جا رہا تھا، وہ گھر پر خرچ ہوتے ہوتے ختم ہوگیا تو اسے مجبوراً فرزانہ کو ملازمت کرنے کی اجازت دینا پڑی جو سال بھر قبل اپنی تعلیم مکمل کر چکی تھی۔

فرزانہ کو وہ ملازمت مل جانے کے بعد جمیل خاں اور عالیہ بانو نے قدرے سکون کا سانس لیا تھا۔ تیسری تنخواہ ملنے کے دو ہی دن بعد فرزانہ نے ملازمت چھوڑ دی تو جمیل خاں کے ذہن کو دھچکا لگا۔ وہ دونوں میاں بیوی تو یہ سوچ بیٹھے تھے کہ تین چار مہینے میں گھر کی حالت سنبھلنے کے بعد فرزانہ ہی کی تنخواہ سے کم از کم اتنا ضرور پس انداز کرلیا جائے گا کہ دو سال بعد وہ فرزانہ کی شادی کردیں گے، خواہ معمولی سطح پر ہی کرنا پڑے۔

☆☆☆

دوسری صبح ناشتا کرنے کے بعد فرزانہ اپنے کمرے میں آبیٹھی اور اخبار کا کلاسیفائڈ صفحہ دیکھنے لگی۔

اس دن وہ مایوس ہی ہوئی کیونکہ اخبار میں کسی ایسی ملازمت کا کوئی اشتہار نہیں تھا۔

"اتوار کا انتظار کرنا پڑے گا۔" اس نے سوچا۔ زیادہ اشتہارات اتوار ہی کو ہوتے ہیں اور اتوار آنے میں ابھی تین دن باقی تھے۔

وہ بستر پر لیٹ کر کئی معاملات پر غور کرنے لگی۔ ان میں سے ایک معاملہ تو اس کے لیے حد درجہ اذیت ناک بھی تھا۔ اسی کی وجہ سے اس کے سامنے دو مقاصد بھی تھے جن کے حصول کے لیے وہ ہر حد سے گزرنے کے لیے بھی تیار تھی۔

اس کے ذہن میں بہت سے خیالات کے ساتھ گھر کے قریب ہی رہنے والے اس شخص کا بھی خیال آیا جسے آس پاس کے بھی رہنے والے صرف جعفری کے نام سے جانتے تھے۔ جعفری کہاں کام کرتا تھا؟ کیا کام کرتا تھا؟ یہ بات اس نے کبھی کسی پر ظاہر نہیں کی تھی۔ وہ ایک اوباش شخص تھا لیکن اس معاملے میں اتنی احتیاط سے کام لیتا تھا کہ اس کی شخصیت کے اس منفی پہلو سے محلے کے لوگ واقف نہیں تھے۔ البتہ ان لڑکیوں کو ضرور واقف ہونا چاہیے تھا جن کو اس نے اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ناکام بھی ہوتا رہا تھا۔ ایک ناکامی اسے فرزانہ کے معاملے میں بھی ہوچکی تھی۔

اس کے تعلقات نہ جانے کہاں کہاں تھے کہ جن لڑکیوں کے سلسلے میں اسے کامیابی ہوئی تھی، ان لڑکیوں کو اس نے اچھی ملازمتیں بھی دلوادی تھیں۔ اس کی اسی صفت کی وجہ سے اس وقت فرزانہ کو اس کا خیال آیا تھا جو اس نے فوراً ہی اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور دوسرے معاملات پر غور کرتی رہی۔

یہ بات فرزانہ کے ذہن میں بھی تھی کہ وقتی طور پر چھوٹی موٹی ملازمت بھی کی جاسکتی ہے لیکن اس سے اس کا دوسرا مقصد پورا نہ ہو پاتا جو اس کے لیے بے حد اہمیت رکھتا تھا۔

اتوار کا انتظار اس نے بڑی بے چینی سے کیا لیکن اس دن کے اخبار نے بھی اسے مایوس ہی کیا اور وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس کے لیے گزرتے ہوئے ایک ایک دن کی اہمیت تھی۔ تاخیر کے باعث وہ نہ صرف اپنا دوسرا مقصد حاصل نہیں کرپاتی بلکہ اس کے بعد کا منصوبہ بھی کھٹائی میں پڑ جاتا۔

شام سے کچھ پہلے وہ گھریلو ضروریات کی خریداری کے لیے بازار گئی۔ جب وہ مطلوبہ چیزیں لے کر دکان سے نکلی تو اس کی نظر جعفری پر پڑی جو قریب ہی کی ایک دکان کے شوکیس کا جائزہ لے رہا تھا۔

فرزانہ اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی لیکن کچھ ہی قدم چلنے کے بعد اس نے جعفری کو اپنے پہلو میں چلتے ہوئے دیکھا۔

"آج کل دفتر نہیں جا رہی ہو کیا؟" وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دھیمی آواز میں بولا۔ "کئی دن ہوگئے، میں نے تمہیں گھر سے نکلتے نہیں دیکھا۔ ملازمت کہیں چھوٹ تو نہیں گئی؟"

"تم سے مطلب؟" فرزانہ نے دانت پر دانت جما کر کہا اور قدم تیزی سے بڑھانے لگی۔

"مطلب تو ہے۔ کوئی لڑکی اگر ملازمت کے لیے پریشان ہو تو مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔"

"مجھے تم سے کوئی مدد نہیں لینا۔" فرزانہ نے کھردرے لہجے میں کہا۔

"یعنی میں ٹھیک سمجھا ہوں۔ ملازمت چھوٹ گئی ہے تمہاری۔"

فرزانہ کچھ نہیں بولی۔

"میں چٹکی بجاتے ملازمت دلا سکتا ہوں۔" جعفری نے کہا۔ "کئی لڑکیاں اس کی گواہی دے سکتی ہیں۔ اور وہ تو معمولی شکل و صورت کی ہیں۔ تمہارے سامنے تو ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ تمہیں تو بہت اچھی ملازمت مل سکتی ہے۔"

"پہلے بھی دو ایک بار تم مجھ سے ایسی باتیں کر چکے ہو جب میں ملازمت کی تلاش میں تھی۔" فرزانہ کی سانسیں غصے کی وجہ سے کچھ تیز چلنے لگیں۔ "بھول گئے کہ میں تمہیں دھتکار چکی ہوں؟"

"ضروری تو نہیں کہ تم اب بھی دھتکار دو۔ انسان کو کسی وقت بھی عقل آسکتی ہے۔" جعفری ڈھٹائی سے مسکرایا۔ "یہ بھی تم شاید پسند نہ کرو کہ میں زیادہ دیر تک تمہارے ساتھ چلتا رہوں اس لیے میں تمہارے موبائل پر ایک میسج کردوں گا، ذرا تفصیل سے۔"

فرزانہ چونکی۔ "تمہیں میرا موبائل نمبر کہاں سے مل گیا؟"

"ایک لڑکی ہی سے ملا ہے۔ جب سے میں نے اسے ملازمت دلائی ہے، تم نے اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔"

فرزانہ گھر آگئی۔ موبائل فون اس کے پرس میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے دو مرتبہ میسج کی ٹون سنی تھی لیکن موبائل نکال کر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے گھر جا کر بھی نہیں دیکھا۔ کام کاج میں مصروف ہوگئی۔ رات اس کے سونے تک میسج کی ٹون تین چار مرتبہ پھر سنائی دی لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ جعفری ہی بار بار میسج کر رہا ہو۔

☆☆☆

طارق جوان العمر اور قبول صورت تھا۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ اسی نے سنبھال رکھی تھی۔ فرزانہ اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"بہت خوش ہوگی میری بیوی تم سے مل کر۔" طارق کہہ رہا تھا پھر وہ ہنس کر بولا۔ "بہت تعریفیں کرچکا ہوں نا میں اس سے تمہاری۔ کئی بار کہہ چکی ہے کہ تمہیں گھر لاؤں اس سے ملانے۔"

"چلیں، آج ملاقات ہو ہی جائے گی۔" فرزانہ دھیرے سے ہنسی۔

"ہاں، بڑی خوشی تو تم سے مل کر خوش ہوگی ہی لیکن تمہیں

بھی اس سے مل کر خوشی ہوگی۔"
"یقیناً وہ اچھی خاتون ہوں گی۔ آپ نے ان کا انتخاب کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔"
کار اس وقت ایک بنگلے کے احاطے میں داخل ہورہی تھی۔ پھاٹک چوکیدار نے کھولا تھا۔
"زینی کہتے ہیں آپ ان کو؟" فرزانہ بولی۔ "ہمیشہ میں نے بھی یہی سنا ہے آپ سے۔ شاید زرینہ نام ہوگا ان کا؟"
"نہیں۔" طارق نے برآمدے میں کار روکتے ہوئے کہا پھر انجن بند کرتے ہوئے بولا۔ "زینت نام ہے اس کا اور وہ مکمل زینت ہے۔ کیا کہتے ہیں اسے، اسم با مسمیٰ۔"
فرزانہ دروازہ کھول کر کار سے اتری۔ طارق، فرزانہ کو ساتھ لیے ہوئے برآمدہ چڑھ کر ایک وسیع اور نہایت آراستہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اسی وقت اس کی جیب میں پڑے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ طارق نے موبائل نکال کر کال ریسیو کی۔
"ہیلو! تمہارا نام دیکھ لیا ہے میں نے۔ خوامخواہ فون کیا تم نے۔ میں گھر آچکا ہوں۔ ڈرائنگ روم میں ہوں۔ فرزانہ بھی ...... کیا؟" دوسری طرف سے شاید اس کی بات کاٹ کر کچھ کہا گیا تھا جس پر فرزانہ نے اسے چونکتے اور پھر طویل سانس لیتے ہوئے دیکھا۔ "حد کردی تم نے۔ شاپنگ کے لیے جانا تھا تو مجھے فون پر اطلاع تو دے دیتیں۔ ابھی تمہاری کال آنے پر تو میں سمجھا تھا کہ تم خواب گاہ سے بول رہی ہو۔" پھر وہ رک کر کچھ سنتا رہا۔ اس کے بعد بولا۔ "تو جلدی آؤ گھر۔ ہاں ...... بس آجاؤ دس پندرہ منٹ میں ...... ہاں ہاں، غلطی میری بھی ہے۔ مجھے اطلاع دے دینا چاہیے تھی تمہیں کہ میں فرزانہ کو لے کر آرہا ہوں۔ اچھا خیر، جلدی آؤ۔" طارق نے فون بند کردیا۔
"شاپنگ کے لیے چلی گئیں وہ!" فرزانہ بولی۔
"آجائے گی پندرہ بیس منٹ میں۔ میں اتنے میں تمہیں اپنا گھر دکھاتا ہوں، آؤ۔"
وہ فرزانہ کو ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے سے دوسری طرف لے گیا۔ ایک لائبریری دکھاتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ زینی کا شوق ہے۔ مجھے اتنا وقت کہاں ملتا ہے کہ کتابیں پڑھوں۔"
پھر وہ دونوں جس کمرے میں داخل ہوئے، وہ خواب گاہ کی طرز پر سجا ہوا تھا۔ "یہ میری اور زینی کی خواب گاہ ہے۔" طارق نے بتاتے ہوئے آگے قدم بڑھائے اور بستر [illegible] فرزانہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "دیکھو! یہ زینی کی تصویر ہے۔"
"خوب صورت ہیں۔" فرزانہ نے تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔
"بیٹھو!" طارق نے ایک جانب لگے ہوئے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔ "جب تک زینی نہیں آتی، ہم اپنا حلق تر کرلیں۔" وہ ایک الماری کھولنے لگا۔ "تم کیا پینا پسند کروگی؟ ہر قسم کا مشروب موجود ہے۔"
الماری کھلی تو فرزانہ یہ دیکھ کر چونکی کہ اس میں مختلف النوع کی مشروب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔
"بھئی ہمارے طبقے میں تو یہ سب کچھ ایک عام بات ہے۔ میں بس ایک ڈرنک بناؤں گا اپنے لیے۔ تم کوئی کولڈ ڈرنک پسند کرلو۔"
"کوئی سی بھی نکال لیں۔" فرزانہ بوتلیں دیکھ کر سنجیدہ نظر آنے لگی تھی۔
طارق نے اپنے لیے ایک لارج پیگ بنایا۔ فرزانہ جانتی ہی نہیں تھی کہ "لارج پیگ" کیسا ہوتا ہے۔ اس کے لیے طارق نے کولڈ ڈرنک کی ایک بوتل گلاس میں انڈیل دی۔ پھر دونوں گلاس لے کر فرزانہ کے قریب کے ایک صوفے پر آبیٹھا۔ کولڈ ڈرنک کا گلاس اس نے تپائی پر رکھ دیا۔
طارق نے اپنے گلاس سے ایک اور بڑا گھونٹ لیا پھر اس نے زینت کی جسے وہ "زینی" کہتا تھا، تعریفیں شروع کردیں۔ اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے لگا۔ اس دوران طارق نے اپنا گلاس خالی کردیا۔ فرزانہ بھی اپنی کولڈ ڈرنک پی چکی تھی۔
"زینت صاحبہ نہیں آئیں؟" وہ بولی۔
"بس آتی ہی ہوگی۔" طارق نے کہا پھر لڑکھڑاتا ہوا بولا۔ "آج دفتر میں اتنا کام تھا کہ بہت تھک گیا ہوں۔ ایک ڈرنک سے تھکن نہیں اتری۔ ایک ڈرنک اور لوں گا۔" وہ الماری کی طرف بڑھا۔
"زینت صاحبہ آپ کو پینے سے نہیں روکتیں؟" فرزانہ بولی۔ اسے یہ اندیشہ بھی ہوگیا تھا کہ اتنی شراب پینے سے طارق بہکنے نہ لگے لیکن اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ چند منٹ میں زینت آہی جائے گی۔
طارق مڑ کر فرزانہ کی طرف دیکھے بغیر ہنسا۔ "وہ تو خود کبھی دو ایک ڈرنک لیتی ہے۔ ہمارے طبقے میں یہ کوئی بری بات نہیں ہے فرزانہ!"
اس بات سے فرزانہ بھی واقف تھی۔
طارق ایک اور لارج پیگ بنا کر واپس آبیٹھا اور

ایک گھونٹ لے کر کہنے لگا۔ "تمہاری شادی اب تک کیوں نہیں ہوئی فرزانہ؟"
فرزانہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اسے جواب دینا پڑا۔ "گھریلو حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔ اسی لیے تو مجھے ملازمت کرنا پڑی ہے۔"
"کبھی کسی کو پسند تو کرتی ہوگی؟"
"جی ...... جی نہیں۔" فرزانہ کو طارق کی ان باتوں سے کچھ گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ وہ بولی۔ "اب تک تو انہیں آجانا چاہیے تھا۔ فون پر آپ نے شاید دس پندرہ منٹ کی بات کی تھی۔ اب تو بیس منٹ ہورہے ہیں۔"
"کہیں ٹریفک میں پھنس گئی ہوگی۔ آج کل یہ مسئلہ بڑھتا ہی جارہا ہے۔" طارق نے کہا اور اس مرتبہ ایک بڑا گھونٹ لے کر ہنسا۔ "زینت کشادہ دل عورت ہے۔"
"میں سمجھی نہیں۔"
"میں نے ایک مرتبہ اس سے کہا تھا کہ میں دوسری شادی کرلوں تو ...... اس پر وہ ہنس کر کہنے لگی کہ آپ دس اور کرلیں۔ میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"
فرزانہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جواب میں اسے کیا کہنا چاہیے۔ وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔
"ویسے میں نے یہ بات اس سے سنجیدگی سے کہی تھی۔" طارق پھر بولا۔ "تم تو پڑھی لکھی لڑکی ہو فرزانہ! اچھی طرح سمجھ سکتی ہو کہ ایک ہی چہرہ سامنے رہے تو اس سے اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ میں واقعی دوسری شادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"
فرزانہ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ طارق کی باتوں کے اس موڑ نے اس کے کان کھڑے کردیے تھے۔
"خیر!" طارق نے پھر ایک گھونٹ لیا تھا۔ "تم نے کسی کو پسند نہیں کیا لیکن مجھے یقین ہے کہ بہتوں نے تمہیں پسند کیا ہوگا۔ تمہیں اندازہ ہے کہ تم کتنی پرکشش ہو، خوب صورت ہو؟"
"زینت صاحبہ ٹریفک میں پھنس گئی ہیں تو نہ جانے کب آسکیں۔ میں ان سے پھر کبھی مل لوں گی۔ مجھے اب جانا چاہیے۔" فرزانہ کھڑی ہوگئی۔
"ارے بیٹھو۔" طارق نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے زبردستی بٹھادیا۔ "یہ بھی شاید اچھا ہی ہوا کہ وہ ٹریفک میں کہیں پھنس گئی ہے۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تم سے چند اہم باتیں کرلوں۔ بہت دن سے سوچ رہا تھا وہ باتیں کرنے کے لیے۔ میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" طارق کی آواز [illegible]
"آپ ...... آپ اچھے آدمی ہیں۔" فرزانہ بمشکل جواب دے سکی۔
"کیا اتنا اچھا کہ تم مجھے پسند کرسکو؟"
اب فرزانہ کو احساس ہونے لگا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہوسکتا ہے۔
"جواب دو فرزانہ!" طارق بڑے محبت آمیز لہجے میں بولا۔
فرزانہ کو جواب دینا پڑا۔ اس نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔ "میرے حالات ایسے ہیں کہ مجھے یہ سب کچھ محسوس کرنے کی مہلت ہی حاصل نہیں۔"
"حالات بدل بھی سکتے ہیں اگر تم چاہو۔" طارق نے کہا۔
"میں ایسا کوئی [illegible] جانتی۔"
طارق نے پھر ایک بڑا گھونٹ لیا۔ "تم تو خود مجسم جادو ہو فرزانہ!" اب اس کی زبان میں خفیف سی لکنت آگئی تھی۔
فرزانہ کو یقین ہوگیا کہ اسے ایک جال میں پھنسایا گیا ہے۔
"کیا تم مجھ سے شادی کرنا پسند کروگی؟" طارق پھر بولا۔
"میں تو ایک ذرہ ہوں طارق صاحب!" فرزانہ نے قدرے سرکتے ہوئے کہا۔ "آفتاب کو چھونے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔"
"ایسے پرکشش ذرات کی طرف تو آسمان خود جھک جاتا ہے۔" طارق نے اپنا گلاس خالی کرکے تپائی پر رکھ دیا۔
"میں اب جاؤں گی۔" فرزانہ اس طرح کھڑی ہوئی کہ طارق اس کا ہاتھ نہ پکڑ سکے۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی تھی لیکن طارق نے تقریباً دوڑ کر اسے پکڑ لیا اور ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف موڑ کر اسے اپنی آغوش میں لیتے ہوئے اپنے سینے سے لگالیا۔ "مجھے اپنا کر تم ایک شاندار زندگی گزار سکتی ہو۔"
"پلیز طارق صاحب!" فرزانہ اس کی آغوش سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے گڑگڑائی۔ "جانے دیں مجھے۔"

☆☆☆

فرزانہ سوتے میں کسمسائی۔ اس کے جسم سے ہلکا ہلکا پسینا پھوٹ پڑا تھا۔ وہ ایک ایسا خواب دیکھ رہی تھی جو اس کے لیے بہت ناخوشگوار تھا پھر خواب میں جیسے ہی طارق نے اپنا چہرہ اس کے چہرے پر جھکایا، اس کا ارادہ صاف ظاہر ہوگیا اور اسی وقت فرزانہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اس کا دل اتنی شدت سے دھڑکنے لگا تھا جیسے پسلیوں کا پنجرہ توڑ کر باہر نکل پڑے گا۔
[illegible]

ساتھ اس کی زندگی میں واقعی پیش آچکا تھا۔

اس نے ٹرنک سے گلاس میں پانی انڈیلا تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ گلاس میں پانی بھر کر اس نے ایک ہی سانس میں پی لیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ اس کی نظر گھڑی پر گئی۔ رات اپنے تیسرے پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ چار بجنے والے تھے۔ نیند اس کی آنکھوں سے بہت دور جا چکی تھی۔ اس نے جو خواب دیکھا تھا وہ ادھورا تھا۔ اس کے بعد کے واقعات یاد آتے رہے۔

طارق نے اسے اپنی آغوش میں لینے کے بعد کچھ ایسی حرکتیں کی تھیں کہ فرزانہ کے انجانے خوابیدہ احساسات جاگ اٹھے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا جسم بے جان ہونے لگا تھا۔ اس کی مزاحمت دم توڑتی چلی گئی۔

اور پھر وہ سب کچھ ہو گیا جو طارق چاہتا تھا۔

فرزانہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ اس کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

"اس میں رونے کی کیا بات ہے جانِ من!" طارق نے اس سے کہا تھا۔ "یہی تو زندگی کا سب سے حسین پہلو ہے جو ابھی ہم نے گزارا۔"

اس وقت بھی زینت کا کہیں پتا نہیں تھا جس کے بارے میں طارق نے بتایا تھا کہ وہ اس کی بیوی تھی۔ یقیناً وہ سب کچھ جھوٹ تھا۔

تھوڑی دیر بعد طارق اسے اپنی ہی کار میں لے کر چلا تھا اور نہ جانے کیا کیا کہتا رہا تھا لیکن فرزانہ بت بنی بیٹھی رہی تھی۔ اس کی سماعت طارق کا ایک لفظ بھی جذب نہیں کر رہی تھی۔ پھر یکایک وہ اس کیفیت سے نکلی۔ اسے خیال آیا کہ لوگ اسے اس کے گھر کے سامنے ایک کار سے اترتے دیکھیں گے تو نہ جانے کیا کیا سوچیں گے۔

وہ اپنے گھر سے خاصی دور ہی طارق کی کار سے اتری تھی اور پیدل چل کر گھر گئی تھی۔ شام ڈھلے وہ کمرے سے نکلی اور باورچی خانے میں جا کر رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی لیکن رات کو خود اس نے کچھ نہیں کھایا۔ وہ ہلکا سا بخار محسوس کرنے لگی تھی۔

جمیل خاں نے اس سے کہا تھا کہ وہ قریب کے ایک ڈاکٹر کو دکھا آئے لیکن وہ یہ کہہ کر ٹال گئی تھی کہ دفتر میں زیادہ کام کی وجہ سے جو تھکن ہوئی تھی، اس کی وجہ سے ہلکا سا بخار ہو گیا تھا جو رات کو آرام کرنے سے خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے بخار یا سر درد میں عموماً استعمال کی جانے والی ایک گولی کھالی تھی۔

رات کو آرام نہ ملنے کی وجہ سے اس کا بخار کچھ تیز ہو گیا۔ جمیل خاں کے کہنے پر اب اسے مجبوراً ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑا۔ اس دن وہ دفتر نہیں جا سکی۔ شام ہوتے ہوتے اس کا بخار بہت ہلکا ہو گیا۔ اس رات اچانک اسے خیال آیا کہ طارق نے خود ہی تو اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

یہ بات اس کے ذہن سے نکل ہی گئی تھی۔ اب جو یاد آئی تو اس نے کچھ سکون محسوس کیا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اچھا نہیں ہوا تھا لیکن شادی کے بعد بدنامی کا [illegible] سے قاصر ہوتا۔

اس روز وہ دفتر گئی تو اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے سیدھی طارق کے کمرے میں گئی۔ وہ کمرے میں اکیلا ہی تھا۔

"آؤ۔" طارق اسے دیکھ کر مسکرایا۔ "کل تم نہیں آئیں تو میں سمجھا تھا کہ تم ناراض ہو گئی ہو مجھ سے۔ ایک بار خیال آیا تھا کہ تمہیں فون کروں لیکن یہ سوچ کر نہیں کیا کہ تم اپنے گھر والوں کے ساتھ ہوئیں تو مجھ سے بات نہیں کر سکو گی۔"

"مجھے بخار ہو گیا تھا۔" فرزانہ سپاٹ لہجے میں جواب دیتے ہوئے طارق کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ارے، اچھا! اب کیسی طبیعت ہے؟"

"پوری طرح ٹھیک تو نہیں ہے۔" فرزانہ نے جواب دیا۔ "اور میرا خیال ہے کہ اس وقت تک ٹھیک نہیں ہو گی جب تک تم مجھے یہ نہیں بتاؤ گے کہ ہماری شادی جلد از جلد کب تک ہو سکتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس میں دیر نہ ہو۔ کل تم خود بھی کہہ چکے ہو کہ مجھ سے شادی کرو گے [illegible] ہوئے یہ بھی بتایا تھا تم نے کہ زینت صاحبہ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

طارق ہنسا۔ "زینت...... زینی...... ! ارے وہ تو کہانی گھڑ لی تھی میں نے۔ وہ میری بیوی نہیں ہے لیکن مجھے پسند بہت ہے۔ بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ ابھی تک [illegible] نہیں پھنسی۔ جال میں آتی ہی نہیں۔ کہتی ہے کہ شادی کر لو......"

"تو...... تو وہ...... وہ سب...... جھوٹ تھا؟" الفاظ فرزانہ کے حلق سے اٹکتے ہوئے نکلے۔

"ایسے جھوٹ بولنا پڑتے ہیں بعض موقعوں پر۔"

"اور...... مجھ سے جو کہا تھا...... شادی کرنے کے لیے؟"

"بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ یقین بھی کر لیا تم نے۔ میں کسی بندھن میں جکڑے بغیر زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے رہتا بھی اکیلا ہوں۔"

طارق بول رہا تھا اور فرزانہ کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ وہ خاموش ہوا تو فرزانہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

[illegible] کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔"

[illegible] "اتنی جلدی کچھ نہیں ہوتا۔ پریشان نہ [illegible] تو پریشان ہونے کی ضرورت [illegible] لیڈی ڈاکٹر سب ٹھیک کر دے گی۔ وہ میرے [illegible] کام کر چکی ہے۔ تم بھی اگر میری زندگی کا [illegible] تو میں تمہارا معاملہ بھی ٹھیک کروا دوں گا۔ تمہاری [illegible] میں بھی اضافہ کر دوں گا۔ عیش سے وقت گزارو۔ [illegible] تو میں نہیں [illegible] فرزانہ!"

☆☆☆

ان خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب فرزانہ نے جمیل خاں کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "تم تو جاگ رہی ہو بیٹی! میں تو تمہیں جگانے آیا تھا۔ تم تو جانتی ہو تمہاری ماں کو جلدی ناشتا کرنے کی عادت ہے۔"

فرزانہ نے چونک کر دیکھا۔ دروازے سے [illegible] کمرے میں آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھی۔ "[illegible] ناشتا تیار کرتی ہوں ابا!"

ہاتھ منہ دھونے کے بعد وہ والدہ کو سلام کر کے [illegible] کمرے میں آ گئی۔ یہاں اس نے معمول بنا لیا تھا [illegible] کمرے میں آ کر وہ اشتہارات دیکھتی لیکن اس دن بھی اسے مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس نے جھنجھلاہٹ میں اخبار ایک طرف پھینک کر اپنا موبائل اٹھایا۔ موبائل کمپنی سے آنے والے [illegible] وہ ڈیلیٹ کر دیا کرتی تھی۔ اس نے وہ بھی ڈیلیٹ کر دیے اور پھر [illegible] ایک پر وہ رک گئی۔ جعفری کا میسج اس کے سامنے آ گیا۔ فوری طور پر اس کے ذہن میں آیا کہ پڑھے بغیر اسے بھی ڈیلیٹ کر دے لیکن پھر [illegible] وہ پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔

"فرزانہ! میں دیکھ رہا ہوں کہ جمیل خاں آج کل پریشان نظر آنے لگے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہوگی۔ تمہاری ملازمت چھوٹ گئی ہے۔ تم جیسی لڑکی معمولی ملازمت تو آسانی سے حاصل کر سکتی ہے لیکن اب تم شاید کسی ادارے کے افسر کی پی اے ہی بننا چاہتی ہو۔ میں تمہیں ایک ادارے کے ایک افسر کی پی اے بھی بنوا سکتا ہوں۔ بس ایک رات...... ! کیا بگڑتا ہے اس میں کسی لڑکی کا...... ! میں ایک اعتبار سے برا آدمی ہوں لیکن اصول کا پکا ہوں۔ جو وعدہ کرتا ہوں، پورا بھی کرتا ہوں۔ میری یہ پیشکش مسترد نہ کرنا۔ تمہارے لیے ایک بہت بڑی جگہ ہے میری نظر میں۔"

طویل پیغام تھا جو فرزانہ نے پڑھ تو لیا لیکن دانت پیستے ہوئے اسے بھی ڈیلیٹ کر دیا۔ دو ایک میسج اور تھے۔ وہ بھی ڈیلیٹ کیے اور لیٹ گئی۔

"کیا طوائف ہی بن کر رہ جاؤں؟" اس نے سوچا۔

"طوائف تو تم بن چکی ہو!" خود اس کے وجود میں ایک آواز گونجی۔

فرزانہ نے بے چینی سے کروٹ لی۔ اس کے وجود سے ابھرنے والی آواز غلط نہیں تھی۔ وہ پے درپے کئی دن تک طارق کی آغوش کی زینت اس امید پر بنتی رہی تھی کہ کسی طرح اسے شادی پر آمادہ کرے مگر اسے مایوسی ہوئی تھی۔ پھر اس نے ایک تدبیر سوچی تھی۔ اس پر عمل بھی کیا تھا لیکن اس کی وہ منصوبہ بندی بھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس کے بعد اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ طارق سے انتقام ضرور لے گی۔

اس کے دماغ میں جو منصوبہ پرورش پا چکا تھا اس کے لیے اسے ایک بار پھر وہ سب کچھ کرنا پڑتا جو وہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس وقت اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر وہ جعفری کی بات بھی مان لے تو کیا فرق پڑے گا۔ برباد تو وہ ہو ہی چکی ہے۔

"یہ معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے۔ وہی اس معاشرے کے حاکم ہیں۔ عورت ان کے آگے بے بس ہے۔ بس کبھی کبھی وہ سراپا انتقام بن جاتی ہے لیکن اس کے بعد بھی وہ معاشرے پر اپنا تسلط قائم نہیں کر سکتی۔ بس اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتی ہے۔" اس نے سوچا۔

فرزانہ بھی بس یہی کر پاتی۔ اسے اس کا اندازہ بھی تھا۔

فیصلہ کرنے کے بعد فرزانہ نے موبائل اٹھایا تو اس کا ہاتھ کانپ گیا۔ اسے جعفری سے اتنی نفرت تھی کہ اسے فون کرنے کا خیال بھی اس کے لیے سوہانِ روح تھا لیکن ہر گزرنے والے دن کے ساتھ اس کی بڑھتی ہوئی پریشانی نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ جعفری کا نمبر ملائے۔

"واہ!" دوسری طرف سے جعفری کی پرمسرت آواز سنائی دی۔ "تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ تمہاری کال ریسیو کرتے ہوئے میں کتنا خوش ہوا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے مجھے برا بھلا کہنے کے لیے فون نہیں کیا ہوگا۔ اگر تمہیں ایسا کرنا ہوتا تو میرا میسج پڑھتے ہی فون کرتیں۔"

فرزانہ نے سب کچھ سپاٹ چہرے کے ساتھ سنا۔ جب وہ بولی تو اس کا لہجہ بھی سپاٹ ہی تھا۔ "اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو گے؟"

"ضمانت تو صرف میری زبان ہی ہے یا اس کی گواہی وہ لڑکیاں دے سکتی ہیں جن کو میں ملازمتیں دلوا چکا ہوں بشرطیکہ تم ان سے یہ اعتراف کرانے میں کامیاب ہو جاؤ کہ

"...انہوں نے میرے ساتھ کچھ اچھا وقت گزارا ہے۔"

فرزانہ خاموش رہی۔ اس وقت اس خیال سے اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا کہ وہ جعفری کی خواہش پوری کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی لیکن یہ سب کچھ وہ صرف اپنے لیے نہیں، اپنے والدین کے لیے کرنا چاہتی تھی۔ خصوصاً اپنی معذور ماں کے لیے۔

"تم.... تم چپ کیوں ہو گئیں؟" جعفری پھر بولا۔

"نہیں.... میں...." فرزانہ کے لیے مزید کچھ کہنا مشکل ہو گیا۔

"کیا میں تمہارا انتظار کروں؟" جعفری نے پوچھا۔

"ہاں۔" فرزانہ کی آواز ایسی تھی جیسے رو دے گی۔

"گڈ!" جعفری کے لہجے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ "آج رات......"

"نہیں۔" فرزانہ بول پڑی۔ "رات کو گھر سے غائب نہیں رہ سکتی۔ کیا جواب دوں گی میں اپنے والدین کو۔"

"ہاں، بات تو یہ بھی ٹھیک ہے۔" جعفری نے کہا۔ "تم پھر کب آ سکتی ہو؟"

"کل صبح دس بجے۔" فرزانہ تھوک نگل کر بولی۔ "اور واپس بھی جلدی آنا چاہوں گی۔ تمہارے گھر آتے اور وہاں سے نکلتے وقت مجھے احتیاط بھی بہت کرنا پڑے گی۔ محلے کا کوئی شخص مجھے دیکھ نہ پائے۔"

"تمہیں میرے گھر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" جعفری بولا۔ "میں کبھی بھی کسی لڑکی کو اپنے گھر نہیں بلاتا۔ میرا ایک اور فلیٹ ہے۔ وہیں لے چلوں گا تمہیں۔ تم مجھے صدر کے ایک ہوٹل میں ملو۔" اس نے ایک ہوٹل کا نام بتایا۔

فرزانہ نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔"

فرزانہ نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس وقت اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"ظالم!" اس نے اپنے دل میں کہا۔ "تم نے میرا ایک حربہ تو ناکام کر دیا لیکن میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔"

گھر سے روانگی کے وقت اس نے جمیل خاں سے یہ بہانہ کیا کہ وہ ملازمت ہی کے سلسلے میں دو تین دفاتر کے چکر لگانے جا رہی ہے۔ جمیل خاں نے اس کی کامیابی کے لیے دعا کر کے ہی اسے رخصت کیا۔

کچھ دور پیدل چلنے کے بعد فرزانہ کو ٹیکسی مل گئی۔ وہ ہوٹل روانہ ہوئی۔ اس نے ہوٹل کے سامنے ٹیکسی رکوائی ہی تھی کہ جعفری ایک طرف کا دروازہ کھول کر ٹیکسی میں اس کے برابر آ بیٹھا۔

"میں دس منٹ سے منتظر تھا۔" وہ بولا اور اس نے ایک کاغذ فرزانہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس کاغذ پر ایک سڑک اور ایک عمارت کا نام لکھا ہوا تھا۔ فرزانہ اس عمارت سے ناواقف نہیں تھی۔ اس عمارت میں اپارٹمنٹس تھے۔ فرزانہ یہ بھی سمجھ گئی کہ جعفری نے اسے وہ کاغذ کیوں دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فرزانہ ہی ٹیکسی ڈرائیور کو بتائے کہ اب کہاں چلنا ہے۔

فرزانہ نے ڈرائیور کو بتا دیا۔ ٹیکسی پھر چل پڑی۔

فرزانہ جعفری سے ملے ہوئے چھوٹے سے کاغذ کو بے خیالی میں توڑنے مروڑنے لگی۔ وہ خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت چونکی جب جعفری نے وہ مڑا تڑا کاغذ اس کے ہاتھ سے لیا اور کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ اس وقت فرزانہ نے یہ بھی محسوس کیا کہ جعفری اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر فاتحانہ چمک اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا ہو۔

ٹیکسی منزلِ مقصود پر پہنچ کر رک گئی۔ فرزانہ نے کرایہ ادا کرنے کے لیے اپنا پرس کھولا۔ جعفری نے اسے روکا بھی نہیں۔ فرزانہ نے کرایہ ادا کیا۔ ٹیکسی سے اتر کر وہ دونوں آگے بڑھے اور سیڑھیاں طے کرنے لگے۔ "ہمیں دوسری منزل پر جانا ہے۔" جعفری نے بتایا۔ فرزانہ اس سے چند زینے پیچھے تھی۔

دوسری منزل پر اتفاق سے کوئی بھی نہیں تھا جب وہ دونوں اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔

جعفری نے اسے اپارٹمنٹ کے آراستہ ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور وہیں رکھے ہوئے ایک ریفریجریٹر سے کولڈ ڈرنک کی دو بوتلیں نکالیں۔ فرزانہ کو یہ عجیب سا لگا۔ اس کا خیال تھا کہ جعفری اسے فوراً اپنے اس کمرے میں لے جائے گا جسے خواب گاہ تو نہیں لیکن عیش کدہ کہا جا سکتا تھا اور وہاں سب سے پہلے شراب کی بوتل نکالے گا لیکن اس کے برعکس اس نے کولڈ ڈرنک گلاس میں انڈیل کر اس کے برابر میں نہیں بلکہ اس کے سامنے آ بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ خوشی نہیں تھی جس کا اظہار اس کے لہجے سے فون پر ہوا تھا۔

فرزانہ نے گلاس سے ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور جعفری کی طرف دیکھنے لگی جو اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ کولڈ ڈرنک کے گھونٹ لیتے ہوئے نہ جانے کیا سوچنے لگا تھا۔

"میں حاضر ہوں جعفری!" دو تین منٹ کی خاموشی کے بعد فرزانہ ہی بولی۔ "میں دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں رک سکتی۔"

جعفری نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے چند لمحے کے توقف سے کہا۔ "اب تک جو لڑکیاں بھی میرے ساتھ یہاں آتی رہی ہیں ان کا انداز کچھ اور تھا۔ وہ ان کی زندگی کا ایسا پہلا موقع تھا جس کی وجہ سے وہ کچھ سہمی ہوئی سی تو ضرور تھیں لیکن میں ٹیکسی میں راستے بھر دیکھتا رہا ہوں کہ تمہارے تاثرات کچھ اور ہی تھے۔ اداسی، غم، یا...... کچھ اسی قسم کے تاثرات۔ میں شاید صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتا۔ میں ان تاثرات کی وجہ جاننا چاہتا ہوں فرزانہ!"

"میرے تاثرات سے تمہیں کیا سروکار؟"

"میں جاننا چاہتا ہوں۔" جعفری نے زور دے کر کہا۔

"آخر کیوں؟" فرزانہ الجھی۔

"سبب ہے اس کا، بتا دوں گا بعد میں۔ پہلے تم بتاؤ...... تم راستے بھر کیا سوچتی رہی ہو؟ میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"میں......" فرزانہ نے نظریں جھکا لیں۔ "اپنی بے بسی پر میرا دل رو رہا تھا۔ میں اپنی معذور ماں کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ مجھے اپنے والد کا خیال آ رہا تھا جو مجھ سے نظریں ملا کر بہت کم بات کرتے ہیں۔ انہیں یہ احساس چوکے دیتا رہتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی سے ملازمت کرانے پر مجبور ہوئے۔ ان کے لیے [illegible] ابھی تو نہیں۔ وہ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت بھی نہیں کر سکتے۔ انہیں کسی وقت بھی سانس رک جانے کا دورہ سا پڑ جاتا ہے۔ ان دنوں تو میں ان کے لیے ایسی دوا میں لاتی رہی ہوں جو ایسے کسی موقع پر انہیں سنبھالے رکھتی ہے لیکن میری ملازمت ختم ہونے پر انہیں [illegible] دوا نہ ملنے کے سبب میری ماں کا کیا [illegible]۔ انہوں نے اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کی [illegible]۔ بس یہی سب خیالات ہیں جو مجھے ہر وقت [illegible] رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے پاس آنے کے لیے مجبور ہوئی۔" فرزانہ کی نہ صرف آواز بھرا گئی بلکہ آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔

جعفری یکایک اٹھا اور ٹہلنے لگا۔ وہ دو تین منٹ تک ٹہلا اور نہ جانے کیا سوچتا رہا پھر اس نے پوچھا۔ "جب تمہیں اپنے والدین کا اتنا خیال ہے تو تم نے وہ ملازمت کیوں چھوڑی؟ چھوڑی یا تمہیں الگ کر دیا گیا؟"

"الگ کر دیا گیا۔ کسی اور لڑکی کے لیے کوئی بڑی سفارش آ گئی تھی۔" فرزانہ نے جھوٹ بولا۔ اسے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ جعفری کو حقیقت بتاتی۔

"ہوں۔" جعفری پھر ٹہلنے لگا پھر کہیں سے اس نے ایک لیٹر پیڈ نکالا اور قلم ہاتھ میں لے کر پیڈ پر کچھ لکھتے لکھتے رکا اور فرزانہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "پی اے کی حیثیت سے کام کرنے کا بھی کچھ تجربہ ہوتا ہے۔ تم نے کچھ تجربہ حاصل کیا؟"

"میں نے بہت محنت سے کام کیا تھا۔ تین مہینے میں مجھے اتنا تجربہ ہو گیا ہے کہ اور کسی کو شاید سال دو سال میں ہوتا۔"

"ہوں۔" جعفری نے نظریں جھکائیں اور پیڈ پر تیزی سے کچھ لکھنے لگا۔ اس نے کوئی زیادہ لمبی چوڑی تحریر نہیں لکھی اور پیڈ سے وہ کاغذ پھاڑ کر فرزانہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اس خط کے نیچے میں نے پتا بھی لکھا ہوا ہے۔ یہ خط سطوت صاحب کے نام ہے۔ ہیں تو وہ بہت دولت مند انسان مگر ان کا یہ ادارہ کوئی زیادہ بڑا ادارہ نہیں ہے۔ اگر وہ چاہتے تو ایسے کئی ادارے کھول سکتے تھے۔ میرا یہ خط پڑھ کر وہ تمہیں ملازم رکھ لیں گے۔ تنخواہ بھی بہت معقول دیں گے۔ میں نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ تمہیں پی اے کی حیثیت سے کام کرنے کا تجربہ ہے۔ ڈیڑھ سال کا تجربہ۔ تم پڑھ لو خط۔"

لیکن فرزانہ نے خط نہیں پڑھا۔ اس پر بس ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ پہلے سے اس کو یہ خط جعفری نے صرف ایک وجہ سے دیا ہے۔ وہ فرزانہ کو یہ باور کرانا چاہتا ہوگا کہ وہ اپنا مطلب نکل جانے کے بعد اسے دھوکا نہیں دے گا۔

'لیکن دھوکا تو یہ اب بھی ہو سکتا ہے۔' فرزانہ نے سوچا۔ ضروری تو نہیں تھا کہ سب کچھ اس خط کی عبارت کے مطابق ہوتا۔

"ہو سکے تو ابھی جا کر سطوت صاحب سے مل لو۔" جعفری بولا۔

"ابھی؟" فرزانہ چونکی۔

"ہاں۔ فوراً چلی جاؤ۔ آج ہی تمہارے ذہن سے سب بوجھ ہٹ جائے گا۔"

فرزانہ اس کا منہ تکنے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" جعفری کی مسکراہٹ پھیکی سی تھی۔

"مجھے یہاں......" فرزانہ کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔ "مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

جعفری کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔ "میں اتنا برا آدمی نہیں ہوں فرزانہ، جتنا سمجھا جاتا ہوں۔ میں نے کبھی کسی لڑکی کی مجبوریوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ صرف ایسی لڑکیاں میرے پاس آتی رہی ہیں جو صرف اس لیے ملازمت کرنا چاہتی تھیں کہ کسی مناسب مرد کو

پھانس کر اس کے ساتھ شادی کر سکیں۔ کوئی مجبوری انہیں مجھ تک نہیں لائی تھی لیکن تم پریشانیوں میں گھر کر میرے پاس آنے کے لیے مجبور ہوئی ہو۔ میں اگر تمہاری مجبوری سے کھیلنا چاہوں گا تو اپنی نظروں سے گر جاؤں گا۔"

فرزانہ اس کی طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے کسی خواب میں آگئی ہو۔

"بس اب جاؤ۔" جعفری نے کہتے ہوئے اٹھنا چاہا۔

"سنیے جعفری صاحب!" فرزانہ بے ساختہ بولی۔ غیر ارادی طور پر اس کا طرزِ تخاطب بدل گیا تھا۔ وہ جعفری کو "تم" کہہ کر مخاطب کرتی رہی تھی اور اس سے نفرت بھی کرتی تھی لیکن اب جعفری کا جو روپ اس کے سامنے آیا تھا، وہ اس کے لیے قابلِ احترام ہو گیا تھا۔

جعفری بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم تیج کا وقت آنے سے پہلے ہی سطوت صاحب سے مل لو ورنہ وہ دو بجے کے بعد ملیں گے۔"

"میں اگر آپ کے بارے میں جانے بغیر چلی گئی تو ذہن میں خلش رہ جائے گی۔"

"کیا جاننا چاہتی ہو؟"

"جب آپ نے میری افسردگی کا سبب جاننا چاہا تھا تو میں نے بتایا، یہ کہا تھا کہ آپ کو اس سے کیا غرض۔ کچھ ایسی ہی بات ہوئی تھی۔ تبھی آپ نے کہا تھا کہ اس کا سبب آپ بعد میں بتائیں گے، پہلے میں بتاؤں۔ اب میں بتا چکی ہوں لیکن آپ نے نہیں بتایا۔"

"نہ جانو تو اچھا ہے۔" جعفری نے ٹھنڈی سانس لی۔ "وہ کوئی خوشگوار سبب نہیں ہے۔"

"میں ہر صورت میں جاننا چاہوں گی ورنہ......" فرزانہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں سطوت صاحب کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

"بچکانہ ضد ہے تمہاری۔" جعفری کی مسکراہٹ بے جان سی تھی پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بہت سنجیدہ نظر آنے لگا پھر کھوئے کھوئے سے انداز میں بولنے لگا۔

"میں کسی آسودہ حال گھرانے کا فرد نہیں ہوں۔ میری والدہ تو میرے بچپن میں ہی انتقال کر گئی تھیں پھر والد صاحب کا انتقال بھی اس زمانے میں ہوا جب میں تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ میری چھوٹی بہن اس وقت میٹرک میں تھی۔ والد اتنا پیسا چھوڑ کر دنیا سے نہیں گئے تھے کہ ہم بہن بھائی سکون سے زندگی گزار سکتے۔ میں نے کالج چھوڑ کر ملازمت کر لی۔ میری بہن بی کام کرنے کی خواہش مند تھی۔ میں نے اس کا تعلیمی سلسلہ ختم نہیں ہونے دیا حالانکہ میری تنخواہ کچھ معقول نہیں تھی۔ آخر اس نے اچھے نمبروں سے بی کام کر لیا۔ میں بھی اس دوران میں پرائیویٹ امتحان دے کر بی اے کر چکا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ بہتر ملازمت مل سکتی تھی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔" جعفری نے پھر ٹھنڈی سانس لی۔

فرزانہ بے تابی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

ذرا سا رک کر جعفری نے پھر بولنا شروع کیا۔ "قدرت کو یہ منظور تھا کہ میں کوئی بھی ملازمت نہ کر سکوں۔ ایک موٹر سائیکل سے میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ میری ٹانگ ٹوٹ گئی۔"

"اوہ!" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"میں پرائیویٹ اسپتال میں تو داخل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔" جعفری نے پھر بولنا شروع کیا۔ "ایک سرکاری اسپتال میں داخل ہوا۔ ٹانگ ٹھیک ہونے میں خاصے دن لگے کیونکہ پہلا آپریشن غلط ہو گیا تھا۔ سرکاری اسپتالوں میں تو یہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ بہرحال کیونکہ اتنے عرصے تک پیٹ کی آگ بجھانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اس لیے میری بہن نے ایک بینک میں ملازمت کر لی۔ تمہاری طرح وہ بھی بہت خوب صورت تھی۔ بی کام اس نے بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اس کے باوجود اس زمانے میں ملازمت آسانی سے نہیں ملتی تھی لیکن خوش قسمتی سے اسے مل گئی۔ البتہ اب میں سوچتا ہوں کہ کاش وہ خوش قسمتی نہ ہوتی جو بدقسمتی میں بدل گئی تھی۔"

فرزانہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

جعفری نے اپنا بیان جاری رکھا۔ "میری ٹانگ آخر ٹھیک ہو گئی۔ میں گھر آ گیا تھا۔ میری بہن بینک گئی ہوئی تھی جہاں سے وہ زندہ واپس نہیں آئی۔"

"کیا مطلب؟ کیا ہوا؟" فرزانہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

جعفری نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "وہ ایک بس کے نیچے آ کر ہلاک ہو گئی تھی۔"

ایک بار پھر فرزانہ کا منہ.... کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"بظاہر وہ ایک حادثہ تھا۔" جعفری قدرے رک کر فرزانہ کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ "لیکن ایک دن بعد مجھے ڈاک سے ایک خط ملا۔ چند سطروں کا وہ خط میری بہن کا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ بینک منیجر نے بینک کے واش روم میں ہی اسے پکڑ لیا تھا اور اس کی آبروریزی کر ڈالی تھی۔"

فرزانہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا سر چکرانے لگا ہو۔

"اس نے خط میں لکھا تھا......" جعفری کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ "کہ اس واقعے کے بعد وہ

میرے سامنے نہیں آنا چاہتی اور اس نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بس کے نیچے آ کر مرجانا چاہتی تھی لیکن اس نے یہ ضروری سمجھا کہ مرنے سے پہلے مجھے صورتِ حال سے آگاہ کر دے۔ اسی لیے اس نے بس کے نیچے آنے سے پہلے مجھے وہ مختصر خط لکھا تھا۔"

"بہت ہی افسوسناک واقعہ ہے۔" فرزانہ نے اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "قیامت گزر گئی ہوگی آپ پر۔ وہ خط لے کر آپ پولیس کے پاس تو گئے ہوں گے؟"

"گیا تھا۔" جعفری نے کہا۔ "لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ آج کا زمانہ ایسا ہی ہے فرزانہ! دولت مند اور بارسوخ آدمیوں کے لیے کوئی قانون نہیں ہوتا۔ سزا صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جن کے وسائل نہیں ہوتے۔ جن کے پاس پیسا نہیں ہوتا۔ اس بینک کا منیجر تو اسی بینک کے سینئر وائس پریذیڈنٹ کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ قانون کی گرفت سے صاف بچ نکلا۔ پولیس نے کیس ہی اس طرح بگاڑا تھا کہ اس بدبخت کو عدالت سے سزا مل ہی نہیں سکتی تھی۔"

فرزانہ نے ٹھنڈی سانس لی۔

"بس......" جعفری نے کہا۔ "اس کے بعد ہی میں نے فیصلہ کیا کہ ہر قیمت پر اس غربت سے نجات حاصل کروں گا جو میری بہن کی موت کا سبب بنی تھی اور میں نے اپنا یہ مقصد حاصل بھی کر لیا۔ اب میرے پاس یہ خوب صورت اپارٹمنٹ ہے، کار بھی ہے لیکن میں تمہارے گھر کے علاقے کے علاوہ بھی ایسے ہی چھوٹے علاقوں میں جاتا ہوں۔ ایسے ہی علاقوں میں رہنے والی لڑکیاں آسانی سے میرے جال میں پھنس جاتی ہیں۔ اسے تم میرا پاگل پن کہو یا کچھ اور لیکن میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جس طرح میری بہن کی آبروریزی کی گئی تھی، اسی طرح میں بہت سے بھائیوں کی بہنوں کو برباد کروں گا۔ وہی میں کر بھی رہا ہوں۔ بس یہ ہے وہ سبب کہ تمہاری مجبوریوں میں مجھے اپنی مجبوری اور بدنصیبی کا عکس نظر آ گیا تھا۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا کہ میں تمہارے ساتھ اس طرح پیش نہیں آؤں گا۔"

نہ جانے فرزانہ کے دماغ میں کیا خیال آیا تھا کہ پوچھ بیٹھی۔ "وہ منیجر اب کہاں ہے؟ اب تو وہ کسی بڑی پوسٹ پر ہوگا؟"

جعفری بڑے زہریلے انداز میں ہنسا۔ "اسے اتنا وقت نہیں ملا کہ بڑی پوسٹ تک پہنچ سکے۔ چند سال پہلے کی بات ہے۔ یہ خبر ٹی وی پر بھی آئی تھی اور اخبارات میں بھی۔ کسی نے اس کمینے انسان کو قتل کر دیا تھا۔"

فرزانہ چونکی۔

"کیوں؟" جعفری مسکرایا۔ "کیا تم یہ سمجھ رہی ہو کہ اسے میں نے قتل کیا ہوگا؟"

"نن...... نہیں۔" فرزانہ ہکلا گئی۔ حالانکہ اس کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا۔

"لیکن ایک کام میں نے ضرور کیا تھا۔" جعفری بولا۔ "میرا اندازہ ہے کہ مجھے یقین ہے کہ تم دل کی بہت اچھی ہو۔ میری بات کسی کو نہیں بتاؤ گی۔ اس کمینے شخص کی بھی ایک بہن تھی۔ میں نے اسے اغوا کروا کے اس کی آبروریزی کی تھی لیکن اتنی ہوشیاری کے ساتھ کہ قانون کے ہاتھ مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔"

فرزانہ پھر اس کا منہ تکنے لگی۔ اب جعفری اسے ایک افسانوی کردار محسوس ہونے لگا تھا۔

"ایک بات شاید تم اور سوچتی رہو۔" جعفری بولا۔ "میرے پاس اب پیسا کہاں سے آ گیا جبکہ بظاہر میں کوئی کام بھی نہیں کرتا۔"

فرزانہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"فرزانہ!" جعفری نے کولڈ ڈرنک کی خالی بوتل پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "پیسا حاصل کرنے کے دو ہی طریقے ہوتے ہیں۔ جائز اور ناجائز...... اور جو لوگ جائز طریقے اختیار کرتے ہیں، وہ مشکلات میں ہی زندگی گزارتے ہیں اور اب تو وہ وقت آ گیا ہے کہ جائز طریقے وہی اختیار کرتے ہیں جنہیں ناجائز طریقے اختیار کرنا نہیں آتے یا ان میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ ناجائز طریقے اختیار کریں۔"

جعفری نے اعتراف نہ کرنے کے باوجود اعتراف کر لیا تھا کہ اس نے جائز طریقے سے پیسا نہیں کمایا۔

"اب جاؤ!" جعفری نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "ابھی وقت ہے کہ تم لنچ سے پہلے سطوت صاحب کے دفتر پہنچ سکو۔ اور ہاں، اگر کبھی کسی بھی وجہ سے میری ضرورت محسوس کرو تو فون کر لینا۔"

"میں آپ سے ملنے آؤں گی۔ ایک اور بات کرنا ہے مجھے آپ سے۔"

"اب کیا بات کرنا چاہتی ہو؟"

"بتاؤں گی۔" فرزانہ کھڑی ہو گئی۔

جعفری نے کہا۔ "میں اصرار کرتا کہ ابھی بتاؤ لیکن تمہیں دیر ہو جائے گی۔"

فرزانہ جب اس کے اپارٹمنٹ سے نکلی تو اس کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ غلط راہوں پر چل نکلنے کے باوجود یہ شخص شاید فرشتہ ہے۔

☆☆☆

جعفری نے کہا تو تھا کہ فوراً جا کر سطوت سے ملے لیکن اس کی باتوں اور اس کے رویے نے فرزانہ کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی کر دی تھی کہ وہ خود کو منتشر محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ اپنے گھر ہی لوٹ گئی۔ جمیل خاں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے کوئی اچھی خبر سننا چاہتے ہوں۔

"کچھ امید بندھی ہے بابا!" فرزانہ نے اس سے کہا۔ "کل کوئی نتیجہ سامنے آ سکتا ہے۔"

جمیل خاں نے سر ہلا دیا۔

دو گھنٹے بعد ہی فرزانہ کے موبائل پر جعفری کی کال آ گئی۔

"تم گئی نہیں فرزانہ؟" جعفری نے فرزانہ کی "ہیلو" سننے کے بعد کہا۔

"جی...... آپ کے پاس سے اٹھ کر ذہن بہت منتشر تھا۔ میں اس حالت میں ٹھیک سے انٹرویو نہیں دے پاتی۔"

"تمہارا انٹرویو لیا ہی نہیں جاتا۔ میرا خط کافی تھا۔ خیر کل چلی جانا۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں نہیں گئی؟"

"فون کیا تھا میں نے سطوت مرزا کو۔"

"اچھا! میں کل صبح چلی جاؤں گی۔"

"تم سے کسی قسم کے سوال نہیں کیے جائیں گے۔ یوں سمجھو کہ تمہیں ملازمت مل چکی ہے اور کل صبح سے تم کام شروع کر دو گی۔"

"بہتر۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

فرزانہ سوچ میں پڑ گئی۔ یہ اس کے لیے عجیب سی بات تھی کہ جعفری جسے چاہتا تھا، ملازمت دلا دیتا تھا۔ آخر ایسی کیا طاقت تھی اس میں؟ بظاہر کوئی ایسی بات فرزانہ کے سامنے نہیں آئی تھی کہ وہ اسے بارسوخ و بااثر شخص سمجھ سکتی۔

اس فون کال سے فرزانہ کے علم میں آیا تھا کہ اسے جس شخص سے ملنا تھا، اس کا پورا نام سطوت مرزا تھا۔

اور وہ دوسرے دن صبح نو بجے ہی سطوت مرزا کے دفتر پہنچ گئی۔

سطوت مرزا کے کمرے سے پہلے جو کمرا تھا، اس میں ایک جوان العمر شخص بیٹھا ہوا تھا۔ فرزانہ نے اس سے جب سطوت مرزا سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ جلدی سے بولا۔ "کیا آپ کا نام فرزانہ ہے؟"

فرزانہ چونکی۔

"میں تو کل دوپہر سے آپ کا منتظر ہوں۔" وہ پھر بولا۔ "صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ آپ آئیں گی۔ پھر بعد میں انہوں نے بتایا کہ آپ آج صبح سے آئیں گی۔ اسی لیے ابھی آپ آئیں تو میں سمجھ گیا کہ آپ فرزانہ ہی ہوں گی۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ "یہ آپ کی سیٹ ہے۔ صاحب کی سیکریٹری تین دن ہوئے جب یہ ملازمت چھوڑ گئی۔ صاحب نے مجھے وقتی طور پر یہاں بٹھا دیا تھا۔ میں تو کلریکل سیکشن میں بیٹھتا ہوں۔ اب آپ سنبھالیے اپنی سیٹ۔" وہ کرسی سے اٹھ گیا۔

"لیکن...... وہ...... میرا مطلب ہے...... مرزا صاحب سے نہ ملوں؟"

"وہ وقت کے بہت پابند ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ دفتر میں نہ ہوتے ہوں لیکن آج انہیں کسی وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔ آپ کے آنے سے چند سیکنڈ پہلے ان کا فون آیا تھا کہ وہ آج آدھے گھنٹے بعد آئیں گے۔ آپ کے بارے میں بھی پوچھا تھا۔ آپ بیٹھیں۔"

فرزانہ اس کرسی پر بیٹھ گئی جس پر وہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔

"میرا نام جمال ہے۔" وہ بولا۔ "مجھ سے روز ہی آپ کا سامنا ہوا کرے گا۔ کچھ ایسے کام میرے سپرد ہیں کہ دفتر کی چھٹی سے پہلے ذرا دیر کے لیے مجھے صاحب کے پاس آنا پڑتا ہے۔"

"جی۔" فرزانہ نے صرف اتنا ہی کہا اور اپنا پرس ایک طرف رکھا۔

جمال اب بھی کھڑا رہا۔ وہ فرزانہ کو تک رہا تھا۔

"کچھ اور کہنا ہے آپ کو؟" فرزانہ بولی۔

"جی نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "بس جا رہا ہوں۔" اور وہ چلا گیا۔

فرزانہ نے گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ الماریوں میں فائلیں بھری ہوئی تھیں۔ کچھ فائلیں اس کی میز پر بھی تھیں۔ میز پر ایک ٹیلی فون اور ایک انٹرکام بھی تھا۔ بائیں ہاتھ پر کمپیوٹر تھا۔

فرزانہ نے فوری طور پر کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جعفری کی بات کے باوجود وہ سمجھ رہی تھی کہ ابھی اس نے چارج نہیں لیا ہے۔

کوئی پچیس منٹ کے بعد ایک بھاری بھرکم شخص اندر آیا۔ اس کی عمر پینسٹھ سال کے لگ بھگ تھی لیکن اس عمر میں بھی وہ پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔

فرزانہ احتراماً کھڑی ہو گئی کیونکہ اسے خیال آیا تھا کہ وہی سطوت مرزا ہوگا اور اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ فرزانہ کی طرف دیکھا اور بولا۔ "ابھی جمال نے بتایا تھا کہ تم آ گئی ہو۔"

"جی سر!"

"میرے کمرے میں آؤ۔" سطوت مرزا آگے بڑھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"جی۔"

وہ سطوت مرزا کے کمرے میں داخل ہوئی۔ سطوت مرزا ایک بڑی میز کے پیچھے جا بیٹھا۔ فرزانہ اس کی میز کے قریب جا رکی۔ اس نے دیکھا کہ وہاں ایک اور کمرے کا دروازہ تھا۔

"بیٹھو۔" سطوت مرزا نے کہا۔

"جی سر۔" فرزانہ بیٹھ گئی۔

"اپائنٹمنٹ لیٹر تمہیں آج ہی مل جائے گا۔ جعفری نے بتایا تھا کہ تم آج ہی سے کام شروع کر دو گی۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ تمہیں سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے کا ڈیڑھ سال کا تجربہ ہے۔ شارٹ ہینڈ سے واقف ہوگی؟"

"یس سر!"

"یس سر!" سطوت مرزا [illegible]

فرزانہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

سطوت مرزا بولا۔ "اب تک تم صرف یہی دو لفظ بولتی رہی ہو۔"

"یس سر......" فرزانہ [illegible] چپ ہو گئی۔

سطوت مرزا ہنس پڑا۔ وہ یقیناً خوش مزاج آدمی تھا۔ فرزانہ سوچنے لگی کہ اس شخص کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنا اس کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوگا۔

"دو ایک کمپنیز سے رابطے میں خود ہی کرتا ہوں۔" سطوت مرزا نے کہا۔ "کسی وجہ سے یہ منیجر پر نہیں چھوڑتا۔ تمہیں خط ڈکٹیٹ کرواتا ہوں۔ اسٹینوگرافی بک تم نے اپنی میز پر دیکھی تو ہوگی۔"

"جی، نظر تو پڑی تھی۔" فرزانہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "لے کر حاضر ہوتی ہوں۔"

سطوت مرزا نے سر ہلایا اور میز پر موجود ایک ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

فرزانہ جب بک لے کر آئی تو سطوت مرزا ٹیلی فون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھا جو خالصتاً کاروباری تھیں۔ فرزانہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ اس نے بک کھول لی تھی اور قلم سنبھال لیا تھا۔

گفتگو ختم کر کے سطوت مرزا نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔ "لکھو۔"

اس نے تین خط ڈکٹیٹ کروائے جس میں دس منٹ لگے۔

[illegible] گی۔" فرزانہ اٹھی۔

"اچھا، سنو!" وہ کچھ رک کے بولا۔

فرزانہ اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میرے دو بچے ہیں۔" سطوت نے بتایا۔ "بڑی لڑکی دس سال کی ہے۔ سائرہ نام ہے اس کا۔ سات سال کا لڑکا ہے، تنویر۔ وہ دونوں اسکول سے سیدھے یہیں آتے ہیں۔ یہ کمرہ ان کے لیے ہے۔" اس نے دوسرے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ یہیں لنچ کرتے ہیں۔ بارہ بجے تک ایک آدمی لنچ لے کر آ جائے گا۔ جب میں گھر جاتا ہوں تبھی وہ میرے ساتھ ہی جاتے ہیں۔ یہ میں تم کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ آج جس وقت وہ دونوں آئیں گے، میں نہیں ہوں گا۔ ایک ضروری کام سے دو گھنٹے کے لیے کہیں جانا ہے۔ تم کو اس لیے بتا دیا کہ جب وہ دونوں آئیں تو......"

"میں سمجھ گئی سر!"

"بس۔" سطوت مرزا نے کہا۔

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ جا سکتی ہے۔

وہ بیرونی کمرے میں آ گئی جو اب دفتر میں اس کا کمرا تھا۔ اس نے کمپیوٹر کھولا اور خطوط ٹائپ کرنے لگی۔ خطوط ٹائپ کر کے ہدایت کے مطابق وہ میل بھی کر دیے۔ اس دوران میں وہ یہ بھی سوچتی رہی کہ بچے اسکول سے اپنے گھر ہی جاتے ہیں، پھر ایسا کیوں ہے کہ سطوت مرزا کے دونوں بچے گھر جانے کے بجائے یہاں آ جاتے ہیں اور پھر سطوت مرزا کے ساتھ ہی یہاں سے گھر جاتے ہیں۔ کیا گھر پر ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں؟

یہ بات جعفری سے معلوم ہو سکتی تھی۔

بارہ بجے کے قریب ایک آدمی ایک بڑا سا لنچ باکس لے کر آیا۔ اس میں اتنا کھانا ہو سکتا تھا کہ چار افراد بھی کھا سکتے تھے۔

کھانا لانے والے نے ایک نظر فرزانہ پر ڈالی اور پھر اندرونی کمرے کی طرف جانے لگا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" فرزانہ نے اسے ٹوکا۔

"کھانا رکھنے۔" وہ گردن موڑ کر بولا۔

"یہیں رکھ دو۔" فرزانہ نے ایک شیلف کی طرف اشارہ کیا۔

"ہمیشہ تو اندر رکھتا ہوں۔"

"مجھے علم نہیں۔ یہیں رکھ جاؤ۔"

اس نے بے پروائی سے سر ہلایا اور لنچ باکس وہیں [illegible]

اب فرزانہ نے میز پر رکھی ہوئی فائلوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ایک ایک فائل کا اس نے بغور جائزہ لینا شروع کیا۔ اسے اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس میں کتنا وقت گزر گیا۔ وہ اس وقت چونکی جب اس نے بچوں کی آوازیں سنیں۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی دروازہ کھول کر اندر آئے۔ ان کی عمریں وہی ہو سکتی تھیں جو سطوت مرزا نے بتائی تھیں۔

"نئی آنٹی آ گئیں باجی!" لڑکا چہکنے والے انداز میں بولا۔ لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ فرزانہ کی میز کے قریب آ گئی۔

"آپ کا نام فرزانہ ہے نا آنٹی؟" اس نے محبت سے پوچھا۔

فرزانہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے لڑکی کا گال تھپکا۔ "اور تم سائرہ ہو۔ یہ تمہارا بھائی تنویر ہے۔"

"جی آنٹی!"

تنویر نے پوچھا۔ "آپ تو نہیں جائیں گی نا آنٹی؟"

"پہلے یہاں جو آنٹی ہوتی تھیں تمہاری، وہ کب چلی گئیں؟"

"کئی دن ہو گئے؟" سائرہ نے جواب دیا۔

"اچھا اب تم دونوں اپنے کمرے میں چلو۔ میں تمہارا کھانا لے کر آتی ہوں۔"

فرزانہ اٹھ کر شیلف کی طرف گئی اور لنچ باکس اٹھا کر بچوں کے پیچھے سطوت مرزا کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"ڈیڈی نے بتایا تھا کہ وہ آج کہیں جائیں گے۔" سائرہ نے کہا۔ وہ اور تنویر سطوت مرزا کے کمرے سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

فرزانہ ان کے پیچھے اس کمرے میں داخل ہوئی جو خاصا کشادہ تھا۔ ایک گوشے میں ڈبل بیڈ لگا ہوا تھا۔ ایک مخصوص طرز کی رائٹنگ ٹیبل بھی تھی جس کے آگے پیچھے کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ میز سطوت مرزا نے خاص طور سے ایسی بنوائی تھی کہ ان کے دونوں بچے ساتھ بیٹھ کر اسکول کا کام کر سکیں۔ ایک گوشے میں چار کرسیوں کی گول ڈائننگ ٹیبل بھی تھی۔ اس پر مائیکرو ویو اوون بھی رکھا ہوا تھا۔ میز کے قریب ہی شیلف میں برتن رکھے تھے۔ شیلف میں دو درازیں بھی تھیں۔

سائرہ اور تنویر نے اپنے وزنی بستے رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیے۔

فرزانہ نے لنچ باکس ڈائننگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں تم دونوں کے لیے کھانا گرم کیے دیتی ہوں۔"

"نہیں آنٹی! کھانا تو لنچ باکس میں گرم ہی رہتا ہے۔" سائرہ بولی۔ "ہاں، اگر نکالنے کے بعد ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو گرم کر لیتے ہیں لیکن پہلے تو ہم نہائیں گے۔"

فرزانہ کی نظر اس دروازے پر پڑ چکی تھی جو باتھ روم ہی کا ہو سکتا تھا۔

"اچھا، تو تم دونوں نہاؤ۔ میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ کوئی ضرورت پڑے تو بلا لینا۔"

"ارے! تو کیا آپ کھانا نہیں کھائیں گی؟" سائرہ بولی۔ "پہلے والی آنٹی تو ہمارے ساتھ ہی کھاتی تھیں۔"

"مجھے اس کا علم نہیں پیارے بچو!" فرزانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں صاحب سے اجازت لیے بغیر تمہارے ساتھ کھانے کے لیے کیسے بیٹھ سکتی ہوں؟"

"بتا کر نہیں گئے ڈیڈی آپ کو؟" سائرہ نے ایک نہایت قیمتی موبائل نکالتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی بات کرتی ہوں ڈیڈی سے۔"

تنویر تیزی سے باتھ روم میں جا گھسا تھا۔

"ڈیڈی!" سائرہ خفا ہونے والے انداز میں بولی۔ "آپ نے نئی آنٹی سے کیوں نہیں کہا کہ وہ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔"

پھر کوئی جواب سن کر سائرہ نے موبائل فرزانہ کی طرف بڑھا دیا۔ "بات کیجیے آنٹی، ڈیڈی سے۔"

فرزانہ نے فون کان سے لگا لیا۔ "جی سر!"

"دراصل میں تم سے کہنا بھول گیا تھا۔ بچوں کے ساتھ ہی لنچ کر لیا کرو تم بھی اور جب میں دفتر میں ہوں گا تو بھی ہمارے ساتھ ہی کھایا کرنا۔"

"جی سر......! جی......! عزت افزائی آپ کی۔"

دوسری طرف سے مزید کچھ کہے بغیر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

"تم بھائی بہن تیار ہو کر مجھے بلا لینا۔ تمہارے ساتھ ہی کھاؤں گی۔"

فرزانہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آ بیٹھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اسے اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں زیادہ وقت نہیں ہوگی۔ دونوں بچے مہذب تھے۔ تنویر شاید تھوڑا سا شرارتی معلوم ہوتا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ان دونوں کو بہت جلد خود سے مانوس کر لیتی۔ اسے یہ خیال بھی آ چکا تھا کہ ان کی ماں کو یا تو طلاق ہو چکی تھی یا انتقال ہو گیا تھا۔

☆☆☆

تین دن گزر گئے اور پھر چوتھے روز تو اس نے بہت سکون کی سانس لی کیونکہ جس کا اسے ڈر تھا، ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس نے بعد میں بظاہر خوشی خوشی ہی اپنے آپ کو طارق کے حوالے کیا تھا۔ اس نے ظاہر یہ کیا تھا کہ وہ اس طرح طارق کو شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

شادی سے طارق کے انکار پر وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی تھی۔ "اچھا اگر آپ میری تنخواہ ڈیوڑھی کرنے کے لیے تیار ہیں تو میں آئندہ بھی آپ کے پاس آتی رہوں گی۔ جو ہونا تھا، وہ تو ہو ہی چکا۔ بس ایک شرط ہوگی میری۔"

"بولو۔" طارق خوش ہو گیا تھا۔

"مجھے ضرورت ہے۔ اگلی تنخواہ آنے سے پہلے مجھے ایڈوانس دے دیں۔"

"میں ابھی اکاؤنٹنٹ سے کہہ دیتا ہوں۔ ابھی بن جائے گا تمہاری اگلے مہینے کی تنخواہ کا چیک۔" طارق بہت خوش تھا۔ "غالباً تم یقین کر چکی ہو کہ اب تمہیں ڈیوڑھی تنخواہ ملے گی۔"

"آپ جو چاہیں... لیکن میں نے تو اپنی ضرورت کی وجہ سے کہا ہے۔"

"اب میری ایک بات اور مان لو۔" طارق عیارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "بعد میں بھی کبھی کبھی سہی مگر فی الحال دو تین دن تمہیں روزانہ ہی میرے گھر چلنا ہوگا۔ تمہارا لمس تو جادو ہے فرزانہ! ابھی تک اس کا نشہ ہے...... تو پھر چلو گی نا؟"

"چلوں گی۔" فرزانہ جبراً اپنے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لے آئی لیکن دل میں خوش بھی تھی کہ مسلسل دو تین روز طارق کے ساتھ جانا ہی اس کے لیے اچھا ہے۔ اب وہ جلد ہی طارق کو شادی پر مجبور کرنے کی تدبیر پر عمل کر گزرے گی۔

اسی روز لنچ آور میں وہ ٹیکسی کر کے سیدھی بینک پہنچی۔ ایک بجے سے پہلے پہلے اس نے وہ چیک جمع کرا دیا جو اسے ملا تھا۔ وہ جلد از جلد اتنی رقم چاہتی تھی کہ جس سے وہ چیزیں خرید سکے جن کے بغیر وہ اپنے ذہن میں آئی ہوئی تدبیر پر عمل نہیں کر سکتی تھی۔

لنچ کے کچھ دیر بعد وہ طارق کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی تاکہ وہاں سے واپسی پر وہ اسی وقت گھر پہنچ سکے جس وقت عام طور پر گھر پہنچتی تھی۔

طارق کے گھر جاتے اور پھر وہاں سے آتے ہوئے بھی اس کا دل لرزتا رہا تھا لیکن طارق کو شادی پر آمادہ کرنے کے لیے اسے ایک تدبیر کرنا ہی تھی۔

گھر جا کر وہ کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔ ساڑھے دس بجے وہ اپنے کمرے میں تھی۔ وہ آن لائن کے باوجود کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر وہ گوگل سرچ میں جا کر وہ کیمرے دیکھنا اور فیصلہ کرنا چاہتی تھی کہ اسے کس قسم کا کیمرا خریدنا ہے۔

گوگل سرچ میں جا کر اس نے مختلف قسم کے کیمروں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ یوٹیوب سے ایک لیڈیز پرس کیمرے کے استعمال کا طریقہ بھی سمجھا کیونکہ اس نے اسی قسم کا کیمرا خریدنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جس دن چیک کیش ہوا، اس نے مطلوبہ کیمرا خریدا اور پھر واپس دفتر پہنچنے میں اس نے دیر نہیں لگائی اور اپنا سامان اس پرس میں منتقل کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ طارق کے ساتھ اس کے گھر روانہ ہوئی۔ وہ طارق سے کہہ چکی تھی کہ آج کے بعد وہ طارق کے ساتھ روزانہ نہیں، بس کبھی کبھی آیا کرے گی۔

اس روز جب وہ طارق کے ساتھ روانہ ہوئی تو اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ گو کہ اس کے خیال کے مطابق اس کی کامیابی یقینی تھی تاہم یہ دھڑکا بھی کسی نہ کسی حد تک لگا رہا کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

"یہ نیا پرس خریدا ہے؟" راہ میں طارق نے اس کی گود میں رکھے ہوئے پرس پر ایک نظر ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" فرزانہ مسکرائی۔ "اچھا ہے نا؟"

"بہت خوب صورت۔" طارق نے کہا۔ "اس میں نگ اتنی مہارت سے لگائے گئے ہیں کہ بہت اچھے لگ رہے ہیں۔"

فرزانہ کے دل کی دھڑکنیں پہلے ہی تیز تھیں۔ طارق کی بات سن کر اس کا دل ایک مرتبہ زیادہ ہی زور سے اچھل گیا کیونکہ انہی نگوں میں سے ایک نگ دراصل کیمرے کا لینس تھا۔

لیکن پھر اس موضوع پر بات آگے نہیں بڑھی اور فرزانہ نے سکون محسوس کیا۔ گھر پہنچنے کے بعد خواب گاہ میں داخل ہو کر فرزانہ نے پرس ایک ایسی جگہ پر رکھ دیا جہاں سے کیمرے کا لینس طارق کے بیڈ کو بہت صحیح طریقے سے کور کر سکتا تھا۔

پرس رکھتے وقت اس نے ٹشو نکالنے کے بہانے پرس کھول کر کیمرا آن کر لیا۔ اسے دکاندار نے بتایا تھا کہ کیمرا

وصال گھنٹے تک مسلسل کام کرسکتا ہے۔
اس دن طارق نے اصرار کیا کہ اب فرزانہ کو تک بھی زیادہ دیر تک رکے۔ فرزانہ نے آمادگی ظاہر کردی۔ زیادہ وقت کے باعث اس کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ دکاندار سے اسے یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ پرس کا کیمرا بند کیا جائے یا نہ کیا جائے، دو گھنٹے بعد وہ خود ہی بند ہوجائے گا اور فرزانہ کے لیے دو گھنٹے کی فکر بھی کافی تھی۔
فرزانہ اس دن طارق کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کرتی رہی تھی اور اس نے محسوس کیا تھا کہ طارق نے بھی یہ بات سمجھ لی تھی کہ وہ اسے شادی پر آمادہ کرنا چاہتی ہے۔ فرزانہ اشاروں کنایوں میں یہ بات کہتی بھی رہی تھی۔ جبکہ طارق کا مزاج سمجھ لینے کے بعد اسے یقین ہو چکا تھا کہ طارق اس کے لیے ہرگز آمادہ نہیں ہوگا۔
فرزانہ کی آمادگی کے باوجود دو گھنٹے سے زیادہ نہیں گزرے۔ طارق کے لیے کوئی کال آگئی تھی اور اس کے لیے کہیں جانا ضروری ہوگیا تھا۔
عموماً وہ فرزانہ کو اپنی کار ہی میں اس کے گھر تک یا قریبی ٹیکسی اسٹینڈ تک چھوڑ آیا کرتا تھا مگر اس دن اس نے کہا۔ "میں تمہیں یہیں قریب ہی سے ٹیکسی دلوا دوں گا۔ مجھے جلد از جلد کہیں پہنچنا ہے۔"
"ٹھیک ہے۔" فرزانہ ہنسی۔ "میں تو خوش ہوں کہ مجھے گھر پہنچنے میں دیر نہیں ہوگی۔"
طارق بھی ہنس دیا۔
"مجھے ذرا سہارا دو۔" فرزانہ نے کہا۔ "آج مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے جان ہی نہیں رہی ہو۔"
فرزانہ نے کمزوری کا صرف بہانہ کیا تھا۔ وہ طارق کا سہارا لے کر پرس تک جانا چاہتی تھی تاکہ ویڈیو میں ان دونوں کے چہرے بہت زیادہ واضح ہوجائیں حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ دکاندار نے اس کیمرے کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی تھی کہ آدھے آدھے گھنٹے بعد کیمرے کا "زوم" بہتر حت کے لیے خود بخود کام کرتا ہے۔
طارق نے اس دن اسے قریب ہی سے ایک ٹیکسی دلوا دی۔ فرزانہ اپنے گھر روانہ ہوگئی۔ اس دن وہ خوش تھی کہ اس کی تدبیر کام کر گئی۔ گھر کے کاموں سے جلد از جلد فارغ ہو کر وہ اپنے پرس کے ساتھ کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھی اور کیمرے کی ویڈیو کمپیوٹر پر منتقل کردی۔
پھر آج [illegible] سے وہ خالی ڈی وی ڈی بھی خرید لائی تھی۔ کمپیوٹر سے اس نے ویڈیو ایک ڈی وی ڈی پر اور پھر دوسری ڈی وی ڈی پر منتقل کی۔ خود ویڈیو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ قسمت میں لکھا تھا کہ وہ اپنی اس حالت کی ویڈیو دیکھے۔ اس نے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے سوچا۔
اس کام سے فارغ ہو کر اس نے کمپیوٹر بند کر دیا۔
اگلے دن جب وہ دفتر گئی تو ایک ڈی وی ڈی اس کے پرس میں تھی۔ وہ فوری طور پر طارق سے ملنا چاہتی تھی لیکن اس وقت کوئی پارٹی طارق سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ فرزانہ کو ایک گھنٹے سے زیادہ انتظار کرنا پڑا پھر وہ طارق کے کمرے میں گئی۔
"خیریت؟" طارق مسکرایا۔
"تمہیں ایک چیز دکھانا تھی۔" فرزانہ نے کمرے میں موجود ٹی وی اور ڈی وی ڈی پلیئر پر ایک اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "خوشی ہوگی تمہیں دیکھ کر۔" اس کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔
"اوہو...... ایسی کیا چیز لے آئی ہو؟"
"دیکھ لو۔" فرزانہ نے خود ہی آگے بڑھ کر پرس سے نکالی ہوئی ڈی وی ڈی پلیئر میں لگائی۔ ٹی وی آن کیا اور دونوں چیزوں کے ریموٹ اپنے ہاتھ میں لے کر واپس کرسی پر آ بیٹھی۔
"کوئی فلم ہے کیا؟" طارق بولا۔
"بہت دلچسپ۔"
طارق ٹی وی اسکرین کو دیکھنے لگا پھر جیسے ہی ویڈیو شروع ہوئی، طارق کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ فرزانہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔
پھر جیسے ہی خاص قسم کے مناظر اسکرین پر آنے شروع ہوئے، اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔ اب فرزانہ [illegible] انداز میں مسکرا رہی تھی۔
"بہت خوب۔" طارق زیر لب بڑبڑایا اور اسکرین پر نظریں جمائے رہا۔ اس کے چہرے کے عضلات تن گئے تھے لیکن پھر دھیرے دھیرے وہ ڈھیلے پڑتے چلے گئے۔
"واقعی بہت خوب!" اس مرتبہ طارق نے مسکرا کر فرزانہ کی طرف دیکھا۔ "یہ ویڈیو تم نے تو کل ہی بنائی ہے۔" پھر اس کی نظر فرزانہ کے پرس پر گئی اور پھر وہ بولا۔ "اس میں خفیہ کیمرا لگا ہوا ہے؟"
"ہوں۔" طارق نے ہاتھ بڑھا کر پرس اٹھایا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔

فرزانہ بولی۔ "چاہو تو رکھ لو اپنے پاس! تحفہ سمجھ لینا میرا۔ مجھے تو اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"
"اس حرکت کا مقصد کیا ہے فرزانہ؟" طارق نے پرس بند کرتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ ٹی وی اسکرین پر ویڈیو چل رہی تھی لیکن طارق اب اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔
"مقصد؟" فرزانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہاری سمجھ میں نہیں آیا؟"
طارق نے جواب دینے کے بجائے کہا۔ "اگر تمہیں اپنی ایسی فلم بنانے کا شوق تھا تو مجھ سے کہتیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔"
فرزانہ ڈی وی ڈی پلیئر بند کرتے ہوئے اٹھی۔ ٹی وی بھی بند کردیا اور پلیئر سے ڈی وی ڈی نکال کر اپنے پرس میں رکھ لی۔ دوبارہ طارق کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔ "میری یہ یادگار میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔"
"کسی خاص وجہ سے؟" طارق نے پوچھا۔
"یقیناً۔" فرزانہ نے جواب دیا۔ "جب ہم دونوں کی شادی ہوجائے گی تو کیا اس ویڈیو کی حیثیت یادگار کی نہیں ہوگی؟"
طارق ہنسا۔ "تمہارے دماغ سے ابھی تک شادی کا بھوت نہیں اترا؟"
"اتر بھی نہیں سکتا۔ میں اب تمہارے علاوہ کسی دوسرے مرد کی نہیں بن سکتی۔"
"آج پھر فضول باتیں لے بیٹھی ہو۔" طارق نے منہ بنایا۔ "میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ بندھن کسی بھی قسم کا ہو، میرے لیے قابل قبول نہیں۔"
"یہ بندھن تو تمہیں قبول کرنا ہی پڑے گا طارق ورنہ......"
"بات پوری کرو۔" طارق مسکرا رہا تھا۔ "ورنہ کیا؟"
"اس سی ڈی کی بہت سی کاپیاں بنانا پڑیں گی مجھے۔" فرزانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "اور وہ تمہارے دفتر کے تمام لوگوں میں تقسیم کردی جائیں گی۔"
طارق کا منہ اس طرح کھلا جیسے وہ فرزانہ کی بات سن کر حیران رہ گیا ہو پھر وہ ایک دم ہنس پڑا۔ "اس سے کیا ہوگا؟"
"ذلیل ہوجاؤ گے اپنے دفتر میں۔"
"بہت خوب!" طارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس لیے میرے ساتھ روزانہ جانے کے لیے تیار ہوتی تھیں؟"

آنکھیں
دنیا کی تمام معصومیت اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں...... جب روتی ہیں تو دلوں کو ہلا دیتی ہیں اور جب بند ہوتی ہیں تو دنیا کو رلا دیتی ہیں۔

درخت
پھل درخت کے اندر سے نہیں آتا۔ یقین نہیں تو درخت کاٹ کر دیکھ لیں۔ لکڑی ہی لکڑی ہے۔ رزق زمین کے اندر سے نہیں آتا۔ یقین نہیں تو کھدائی کر کے دیکھ لیں۔ مٹی ہی مٹی ہے۔ یہ سب اللہ کے حکم سے آتا ہے۔ چاہے زمین سے نکالے یا آسمان سے اتارے۔

نصیب
دوسرے انسانوں کے نصیب سے مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔ جو ذرہ جس جگہ ہے، وہیں آفتاب ہے۔
(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بفل ہزارہ)

فرزانہ خاموشی سے اسے گھورتی رہی۔
"یہ شوق ضرور پورا کرو۔" طارق بدستور مسکرا رہا تھا۔ "اگر یہ ذلالت کی بات سمجھ رہی ہو تو جان لو کہ میرے دفتر کا چپراسی تک جانتا ہے کہ میری پی اے لڑکیاں ہی کیوں ہوتی ہیں۔ دفتر کے لوگ تمہیں دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکراتے ہیں۔ تم نے کبھی غور نہیں کیا ہوگا۔"
فرزانہ کے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور بولی۔ "مجھے تمہاری اس بات پر یقین نہیں لیکن اگر ایسی صورت سامنے آئی تو پھر یہ سی ڈی پولیس تک بھی جاسکتی ہے۔"
"بے وقوف لڑکی! تم ایسا نہیں کرسکتیں۔"
"کرسکتی ہوں۔"
"اس سے تم صرف مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتیں، تم بھی بدنام ہو جاؤ گی۔ اگر یہ فلم اس دن کی ہوتی جب پہلی بار میں نے تمہارے ساتھ زبردستی کی تھی، تب یقیناً یہ میرے لیے پریشانی کا سبب ہوتی۔ تمہاری رسوائی اس صورت میں بھی بہرحال ہوتی۔ رہی یہ سی ڈی جو تم نے مجھے ابھی دکھائی ہے، اس سے تو صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ جو کچھ ہوا، وہ تمہاری رضامندی کے بغیر نہیں ہوا۔ اس معاملے میں تم میری برابر کی شریک ہو۔"

طارق بول رہا تھا اور فرزانہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اس کے جسم کی جان نکلتی جا رہی ہو۔ اس نے اس پہلو پر تو غور ہی نہیں کیا تھا۔

"کیوں؟" طارق نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تمہارے چہرے کا رنگ کیوں بدل گیا؟ بے وقوف لڑکی! اس قسم کے کاموں کے لیے بڑے عیار دماغ کی ضرورت ہوتی ہے جو تمہاری کھوپڑی میں نہیں ہے۔ تم ذہین تو ہو لیکن ذہین اور عیار ہونے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ جیسا چل رہا ہے چلنے دو۔ خاصی تنخواہ بڑھا چکا ہوں میں تمہاری۔"

اتنی دیر میں فرزانہ خود کو بالکل بے جان محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے طارق کو شادی پر مجبور کرنے کے بجائے اپنے آپ کو ہی بے بس کر لیا تھا۔

"پانی منگواؤں تمہارے لیے؟" طارق مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا۔

فرزانہ خاموش رہی۔ اس کی سانسیں ناہموار ہو چکی تھیں۔ طارق نے چپراسی کو بلا کر پانی منگوایا اور چپراسی ہی سے پانی کا گلاس فرزانہ کے آگے رکھوا دیا۔

فرزانہ محسوس بھی کرنے لگی تھی کہ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے پانی کے دو گھونٹ لے کر گلاس رکھ دیا اور بے بسی سے طارق کی طرف دیکھنے لگی۔ اپنی شکست کے احساس سے اس کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میری یہ غلطی معاف کر دو طارق اور مجھ پر ترس کھا کر مجھ سے شادی کر لو۔"

"بکواس بند کرو۔" طارق نے بگڑ کر کہا۔ "جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھو۔ مہینے میں دو تین بار میں بلاؤں تو آ جایا کرنا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" فرزانہ یکبارگی پاگلوں کی طرح چیخ پڑی۔

"اور زور سے چیخو اور یقین رکھو کہ دفتر کا کوئی آدمی تمہارے چیخنے کا سبب جاننے کے لیے یہاں نہیں آئے گا۔ بس وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔"

"ناممکن۔" فرزانہ نے دانت پر دانت جما کر کہا۔ "میں تمہاری داشتہ بن کر نہیں رہ سکتی۔"

"اب تک کیا بن کر رہی ہو؟" اس بار پھر طارق کا لہجہ مضحکہ اڑانے والا تھا۔

فرزانہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ اب بے بسی کے احساس کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔ "طارق! میں قسم کھا کر کہتی ہوں، میں تم سے اس کا انتقام ضرور لوں گی۔"

"قتل کرو گی مجھے؟" طارق مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔ "اور باقی زندگی جیل میں گزارو گی؟"

فرزانہ نے اپنا پرس اٹھایا، مڑی اور تیزی سے چلتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔

"کیا میں سمجھ لوں کہ اب تم نہیں آؤ گی؟" اس نے پشت سے طارق کی آواز سنی لیکن کوئی جواب دیے بغیر کمرے سے نکل آئی۔

اسی دن اس نے جمیل خاں کو بتایا تھا کہ اس نے ملازمت سے استعفا دے دیا ہے۔ اس کے بعد وہ مسلسل سوچتی رہی کہ طارق سے انتقام کس طرح لے اور پھر اس نے کچھ سوچ بھی لیا۔ اس کے بعد ہی وہ جعفری سے ملی تھی اور اسی کی وجہ سے اس کی رسائی سطوت مرزا کے دفتر تک ہوئی تھی۔

☆☆☆

سطوت مرزا کے دفتر میں چوتھے روز فرزانہ اپنے کام کے دوران میں بھی سوچتی رہی کہ طارق سے انتقام ضرور لے گی۔ اس نے جو کچھ سوچا تھا، اس کے لیے اسے سازگار حالات بھی مل گئے تھے۔ اس نے سائرہ اور تنویر کو خود سے بہت مانوس کر لیا تھا اور اب اس سے اگلا قدم اٹھانے کے لیے اسے کسی موقع کی تلاش تھی۔

سائرہ سے اسے گزشتہ روز یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ ان دونوں بچوں کی والدہ کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب تنویر کی عمر صرف تین سال تھی۔ سطوت مرزا اس کے بعد دوسری شادی کر سکتے تھے مگر انہوں نے نہیں کی۔ بچوں کو انہوں نے ماں باپ بن کر پالا تھا اور اب بھی وہی کردار ادا کر رہے تھے۔

"سر! ایک بات کہوں آپ سے؟" فرزانہ نے اسی دن سطوت مرزا سے اس وقت کہا جب دفتر سے چھٹی کا وقت قریب تھا۔

"ہاں، ہاں۔ کہو۔"

"بہت نجی سی بات ہے سر! آپ برا مان سکتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم میرے مزاج کا اندازہ نہیں لگا سکیں۔" سطوت مرزا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں دفتر میں کام کرنے والے کسی فرد کو بھی کمتر نہیں سمجھتا۔ تم تو خیر میری سیکریٹری ہو لیکن اگر مجھے اپنے چپراسی کے ساتھ بھی کھانا کھانا پڑے تو میں اس میں کوئی عار نہیں سمجھوں گا۔"

فرزانہ مسکرا دی۔ "یہ تو آپ کی عالی ظرفی ہے سر!"

"میں اسے صرف انسانیت کہتا ہوں۔ خیر چھوڑو۔ تم ابھی کچھ کہتے کہتے رک گئی ہو

جو بات کہنی ہو، کہہ دینی چاہیے۔"

"میں یہ کہنا چاہتی تھی سر کہ آپ بچوں کی وجہ سے دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ آپ کو دوسری شادی کر لینا چاہیے تھی۔"

سطوت مرزا ہنس دیا۔ "کیوں؟"

"ماں ہی بچوں کی صحیح نگہداشت کر سکتی ہے۔"

"بشرطیکہ سگی ماں ہو۔" سطوت مرزا نے کہا۔

"سوتیلی مائیں بچوں کو برباد بھی کر دیتی ہیں۔"

"سبھی عورتیں بری تو نہیں ہوتیں۔"

"لیکن کسی کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوتا کہ وہ اچھی ہے یا بری۔ میں یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا فرزانہ! مجھے اپنے بچے زندگی سے زیادہ پیارے ہیں۔"

پھر یکایک سطوت مرزا میز پر تھوڑا سا جھکا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی کہنی میز پر ٹکائی اور اسی ہاتھ سے اپنی پیشانی مسلنے لگا۔

"کیا ہوا سر؟" فرزانہ نے جلدی سے پوچھا۔

"درد۔" سطوت مرزا نے کسی قدر کمزور سی آواز میں جواب دیا۔ "برسوں سے مریض ہوں اس کا۔ دوائیں استعمال کرتا رہتا ہوں تو ٹھیک رہتا ہوں۔ دوائیں چھوڑنے کے بعد بھی کچھ عرصے ٹھیک رہتا ہوں لیکن پھر اچانک کسی وقت ۔۔۔"

سطوت مرزا نے [illegible] کر دو تین طویل سانسیں لیں۔

فرزانہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔

سطوت مرزا نے سانسیں لینے کے بعد کہا۔ "پھر دوا کھانا شروع کر دوں تو بھی ٹھیک ہونے میں دو تین روز تو لگ ہی جاتے ہیں۔ بس کچھ دیر سونے یا سر کی مالش سے کچھ آرام مل جاتا ہے۔ جب اہلیہ حیات تھیں تو وہ جھٹ سے مالش کرنے بیٹھ جاتی تھیں۔"

"میں مالش کر دیتی ہوں۔" فرزانہ جلدی سے اٹھی۔

"ارے نہیں! تم کہاں ۔۔۔۔۔! بس اب گھر جا کے سونے کی کوشش کروں گا۔"

"لیکن آپ وقت کے بہت پابند ہیں۔ پندرہ منٹ بعد ہی اٹھیں گے دفتر سے۔ میں مالش کر دیتی ہوں۔" فرزانہ کہتی ہوئی سطوت مرزا کی پشت پر پہنچ گئی تھی۔ اس نے انگلیاں بھی سطوت مرزا کے بالوں میں پھنسا دیں۔ اسے سطوت مرزا کی باتوں سے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اپنی اس حرکت کی وجہ سے اسے ڈانٹ نہیں کھانی پڑے گی۔

"مالش کرنا بھی ایک فن ہے۔" وہ بولتی رہی۔ "مجھے یہ فن نہیں آتا لیکن کبھی کبھی اپنی والدہ کا سر دباتی ہوں تو انہیں اتنا سکون ملتا ہے کہ وہ سو جاتی تھیں۔ شاید آپ بھی کچھ آرام محسوس کریں۔"

"ارے ۔۔۔۔ لیکن ۔۔۔۔" سطوت مرزا کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر بولا۔ "یہ تمہاری ڈیوٹی نہیں ہے فرزانہ!"

"آپ کی پی اے کی ڈیوٹی تو نہیں ہے مگر انسان کی ڈیوٹی تو یہی ہوتی ہے کہ وہ انسان کی تکلیف میں اس کا ساتھ دے۔"

سطوت مرزا چپ ہو گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اسے یقیناً کچھ سکون ملا ہوگا۔ فرزانہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسائے اس کا سر سہلا رہی تھی۔

اسی وقت اندرونی کمرے سے سائرہ آئی اور فرزانہ کو سطوت مرزا کا سر سہلاتے ہوئے دیکھ کر ٹھٹکی پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"آؤ سائرہ!" فرزانہ نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی کام ہے؟"

"جی۔" سائرہ آگے آئی۔ "وہ ایک لفظ ہے نا انگریزی کا ۔۔۔ رف ۔۔۔ اس کی اسپیلنگ پوچھنے آئی ہوں ڈیڈی سے۔ ڈکشنری میں تو ملی نہیں۔"

اس سے پہلے کہ سطوت مرزا کچھ بولتا، فرزانہ بول پڑی۔ "تم ڈکشنری میں آر اے ایف یا آر یو ایف دیکھ رہی ہوگی۔ اس کی اسپیلنگ آر او یو جی ایچ ہے سائرہ!"

"جی، جی۔" سائرہ جلدی سے بولی۔ "اب یاد آ گیا۔" سائرہ یہ کہنے کے بعد بھی وہیں کھڑی فرزانہ کو سطوت مرزا کا سر سہلاتے دیکھتی رہی۔

"اب جاؤ۔" سطوت مرزا نے کہا۔ "پوچھ تو لی اسپیلنگ۔"

"مجھے ممی یاد آ گئیں ڈیڈی!" سائرہ نے کہا۔ "چھوٹی تو تھی میں اس وقت لیکن یاد ہے مجھے۔ ممی بھی اسی طرح آپ کا سر دبایا کرتی تھیں۔ آپ کے سر میں درد ہو گیا ہے نا ڈیڈی؟"

"ہاں، بس اب جاؤ۔ کتابیں سمیٹو اپنی۔ وقت نہیں دیکھا؟ گھر چلنا ہے اب۔"

"آنٹی!" سائرہ نے فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "آپ بہت اچھی ہیں۔ آپ ہماری ممی بن جائیے نا۔"

"سائرہ!" سطوت مرزا جھٹکے سے کھڑے ہو گئے۔ "بدتمیز! جاؤ یہاں سے۔"

سائرہ سہم گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے تھے۔ وہ مڑ کر تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"شکریہ فرزانہ!" سطوت مرزا نے کہا۔ "اب میں

"ٹھیک ہوں۔ درد بالکل ختم ہوگیا۔"

"ایسا ہوتا ہے۔" فرزانہ نے کہا۔ "اگر کسی وجہ سے ذہن کو جھٹکا لگ جائے تو سر کا درد ختم ہوجاتا ہے۔ آپ کو سائرہ کی بات سے جھٹکا لگا تھا۔"

"میں اس کی بدتمیزی پر تم سے معافی مانگتا ہوں۔"

"لیکن آپ نے تو ایسی کوئی بات ہی نہیں کی جس پر معافی مانگی جائے اور سائرہ ابھی بچی ہے، معصوم ہے۔ اس کے ذہن میں جو خیال آیا وہ اس کی زبان پر بھی آگیا۔ یہ تو آپ ہی کہتے ہیں کہ خود پر کوئی بوجھ نہیں رکھنا چاہیے۔ جو بات بھی ہو، کہہ دینا چاہیے۔"

سطوت مرزا آہستہ سے ہنس پڑا۔ "میری بات تم نے مجھ پر ہی پلٹ دی۔ بہرحال!" سطوت مرزا نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی۔ "دفتر کا وقت ختم ہوا۔ اب تم اپنے گھر جاؤ۔"

"آپ سے ایک درخواست کروں سر!"

"بولو۔"

"سائرہ کو اب آپ پھر نہ ڈانٹیے گا۔"

"اچھا!" سطوت مرزا نے مسکرا کر کہا۔ "نہیں ڈانٹوں گا۔ بہت خیال رکھتی ہو تم ان بچوں کا۔ اسی لیے تم سے مانوس بھی بہت ہوگئے ہیں۔"

"ایک اور بات کہوں سر؟"

"سب کہہ ڈالو۔" سطوت مرزا نے کہا۔ "لیکن بس دو منٹ میں۔" سطوت مرزا نے پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔

"صبح آپ دفتر آنے کے لیے آٹھ بجے تیاری شروع کرتے ہوں گے؟" فرزانہ نے کہا۔

"ٹھیک اندازہ لگایا تم نے۔"

"بچوں کو بھی تیار کرنا پڑتا ہوگا؟"

"نہیں۔" سطوت مرزا نے کہا۔ "ملازم تو ہیں نا گھر میں۔ ان میں ایک تو جوڑا ہے۔ میرا مطلب ہے میاں بیوی ہیں وہ۔ بیوی سائرہ کو تیار ہونے میں مدد دیتی ہے۔ میاں خوبی کو تیار کرا دیتا ہے۔ لیکن یہ تم نے کیوں پوچھا؟"

"میں صبح بہت جلدی اٹھ جاتی ہوں سر! بس یہ خیال آیا تھا مجھے کہ میں آٹھ بجے آپ کے گھر آکر بچوں کو تیار کروادیا کروں اور آپ انہیں تیار کرانے کی زحمت سے بچ جائیں۔"

"نہیں فرزانہ! ملازم ہیں گھر میں۔ مجھے یہ کام نہیں کرنا پڑتا۔ اچھا اب......" سطوت مرزا نے مسکرا کر گھڑی کی طرف دیکھا۔

"میں جارہی ہوں سر!" فرزانہ ہنس پڑی۔ وہ بہت خوش تھی [illegible]

اپنے کمرے میں آکر اس نے میز پر فائلیں درست کیں، دیگر چیزوں کو بھی قاعدے سے رکھا پھر دراز سے اپنا پرس نکالا۔ اس میں سے چھوٹا سا آئینہ نکال کر ٹشو پیپر سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔ وہ دراصل اتنا وقت گزارنا چاہتی تھی کہ سطوت مرزا اور بچے چلے جاتے۔ کچھ دیر بعد سطوت مرزا دونوں بچوں کے ساتھ باہر آئے۔

"تم ابھی گئی نہیں فرزانہ؟" سطوت مرزا نے نرمی سے پوچھا۔

"بس جا رہی ہوں سر!" فرزانہ نے دراز مقفل کرتے ہوئے کہا پھر گھڑی پر نظر ڈال کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "ابھی پندرہ سیکنڈ باقی ہیں۔"

سطوت مرزا اور بچے باہر نکل گئے۔

فرزانہ جب بھی تو سوچ رہی تھی، ابتدا تو ہوگئی ہے۔ اب اسے عجلت میں کچھ نہیں کرنا۔ طارق سے انتقام لینے میں کچھ دیر ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

وہ پرس اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اس کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ وہ مڑ کر میز کے قریب آئی اور کھڑے کھڑے ہی ریسیور اٹھایا۔ "یس!"

دوسری طرف آپریٹر تھا۔ اس نے کہا۔ "صاحب تو نکل گئے۔ کل آپ انہیں بتا دیجیے گا کہ مسز ارباب کا فون آیا تھا۔ ٹائم بھی لکھ لیجیے۔ ابھی آیا تھا ان کا فون۔"

"کوئی پیغام ان کا؟"

"جی نہیں۔ بس اتنا کہہ رہی تھیں کہ صاحب کو ان کے فون کے بارے میں بتا دیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" فرزانہ نے ریسیور رکھ کر میز پر موجود پیڈ پر "مسز ارباب" لکھا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن فرزانہ نے سطوت مرزا کو مسز ارباب کے فون کی اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ "آپ کے جاتے ہی ان کا فون آیا تھا۔"

"ہوں۔" سطوت مرزا کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے وہ ان کے لیے کوئی خوشگوار اطلاع نہیں تھی۔

"سر!" فرزانہ نے قدرے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "کیا آپ کو ان کا فون آنا برا لگا ہے؟"

سطوت مرزا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تم اچھی فیس ریڈر بھی ہو۔ تم نے صحیح سمجھا۔ عورت......" سطوت مرزا نے [illegible]

بغیر خاموشی اختیار کرلی۔

فرزانہ متجسس ہوئی۔ "یہ عورت......؟"

"ایک بیوہ خاتون ہیں۔" سطوت مرزا نے جواب دیا۔ "ارباب خاں ایک اچھے بزنس مین تھے۔ اب ان کا کاروبار انہی خاتون نے سنبھال رکھا ہے۔ میمن خاتون ہیں۔ کاروبار ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ سنبھال لیا ہے انہوں نے سب کچھ لیکن پھر بھی کاروباری مشورے کے بہانے مجھ سے ملتی رہتی ہیں۔ کبھی فون کرلیتی ہیں۔ میرا موبائل نمبر نہیں بند ملا ہوگا اس لیے یہاں فون کر بیٹھیں۔ یہ میری عادت ہے کہ جب دفتر سے اٹھ جاتا ہوں تو اپنے موبائل کا وہ نمبر بند کردیتا ہوں جو کاروباری حلقے جانتے ہیں۔ میں ہر وقت اپنے اوپر کاروبار مسلط نہیں رکھنا چاہتا۔"

اس تفصیلی جواب میں فرزانہ کو "کاروباری مشورے کے بہانے" کے الفاظ معنی خیز معلوم ہوئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسز ارباب کے فون کرنے کی کوئی اور وجہ ہوتی تھی۔

"میں ایک بات نہیں سمجھی سر!" وہ بولی۔ "آپ کے شناساؤں کے بارے میں عام سی معلومات ایک پی اے کی حیثیت سے میرے علم میں رہنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی کہا تھا کہ وہ کاروباری مشورے کے بہانے آپ سے ملتی ہیں۔ اس سے تو یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ ان کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے۔"

"ہاں، وہ کوئی اور بات ہے۔ اچھا وہ...... لنکن انٹر پرائز کا جواب نہیں آیا ابھی؟"

"جی نہیں سر! میں دفتر آکر سب سے پہلے تو میل ہی دیکھتی ہوں۔ آج تک تو ان کا جواب نہیں آیا۔"

فرزانہ کو اندازہ تھا کہ لنکن انٹر پرائز کا جواب اتنی جلدی نہیں آسکتا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ سطوت مرزا کو اس کا اندازہ نہ ہو۔ اس کے باوجود اس سوال کا مقصد یہی ہوسکتا تھا کہ سطوت مرزا نے اسے مسز ارباب کے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

مگر کیوں؟ فرزانہ کو الجھن سی رہی۔

بچے جب اسکول سے آئے تو فرزانہ نے انہیں اعلیٰ درجے کی چاکلیٹ کے دو پیکٹ دیے جو "تھینک یو" کر کے لے لیے گئے۔ فرزانہ روز ہی ان کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آتی تھی۔

لنچ پر وہ معمول کے مطابق سطوت مرزا اور بچوں کے ساتھ تھی۔

"یہ تم کیا کرتی ہو فرزانہ؟" سطوت مرزا نے کہا۔

[illegible]

"میرا جی چاہتا ہے سر! یہ مجھے بہت پیارے لگتے ہیں۔ کاش ایسے بچے میرے بھی ہوتے۔"

آخری جملہ معنی خیز تھا۔ سطوت مرزا نے چونک کر فرزانہ کی طرف دیکھا لیکن فرزانہ سائرہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ "چاکلیٹ کیسی لگی سائرہ؟"

"ابھی تو کھائی ہی نہیں آنٹی! ابھی تو دی تھی آپ نے۔"

"اچھا، جب کھالو تو بتانا۔" فرزانہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس نے سطوت مرزا کی طرف نہیں دیکھا مگر لنچ کے دوران میں سطوت مرزا نے کئی مرتبہ اسے بہت غور سے دیکھا تھا۔

اس روز فرزانہ جب دفتر سے گھر روانہ ہوئی، اس وقت بھی اس کے ذہن میں یہ خلش موجود تھی کہ سطوت مرزا نے مسز ارباب کے بارے میں کچھ بتانے سے گریز کیوں کیا تھا؟ بات کیوں ٹالی تھی؟

رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو اس نے موبائل پر جعفری سے رابطہ کیا۔

"خیریت تو ہے فرزانہ؟" جعفری نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں آپ سے۔ بس یوں ہی خیال آگیا کہ شاید آپ کے علم میں ہو۔"

"کیا بات ہے؟"

"آپ کسی ایسی خاتون کو جانتے ہیں جن کو مسز ارباب کہا جاتا ہے؟"

دوسری طرف طویل سانس لی گئی۔ "تمہیں یہ نام کہاں معلوم ہوا؟"

فرزانہ نے بے کم و کاست سب کچھ بتا دیا پھر کہا۔ "مرزا صاحب نے جس طرح بات ٹالی تھی اس سے مجھے تجسس ہوگیا۔ میں ان کی سیکریٹری ہوں۔ مجھے ان کے جاننے والوں کے بارے میں کچھ تو علم ہونا چاہیے۔"

"دراصل......" جعفری کے لہجے میں تذبذب تھا۔ "ارباب خاں زندہ تھے تو ان سے مرزا صاحب کے تعلقات تھے۔ اسی لیے مسز ارباب بھی انہیں جانتی ہیں۔ مجھے اس کا علم نہیں کہ وہ کس قسم کی خاتون ہیں لیکن مرزا صاحب کو ان سے میل جول کچھ پسند نہیں۔"

"ناپسندیدگی کی کوئی وجہ تو ہوگی؟"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر کہا گیا۔ "مرزا صاحب پر ظاہر مت کرنا کہ تمہیں یہ بات مجھ سے معلوم ہوئی ہے۔"

"آپ کو یہ تاکید کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

[illegible]

"چاہتی ہے۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔
"اور مرزا صاحب شادی کرنا نہیں چاہتے اس لیے اس سے دور بھاگتے ہیں۔"
فرزانہ کے لیے یہ بات خاصی اہم تھی لیکن اس نے اس بارے میں جعفری سے کچھ نہیں کہا۔
جعفری کی آواز آئی۔ "پچاس سال سے کچھ زیادہ ہی عمر ہوگی اس کی۔ جوان بیٹی کی ماں ہے۔ اگر میں بھول نہیں رہا ہوں تو اس کا نام غالباً زینت ہے۔ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی۔"
فرزانہ چونک پڑی۔ اسے طارق کی خواب گاہ میں رکھی ہوئی کی تصویر یاد آگئی۔ طارق نے اس کے لیے زینت کا نام ہی استعمال کیا تھا۔
"بس، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔" جعفری نے کہا۔
"میں بھی بس اتنا ہی جاننا چاہتی تھی۔" فرزانہ نے کہا۔ [illegible] تو زینت کا نام اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا لیکن جلد ہی اس نے یہ نام اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ ضروری نہیں تھا کہ طارق کی خواب گاہ میں رکھی ہوئی تصویر مسز ارباب کی بیٹی زینت ہی کی ہو۔
اگلے روز وہ دفتر میں بیٹھی بہت تیزی سے ایک خط ٹائپ کر رہی تھی۔ تیزی سے اس لیے کہ اسکول سے بچوں کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ فرزانہ ان کے آنے سے پہلے خط ٹائپ کر لینا چاہتی تھی لیکن اسے رکنا پڑ گیا کیونکہ ایک عورت اندر داخل ہوئی تھی اور فرزانہ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر سیدھی سطوت مرزا کے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔
"ارے محترمہ!" فرزانہ جلدی سے بولی۔
"کیوں؟" اس نے مڑ کر نہایت متکبرانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے مرزا صاحب سے ملنا ہے۔"
"دو چار منٹ رک جائیے۔ وہ ابھی کسی خاص کام میں مصروف ہیں۔" فرزانہ نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ "آدھے گھنٹے پہلے انہوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ وہ ابھی کسی سے نہیں ملیں گے۔ دو چار منٹ باقی ہیں آدھا گھنٹا ہونے میں۔ میں ان کی سیکریٹری ہوں، ان کی ہدایت کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔ آپ یہاں تشریف رکھیے۔" فرزانہ نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
نو وارد عورت برا سا منہ بنا کر قریب آئی اور ایک کرسی پر بیٹھ [illegible]

اسے کبھی جرأت نہیں ہوئی مجھے روکنے کی۔"
"انہیں صاحب نے آپ کے بارے میں کچھ ہدایت نہیں دی ہوگی۔ میں تو آپ کے نام سے بھی واقف نہیں ہوں۔ جب مجھے آپ کے بارے میں اس قسم کی ہدایت مل جائے گی تو میں بھی آپ کو روکنے کی جسارت نہیں کروں گی۔"
"مسز ارباب کہتے ہیں مجھے۔" وہ خشک لہجے میں بولی۔
فرزانہ کے دماغ میں پہلے ہی یہ خیال گردش کر چکا تھا کہ یہ عورت مسز ارباب ہی ہوگی۔
"جی، آپ کا فون آیا تھا پرسوں۔ میں نے صاحب کو بتا دیا تھا۔"
مسز ارباب نے جواب میں کچھ کہنا غیر ضروری سمجھا اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔ فرزانہ کو یقین ہو گیا کہ وہ خاصی مغرور عورت تھی۔ جعفری کے کہنے کے مطابق اس کی عمر پچاس پچپن سال ہی ہو سکتی تھی۔ اس نے خود کو خاصا "مینٹین" بنا کر رکھا ہوا تھا۔ پرکشش نظر آتی تھی۔ بہت زیادہ فیشن ایبل بھی تھی۔ ساڑی کے ساتھ بلاؤز خاصا کشادہ گلے کا پہنے ہوئے تھی۔ پیٹھ تو تقریباً عریاں ہی تھی۔
فرزانہ نے ذرا سا وقت گزارنے کے بعد انٹرکام پر سطوت مرزا کو مسز ارباب کے آنے کی اطلاع دی۔
"اوہ!" سطوت مرزا نے طویل سانس لی۔ "اچھا، آنے دو۔"
"جائیے!" فرزانہ نے ریسیور رکھتے ہوئے مسز ارباب سے کہا۔
مسز ارباب نے اس پر کڑی نظر ڈالی اور اٹھ کر سطوت مرزا کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اسی وقت سائرہ اور تنویر بیرونی دروازے سے اندر آئے۔ مسز ارباب کو انہوں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ سائرہ نے کچھ منہ بنایا۔
"آج یہ پھر ٹپک پڑیں۔" سائرہ نے فرزانہ کی طرف آتے ہوئے کہا۔
"ہوں۔ اچھا اب جاؤ۔ نہا دھو لو پھر کھانے کا بندوبست کریں گے۔"
"یہ نہ جانے کب ٹلیں گی۔" سائرہ نے پھر منہ بنایا۔
اس کا اشارہ مسز ارباب ہی کی طرف ہو سکتا تھا۔
"تم بھوک بھوک کا شور مچا دینا۔" فرزانہ نے مسکرا کر تنویر سے کہا۔
"یہ تو مزے کی بات کی آپ نے۔" تنویر نے مسکے کی طرح سر ہلایا۔
فرزانہ ان دونوں کو اندر بھیج کر وہ خط ٹائپ کرنے لگی [illegible]

جو مسز ارباب کے آنے کی وجہ سے رہ گیا تھا۔ اس کا ذہن مسز ارباب ہی میں الجھا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں جب اس نے خط پڑھا تو اس خط میں اسپیلنگ کی غلطیاں ہوئی تھیں جو اس نے اسی وقت ٹائپ کیا تھا۔ اس نے غلطیاں ٹھیک کرتے ہوئے سوچا، اسے مسز ارباب کی وجہ سے اتنا نہیں الجھنا چاہیے۔ جعفری نے بتا تو دیا تھا کہ سطوت مرزا اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔
آدھا گھنٹا گزر گیا۔ اتنی دیر میں سائرہ اور تنویر غسل کر کے کھانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے اور سائرہ اسے بلانے آجاتی تھی لیکن اس دن چالیس منٹ گزر گئے جب مسز ارباب کچھ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکلی۔ صرف "بدتمیز بچہ" کے الفاظ فرزانہ کی سمجھ میں آسکے اور وہ سمجھ گئی کہ تنویر نے وہی حرکت کی ہوگی جو فرزانہ نے ہی اسے سکھائی تھی۔
پھر سائرہ حسب معمول اسے بلانے آئی۔
"چلو، میں آتی ہوں۔"
سائرہ کے جانے کے بعد فرزانہ نے میز کے نیچے رکھا ہوا چھوٹا سا ٹفن نکالا اور وہ لیے ہوئے سطوت مرزا کے کمرے میں اور پھر بچوں کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ تینوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے اس کے منتظر تھے۔ میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔ سائرہ گیارہ سال کی عمر میں بھی خاصی سلیقہ مند ہو گئی تھی۔
"یہ آج کیا لے آئیں فرزانہ؟" سطوت مرزا نے ٹفن دیکھ کر پوچھا۔ "کیا تم اپنا کھانا اب خود لایا کرو گی؟"
"یہ بات نہیں ہے سر!" فرزانہ نے ٹفن میز پر رکھ کر اسے کھولتے ہوئے کہا۔ "آج آپ لوگوں کے لیے کوفتے بنا کر لائی ہوں۔"
"واہ! یہ تو خیر تم نے بہت عمدہ کام کیا۔ ہمارا خانساماں بڑے بڑے کوفتے پکایا کرتا تھا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ آئندہ نہ بنائے۔ ویسے باقی کھانے بھی بس وہ یوں ہی بناتا ہے۔ جب سائرہ کی ماں حیات تھیں تو وہ اپنی نگرانی میں کھانا پکوایا کرتی تھیں۔"
فرزانہ نے اس دوران میں شیلف سے اَن بریک ایبل ڈش نکال کر ٹفن کے تینوں حصے اس میں الٹ دیے۔
"ارے، یہ تو تم بہت لے آئیں۔" سطوت مرزا نے کہا۔
"کچھ ایسے زیادہ تو نہیں ہیں۔" فرزانہ نے ڈش مائکروویو اوون میں رکھتے ہوئے کہا۔
"شروع کیجیے نا ڈیڈی!" تنویر مچلا۔
"آج تم شروع کردو۔" سطوت مرزا نے ہنس کر کہا
پھر فرزانہ کی طرف [illegible]

ہیں۔ اس نے بھوک لگ رہی ہے، بھوک لگ رہی ہے کا شور مچا دیا تھا۔ آج پہلی مرتبہ مجھے اس کی بدتمیزی بری نہیں لگی۔ اسی کی وجہ سے وہ ٹل سکیں۔"
"اگر آپ کو ان کا آنا برا لگتا ہے تو ٹال دیا کریں سر!" فرزانہ نے کہا۔
"مرحوم ارباب خاں کا خیال آجاتا ہے۔ اچھا دوست تھا میرا۔"
"معاف کیجیے گا سر! مجھے تو کوئی اور بات لگتی ہے۔"
سطوت مرزا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"کوئی اور بات...... کیا؟"
"آپ نے کچھ "بظاہر" کی بات کی تھی۔ اس لیے مجھے خیال آیا۔"
سطوت مرزا نے کچھ نہیں کہا۔ غالباً بچوں کے سامنے وہ گفتگو نہیں کرنا چاہتے تھے۔
کھانے کے دوران سائرہ کو تو کوفتے اچھے ہی لگے تھے لیکن سطوت مرزا کی تو زبان نہیں تھک رہی تھی تعریف کرتے ہوئے اور تنویر بولا۔ "بڑا گول گول مزہ ہے۔"
"گول گول مزہ!" فرزانہ ہنس پڑی۔
سطوت مرزا بھی ہنس دیے۔
سائرہ بولی۔ "یہ ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔ کل کہہ رہا تھا آج ٹیچر نے بڑے مزے کا پڑھایا۔"
کھانے کے دوران میں عموماً تنویر ہی کی "گول گول باتیں" جاری رہتی تھیں۔
کھانے کے بعد فرزانہ نے جلدی جلدی برتن سمیٹے اور انہیں دھونے کے لیے ڈش واشر میں ڈالا۔ اس کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔
سطوت مرزا اپنے کمرے میں چلے گئے۔
فرزانہ برتن شیلف میں رکھنے لگی۔ تنویر کھڑا دیکھتا رہا۔ فرزانہ نے اس کام سے فارغ ہو کر مائکروویو اوون ہی میں دو پیالی چائے بنائی۔ سطوت مرزا کھانے کے بعد چائے ضرور پیتے تھے اور فرزانہ بھی عادی تھی۔ وہ چائے بنا کر سطوت مرزا کے کمرے میں لے گئی۔ سائرہ اور تنویر وہیں رہے۔ ایک پیالی اس نے سطوت مرزا کے سامنے رکھی اور دوسری پیالی لے کر اپنے کمرے میں جانے لگی۔ عموماً وہ ایسا ہی کرتی تھی۔
"رکو فرزانہ!" سطوت مرزا بول پڑے۔ "آج چائے یہیں بیٹھ کر پیو۔"
[illegible]

تھا کہ اس نے کچھ دیر پہلے مسز ارباب کے حوالے سے جو کچھ کہا تھا، وہی بات اب سطوت مرزا آگے بڑھائیں گے لیکن بات جس حد تک آگے بڑھی اس کا خیال اسے بالکل نہیں آیا تھا۔

وہ سطوت مرزا کے سامنے بیٹھ گئی۔

"میں نے کیا کہا تھا ابھی تم سے جب کھانا کھا رہے تھے؟"

"جی ___ شاید مسز ارباب کی بات تھی۔"

فرزانہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"تم نے مجھے میرا جملہ یاد دلا دیا تھا جو میں نے تم سے مسز ارباب کے بارے میں کہا تھا۔"

"میں معافی چاہتی ہوں۔ شاید میں غلطی کر بیٹھی۔"

"تمہاری اسی غلطی کی وجہ سے میں نے کھانے کے دوران میں ایک فیصلہ کرلیا۔"

"جی؟" فرزانہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں۔" سطوت مرزا نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے سوچا کہ تمہیں مسز ارباب کے بارے میں وہ بات بتا ہی دوں۔"

"کون سی بات سر؟" فرزانہ کے دل کی دھڑکن کچھ اور تیز ہوئی۔

"یہ عورت ___" سطوت مرزا نے کہا اور پھر کچھ دیر رک کر اضافہ کیا۔ "مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"اوہ!" فرزانہ کے منہ سے اس طرح نکلا جیسے وہ چونک گئی ہو حالانکہ اسے پہلے ہی سے اس بات کا علم ہو چکا تھا۔

"جب میری اہلیہ کی وفات ہوئی اس وقت بچے چھوٹے تھے۔ تنویر تو خاصا چھوٹا تھا۔ اسی لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ ان پر سوتیلی ماں کا سایہ پڑے لیکن اب تنویر خاصا بڑا ہو گیا ہے۔ سائرہ تو بہت سمجھدار ہو گئی ہے۔ میں بھی اپنی زندگی میں کچھ کمی محسوس کرتا رہا ہوں۔ میں اب اگر اس بارے میں سوچ لوں تو شاید کوئی حرج نہیں ہوگا۔"

"جی!" فرزانہ اس کا منہ تکنے لگی۔

"تم اگر چاہو تو اس عورت سے ___ مسز ارباب سے میرا پیچھا چھڑا سکتی ہو۔ اس سے تو میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ یہ اچھی عورت نہیں ہے۔ میں اسے بس اپنے مرحوم دوست کی وجہ سے برداشت کرتا ہوں۔"

"یہ آپ نے کیوں سمجھ لیا سر کہ یہ اچھی عورت نہیں ہے؟"

"یہ بھی بتا دوں گا کسی مناسب موقع پر، اگر تم نے گوارا کیا۔"

"بالکل۔"

"میں سمجھی نہیں سر!"

"میں نے ابھی کہا تھا کہ تم اس عورت سے میرا پیچھا چھڑا سکتی ہو۔"

"مگر کیسے سر؟"

فرزانہ کے دل کی دھڑکنیں اب اور بڑھیں۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ زیادہ کوشش کیے بغیر اپنی منزل کے قریب پہنچ رہی ہے۔

"تمہیں یاد ہوگا میں نے ایک بار تم سے کہا تھا کہ دل پر بوجھ نہیں رکھنا چاہیے۔ جو بات دل میں ہو وہ کہہ دینا چاہیے۔"

"جی مجھے آپ کی بات یاد ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ میرے دل پر یہ بوجھ بتدریج بڑھا ہے۔ جس کا مجھے شعوری احساس نہیں تھا۔ آج وہ شعور میں آ گیا ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ بوجھ کس طرح اتاروں۔ مجھے الفاظ نہیں مل رہے اپنی بات کہنے کے لیے۔"

"آپ کسی طرح بھی کہہ ڈالیے سر!" فرزانہ کی آواز کانپ گئی۔

سطوت مرزا کرسی سے اٹھے اور ٹہلنے لگے۔

"کہہ بھی ڈالیے سر!" فرزانہ نے دل ہی دل میں بڑی بے چینی سے کہا۔ "کہہ بھی دیجیے۔ میں تو بے چین ہوں وہ سننے کے لیے۔" فرزانہ بے چینی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

سطوت مرزا نے ایک طویل سانس لی۔ "تم جوان ہو فرزانہ ___! اور جوان لڑکیوں کے کچھ خواب ہوتے ہیں ___ بہت سہانے خواب ...... ! وہ خواب تم بھی دیکھتی ہوگی۔ تم غالباً ہرگز نہیں چاہو گی کہ وہ خواب بکھر جائیں۔"

"میرے خواب تو کبھی کے بکھر چکے سر!" فرزانہ کی آواز بھرا گئی۔ اسے وہ دن یاد آ گئے جب اس نے خاصا وقت طارق کے ساتھ گزارا تھا۔

"یہ ___ کیسے ممکن ہے؟" سطوت مرزا نے تعجب سے کہا۔

حقیقت کا اظہار کرنا فرزانہ کے لیے ممکن نہیں تھا اس لیے اس نے بات بنائی۔ "میں غریب گھر کی لڑکی ہوں سر ___! ملازمت کرنے سے گھریلو حالات کچھ سدھر تو گئے ہیں لیکن ایسے نہیں ہوئے کہ میں سہانے خواب دیکھ سکوں۔ غریب گھر کی لڑکیوں کے خواب بکھر ہی جاتے ہیں سر!" فرزانہ کی آواز بھرا گئی۔ "لیکن آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، کہہ ڈالیے ...... ! میرا کوئی خواب نہیں ہے جو آپ کی کسی بات سے بکھر جائے۔"

[illegible]

خیال ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ گئی ہوگی۔ اس سے زیادہ صاف صاف کہنا میرے لیے مشکل ہے۔ ہاں، یہ ضرور کہوں گا کہ تمہارے انکار سے تمہاری ملازمت ختم نہیں ہوگی۔"

اب فرزانہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ لب بند تھے۔

"ہاں۔" سطوت مرزا نے کہا۔ "یہ ضروری ہے کہ تم سوچ سمجھ لو۔ اپنے والدین کو بھی بتا دو۔ میں اصرار نہیں کروں گا کہ تم مجھے ابھی جواب دو۔ ایسے فیصلے بلاتامل نہیں کیے جاتے۔ تم دو تین روز بعد جواب دینا۔ اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔"

فرزانہ جلدی سے اٹھی اور تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ وہ یہی تو چاہتی تھی کہ دولت مند شوہر مل جانے کے بعد ہی وہ طارق سے انتقام لے سکتی تھی۔

لیکن جب اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ خوشگوار تصورات میں کھوئی ہوئی تھی تو اچانک ایک خیال کسی تیر کی طرح اس کے دل میں پیوست ہوا۔

کیا یہ انتہائی درجے کا گھٹیا پن نہیں کہ وہ صرف اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ایک شریف آدمی کو دھوکا دے؟ وہ برباد ہو چکی تھی۔ کئی روز تک طارق کی داشتہ بنی رہی تھی اور سطوت مرزا نہایت شریف انسان تھے۔ کیا وہ ان کو دھوکا دے کر اپنے ضمیر کی ملامت سے بچ سکتی تھی؟

اس سوال نے فرزانہ کا پیچھا اس وقت بھی نہیں چھوڑا جب وہ گھر جانے کے بعد رات کو اپنے بستر پر لیٹی۔ یہ احساس اسے کچوکے دیتا رہا کہ سطوت مرزا سے شادی کرنے کے بعد اس کا ضمیر اسے زندگی بھر ملامت کرتا رہے گا۔

نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور جا چکی تھی اور خیالات کا ریلا اس کے دماغ میں مسلسل بہہ رہا تھا۔ آخر رات گئے اس نے فیصلہ کر ہی لیا کہ وہ طارق سے اپنا انتقام لے سکے یا نہ لے سکے، سطوت مرزا کو دھوکا نہیں دے گی۔ ان سے شادی نہیں کرے گی۔

☆☆☆

سطوت مرزا کا دفتر غالباً واحد دفتر تھا جہاں کام کرنے والے زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس سیکنڈ کے فرق سے اپنی اپنی ڈیوٹی پر موجود ہوتے تھے۔

یہی معاملہ فرزانہ کے ساتھ بھی تھا۔ وہ کبھی سطوت مرزا سے کچھ سیکنڈ پہلے دفتر پہنچ جاتی تھی یا کچھ سیکنڈ بعد۔ اس سے زیادہ فرق نہیں ہوتا تھا مگر دوسرے دن وہ پانچ منٹ پہلے دفتر پہنچ گئی [illegible]

سطوت مرزا اس سے پہلے دفتر آ کر کسی کام میں مصروف نہ ہو سکیں اس لیے ان سے بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔

سطوت مرزا وقت پر ہی آئے۔ وہ فرزانہ پر مسکراتی ہوئی ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتے تھے۔ فرزانہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت بھی کھڑی ہوئی۔ حسبِ معمول اس نے سطوت مرزا کو سلام بھی کیا لیکن اس کے چہرے پر بکھری ہوئی غیر معمولی سنجیدگی دیکھ کر سطوت مرزا کی مسکراتی ہوئی نظر ٹھٹک کر رہ گئی اور وہ فرزانہ کے جواب میں سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

"سر!" فرزانہ جلدی سے بولی۔ "اگر آپ کو فوری طور پر کوئی ضروری کام نہ ہو تو میں ابھی آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"آ جاؤ۔" سطوت مرزا نے مڑ کر دیکھے بغیر کہا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

فرزانہ آئی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے پیروں میں من بھر کے ہو گئے ہوں۔ فرزانہ میز کے قریب جا کر رکی۔

"بیٹھو۔" سطوت مرزا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

فرزانہ بیٹھ گئی۔

"سر!" وہ دل گرفتہ آواز میں بولی۔ "میں سائرہ اور تنویر کی ماں نہیں بن سکوں گی۔"

"ہوں! میری طرف دیکھو فرزانہ!"

فرزانہ نے نظریں اٹھائیں۔ اب سطوت مرزا بھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"غلطی مجھ سے ہوئی فرزانہ!" وہ بولے۔ "بعد میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ایک بوڑھے شخص کو ایک جوان لڑکی سے ایسی خواہش کا اظہار کرنا ہی نہیں چاہیے۔"

"آپ بوڑھے تو نہیں ہیں سر!"

"پچپن سال سے زیادہ کا ہو چکا ہوں فرزانہ!"

"لیکن جب میں آپ کے دفتر میں آئی تھی تو میری نیت یہی تھی کہ آپ کو کسی نہ کسی طرح اپنی طرف اس حد تک راغب کروں گی کہ آپ سے میری شادی ہو جائے۔"

"کیا!" سطوت مرزا کے چہرے پر حیرت مجسم ہو گئی۔

"جی سر!" فرزانہ نے نظریں جھکا لیں۔ "میری وہ خواہش میری خود غرضی تھی۔ میں کسی سے اپنا انتقام لینے کے لیے آپ کی دولت کا سہارا لینا چاہتی تھی۔ آپ نے جب خواہش کا اظہار کیا تو میں بے حد خوش ہوئی تھی لیکن پھر ضمیر [illegible]

پڑا۔ آپ جیسے انسان کو دھوکا دے کر تو میں ساری زندگی کے لیے اپنی نظروں سے گر جاتی۔"

"مگر کیوں؟" سطوت مرزا نے پہلو بدلا۔ "کیوں فرزانہ؟"

"اس لیے کہ میں برباد ہو چکی ہوں سر! میں کوئی پاک دامن لڑکی نہیں ہوں۔" سطوت مرزا جیسے سکتے میں رہ گئے۔ تیس چالیس سیکنڈ تک کمرے پر ایک بوجھل سکوت طاری رہا۔ آخر سطوت مرزا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں یقین نہیں کر سکتا۔ تم جیسی اچھی لڑکی...... نہیں فرزانہ...... تم یہ جھوٹ کیوں بول رہی ہو......؟ شادی سے انکار کے لیے تم کوئی اور وجہ بھی بتا سکتی تھیں۔"

"میں سچ بول رہی ہوں سر...... بالکل سچ...... ہاں یہ ضرور ہے کہ اس بربادی میں میری رضامندی شامل نہیں تھی۔ اس درندے نے مجھے دھوکے سے جال میں پھنسایا اور روند ڈالا۔ مجھے بے آبرو کر دیا، برباد کر دیا۔ اسی بات کا انتقام لینے کے لیے میں آپ کی دولت کا سہارا لینا چاہتی تھی۔"

سطوت مرزا چند لمحے خاموشی سے فرزانہ کی طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔ "کون ہے وہ ذلیل شخص؟"

"فاضل ٹریڈرز کا مالک طارق مجید!"

سطوت مرزا ایک جھٹکے سے کھڑے ہو گئے۔ فرزانہ نے چونک کر دیکھا۔ ان کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔ وہ ٹہلتے ہوئے بولے۔ "کاروباری دنیا کے خاصے لوگ اس کے اس گھناؤنے کردار سے واقف ہیں۔" کچھ دیر رک کر انہوں نے فرزانہ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تم اس کے جال میں کیسے پھنس گئیں؟"

"میں پہلے فاضل ٹریڈرز میں ہی ملازم تھی۔" فرزانہ نے جواب دیا اور پھر جو کچھ اس پر بیتی تھی، وہ سب کچھ بیان کر ڈالا۔

سطوت مرزا نے کرسی پر بیٹھ کر وہ سب کچھ سنا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "اس کا انتقام تو میں بھی اس سے لینا چاہوں گا کہ وہ میری ایک خوشگوار زندگی کی تباہی کا سبب بنا ہے۔ تم مجھ سے شادی کر کے اس سے انتقام کس طرح لیتیں؟"

"جعفری صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کے پاس بہت پیسا ہے۔ جو ادارہ آپ اس وقت چلا رہے ہیں، ایسے کئی ادارے کھول سکتے ہیں۔"

"یہ تو اس نے ٹھیک بتایا۔ میں نے کاروبار زیادہ اس لیے نہیں پھیلایا کہ پھر میری مصروفیت بہت بڑھ جاتی۔ میں [illegible] بھی سوچا تھا کہ جب تنویر بڑا ہو جائے گا تو وہ خود اس پیسے سے کاروبار کو وسعت دے سکے گا لیکن تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ تم اس سے کس طرح انتقام لیتیں؟"

"میں آپ سے اس خواہش کا اظہار کرتی کہ آپ میرے نام سے بھی ایک ادارہ قائم کریں۔ مجھے امید نہیں بلکہ یقین تھا کہ آپ میری بات مان لیں گے۔ میں اسی قسم کا ادارہ قائم کرتی جیسا طارق کا ہے۔ تھوڑا بہت تو میں اس کاروبار کی نوعیت سمجھ ہی چکی ہوں۔ آپ کی مدد بھی مجھے حاصل رہتی۔" فرزانہ نے جو کچھ سوچا تھا، سب بیان کر دیا پھر بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ طارق بہت ضدی ہے۔ وہ مقابلہ کرنے کی پوری کوشش کرتا لیکن اس کے پاس اتنا زیادہ سرمایہ نہیں کہ زیادہ عرصے تک مقابلہ کر سکتا۔ اپنی ضد کی وجہ سے وہ اپنی تباہی کو قریب سے قریب تر لاتا چلا جاتا اور آخر مکمل تباہی اس کا مقدر بن جاتی۔ یہی اس سے میرا انتقام ہوتا اور میں اسے جتا بھی دیتی کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے۔"

سطوت مرزا کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ آ گئی۔ "گو کہ میں اسے کاروباری مسابقت کا ایک گھٹیا طریقہ سمجھتا ہوں لیکن طارق کے ساتھ ایسا ہی کیا جانا چاہیے۔ اس کی تباہی بہت سی اور لڑکیوں کی عزت محفوظ کر دے گی۔ تم یہ کام کب سے شروع کرنا چاہتی ہو؟"

"جی!" فرزانہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں، میں نے ابھی کہا تھا نا کہ میری خوشگوار زندگی میں رکاوٹ ڈالنے والے کو اس کی سزا تو ملنا ہی چاہیے۔"

فرزانہ حیرت سے سطوت مرزا کی طرف دیکھتی رہی۔

"ہاں۔" سطوت مرزا نے کہا۔ "تمہارا یہ ادارہ جلد از جلد قائم ہو جائے گا۔ میں خود کو پس منظر میں رکھوں گا۔ کسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تمہاری پشت پر میں ہوں۔"

"آپ...... آپ...... تیار ہیں......؟" فرزانہ کی آواز خوشی سے کانپ گئی۔

"تمہارے ادارے کا نام بھی فرزانہ ٹریڈرز ہو گا۔"

فرزانہ کی حالت ایسی ہو گئی جیسے ابھی خوشی سے رو پڑے گی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ سب کچھ بیان کر کے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرے گی تو اس کا یہ نتیجہ سامنے آئے گا۔

"یہ ادارہ قائم کرنے میں وقت تو لگے گا۔" سطوت مرزا پھر بولے۔ "لیکن میں خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے بھی کوشش کروں گا کہ یہ کام جتنی جلد ممکن ہو، ہو جائے۔ اس عرصے میں تم یہیں کام کرتی رہنا۔ جب سب کچھ تیار

ہو جائے گا تو اس کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں دے دی جائے گی۔"

فرزانہ اب اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکی۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ فرزانہ سطوت مرزا کے دفتر جاتی رہی۔ اسے سطوت مرزا سے معلوم ہوتا رہا کہ کام کی رفتار تسلی بخش ہے۔

ایک روز سطوت مرزا نے اس سے کہا۔ "میں جو کچھ بھی خرچ کر رہا ہوں، اسے تم اپنے اوپر بوجھ مت سمجھنا۔ یہ تم پر میرا قرضِ حسنہ ہو گا۔ جب نقصانات اٹھانے کے بعد منافع ہونے لگے تو تم میرا سرمایہ مجھے لوٹا دینا۔ اگر نہ لوٹا سکو تو بھی کوئی حرج نہیں۔ قرضِ حسنہ اسی کو کہتے ہیں کہ اگر ممکن نہ ہو تو واپس نہ کیا جائے۔"

"میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی سر!"

"کل تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری والدہ معذور ہیں اور ان کا علاج یہاں نہیں ہو سکتا۔ یہ تمہیں بہت پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔"

"پہلے آپ نے کبھی میرے گھر والوں کے بارے میں کوئی سوال ہی نہیں کیا تھا۔ کل آپ نے پوچھا تو میں نے بتا دیا۔"

"ان کی میڈیکل رپورٹس کی فائل تو ہو گی تمہارے پاس؟"

"جی ہاں، وہ تو ہے۔"

"کل دفتر لیتی آنا۔ مجھے دے دینا۔ انگلینڈ کا ایک سرجن میرا دوست ہے۔ میں اسے فائل کے مندرجات سے آگاہ کر دوں گا۔ اگر ضروری ہوا تو تمام رپورٹس اسے میل بھی کی جا سکتی ہیں۔ تمہارے ارجنٹ پاسپورٹ بھی بن جائیں گے۔ تم انہیں علاج کے لیے برطانیہ لے جانا۔ زیادہ سے زیادہ ایک مہینے میں واپس آ جاؤ گی۔ جو کچھ بھی خرچ ہو گا اس کے لیے تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"سر......!" فرزانہ کی آواز کانپ گئی۔

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" سطوت مرزا نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ "تم اپنے والدین سے کہہ سکتی ہو کہ اب تم جس ادارے میں ملازم ہو، وہ ادارہ اپنے ملازمین کو مکمل میڈیکل سپورٹ دیتا ہے لہٰذا تمہیں بھی سپورٹ کیا جا رہا ہے۔"

"سر! مجھے کہنے دیجیے۔" فرزانہ جذباتی لہجے میں بولی۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری بربادی کی داستان سننے کے بعد آپ مجھ پر اتنے مہربان ہو سکتے ہیں۔"

"جو کچھ ہوا، وہ تمہاری مرضی سے تو نہیں ہوا تھا۔ یہ تمہارا بڑا پن ہے کہ تم نے مجھے دھوکے میں رکھنا گوارا نہیں کیا اور سب کچھ بتا دیا۔ بس، اب اس موضوع پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ وہ سب کام ختم کرو جو میں نے صبح تمہیں بتائے تھے۔"

ان دونوں میں یہ گفتگو کھانے کے بعد ہوئی تھی۔ بچے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ فرزانہ کو سطوت مرزا نے اپنے کمرے میں روک لیا تھا۔

دس دن بعد ہی فرزانہ اپنی والدہ اور والد کو لے کر برطانیہ روانہ ہو گئی۔ سارا بندوبست سطوت مرزا ہی نے کیا۔ واپسی پچیس دن بعد ہوئی۔ عالیہ بیگم کا وہ جسمانی نقص ختم ہو چکا تھا جو معذوری کا سبب بنا تھا۔

"میں نے تو یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا کہ کبھی چل پھر سکوں گی۔" عالیہ بانو نے فرزانہ سے کہا۔ "جب سے میں ٹھیک ہوئی ہوں، مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔"

جمیل خان کے لیے بھی یہ بڑی خوشی کی بات تھی کہ اب وہ اپنی بیوی کو چلتے پھرتے دیکھ سکتے تھے۔ خود ان کی طبیعت بھی اب بالکل ٹھیک تھی۔ انگلینڈ میں ان کا علاج بھی ہو گیا تھا اور وہ سارے اخراجات سطوت مرزا ہی نے کیے تھے۔

دوسرے ہی دن فرزانہ دفتر پہنچی اور سطوت مرزا کے سامنے بیٹھ کر رونے لگی۔ جذبات کی شدت کے باعث وہ اپنے آنسو روک ہی نہیں سکی تھی۔

اسی دن سطوت مرزا نے اس سے کہا۔ "بچے آ جائیں تو کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد تم کو میری ہی کار میں جمال کے ساتھ کہیں جانا ہو گا۔ جمال کو تم جانتی ہو نا؟"

"اس دفتر میں میری پہلی ملاقات انہی سے ہوئی تھی۔"

"جمال میرے اعتماد کا آدمی ہے۔ مجھے اس پر اتنا ہی بھروسا ہے جتنا بھروسا میں خود پر کر سکتا ہوں۔ فرزانہ ٹریڈرز میں تمہارا جنرل منیجر وہی ہو گا۔"

"اوہ، لیکن مجھے اس کے ساتھ کہاں جانا ہے؟"

"کوئی کام ہے۔ وہی بتا دے گا تمہیں۔ اس کے ساتھ جاتے ہوئے تمہیں گھبرانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔"

"آپ کی کسی بھی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے مجھے کبھی کوئی گھبراہٹ نہیں ہوئی سر!"

پھر وہ جمال کے ساتھ دفتر سے نکلی۔ سطوت مرزا کی کار کی چابی جمال کے ہاتھ میں تھی۔ فرزانہ نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کے ساتھ جمال کا انداز اب مؤدبانہ تھا

کار کے قریب پہنچ کر اس نے فرزانہ سے ایک قدم آگے بڑھ کر کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔

"ارے نہیں۔" فرزانہ بولی۔ "میں آگے ہی بیٹھوں گی۔"

"یہ تو مناسب نہیں ہوگا میڈم کہ آپ میرے برابر میں بیٹھیں۔"

فرزانہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ دفتر میں جمال سے اس کا آمنا سامنا ہوتا ہی رہتا تھا لیکن اس نے پہلے کبھی اسے "میڈم" نہیں کہا تھا۔

"فرزانہ ٹریڈرز میں تمہارا جنرل منیجر وہی ہوگا۔" سطوت مرزا کی آواز اس کے دماغ میں گونجی اور وہ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ جمال نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور انجن اسٹارٹ کیا۔

"خواب...... خواب......" فرزانہ زیر لب بڑبڑائی۔

پچیس منٹ بعد کار ایک بنگلے کے احاطے میں داخل ہوئی۔ پھاٹک چوکیدار نے کھولا تھا۔

"کس کا بنگلا ہے یہ؟" فرزانہ نے پوچھا۔ "تم نے مجھے ابھی تک نہیں بتایا کہ ہم دفتر سے کس کام سے نکلے ہیں۔"

"یہ بنگلا ابھی خالی ہے میڈم!" جمال نے کہا۔ "آپ کو یہ سارا بنگلا دیکھنا ہے اور اس کے بعد صاحب کو اس کے بارے میں رپورٹ دینا ہے۔"

فرزانہ کے ذہن میں فوراً یہ سوال ابھرا۔ کیا فرزانہ ٹریڈرز کا دفتر اس بنگلے میں قائم کیا جائے گا؟

جمال نے اسے بنگلے کا ایک ایک گوشہ دکھایا۔ اس کے بعد وہ پھر کار میں آ بیٹھے اور کار دفتر کی جانب روانہ ہوئی۔ دفتر پہنچ کر فرزانہ بلا تاخیر سیدھی سطوت مرزا کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"آؤ" سطوت مرزا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"سر!" فرزانہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "بنگلے کو باہر سے دیکھ کر مجھے خیال آیا تھا کہ وہاں دفتر بنایا جائے گا لیکن جب اندر سے دیکھا تو اس کی ڈیکوریشن سے اندازہ ہوا کہ وہ تو رہنے کے لیے ہونا چاہیے۔"

"ہاں" سطوت مرزا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ قائم رہی۔ "تم جس مکان میں رہتی ہو، فرزانہ ٹریڈرز کی مالک کو اب وہاں نہیں رہنا چاہیے۔"

"تو...... تو...... وہ......"

"ہاں۔" سطوت مرزا نے کہا۔ "اب تم اپنے والدین کے ساتھ جلد از جلد وہاں منتقل ہو جاؤ۔ ابھی وہاں چوکیدار کے علاوہ [illegible] کر لیا گیا ہے۔ جس روز تم وہاں منتقل ہو جاؤ گی اسی روز ملازمین بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔ سرونٹ کوارٹر تم نے دیکھ ہی لیے ہوں گے۔ ان ملازمین میں ایک عورت بھی ہوگی۔ جس روز تم فرزانہ ٹریڈرز کے دفتر میں قدم رکھو گی، اسی روز تمہارے لیے کار بھی مہیا کی جا چکی ہوگی۔ فی الحال تمہیں یہاں لانے اور واپس گھر پہنچانے کے لیے دفتر کی ایک کار وقف ہوگی۔ آج مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں نے تمہیں اپنی کار میں بھیجا۔ یہ مناسب نہیں ہوگا کہ کوئی بھی تمہیں میری کار میں دیکھے۔ میں نے خود کو بالکل پوشیدہ رکھا ہے۔ فرزانہ ٹریڈرز کے قیام کے لیے تمام تر ذمے داریاں میں نے جمال پر ڈالی ہیں۔"

سطوت مرزا بولتے چلے گئے اور فرزانہ ساکت بیٹھی ان کا منہ تکتی رہی تھی۔ اس وقت اس کا رواں رواں "خواب خواب" کی تکرار کرنے لگا۔

پھر اس دن یہ خواب اپنی دلکشی کی معراج پر تھا جب فرزانہ ٹریڈرز کا افتتاح ہوا۔ فیتہ کاٹ کر یہ رسم ایک منسٹر کے ہاتھوں سے ادا ہوئی۔ اس منسٹر سے سطوت مرزا کے بہت قریبی تعلقات تھے۔

"ان کی وجہ سے......" سطوت مرزا نے کہا۔ "افتتاح کی تصویریں بھی اخبارات میں چھپیں گی اور ناممکن ہے کہ وہ طارق کی نظر میں نہ آئیں۔"

فرزانہ نے دیکھا بھی کہ افتتاح کے اس موقع پر میڈیا کے بہت سے نمائندے موجود تھے۔ اس موقع پر فرزانہ اپنے والدین کو بھی ساتھ لائی تھی۔ ان سے اس نے کہا تھا کہ مرزا صاحب یہ نیا کاروبار شروع کر رہے ہیں اور انہوں نے اس کی تمام تر ذمے داری اسی پر ڈالی ہے لیکن یہ بات کسی وجہ سے وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے کہ یہ کاروبار ان کا ہے۔

فرزانہ نے انٹرکام پر جمال کو ہدایت کی کہ اس کا شوفر آدھے گھنٹے بعد اس کے والدین کو گھر چھوڑ آئے۔

"اس کے بعد تم میرے پاس آنا۔" فرزانہ نے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

آدھے گھنٹے بعد اس کے والدین چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد جمال کمرے میں آیا۔

"کیا پروگریس ہے جمال؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"کل سارے اخبارات میں ہماری پروڈکشنز کے اشتہارات موجود ہوں گے اور آج رات سے ٹی وی چینلز پر بھی اشتہارات شروع ہو جائیں گے۔ ان کی فلمیں آپ دیکھ چکی ہیں۔"

"بہت اچھی فلمیں بنوائی ہیں تم نے۔"

"شکریہ میڈم!"

"مارکیٹ کا کیا سوچا ہے؟"

"پندرہ دن بعد ہم اپنی پروڈکشنز مارکیٹ میں پہنچا دیں گے۔"

"گڈ......! اچھا اب ایک کام کرو۔ میں آج ہی اپنے دفتر کے تمام افراد سے دو دو منٹ کے لیے ملنا چاہوں گی۔ اہم ذمے داروں سے لے کر چپراسیوں تک۔"

فرزانہ خود کو اس سانچے میں ڈھالنا چاہتی تھی جس سانچے میں سطوت مرزا ڈھلے تھے۔

اس دن وہ دفتر کے سبھی لوگوں سے ملی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ لوگ اس سے مل کر اس خیال سے بہت خوش ہوئے تھے کہ وہ جس کے ملازم تھے، وہ نہایت منکسر المزاج تھی۔ چپراسی تو بہت زیادہ نہال ہو اٹھے تھے۔ وہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ ان کی مالکن انہیں اپنے سامنے بٹھا کر ان سے ان کا [illegible] حال احوال پوچھے گی۔

طے شدہ وقت پر وہ دفتر سے اٹھی جو ایک معروف عمارت کے سیکنڈ فلور پر تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنے والدین کے ساتھ خاصا وقت گزارا جس کا موقع اسے پہلے نہیں ملتا تھا۔ آتے ہی گھر کے کام کاج میں مصروف ہو جاتی تھی جبکہ اب کھانا پکانے کے لیے ایک عورت ملازم تھی۔

شام کو وہ گھر سے سطوت مرزا کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ اس وقت اس نے شوفر کو اپنے ساتھ نہیں لیا تھا۔ خود ہی ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ ڈرائیونگ اس نے بنگلے میں منتقل ہونے کے بعد ہی سیکھنا شروع کر دی تھی۔

سائرہ اور تنویر اس سے لپٹ گئے۔ وہ ان کے گھر پہلی مرتبہ آئی تھی۔

سطوت مرزا بولے۔ "یہ تو تم نے اچھا کیا کہ شوفر کے ساتھ نہیں آئیں۔ تمہارے دفتر اور گھر کے ملازمین بھی مجھے نہیں جانتے۔ میں بہت احتیاط سے خود کو پوشیدہ رکھ رہا ہوں فرزانہ! افتتاح کے موقع پر بھی میں اسی لیے نہیں آیا تھا۔ اس معاملے میں مجھ سے صرف جمال اور وہ منسٹر صاحب واقف ہیں۔ ان پر بھی مجھے اعتبار ہے۔ وہ ہرگز کسی کو نہیں بتائیں گے لیکن اگر تم اس طرح یہاں آتی جاتی رہیں تو خدشہ ہے کہ کوئی دیکھ لے۔"

"میں بچوں سے ملے بغیر نہیں رہ سکتی سر!" فرزانہ نے کہا۔

تنویر ٹھنک کر بولا۔ "آج آپ دفتر بھی نہیں آئیں آنٹی!"

"اب یہ دفتر نہیں آیا کریں گی۔" سطوت مرزا نے تنویر کو تھپک کر کہا۔ "انہوں نے اپنا الگ دفتر بنا لیا ہے۔" پھر انہوں نے فرزانہ سے کہا۔ "تم بچوں سے ملنے آنا چاہتی ہو تو رات کو گیارہ بجے آیا کرو۔"

"ٹھیک ہے سر! میں خیال رکھوں گی۔"

فرزانہ بچوں سے جتنا پیار کرنے لگی تھی، اتنا ہی وہ دونوں بھی اس سے ملنے کے لیے بے چین رہا کرتے تھے۔

گھنٹا بھر بعد فرزانہ وہاں سے لوٹ آئی۔ رات کو وہ جب اپنی آرام دہ خواب گاہ میں لیٹی تو اس نے اپنے دل میں کہا۔ "تو کب تک سوچتی رہے گی فرزانہ کہ یہ سب خواب ہے۔ دنیا میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ راتوں رات انسان کی قسمت بدل جاتی ہے۔"

اسے جلدی نیند نہیں آتی تھی اس لیے تھوڑی دیر آرام کر کے وہ کمپیوٹر پر جا بیٹھتی تھی اور ایک ڈیڑھ گھنٹا گزارا کرتی تھی۔ زیادہ تر وہ سرچنگ کر کے اپنی جنرل نالج میں اضافہ کیا کرتی تھی۔ فیس بک کا استعمال بخوبی آ گیا تھا۔ فرضی اکاؤنٹ سے وہ فیس بک پر موجود تھی۔ فرینڈشپ کے لیے چند لڑکیوں کو ریکویسٹ بھیجنے کے بعد کمپیوٹر بند کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن اس نے اخبار میں "فرزانہ ٹریڈرز" کا بڑا سا اشتہار دیکھا تو کئی منٹ تک دیکھتی رہی۔ اس نے کچھ عجیب سا محسوس کیا تھا۔ اسے جمال کی بات بھی یاد آئی کہ رات سے ٹی وی چینلز پر بھی اشتہار آئیں گے لیکن وہ بھول ہی گئی تھی۔

"خیر، آج رات سہی۔" اس نے سوچا اور خبروں پر نظر دوڑانے لگی۔

دوپہر کو جب وہ دفتر میں تھی تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف دفتر کا آپریٹر تھا۔ اس نے بتایا کہ کوئی طارق صاحب اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی۔ دفتر کے افتتاح کی تصاویر چھپ چکی تھیں۔ امکان تھا کہ ٹی وی چینلز پر بھی منسٹر کی وجہ سے کوئی چھوٹی موٹی خبر چلی ہو لیکن فرزانہ نے گزشتہ رات ٹی وی سرے سے دیکھا ہی نہیں تھا۔

فوری طور پر فرزانہ سے جواب نہیں ملا تو آپریٹر بولا۔

"میڈم! کیا کال ملاؤں آپ سے؟"

"ملاؤ۔" فرزانہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ وہ [illegible]

طارق کا ڈومیل جاننا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا موبائل نمبر تبدیل کرلیا تھا۔ طارق نے پہلے تو اسی نمبر سے رابطہ کرنا چاہا ہوگا۔ ناکامی کے بعد اس نے ٹیلی فون کا نمبر گھمایا ہوگا۔ وہ نمبر اخبارات کے اشتہارات میں موجود تھا۔

''بات کیجیے میڈم!'' آپریٹر کی آواز آئی اور اس کی طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

''ہیلو!'' فرزانہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''میڈم!'' طارق نے طنزیہ انداز میں کہا۔ اس نے آپریٹر کی آواز سن لی ہوگی۔

''کہو!'' فرزانہ کا لہجہ بدستور سپاٹ رہا۔

''بہت ہی اونچی اسامی پھانس لی؟'' طارق ہنسا۔

''ہوں۔'' فرزانہ کے ہونٹ بھنچ گئے۔

''کون ہے وہ؟''

''میں نے اسی لیے فون ریسیو کیا ہے تاکہ تمہاری گفتگو کا انداز دیکھوں۔ جو گھٹیا ذہنیت ہے تمہاری، اسی انداز میں بات کررہے ہو۔''

''ہائے ہائے!'' طارق نے آہ بھری۔ ''میں وہ وقت آج بھی نہیں بھولا ہوں جو میں نے تمہارے ساتھ گزارا۔''

''میں بھی وہ دن نہیں بھولی ہوں۔'' فرزانہ نے دانت پر دانت جمالیے۔ ''اور مجھے انہی دنوں کا حساب لینا ہے تم سے۔''

''تو آجاؤ کسی وقت حساب لینے۔'' طارق مضحکہ اڑانے کے انداز میں بولا۔

''اب تو تمہیں ہی آنا پڑے گا میرے پیروں میں گرنے کے لیے۔ اسی لیے آئی ہوں میں تمہاری ہی فیلڈ میں اور تمہاری طرح گھٹیا نہیں ہوں کہ دھوکے سے وار کروں۔ یہ اچھا ہوا کہ تم نے مجھے فون کرلیا۔ میں تمہیں پہلے سے بتادینا چاہتی ہوں کہ تمہارا ادارہ ہی میرا ٹارگٹ ہوگا۔ میں تمہیں تباہ کردوں گی۔ تم ہاتھ پر آجاؤ گے اور یہ نوبت آنے سے پہلے ایک بار میرے پاس آکر میرے پیروں میں گر کر گڑگڑاؤ گے ضرور۔''

''اچھا!'' طارق ہنسا۔ ''تو یہ ارادے ہیں؟''

''ہوں۔''

''بچی ہو ابھی اس معاملے میں۔ کاروباری داؤ پیچ کی ابھی ہجے بھی نہیں جان سکتیں تم۔''

''وقت کا انتظار کرو۔'' فرزانہ نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ اب اس کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی سی مسکراہٹ تھی پھر اس نے [illegible] اور جمال کو بلایا۔ اس سے کچھ معلومات حاصل کیں پھر اسے رخصت کرکے کمپیوٹر کھولا۔ ابھی کچھ دن تک دفتر میں اس کے لیے کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ بس وقت ہی گزارنا تھا اور وقت گزاری کے لیے اس کے کمرے میں کمپیوٹر تھا۔

وہ فیس بک پر گئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس نے جن لڑکیوں سے فرینڈ شپ کی ریکویسٹ کی تھی، ان میں سے چار اس کی فرینڈ شپ میں آگئی تھیں۔

فرزانہ کو خیال آیا کہ شاید طارق بھی فیس بک پر ہو۔ اس نے ٹرائی کیا تو اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ طارق نے اپنے پیج پر تصویر بھی اپنی ہی لگائی تھی۔ اس کے فرینڈز کی تعداد خاصی تھی۔ فرزانہ نے اس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ زیادہ تر لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے ایک چہرہ دیکھ کر فرزانہ چونکی۔ وہ تصویر زینت کی تھی۔ نام بھی زینت ہی تھا۔

''کیا یہ طارق کے جال میں پھنس چکی ہوگی؟'' فرزانہ نے سوچا۔

اس وقت یکایک اسے خیال آیا کہ وہ طارق کو فرینڈ شپ میں لے۔ اس سے ریکویسٹ کرے۔ اس کے لیے اس نے ایک حرکت یہ کی کہ گوگل سرچ میں جاکر چند اداکاراؤں کی نیم عریاں تصاویر لفٹ کیں اور پھر وہ اپنی ٹائم لائن پر ڈال دیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی ریکویسٹ قبول کرنے سے پہلے طارق اس کے پیج کا جائزہ لینے کے لیے ضرور آئے گا اور وہ نیم عریاں تصویریں دیکھنے کے بعد اس کی ریکویسٹ یقینی طور پر قبول کرلے گا۔

اس کی یہ توقع درست ثابت ہوئی۔ وہ نہ صرف فرینڈ شپ میں آچکا تھا بلکہ ایک سوال بھی چھوڑ گیا تھا کہ ''آپ فیس بک پر کس وقت آتی ہیں؟''

فرزانہ نے جواب میں لکھ دیا۔ ''میں صبح گیارہ بجے اور رات کو بارہ بجے کے بعد فیس بک پر آتی ہوں۔''

اگر اس وقت طارق فیس بک پر ہوتا تو اس سے بات کرنے کے لیے ضرور ٹپک پڑتا۔

فرزانہ نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے پیج پر آٹھ افراد کی ریکویسٹ موجود تھی۔ اس کا سبب وہ تصویریں ہی ہوسکتی تھیں جو اس نے پیج پر ڈالی تھیں۔ فرزانہ نے وہ سب ڈیلیٹ کردیں۔ وہ ابھی فرینڈ لسٹ میں زیادہ بھیڑ نہیں چاہتی تھی۔ اس نے فیس بک پر کچھ وقت گزارا پھر کمپیوٹر بند کرکے جمال کو بلایا اور اس سے کہا۔

''جمال! میں کوئی ایسا شخص چاہتی ہوں جو مجھے کمپیوٹر کے کچھ پروگرام سکھاسکے۔''

''تھوڑا بہت تو میں بھی جانتا ہوں میڈم! آپ کیا سیکھنا چاہتی ہیں؟''

''اگر ہم نیٹ سے کسی بھی چیز کی تصویر بنانا چاہیں تو کس پروگرام کے تحت بناسکتے ہیں۔ میں نے شاید کہیں پڑھا تھا یا سنا تھا کہ ایسا کوئی پروگرام ہوتا ہے۔''

''جی ہاں میڈم! وہ میں جانتا ہوں۔ اگر وہ پروگرام آپ کے کمپیوٹر میں لوڈ ہے تو اس کا استعمال میں آپ کو سکھادوں گا اور اگر وہ نہیں ہے تو اسے لوڈ بھی کردوں گا۔ چند منٹ لگیں گے۔''

''ویری گڈ! تو یہ تم ابھی کرو۔ کمپیوٹر کا رخ اپنی طرف کرلو۔''

پھر جمال نے وہ پروگرام نہ صرف لوڈ کیا بلکہ اس کے استعمال کا طریقہ بھی سکھادیا۔ فرزانہ نے جمال کے سامنے ہی اس کی تھوڑی سی پریکٹس بھی کی۔ یہ دیکھ کر جمال نے کہا۔

''آپ نے تو بہت جلدی سیکھ لیا میڈم۔''

''تم اور کیا کیا جانتے ہو؟''

جمال نے چند پروگراموں کے نام بتائے اور یہ بھی کہ ان پروگرامز میں کیا کیا، کیسا کیا جاسکتا ہے۔

''گڈ!'' فرزانہ نے کہا۔ ''جب تک ہماری پروڈکٹس مارکیٹ میں نہیں آتیں، کوئی خاص مصروفیت تو ہوگی نہیں۔ تم مجھے روزانہ ایک ڈیڑھ گھنٹے جو کچھ بھی سکھاسکتے ہو، سکھادو۔ آج کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔ تم اب جاؤ۔ میں تھوڑی دیر اس کی پریکٹس کروں گی۔''

جمال کو رخصت کرکے فرزانہ نے ایک گھنٹے تک پریکٹس کی پھر کمپیوٹر بند کردیا۔ اس کے بعد ٹی وی کھولا۔ اس کی ہدایت پر جمال نے دن کے لیے بھی اشتہارات بک کروائے تھے۔

فرزانہ نے خاصا وقت مختلف چینلز پر ''فرزانہ ٹریڈرز'' کے اشتہارات دیکھے۔ اس نے پروڈکٹس کے آنے تک کے لیے اشتہار کی مد میں خاصی بڑی رقم مختص کی تھی۔ اس کا نتیجہ یقیناً اتنا مثبت نکلتا کہ ابتدائی دو ایک دن میں ہی طارق کے چھکے چھوٹ سکتے تھے۔

مقررہ وقت پر وہ دفتر سے اٹھ گئی۔ گھر پر اس نے والدین کے ساتھ وقت گزارا۔ گیارہ بجے سطوت مرزا کے گھر پہنچی۔ بچوں کے ساتھ اس نے آدھا گھنٹا ہی گزارا کیونکہ بارہ بجے سے پہلے اسے واپس گھر پہنچنا تھا۔ اسے یقین تھا کہ طارق نے اس کا جواب پڑھ لیا ہوگا اور بارہ بجے فیس بک پر ضرور آئے گا۔

اس کی یہ توقع بالکل درست ثابت ہوئی۔ گھر پہنچ کر جب اس نے کمپیوٹر کھولا اور فیس بک پر گئی تو طارق فیس بک پر تھا۔ چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ اس کا میسج باکس اسکرین پر آگیا۔ اس نے ''ہیلو'' سے بات شروع کی اور پھر ایسے سوالات شروع کردیے جیسے فوراً ہی اس کے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتا ہو۔ فرزانہ نے اپنی عمر اٹھارہ سال بتائی اور قیام کراچی ہی میں ظاہر کیا پھر لکھا۔ ''آج ہماری فرینڈ شپ کو پہلا ہی دن ہے۔ فوراً ہی تو میں آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ نہیں بتاؤں گی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' طارق کا جواب آیا۔ ''آپ نے ٹائم لائن پر تصویریں بہت اچھی لگائی ہیں۔''

''میری پسندیدہ اداکارائیں ہیں۔'' فرزانہ نے لکھا۔

''مگر تصویریں بہت خاص ہیں۔''

فرزانہ کے ہونٹوں پر زہریلی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''شاید میں یہ تصویریں ہٹادوں۔''

''کیوں؟''

''ان کی وجہ سے فرینڈ شپ کے لیے بہت لوگ آرہے ہیں۔ اس وقت بھی آٹھ ریکویسٹ موجود ہیں۔ ابھی دیکھی نہیں میں نے۔''

''ابھی مت ہٹائیے۔ بلکہ میں آپ کو اس سے بھی اچھی تصویریں بھیج دیتا ہوں۔''

''بھیجیے۔ میں دیکھوں گی پھر فیصلہ کروں گی کہ ان کا کیا کروں۔''

''بس ایک منٹ میں بھیجتا ہوں۔''

''منتظر ہوں۔''

ان باتوں کے دوران میں اس کے ذہن میں ایک خیال آیا تھا اور اس نے سیکھے گئے پروگرام کے ذریعے میسج باکس کی دو تصویریں بنا کر ڈاؤن لوڈ کرلی تھیں۔ جب اس نے جمال سے یہ پروگرام سیکھا تھا اس وقت اس کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ وہ پروگرام اس طرح اس کے کام آئے گا۔

ایک منٹ نہیں گزرنے پایا تھا کہ طارق نے دو تصویریں بھیج دیں۔ فرزانہ کا خیال تھا کہ شاید وہ بالکل ہی عریاں تصویریں بھیجے گا لیکن ایسا نہیں ہوا البتہ تصویریں فرزانہ کی لگائی ہوئی تصویروں سے زیادہ عریاں تھیں۔

فرزانہ نے اس میسج باکس کی تصویر بنا کر ڈاؤن لوڈ کرلی۔ اس وقت اسے یقین آگیا تھا کہ آئندہ چل کر طارق اور زیادہ ''کھلے گا'' لہٰذا اس کی ان حرکتوں کی تصاویر [illegible]

ذریعے وہ اسے فیس بک پر تو ڈیلیٹ کر ہی دے گی اور کیا معلوم کہ وہ کسی اور کام بھی آجائیں۔

"جواب نہیں آیا آپ کا۔" طارق کی تحریر سامنے آئی۔ "کیسی ہیں تصویریں؟"

"اچھی ہیں لیکن یہ میں ٹائم لائن پر نہیں لگاؤں گی۔ مجھے سوچنا پڑے گا۔ اچھا اب میں فیس بک سے جاؤں گی۔ رات کو ہی نہیں میں دن میں بھی فیس بک پر کم ہی آتی ہوں۔ اب اجازت دیجیے..... کچھ اور کام بھی ہے۔"

"آپ اپنا کام کیجیے۔ میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ خدا حافظ!"

"یہ تحمل سے کام کرتا ہے۔" فرزانہ نے سوچا پھر خود بھی "خدا حافظ" لکھ کر میسج باکس ٹائم لائن سے اڑا دیا۔ آئی ہوئی ریکویسٹ ڈیلیٹ کردیں پھر سرچ میں جا کر مختلف فلسفیوں کے اقوال ڈھونڈ کر ڈاؤن لوڈ کیے اور اپنی ٹائم لائن پر اپ لوڈ کیے۔ اتنی دیر میں طارق فیس بک سے چلا گیا تھا۔ فرزانہ نے اپنی لگائی ہوئی نیم عریاں تصویریں ڈیلیٹ کردیں پھر زینت کی ٹائم لائن پر گئی اور فرینڈ ریکویسٹ کرکے فیس بک سے باہر آگئی۔ وہ چاہتی تھی کہ زینت اس کی ٹائم لائن پر وہ نیم عریاں تصویریں دیکھ کر اس کے بارے میں غلط رائے قائم نہ کرلے۔

دوسرے دن وہ دفتر پہنچنے کے بعد جب فیس بک پر گئی تو زینت خود تو فیس بک پر نہیں تھی لیکن فرینڈ شپ میں آگئی تھی۔

طارق فیس بک پر جیسے اس کا منتظر ہی تھا۔ اس موقع پر وہ گزشتہ رات کی بہ نسبت زیادہ کھلا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ فاضل ٹریڈرز کا مالک ہے۔ اس طرح اس نے اپنی دولت مندی ظاہر کی تھی۔ فرزانہ نے اسے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ وہ مڈل کلاس کی لڑکی ہے۔

طارق نے اس پر بھی افسوس کا اظہار کیا کہ اس نے بڑی اچھی تصویریں اپنی ٹائم لائن سے ختم کردی تھیں۔

فرزانہ اس وقت بھی طارق کے میسج باکس کی تصویریں کھینچ کر ڈاؤن لوڈ کرتی رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے طارق سے رخصت چاہی پھر وہ زینت کی ٹائم لائن پر گئی اور اس کا میسج باکس کھول کر پیغام لکھا۔ "شکریہ......! آپ نے میری ریکویسٹ کی لاج رکھی۔ آپ کی تصویر مجھے بہت اچھی لگی۔ جی چاہ رہا تھا کہ میں آپ سے باتیں بھی کروں لیکن آپ فیس بک پر نہیں ہیں۔ خیر، کبھی تو فیس بک پر ملاقات ہو ہی جائے گی۔"

اور پھر یہ ملاقات دو دن بعد ہوگئی۔ اس ملاقات میں زینت نے اپنے بارے میں سب کچھ سچ بتا دیا۔ فرزانہ نے اسے سچ اس لیے سمجھا کہ وہ اس کے بارے میں پہلے سے ہی تھوڑا بہت جانتی تھی۔ اپنے بارے میں اس نے جھوٹ ہی بولا۔ اس کا وہ پیج بھی فرضی نام سے تھا۔ جھوٹ بولنا اس کی مجبوری تھی۔

☆☆☆

دفتر کھلنے کے بارھویں دن جب فرزانہ رات کو سطوت مرزا کے گھر گئی تو سطوت مرزا نے اس سے کہا۔ "تمہارے لیے ایک خبر ہے میرے پاس لیکن وہ باتیں بچوں کے سامنے نہیں کی جاسکتیں۔"

فرزانہ بے چین ہوگئی۔ اس نے دس منٹ بعد ہی سائرہ اور تنویر سے کہا۔ "اب تم دونوں جا کر سو جاؤ۔ آج مجھے تمہارے ڈیڈی سے کچھ بات کرنا ہے۔"

تنویر تھوڑا سا ٹھنکا لیکن سائرہ اسے بہلا کر اپنے ساتھ ڈرائنگ روم سے لے گئی۔ فرزانہ فوراً سطوت مرزا سے بولی۔ "کیا خبر ہے؟"

"زینت اور طارق کی شادی طے ہوگئی ہے۔"

"کیا؟" فرزانہ حیرت زدہ رہ گئی۔

"ہاں۔" سطوت مرزا نے کہا۔ "مسز ارباب آئی تھی آج دفتر۔ یہ دعوت نامہ دے گئی ہے بیٹی کی شادی کا۔"

سطوت مرزا نے کارڈ فرزانہ کے سامنے ڈال دیا لیکن فرزانہ نے وہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اس کے دماغ میں طارق کی بات گونج رہی تھی کہ وہ شادی کے بندھن میں جکڑنا کبھی گوارا نہیں کرے گا۔

"چپ کیوں ہوگئیں؟" سطوت مرزا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"حیران کن بات ہے۔" فرزانہ نے کہا۔ "طارق تو کہا کرتا تھا کہ......"

اس نے سب کچھ بیان کردیا۔

"ہوں۔" سطوت مرزا بولے۔ "دراصل سیر کو سوا سیر مل گیا۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ مسز ارباب مجھ سے بہت بے تکلف ہے۔ بعض اوقات تو ایسی باتیں بھی کر بیٹھتی ہے جو میں تمہارے سامنے اپنی زبان پر نہیں لا سکتا۔ بہرحال یہ بات تو بتا ہی سکتا ہوں۔ میں بھی یہ دعوت نامہ دیکھ کر حیران ہوا تھا اور میں نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا وہ طارق کے کردار سے واقف نہیں؟ کاروباری حلقے میں تو خاصا مشہور ہے کہ طارق کس قسم کا شخص ہے۔"

سطوت مرزا خاموش ہوگئے کیونکہ ملازم کافی لے آیا تھا۔ یہ روزانہ کا معمول تھا کہ فرزانہ جب ان کے گھر پہنچتی تھی تو سطوت مرزا کافی اس کے ساتھ ہی پیا کرتے تھے۔

ملازم کے جانے کے بعد وہ بولے۔ "مسز ارباب کے بیان کے مطابق قصہ کچھ یوں ہے کہ طارق سال بھر سے زینت کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کرتا رہا ہے لیکن کامیاب نہیں ہوسکا اور یہ تو تم سمجھ ہی سکتی ہو کہ اگر انسان کسی چیز کو شدت سے چاہتا ہو اور وہ اسے نہ ملے تو وہ بہت بے چین ہوجاتا ہے۔ زینت نے کوئی سال بھر پہلے ہی اس کے سامنے شادی کے لیے دو شرطیں رکھ دی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ آئندہ کسی لڑکی سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا اور دوسری یہ کہ اسے اپنے کاروبار میں نصف کا شریک بنائے گا۔ بلکہ تیسری شرط یہ بھی تھی کہ اگر اس نے شادی کی تاریخ طے ہوجانے کے بعد یعنی نکاح سے پہلے ہی ایسی کوئی حرکت کی تو وہ اس سے شادی نہیں کرے گی۔ یعنی یہ رشتہ توڑ دے گی اور اگر شادی کے بعد یہ حرکت کی تو نہ صرف طلاق دینا پڑے گی بلکہ اپنا باقی نصف کاروبار بھی اس کے حوالے کرنا پڑے گا۔"

"اوہ!" فرزانہ کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔

"طارق سات آٹھ مہینے قبل اس کی یہ شرط تو ماننے کے لیے تیار ہوگیا تھا کہ وہ آئندہ کسی لڑکی سے کوئی تعلق قائم نہیں کرے گا اور شادی بھی نہیں کرے گا لیکن کاروبار میں نصف کا حصے دار نہیں بنائے گا۔"

"اس سے تو وہ انحراف کرسکتا تھا۔" فرزانہ نے کہا۔ "کسی سے بھی وہ خفیہ مراسم رکھ سکتا تھا۔"

"یہی بات زینت نے بھی اس سے کہی تھی اور معاملہ آگے نہیں بڑھ سکا تھا لیکن دو ماہ قبل اس نے زینت کی یہ شرط مان لی کہ اسے اپنا حصے دار بنالے گا لیکن یہ نہیں مانی تھی کہ معاہدے سے انحراف کی صورت میں وہ اپنا باقی کاروبار بھی کھو دے گا۔ اس پر زینت نے اس سے کہا کہ اس جواب سے تو اس کی بدنیتی صاف ظاہر ہو رہی ہے۔ یعنی یہ بات اس کے ذہن میں ہے کہ وہ دوسری لڑکیوں سے تعلقات رکھے گا اور شاید دوسری شادی بھی کرلے۔ اس کے بعد زینت اس سے ناراض ہوگئی۔ آخر ایک ہفتے قبل اس نے میسج بھیجا کہ وہ اس کی تمام شرائط ماننے کے لیے تیار ہے۔ اس کے بعد ہی زینت نے اس سے ملاقات کی پھر اس نے کسی وکیل کے ذریعے معاہدہ تیار کروایا اور جس دن شادی کی تاریخ طے ہوئی، اسی دن زینت نے طارق سے اس معاہدے پر دستخط بھی کروالیے۔"

فرزانہ بڑے غور سے سب کچھ سن رہی تھی۔ سطوت مرزا کے خاموش ہوجانے کے بعد اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس معاہدے کی قانونی حیثیت کیا ہے؟"

"یہ تو کوئی بڑا وکیل ہی بتا سکتا ہے۔ میں قانون داں تو نہیں ہوں فرزانہ۔"

"شاید اس میں کوئی سقم نہیں ہوگا ورنہ جس وکیل سے معاہدہ تیار کروایا گیا ہے، وہ زینت کو بتا دیتا۔"

"بہت سے وکیل صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا موکل کیا چاہتا ہے۔ انہیں بس اپنی فیس سے غرض ہوتی ہے۔ ویسے اس میں یہ بات اہم ہے کہ اگریمنٹ تیار کرتے ہوئے تمام قانونی نکتوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے یا نہیں۔"

فرزانہ کے دماغ میں اس وقت کچھ ایسے خیالات چکرانے لگے تھے جو اس کے لیے خاصے خوش کن تھے۔

"زینت اس کے کاروبار کی حصے دار بھی بن چکی ہے؟" فرزانہ نے کچھ توقف سے پوچھا۔

"ہاں۔ یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا۔ وہ اگریمنٹ بھی تیار ہوچکا ہے جس پر طارق نکاح کے فوراً بعد دستخط کرے گا۔"

"تب تو......" فرزانہ کچھ کہتے کہتے رکی پھر بولی۔ "مسز ارباب نے یا زینت نے یہ نہیں سوچا کہ وہ ایک بدنام شخص سے شادی کررہی ہے۔"

سطوت مرزا مسکرائے۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مسز ارباب کس کمیونٹی کی عورت ہے۔ اس کا زینت پر گہرا اثر پڑا ہوگا لہٰذا بس فائدے کی بات سوچی گئی ہوگی۔ فاضل ٹریڈرز کوئی بڑا... ادارہ نہیں لیکن بہرحال کچھ تو ہے اور زینت اس کے آدھے کی حصے دار بن جائے گی۔"

فرزانہ نے سر ہلایا۔ اس کے دماغ میں خیالات کا ریلا مسلسل بہہ رہا تھا۔

کچھ دیر اور باتیں کرکے فرزانہ اپنے گھر روانہ ہوگئی۔ اس رات اسے کمپیوٹر کھولنے اور فیس بک پر جانے میں پندرہ منٹ کی تاخیر ہوگئی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ طارق فیس بک پر ہوگا۔ معاہدہ ہوجانے کے باوجود وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آسکتا تھا۔ دوسری شادی نہیں کرتا لیکن مختلف لڑکیوں سے تعلق رکھنا اس کی فطرت بن چکی تھی۔ اب وہ بس محتاط رہتا۔ اپنے یہ معاملات بہت خفیہ رکھتا۔

اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ طارق فیس بک پر موجود

تھا۔ اس نے فوراً میسج باکس بھیجا۔ لکھا تھا۔ "ہیلو صبوحی ڈیئر!" دو تین روز سے وہ اسے اس کے فرضی نام سے مخاطب کرنے لگا تھا۔

"ہیلو طارق!" فرزانہ نے بھی اب "طارق صاحب" کہنا چھوڑ دیا تھا۔

"آج کچھ دیر کر دی آنے میں۔ اب تک وقت کی اتنی پابند رہی ہو کہ میں اتنی سی تاخیر کے باعث اب مایوس ہونے لگا تھا۔"

"وہ بس...... کسی کام میں الجھ گئی تھی۔"

چند اور باتیں کرنے کے بعد طارق نے ایک انگریزی فلم کا نام لے کر پوچھا کہ اس نے وہ فلم دیکھی ہے؟

فرزانہ نے نفی میں جواب دیا۔ طارق بولا۔ "اس کے بعض حصے سینسر ہونے چاہیے تھے مگر جانے کیوں نہیں ہوئے۔ یوٹیوب پر وہ فلم موجود ہے، دیکھنا کبھی۔"

"اچھا، کسی وقت دیکھوں گی۔"

پھر جب فرزانہ نے فیس بک سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو طارق نے کہا۔ "اچھا تو ایک بات سنتی جاؤ۔ آئندہ ایک ہفتے میں میری کچھ مصروفیت رہے گی۔ رات ہی کو فیس بک پر ملاقات ہو سکے گی۔"

'ایک ہفتے کی مصروفیت، شادی کی تیاری۔' فرزانہ نے سوچا پھر بولی۔ "ٹھیک ہے۔ میں اس ہفتے صبح کے وقت فیس بک پر تمہارا انتظار نہیں کیا کروں گی۔ خود بھی شاید پابندی سے نہ آؤں۔ تمہاری ہی وجہ سے آتی ہوں۔"

"اتنا لگاؤ ہو گیا ہے مجھ سے؟"

جواب میں فرزانہ نے ایک مسکراتا کارٹون بھیجا اور فیس بک سے باہر آ گئی۔

'کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے۔' اس نے سوچا۔ 'چور چوری سے جاتا ہے لیکن ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔'

اس نے اسی وقت یوٹیوب پر وہ فلم بھی دیکھی جس کا نام طارق نے بتایا تھا۔ اس فلم کی ابتدا ہی ایک ریپ سین سے ہوئی تھی لیکن یہ بات صرف جسمانی حرکات سے ظاہر کی گئی تھیں۔

فرزانہ نے زہریلی سی مسکراہٹ کے ساتھ کمپیوٹر بند کر دیا۔ پوری فلم نہیں دیکھی۔

☆☆☆

دن گزرتے رہے۔ ان دنوں میں طارق سے صرف رات کے وقت فیس بک پر ملاقات ہوتی رہی جس میں وہ بہت زیادہ بے تکلف ہو گیا۔ حقیقی ملاقات کے لیے اس کی بے چینی ظاہر ہوتی رہی جسے کسی نہ کسی طرح ٹالتے رہنا فرزانہ کے لیے ضروری تھا۔ طارق نے اب ایسی باتیں بھی شروع کر دی تھیں جنہیں کسی حد تک جنسی گفتگو کہا جا سکتا تھا۔

زینت سے کم باتیں ہو سکیں۔ اس سے بھی کچھ بے تکلفی ہو گئی لیکن ایسی نہیں جسے تہذیب کے دائرے سے باہر کہا جا سکتا۔

جس دن طارق کی شادی تھی، اس سے ایک رات پہلے اس نے فرزانہ سے یہ بھی کہا کہ وہ تین چار دن کے لیے ایک ضروری کام سے بیرون ملک جا رہا ہے اور اگرچہ لیپ ٹاپ اس کے ساتھ ہو گا لیکن بے حد مصروفیت کے باعث وہ فیس بک کے لیے وقت نہیں نکال سکے گا۔

'سال بھر کی بے چینی جو ہے۔' فرزانہ نے سوچا تھا۔

اسی دوران میں جمال نے اس سے اس معاملے میں بھی گفتگو کی تھی کہ جو پروڈکٹس بازار میں جائیں گی، ان کے پیکٹ چھپوانا ہیں اور ان پر قیمت بھی چھپے گی۔

"جس پروڈکٹ پر جو لاگت آ رہی ہے، اس سے دس فیصد کم قیمت رکھو۔"

جمال ہکا بکا اس کی صورت تکتا رہ گیا۔

"اس معاملے میں مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔" فرزانہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

اسی رات سطوت مرزا نے مسکرا کر فرزانہ سے کہا۔ "جمال سے میں نے کہہ دیا تھا کہ فرزانہ ٹریڈرز کے قیام کے بعد وہ مجھ سے بالکل نہیں ملے گا لیکن آج وہ اتنا پریشان تھا کہ مجھے فون کر بیٹھا۔ تم نے پروڈکٹس کی جو قیمتیں رکھوائی ہیں، اس کی وجہ سے اس کا دماغ چکرا گیا ہے۔ چونکہ وہ جانتا ہے کہ سرمایہ میرا ہے۔ اس لیے اس نے مجھے بتانا اپنا فرض سمجھا۔"

"جی ہاں۔" فرزانہ نے کہا۔ "اس کے پیروں تلے سے تو شاید زمین نکل گئی ہوگی اور یہ میں اسے بتانا نہیں چاہتی تھی کہ میں فاضل ٹریڈرز پر ایک نہایت شدید ضرب لگانا چاہتی ہوں۔"

"تم نے مجھے اپنا منصوبہ بتا ہی دیا تھا۔ اس لیے میں نے اس سے کہہ دیا کہ جو کچھ اس سے کہا جا رہا ہے، وہ صرف وہی کرے۔"

"سر!" فرزانہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "فاضل ٹریڈرز کو تباہ کرنے کے لیے مجھے اب ایک اور راستہ بھی مل گیا ہے۔ شاید اب میں اسی راستے پر چلوں۔ فرزانہ ٹریڈرز کو زیادہ نقصان نہیں اٹھانا پڑے گا۔"

"وہ کیسے؟ کیا راستہ ہے؟" سطوت مرزا نے الجھ کر پوچھا۔

"میں آپ سے گزارش کروں گی کہ وہ آپ مجھ سے نہ پوچھیں۔ بس یہ عرض کروں گی کہ اگر مجھے اس راستے سے کامیابی نہ ملی تو پھر پہلے ہی منصوبے پر کام جاری کیا جائے گا۔"

"تم نے تو میری الجھن بڑھا دی۔"

"پلیز، سر!"

اس کے بعد سطوت مرزا نے اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہیں کی۔

فرزانہ کا دوسرا منصوبہ ایسا تھا جو وہ سطوت مرزا کو بتانا نہیں چاہتی تھی۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب طارق اور زینت کی شادی تھی۔ اس رات فرزانہ، سطوت مرزا کے گھر نہیں گئی۔ وہ بتا چکے تھے کہ وہ بچوں کے ساتھ کسی شادی میں شرکت کے لیے جائیں گے۔

دو دن بعد ہی فرزانہ کی فیس بک پر زینت سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔

"ارے!" فرزانہ نے شکایت کی۔ "اور تم مجھے بعد میں بتا رہی ہو۔"

"اگر میں تمہیں بتا دیتی تو کیا تم شادی میں شرکت کے لیے لاہور سے آ تیں؟"

فرزانہ نے اس پر یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ لاہور سے ہے۔

"ہاں۔" اس نے کہا۔ "کراچی آنا تو واقعی مشکل تھا۔" پھر وہ ہنس کر بولی۔ "چلو میں اپنی شکایت واپس لیتی ہوں۔ یہ تو بتاؤ کہ شادی کس سے ہوئی ہے؟"

"تم جانتی ہو ان کو۔" زینت نے کہا۔

فرزانہ کے ذہن کو دھچکا سا لگا۔ دل کی دھڑکن بھی کچھ بڑھ گئی۔

"شاید تم کچھ حیران ہوئی ہو۔" زینت نے کہا۔ "وہ فیس بک پر تمہاری فرینڈ شپ میں ہے۔ میں ان کا نام اور تصویر دیکھ چکی ہوں۔"

فرزانہ نے سکون کا سانس لیا۔

"تم سے کچھ باتیں تو ہوتی ہوں گی اس کی؟"

"ہاں، ہوتی تو ہیں۔"

"کوئی خاص قسم کی گفتگو؟" زینت نے اسے ٹٹولنا چاہا۔

"خاص سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"دراصل وہ ذرا عاشق مزاج قسم کے ہیں۔"

"ہوں۔" فرزانہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی ان کی کسی بات سے مجھے شک تو ہوا ہے۔"

"اس ہفتے تو انہوں نے بات نہیں کی ہوگی تم سے؟"

"یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟"

"شادی سے پہلے ہی مجھے معلوم تھا کہ وہ عاشق مزاج قسم کے ہیں۔ اس لیے میں نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ شادی کی تاریخ طے ہونے کے بعد کسی لڑکی سے کسی بھی قسم کا رابطہ نہیں رکھیں گے۔"

"ہوں۔ کیا تم مطمئن ہو کہ وہ وعدہ نبھائیں گے؟"

"بات کچھ ایسی ہے کہ انہیں نبھانا تو پڑے گا۔" زینت نے کہا۔ اس نے ایگریمنٹ کی بات نہیں بتائی پھر بولی۔ "اب وہ آئندہ بھی تم سے بات نہیں کریں گے۔"

"اچھا۔ چلو اب پھر کسی وقت بات ہوگی۔ مجھے والدہ نے پکارا ہے۔"

"جاؤ۔ خدا حافظ!"

"خدا حافظ!"

فرزانہ فیس بک سے نکل آئی لیکن کمپیوٹر بند نہیں کیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب اسے اپنے نئے منصوبے پر کس طرح عمل کرنا چاہیے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے انٹرنیٹ کے پروگرام "ویڈیو ایڈیٹنگ" میں کچھ کام شروع کیا۔ یہ پروگرام بھی اس نے جمال سے سیکھا تھا لیکن اس وقت اسے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ یہ پروگرام سیکھنا اس کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگا۔

پھر دو دن بعد فیس بک پر طارق سے بھی بات ہوئی۔ فرزانہ کو پہلے ہی ایک خیال آ چکا تھا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ طارق نے اس کی فرینڈ شپ میں لوگوں کے نام اور تصویریں دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی ہوگی یا اسے خیال ہی نہیں آیا ہوگا ورنہ وہ زینت کا نام اور تصویر دیکھ کر بھڑک جاتا۔ ممکن تھا کہ اپنی شادی کی تاریخ مقرر ہونے کے بعد اسے "ان فرینڈ" ہی کر دیتا۔

اس روز اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بہت خوش تھا۔ اس کی بے تکلفی اس روز ساری حدیں پار کر گئی۔ جنسی باتیں تو اس نے پہلے ہی شروع کر دی تھیں۔ ایک مرتبہ وہ کسی فلم کی ایک تصویر بھی بھیج چکا تھا جس میں ایک نوجوان جوڑا نیم عریاں حالت میں ہم آغوش تھا۔

"ایسی تصویریں مت بھیجا کریں طارق!" فرزانہ نے اس سے کہا تھا۔ "اس سے جذبات بھڑکتے ہیں۔"

"مجھ سے ملنے کی بات آتی ہے تو تم ٹال جاتی ہو۔ میں تو اس سے زیادہ ہیجان خیز تصویریں بھی بھیجوں گا۔"

اور [illegible]

ہو چکی تھی۔ فرزانہ نے فوراً ماؤس پکڑ کر "پوسٹ" کے
ذریعے اس کی تصویر پر کلک کر کے ڈاؤن لوڈ کر لی۔
"یہ کس کی تصویر ہے؟" طارق نے پوچھا۔
"آج کیا تاریخ ہے؟" فرزانہ نے اپنے منصوبے
کے مطابق پوچھا۔
"کیوں؟"
"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم نے مجھے یہ تصویر کس
تاریخ کو بھیجی۔"
"مجھے تاریخ یاد نہیں۔"
"آٹھ یا نو ہے آج۔"
"آٹھ ہے۔" طارق نے جواب دیا۔
فرزانہ نے کہا۔ [illegible]
"ہاں [illegible] تم نے مجھ سے کیا فضول باتیں لے بیٹھیں۔"
[illegible]
[illegible]
فرزانہ نے [illegible] تصویر [illegible]
کی اس وقت طارق [illegible] فرزانہ کی ٹائم لائن پر تھا۔
فرزانہ فوراً [illegible] سامنے ہی رہا۔
"جواب تو بھیجو نا۔" طارق نے کہا۔
لیکن فرزانہ نے جواب دینے کے بجائے اسے نہ
صرف "ان فرینڈ" کیا۔ "بلاک" بھی کر دیا تاکہ آئندہ وہ
اسے فرینڈ ریکویسٹ بھی نہ بھیج سکے۔ پھر [illegible] بھی
[illegible] اس وقت اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی
[illegible] فرینڈ شپ میں جا کر دیکھا۔ طارق کی
تصویر غائب ہو چکی تھی۔ [illegible] فرزانہ کی فرینڈ شپ
میں اٹھارہ افراد آ چکے تھے مگر اب اٹھارہ کی جگہ سترہ کا
عدد چمک رہا تھا۔
اس طرح فرزانہ کا "پلان بی" بھی مکمل ہو گیا۔ اب
اسے فیصلہ یہ کرنا تھا کہ پہلے "پلان اے" پر عمل کرے یا
"پلان بی" پر اور عمل کب ہو؟
ہیروں کے پیکٹ چھپ چکے تھے جن پر ہوئی قیمت
تھی جو فرزانہ نے جمال سے کی تھی لہٰذا اس نے سوچا کہ جب
تک یہ پیکٹس ختم نہیں ہو جاتے، پلان اے پر ہی عمل کیا
جائے۔ طارق کو بلاک کر کے بھی اسے خوشی ہوئی۔
اور ایسا ہی ہوا۔ [illegible] بازار میں جانے کے دن
ہی دوپہر کو آپریٹر نے بتایا کہ طارق صاحب بات کرنا
چاہتے ہیں۔
"کہہ دو کہ میں بات نہیں کرنا چاہتی اور اگر آئندہ بھی
فون آ [illegible]

نہیں۔" فرزانہ نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ اس کا چہرہ خوشی
سے چمک رہا تھا۔
رات کو وہ سطوت مرزا کے گھر گئی اور انہیں طارق
کے فون کے بارے میں بتایا۔
سطوت مرزا نے فوراً کچھ نہیں کہا۔ وہ بہت سنجیدہ نظر
آ رہے تھے۔
"کیا ہوا سر؟" فرزانہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔
"کچھ پریشانی ہو گئی ہے مجھے۔" سطوت مرزا نے
کہا۔ "ابھی دو تین روز پہلے ہی مجھے خیال آیا تھا اور نہ جانے
کیوں آیا تھا کہ طارق کے بارے میں مکمل انکوائری کروائی
جائے۔ کچھ ایسے تعلقات بھی ہیں میرے کہ میں یہ کام
کروا سکتا تھا اور میں نے کروا بھی لیا۔ آج ہی مجھے رپورٹ
ملی ہے کہ طارق کے تعلقات دو ایک اونچے قسم کے جرائم
پیشہ افراد سے بھی ہیں۔ اسی لیے میں فکر مند ہو گیا ہوں۔ وہ
تمہارے خلاف کوئی نہایت جارحانہ قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔
ان جرائم پیشہ افراد میں سے کسی کو آلۂ کار بنانا، میرا خیال
ہے اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔"
فرزانہ نے سنجیدگی سے سب کچھ سنا پھر چند لمحے کچھ
سوچنے کے بعد بولی۔ "جب اوکھلی میں سر دے ہی چکی
ہوں سر تو موسل سے کیا ڈرنا۔"
"احتیاط بہر حال ضروری ہے۔ جمال سے کہو کہ وہ
تمہارے لیے سیکیورٹی گارڈز کا بندوبست کرے۔ ایک
سیکیورٹی گارڈ تمہارے گھر پر، ایک تمہارے دفتر کے گیٹ
کے باہر اور ایک تمہارے ساتھ کار میں ہونا چاہیے۔"
"تین گارڈز؟"
"ہاں۔ ضروری ہے۔ اس کے علاوہ تم اپنے پاس بھی
حفظ ماتقدم کے طور پر ریوالور رکھو۔ میں کل ہی تمہارا اسلحے کا
لائسنس بنوا دوں گا۔"
"مگر مجھے ریوالور استعمال کرنا نہیں آتا۔"
"استعمال کرنا سیکھنا ہوگا۔" سطوت مرزا نے زور
دے کر کہا۔ "گارڈز کا بندوبست ہونے کے بعد تم شوٹنگ
کلب کی ممبر بن جاؤ۔ کل تم دفتر نہیں جانا۔ گھر پر ہی رہنا۔
میں تم سے یہ باتیں کرنے سے پہلے ہی جمال کو فون پر
ہدایت کر چکا ہوں کہ وہ کل صبح ہی پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈز
کے کسی ادارے سے بات کرے۔ پرسوں تک گارڈز مل
جانے چاہئیں اور اگر ممکن ہو تو کل ہی۔"
یکایک فرزانہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔
"ارے ارے!" سطوت مرزا جلدی سے بولے [illegible]

کہہ چکی ہو کہ جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسل سے کیا ڈرنا۔"
"میں ڈری نہیں ہوں سر! جذباتی ہو گئی ہوں۔ میں
اپنی قسمت پر ناز کر سکتی ہوں کہ مجھے آپ جیسا شفیق انسان
مل گیا۔ آپ میرا ہر طرح سے خیال رکھ رہے ہیں۔"
سطوت مرزا دھیرے سے ہنس دیے پھر بولے۔
"اول تو اس کا امکان نہیں کہ طارق اتنی جلدی تمہارے
خلاف کوئی قدم اٹھائے لیکن احتیاط کرنے میں کوئی حرج
نہیں۔ ابھی تم گھر جاؤ گی تو تمہارے پیچھے میری کار بھی
ہوگی۔ میرے ساتھ تو گارڈ ہوتا ہی ہے۔"
ان دنوں شہر کے حالات ایسے ہی تھے کہ بہت سے
بزنس مین اپنے ساتھ گارڈز رکھنے لگے تھے۔
اس رات خواب گاہ میں لیٹنے کے بعد اسے دیر تک
نیند نہیں آئی۔ وہ لیٹی سوچتی رہی۔ [illegible] اس سنسنی خیز صورت
حال کا تو اسے کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا لیکن وہ اس سے
خوفزدہ بہر حال نہیں ہوئی تھی۔ طارق سے انتقام لینے کا
جذبہ اتنا ہی شدید تھا کہ وہ آگ میں بھی چھلانگ لگانے کے
لیے تیار تھی۔
دوسرے دن وہ سطوت مرزا کی ہدایت کے مطابق
دفتر نہیں گئی۔ دوپہر کو جمال اس کے لیے اسلحے کا لائسنس لے
آیا۔ اسلحے کی درخواست کے فارم پر فرزانہ کے دستخط
کروانے وہ صبح ہی آ چکا تھا۔
"کل صبح گارڈز کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔" جمال
نے لائسنس دینے کے بعد کہا۔ "اور ریوالور بھی آپ کو آج
ہی کسی وقت مل جائے گا۔"
جمال کی اس بات کے مطابق تیسرے پہر ہی کو
ریوالور فرزانہ کے ہاتھ میں تھا۔
"کل صبح آپ دفتر جانے سے پہلے شوٹنگ کلب چلیں
گی۔" جمال نے ریوالور دینے کے بعد کہا۔ "گارڈ ہمارے
ساتھ ہوگا۔ کلب والوں سے میں بات کر چکا ہوں۔"
فرزانہ نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اب وہ خود کو بالکل
پُرسکون کر چکی تھی اور اس کا ذہن ہر قسم کے حالات کا مقابلہ
کرنے کے لیے آمادہ تھا۔ اس شام اس نے کمپیوٹر کھولا ضرور
لیکن فیس بک پر نہیں گئی۔
دوسری صبح جمال آیا تو اس کے ساتھ دو گارڈز تھے۔
ان کو فرزانہ سے ملاتے ہوئے اس نے کہا۔ "ایک گارڈ کو میں
دفتر چھوڑ آیا ہوں۔ ابھی ہم شوٹنگ کلب چلیں گے۔ وہاں
سے جب دفتر جائیں گے تو آپ اس سے بھی مل لیں گی۔"
فرزانہ [illegible]

آخری گاہک

نیو یارک کے ایک ہوٹل میں رات کے
دو بجے آخری گاہک اپنی میز پر سر رکھے سو رہا
تھا۔ صفائی کرنے والی عورت نے مالک سے
پوچھا۔ "میں نے آپ کو پانچ بار اس آدمی کو
اٹھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ اسے نکال کیوں
نہیں دیتے؟"
"ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" مالک
نے جواب دیا۔ "میں جب بھی اسے اٹھاتا
ہوں، یہ بل مانگتا ہے اور ادا کر کے پھر سو جاتا
ہے۔"

(مرسلہ: نگہت نصیر، ملتان)

جھوٹ کی یادگار

شمالی امریکا کے شہر میں ایک مینارہ
"جھوٹ کی یادگار" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ
غلہ منڈی کے عین وسط میں واقع ہے اور اس کی
بلندی سو فٹ ہے۔ اس کے کتبے پر یہ عبارت
کندہ ہے۔
"25 جنوری 1853ء کا ذکر ہے، ایک
خاتون رتھ پیرس نے اپنی تین سہیلیوں سے کہا،
آؤ منڈی چلیں اور وہاں سے گندم خریدیں۔
اس مقصد کے لیے ایک خاتون کے پاس رقم جمع
کر لی گئی۔ یہ چاروں خواتین جب منڈی پہنچیں
تو اس عورت نے جس کے پاس رقم جمع تھی،
محسوس کیا کہ رقم کم ہے۔ اچانک اسے یاد آیا کہ
رتھ پیرس نے اپنے حصے کی رقم ادا نہیں کی لہٰذا
اس نے رتھ سے رقم طلب کی لیکن اس نے
جواب دیا کہ میں رقم ادا کر چکی ہوں۔ اگر یہ
جھوٹ ہو تو خدا مجھے موت دے دے۔ دیکھتے
ہی دیکھتے وہ گری اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔ مطلوبہ
رقم اس کی مٹھی سے برآمد ہوئی۔ یہ مینارہ اسی
عبرتناک واقعے کی یاد تازہ کرتا ہے۔"

(مرسلہ: خالد حسین، فیصل آباد)

اور یہ بھی بتا دیا کہ ان میں سے کون سا گارڈ گھر پر مستقل طور پر رہے گا۔ اس سارے معاملے کے بارے میں صبح ناشتا کرتے ہوئے فرزانہ انہیں اور اپنی والدہ کو سب کچھ بتا چکی تھی اور وہ دونوں خاصے فکرمند نظر آنے لگے تھے۔

شوٹنگ کلب کا فارم بھرنے کے بعد فرزانہ دفتر پہنچی اور وہاں موجود گارڈ سے ملنے کے بعد اپنے کمرے میں جا کر بیٹھی ہی تھی کہ اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے کچھ لوگوں کو یہ نمبر دیا تو تھا لیکن جو نمبر اس کی اسکرین پر آیا تھا، اس سے وہ ناواقف تھی۔

قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ اس نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو!"

"تم نے جو کچھ کیا ہے، اچھا نہیں کیا۔"

فرزانہ، طارق کی آواز پہچان کر چونک گئی۔ "تمہیں یہ نمبر..."

"کسی سے ملا ہی ہے۔" طارق نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کچھ لوگوں کو تو بتایا ہی تھا تم نے۔"

"تمہیں کس نے دیا؟"

"میں کسی کا نام بتا کر اس کے اعتماد کو دھوکا نہیں دینا چاہتا۔"

"اچھے شریف زادے کب سے ہو گئے ہو؟" فرزانہ کا لہجہ تلخ تھا۔

"اس حرکت سے تمہارا مقصد کیا ہے؟" طارق کے لہجے میں غراہٹ سی تھی۔ "مارکیٹ تباہ کر دی ہے تم نے۔"

"مقصد تو تمہیں تباہ کرنا ہے۔"

"تمہیں بڑی اسامی پھانسی ہے؟" طارق نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کب تک نقصان برداشت کر سکے گا وہ؟"

"میرے نقصان کو چھوڑو، اپنی تباہی کے بارے میں سوچو۔ بھیک مانگنے کب آؤ گے مجھ سے؟"

"خوابوں کی دنیا میں رہ رہی ہو تم۔ تین مہینے بھی نہیں ٹک سکو گی اس طرح تم مارکیٹ میں۔"

"یہ تو وقت بتائے گا۔ دوبارہ مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔" فرزانہ نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ "ذلیل انسان۔" اس نے دل میں کہا۔

پھر اس نے جمال کو بلایا۔

"مارکیٹ کی کیا رپورٹ ہے؟" فرزانہ نے اس سے پوچھا۔

"کئی بزنس مین پریشان ہو گئے ہیں۔ ان سبھی پر اثر پڑا ہے۔ آج میٹنگ کر رہے ہیں وہ۔"

"اوہ! یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا۔"

"کس بات کا خیال میڈم؟"

"[illegible] تم جاؤ۔" فرزانہ نے کہا۔

جمال یقیناً الجھ گیا ہوگا لیکن وہ کوئی سوال کرنے کی جرأت نہیں کر سکا اور چلا گیا۔

فرزانہ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ یہ خیال اس کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا کہ فاضل ٹریڈرز کے علاوہ بھی کچھ ادارے اسی قسم کی پروڈکٹس بنا رہے تھے۔ فرزانہ ٹریڈرز کے اس اقدام سے ان کا متاثر ہونا بھی یقینی تھا۔ وہ بھی گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح پس جاتے جبکہ ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ فرزانہ کو انتقام تو طارق سے لینا تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے فرزانہ کو زینت کا خیال بھی آیا۔ شادی کے بعد وہ طارق کے نصف کاروبار کی مالک بن چکی تھی۔ طارق کے ساتھ اس کا حصہ بھی ختم ہو جاتا۔

'ان سب کے ساتھ تو یہ زیادتی ہوگی۔' فرزانہ نے سوچا اور کچھ دیر میں ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس معاملے کو آگے بڑھانے کے بجائے "پلان بی" پر عمل کرے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ فیس بک پر اسے زینت مل جائے۔

اس نے کمپیوٹر کھولا اور فیس بک پر گئی۔ کچھ دیر تک وہاں رکی بھی لیکن زینت نہیں آئی۔ فرزانہ نے کمپیوٹر بند کر دیا۔ اس دن دفتر کا وقت ختم ہونے تک اس نے کئی مرتبہ کمپیوٹر کھولا، فیس بک پر گئی لیکن زینت نہیں آئی پھر آئندہ دو دنوں میں بھی اسے مایوسی ہوئی لیکن جب رات گئے فیس بک پر گئی تو زینت بھی وہاں تھی۔

فرزانہ فوراً اس کے پیج پر گئی۔ میسج باکس کھولا اور اس پر سوال لکھ کر بھیج دیا۔ اس نے لکھا تھا۔ "کئی دن سے غائب ہو۔ کیا شادی کی وجہ سے صرف شوہر کی ہو کر رہ گئی ہو؟"

"یہ بات نہیں ہے۔" ذرا سا رک کر زینت کا جواب آیا۔ "کئی دن سے پریشان ہوں۔ اس وقت بھی پریشانی کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے دھیان بٹانے کے لیے فیس بک پر آ گئی ورنہ اتنی رات کو تو میں کمپیوٹر کھولتی ہی نہیں۔"

"ایسی کیا پریشانی ہو گئی؟ اور اس وقت تمہارے شوہر نامدار کہاں ہیں؟"

"وہ ذرا دیر پہلے ہی سوئے ہیں۔ میں نے ابھی دیکھا۔ وہ اب تمہاری فرینڈشپ میں نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے ہی تمہیں ان فرینڈ کیا ہوگا؟"

"انہوں نے نہیں، میں نے کیا ہے۔" فرزانہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"کیوں؟" زینت کو یقیناً تعجب ہوا ہوگا۔

"فیس بک پر جب تم سے آخری ملاقات ہوئی تھی تو میں تمہیں کچھ بتاتے بتاتے رک گئی تھی۔"

"کیا بتانا چاہتی تھیں؟" زینت الجھ گئی۔

"تم اپنے شوہر کی کسی بات سے پریشان ہو نا؟"

"یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟"

فرزانہ نے فوراً جواب نہیں لکھا۔ اس طرح وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی جیسے کچھ بتاتے ہوئے ہچکچا رہی ہو، تذبذب کا شکار ہو پھر اس نے لکھا۔

"تم شادی سے پہلے شاید نہ جانتی ہو لیکن مجھے گمان ہے کہ بعد میں یعنی اب تو تمہیں علم ہو گیا ہوگا اور یہی تمہاری پریشانی کا سبب ہو سکتا ہے۔"

اس مرتبہ زینت نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ وقفے سے اس کا جواب آیا۔ "اب تم کچھ ایسی باتیں کرنے لگی ہو کہ فیس بک پر یہ تحریری گفتگو مجھے کچھ پریشان کر رہی ہے۔ کیا تم مجھے اپنا فون نمبر دے سکتی ہو؟"

"ہاں، ہاں۔ اچھا ہوگا کہ ہم باتیں فون پر ہی کر لیں۔"

فرزانہ نے اپنا پہلا موبائل نمبر ختم کرنے کے بعد تین نئے نمبر لیے تھے۔ ان میں سے ایک وہ کچھ لوگوں کو دے چکی تھی۔ دو نمبر اس نے ابھی استعمال نہیں کیے تھے۔ انہی میں سے ایک نمبر اس نے زینت کو بتا دیا۔

"میں ابھی فون کرتی ہوں تمہیں۔" زینت کا جواب آیا اور فوراً ہی فیس بک سے چلی گئی۔

فرزانہ نے بھی فوراً ہی کمپیوٹر بند کیا اور سوچنے لگی کہ پہلے کیا قدم اٹھایا جائے۔ اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ موبائل کی گھنٹی بجی۔ کال کرنے والی زینت ہی تھی۔ اس نے کہا۔

"یہ تم نے کیسے گمان کر لیا کہ میں اپنے شوہر کی وجہ سے پریشان ہوں۔"

"اچھا نہیں لگ رہا ہے تمہیں یہ بتاتے ہوئے کہ تمہارے شوہر طارق کے تعلقات کئی لڑکیوں سے ہیں اور شادی کے بعد بھی انہوں نے اپنا وتیرا نہیں بدلا ہے۔"

"تم اس بارے میں کیسے جانتی ہو؟" زینت نے تیزی سے پوچھا۔

"میری ایک دوست ہے۔ طارق صاحب سے اس کے تعلقات ہیں۔ طارق صاحب نے شروع میں اسے شادی کا جھانسا دے کر برباد کیا تھا، بعد میں وہ شادی کی بات ٹالتے رہے۔ میری دوست ان سے اس توقع پر ملتی رہی کہ وہ انہیں کسی نہ کسی طرح شادی کے لیے آمادہ کر لے گی مگر کچھ دن پہلے اسے اچانک کسی طرح معلوم ہو گیا کہ ان کی شادی تم سے طے ہو گئی ہے۔ اس پر اسے غصہ آ گیا۔ وہ مجھے سب کچھ بتاتی رہتی تھی۔ تمہاری شادی سے دو دن قبل وہ طارق صاحب سے ان کے گھر جا کر ملی تھی۔ اس نے ان پر ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ ان کی ہونے والی شادی سے باخبر ہو چکی ہے۔ اس دن اس نے ان کے ساتھ جو وقت گزارا، خفیہ کیمرے سے اس کی وڈیو بنا لی تھی۔ وہ اس وڈیو کی بنیاد پر طارق صاحب پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنا چاہتی ہے لیکن ابھی وہ یہ قدم نہیں اٹھا سکی۔ اچانک بیمار پڑ گئی ہے۔"

"وہ وڈیو دیکھی ہے تم نے؟"

"دیکھی ہے۔"

"کیا میں وہ دیکھ سکتی ہوں؟"

"اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں آ رہا ہے تو میں اپنی دوست سے کسی بہانے وہ وڈیو لے کر اس کی ڈی وی ڈی بنا کر تمہیں بھیج سکتی ہوں۔ اپنا پتا بتا دو۔"

"نہیں، گھر پر منگوانا میں مناسب نہیں سمجھوں گی۔ کیا نیٹ پر تمہارا بلاگ ہے؟ اگر ہو تو اس پر ڈال دو اور اس کا لنک مجھے بھیج دو۔ میں تمہارے بلاگ پر آ کر دیکھ لوں گی۔"

"میرا بلاگ نہیں ہے۔ میں نے اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی لیکن میں آج ہی بنا لوں گی۔ فیس بک پر آ کر اس کا لنک تمہیں بھیج دوں گی۔"

"تمہارے لہجے میں مجھے سچائی محسوس ہو رہی ہے۔ میں بے چینی سے کل تک اس کا انتظار کروں گی۔"

"ایک بات بتا دوں۔ تم میری دوست کا چہرہ نہیں دیکھ سکو گی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اسے جانو۔ وڈیو ایڈیٹنگ سے میں اس کا چہرہ دھندلا کر دوں گی۔"

"مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لڑکی کا جسم تو نظر آئے گا نا؟ اور طارق بھی پہچانے جا سکیں گے؟"

"ہاں، یہ تو ہوگا۔ میں بس اپنی دوست کا چہرہ دھندلا کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں بے چینی سے کل تک انتظار کروں گی۔"

"اوکے۔" فرزانہ نے کہا اور موبائل آف کر دیا۔

وہ وڈیو ایڈیٹنگ کے پروگرام میں اپنا چہرہ پہلے ہی دھندلا کر چکی تھی۔ ایک دن کا وقت اس نے یہ ظاہر کرنے کے لیے لیا تھا جیسے اسے واقعی وہ وڈیو اپنی دوست سے لانا ہو۔

اس نے اسی وقت کمپیوٹر دوبارہ کھولا۔ بلاگ تو وہ اسی وقت بنا لینا چاہتی تھی۔ بلاگ بنا کر اس نے وڈیو اس پر لوڈ کر دی۔

رات اسے بڑی پُرسکون نیند آئی۔ وڈیو دیکھنے کے

بعد زینت یقیناً بھڑک جاتی۔ طارق سے طلاق کا مطالبہ کرتی اور معاہدے کے مطابق کاروبار میں طارق کا جو حصہ تھا، اس پر بھی قابض ہو جاتی۔

دوسرے روز اس نے دس بجے زینت کو فون کیا کہ وہ فیس بک پر آئے۔ وہ خود بھی فیس بک پر پہنچی۔ زینت نہیں تھی۔ کسی بھی وجہ سے اسے کچھ دیر ہو سکتی تھی۔ فرزانہ کے لیے اس سے کوئی فرق بھی نہیں پڑ سکتا تھا۔ اس نے زینت کے میسج باکس میں اپنے بلاگ کا لنک ڈال دیا اور فیس بک سے باہر آ کر کمپیوٹر بند کر دیا۔ اب اسے نتیجے کا انتظار کرنا تھا اور وہ نتیجہ زینت کا فون آنے پر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

اس دن زینت کا فون شام کو آیا۔ "اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ ویڈیو میری شادی کے ایک دو دن پہلے کی ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"میں جو بتا رہی ہوں تمہیں۔"

"میں نے طارق کو بھی تمہارے بلاگ پر وہ ویڈیو دکھائی تھی۔ انہوں نے یہ تو مان لیا کہ وہ جعلی نہیں ہے مگر یہ بھی کہا کہ وہ بہت پہلے کی ہے۔ انہیں ویڈیو دیکھ کر غصہ بھی آ گیا تھا کیونکہ وہ تو اس لڑکی کا چہرہ نہ دیکھ کر بھی اسے پہچان سکتے ہیں اور یہ میرے علم میں پہلے سے ہے کہ شادی سے پہلے ان کے تعلقات لڑکیوں سے رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ شادی کی تاریخ طے ہونے کے بعد وہ کسی اور لڑکی سے رابطہ نہیں رکھیں گے اور ان کے کہنے کے مطابق وہ اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہیں۔"

"اچھا!" فرزانہ ہنسی۔ "چلو، اب میں تم کو یہ بھی بتا دیتی ہوں کہ انہوں نے فیس بک کے ذریعے مجھے بھی اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کی تھی۔"

"اگر تم سچ کہہ رہی ہو تو بھی یہ کوشش انہوں نے شادی طے ہونے سے پہلے کی ہوگی۔"

"نہیں۔" فرزانہ نے زور دے کر کہا۔ "یہ بعد کی بات ہے اور اس کا تو میں ثبوت بھی دے سکتی ہوں۔ فیس بک پر میسج باکس کے فوٹو بنا تی رہی ہوں۔ ان میں طارق صاحب سے میری سب گفتگو موجود ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک۔ آخری دن وہ ہے جب انہوں نے مجھے نہایت فحش تصویر بھیجی تھی۔ اس کے بعد ہی میں نے ان کو ان فرینڈ کیا تھا۔ اس آخری تصویر میں یہ ثبوت بھی موجود ہے کہ اس روز کیا تاریخ تھی۔ وہ تاریخ پہلے کی نہیں، شادی کے بعد کی ہے۔"

دوسری طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ زینت کو یقین آ گیا ہوگا کہ فرزانہ سچ بول رہی ہے۔

فرزانہ پھر بولی۔ "میں ابھی فیس بک پر جا کر وہ سب فوٹو میسج باکس میں ڈال دیتی ہوں۔ تم فیس بک پر آ کر وہ دیکھ سکتی ہو۔"

"میں ابھی فیس بک پر آ رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

فرزانہ نے رابطہ منقطع کر کے کمپیوٹر کھولا۔ فیس بک پر گئی اور تمام فوٹو میسج باکس میں ڈال دیے۔ اسی وقت زینت بھی فیس بک پر آ گئی لیکن فرزانہ نے فوری طور پر اس سے کوئی بات کرنا ضروری نہیں سمجھا اور فیس بک سے باہر آ گئی۔

اب اسے یقین تھا کہ طارق کے بچنے کا کوئی امکان نہیں۔ اسے اپنے کاروبار کے باقی حصے سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ ان دونوں میں مقدمے بازی کی نوبت آ جاتی۔

☆☆☆

دوسرے دن فرزانہ کو دفتر پہنچے ہوئے مشکل سے آدھا گھنٹہ گزرا تھا کہ انٹرکام پر جمال نے اطلاع دی۔ "میڈم! ایک خاتون زینت صاحبہ آپ سے ملنے کے لیے آئی ہیں۔"

فرزانہ چونک گئی۔ اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ زینت اس سے ملنے کے لیے آ سکتی ہے۔ اس نے کچھ سوچا پھر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں مل لوں گی۔"

"میں گارڈ کو ہدایت کر دیتا ہوں کہ وہ بھی زینت صاحبہ کے ساتھ کمرے میں آئے گا لیکن دروازے پر ہی کھڑا رہے گا۔ اتنے فاصلے سے وہ آپ دونوں کی باتیں تو نہیں سن سکتا۔ پلیز! ذرا سا ہولڈ کیجیے۔ میں زینت صاحبہ سے بات کر لوں۔"

اچھا، کہہ کر فرزانہ انتظار کرنے لگی۔ پندرہ سیکنڈ کے بعد ہی جمال کی آواز آئی۔ "میڈم! وہ آپ کے پاس آ رہی ہیں۔ انہیں گارڈ کی موجودگی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

فرزانہ نے ریسیور رکھ دیا اور سوچ میں ڈوبی ہوئی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

جلد ہی دروازہ کھلا اور زینت اندر آ گئی۔ اس کے پیچھے گارڈ بھی آیا۔ وہ دروازے پر ہی رک گیا۔ زینت میز کے قریب آ گئی۔

"تشریف رکھیے!" فرزانہ نے کہا۔

زینت غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"فرمائیے!" فرزانہ پھر بولی۔

"میں فاضل ٹریڈرز کے مالک طارق صاحب کی بیوی ہوں۔" زینت نے سنجیدگی سے کہا۔ "کم از کم ابھی تو

بیوی ہی ہوں۔ میں نے ان سے طلاق کا مطالبہ کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس سلسلے میں مقدمے بازی کی نوبت آ جائے لیکن مقدمہ میں ہی جیتوں گی۔ طلاق کا مضبوط جواز ہے میرے پاس۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ مجھ سے نکاح کے ساتھ ہی میں ان کے کاروبار کی پچاس فیصد کی حصے دار بن گئی تھی۔ ہمارا اگریمنٹ کچھ ایسا ہے کہ طلاق کے بعد باقی نصف کاروبار بھی میری ملکیت میں آ جائے گا یعنی صرف میں ہی فاضل ٹریڈرز کی مالک ہوں گی۔"

"خوب!" فرزانہ نے صرف اتنا ہی کہا۔

زینت نے بات آگے بڑھائی۔ "آپ نے تجارتی اعتبار سے جو قدم اٹھایا ہے، وہ فاضل ٹریڈرز کی تباہی کا سبب بھی بن سکتا ہے لیکن یہ نقصان طارق کا نہیں، میرا ہوگا۔ ابھی میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ آج نہیں تو کل فاضل ٹریڈرز صرف میری ملکیت ہوگا۔"

"جی۔" فرزانہ نے اب بھی صرف اتنا ہی کہا۔

"ایسی صورت میں......" زینت نے کہا۔ "نقصان طارق کا نہیں، میرا ہوگا۔ اس لیے اس تجارتی معاملے میں آپ کو اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنا چاہیے۔ نظرثانی اس لیے کہ مجھ سے تو آپ کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ آپ کے اس منصوبے کا مقصد تو صرف طارق سے انتقام لینا ہے نا۔"

فرزانہ چونکی پھر اس نے تیزی سے کہا۔ "کیا مطلب؟ کس انتقام کی بات کر رہی ہیں آپ؟"

زینت مسکرا رہی اور بولی۔ "اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں صاف صاف بات کروں تو ٹھیک ہے۔ آپ کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے، اس سلسلے میں آپ مجھے اپنی حمایت میں پائیں گی۔ آپ کی جگہ اگر میں ہوتی تو میرے دل میں بھی انتقام کا جذبہ ہوتا اور جو کچھ میرے اختیار میں ہوتا، وہ میں بھی کر گزرتی۔"

فرزانہ کا منہ کھلا لیکن وہ کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ زینت نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں نہیں جانتی کہ آپ کے پس پشت کس کی طاقت ہے اور نہ میں جاننا چاہتی ہوں لیکن کوئی طاقت ہے ضرور۔ آپ کے پاس اتنا پیسا نہیں تھا۔ یہ مجھے طارق نے بتا دیا ہے۔ آپ نے مجھے جو ویڈیو دکھائی تھی، وہ میں نے طارق کو بھی دکھائی تھی اور آپ کا چہرہ دھندلا ہونے کے باوجود طارق نے آپ کو پہچان لیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ آپ کا یہ تجارتی اقدام درحقیقت اس سے انتقام لینے کے لیے ہے۔"

فرزانہ نے پہلو بدلا۔ "کس ویڈیو کی بات کر رہی ہیں آپ؟"

زینت کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے کہا۔ "میں آپ کو کیا کہوں فرزانہ یا مس صبوحی؟"

فرزانہ نے طویل سانس لی۔ "میں سمجھ گئی۔ میں فون پر صبوحی کی حیثیت سے بات کرتی ہوں آپ سے۔ اس لیے اب آپ نے میری آواز پہچان لی ہوگی۔"

"نہ صرف میں نے بلکہ طارق نے بھی۔" زینت نے جواب میں کہا۔ "آپ سے جو آخری گفتگو ہوئی تھی اس وقت طارق میرے ساتھ تھا اور میں نے اسپیکر آن کر کے آپ کی آواز اسے بھی سنائی تھی۔ اس نے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ وہ آپ کی آواز ہے۔ بہرحال آپ نے اس سے انتقام لینے کے لیے صبوحی کے نام سے فیس بک پر جو کچھ کیا، ٹھیک کیا۔ مجھے یہ اعتراض کرنے کا حق ہی نہیں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی، اس کے بعد آپ کچھ بھی کر سکتی تھیں۔"

فرزانہ کا دماغ اس وقت بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ صورتِ حال اسے بتا رہی تھی کہ زینت سے اب کٹ حجتی کرنا بے کار ہے۔ تمام حالات اس کے سامنے آ چکے تھے۔ اس کے سامنے کسی بات سے انحراف کسی بھی اعتبار سے فائدہ مند ثابت نہیں ہوتا۔

"خیر!" زینت نے بات جاری رکھی۔ "میں زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ میں آپ سے صرف یہ کہنے آئی تھی کہ آپ اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں۔ اگر آپ اپنے اسی فیصلے پر بھی رہیں تو اب آپ سے طارق کو نہیں، مجھے نقصان پہنچے گا۔ طارق کو تو اب میں تہی دامن کر دوں گی۔ مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ اس کی فطرت نہیں بدل سکتی۔ مجھے پہلے یہ گمان تھا کہ اسے مجھ سے اتنی محبت ہے کہ مجھے پا کر وہ اپنے آپ کو بدل لے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اسے مجھ سے محبت نہیں تھی۔ وہ بس مجھے پانا چاہتا تھا، سو وہ اس نے پا لیا۔ اس کی بوالہوسی برقرار رہی اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ دوسری لڑکیاں میرے حقوق میں حصے دار بنیں۔ بس......" وہ کھڑی ہو گئی۔ "میں منتظر رہوں گی کہ آپ اپنے فیصلے پر نظرثانی کرتی ہیں یا نہیں۔ اگر آپ نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا تو میں فاضل ٹریڈرز کی مالک بننے کے بعد اسے فروخت ہی کرنے کے بارے میں سوچوں گی۔ میں طارق کی طرح ضدی نہیں ہوں کہ آپ سے مقابلہ کرنے کے لیے تجارتی میدان میں جمی ہی رہوں۔"

پھر وہ واپس جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑنا چاہتی تھی کہ فرزانہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ "ٹھہریے۔"

زینت اس کی طرف دیکھنے لگی۔
"بیٹھ جائیے!" فرزانہ نے کہا۔ "آپ مجھے پسند آ گئیں۔ آپ کے دل میں میرے خلاف جذبات نہیں بھڑکے۔"
"اصولی بات ہے کہ بھڑکنا بھی نہیں چاہئیں۔" زینت نے کہا۔ "زیادتی تو آپ کے ساتھ ہوئی ہے۔ اب آپ جو کرنے جا رہی ہیں، یا یہ کہا جائے کہ کر رہی ہیں، وہ تو اس زیادتی کا ردعمل ہے۔"
فرزانہ نے سر ہلایا پھر کہا۔ "یہ ناممکن ہے کہ طارق آسانی سے آپ کو طلاق دے کر کنگال ہو جائے۔"
"تو میں اس پر مقدمہ دائر کروں گی۔"
"میں یہی کہنے والی تھی۔" فرزانہ نے کہا۔ "اگر آپ مقدمہ جیت کر فاضل ٹریڈرز کی بلاشرکت غیرے مالک بن گئیں تو میں اپنے اس فیصلے پر قائم نہیں رہوں گی لیکن جب تک عدالت آپ کے حق میں فیصلہ نہیں دیتی، یہ صورت حال جوں کی توں رہے گی۔"
"شکریہ!" زینت کے سنجیدہ چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ آئی۔ "مقدمہ تو میں ہی جیتوں گی۔"
"میں اس خبر کا انتظار کروں گی۔"
"طارق کی طرف سے ہوشیار رہیے گا۔ وہ آپ کے لیے زخمی سانپ کی طرح خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ میں تو اسے غصے میں بل کھاتا چھوڑ کر اس کے گھر سے اپنی ماں کے پاس واپس آ چکی ہوں۔" وہ پھر کھڑی ہو گئی۔ "تو پھر میں آپ کے وعدے پر یقین کر کے جاؤں؟"
"سو فیصد۔"
زینت نے بڑی گرم جوشی سے فرزانہ سے ہاتھ ملایا اور دروازے کی طرف مڑ گئی۔ اس کے جانے کے بعد گارڈ بھی کمرے سے نکل گیا۔ فرزانہ نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

"میرا خیال ہے کھیل ختم ہی ہو گیا ہے سر!" رات کو فرزانہ، سطوت مرزا سے کہہ رہی تھی۔ "آج زینت میرے پاس آئی تھی۔ اس نے مجھے صاف صاف بتایا کہ فاضل ٹریڈرز کی پچاس فیصد کی شراکت دار تو وہ طارق سے نکاح کے بعد ہی بن گئی تھی اور اب چونکہ شادی کے بعد بھی طارق اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تھا اور اسے اس کا ثبوت بھی مل گیا ہے لہٰذا اس نے طارق سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور طلاق کا مطالبہ کر دیا ہے۔ اسے یہ بھی یقین ہے کہ اگر مقدمے کی نوبت آئی تو مقدمہ وہ ہی جیتے گی اور نقصان طارق کا نہیں، اس کا ہو گا اور اس سے کیونکہ میری کوئی پرخاش نہیں ہے اس لیے مجھے اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنا پڑی۔ طارق نے اسے میرے بارے میں بتا دیا تھا۔ بہرحال میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ اگر وہ مقدمہ جیت گئی تو میں پیکنگ کی قیمت بڑھا دوں گی۔"
"مقدمہ تو وہی جیتے گی۔" سطوت مرزا نے کہا۔
"آج تو آپ یہ بات بڑے یقین سے کہہ رہے تھے۔ پہلے آپ نے کہا تھا کہ اس کا انحصار اگریمنٹ پر ہے۔"
"ہاں۔" سطوت مرزا مسکرائے۔ "آج مسز ارباب کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ طارق نے فیس بک پر کسی لڑکی سے پینگیں بڑھائی تھیں۔ زینت کو نہ صرف معلوم ہو گیا ہے بلکہ وہ ثبوت بھی مل گئے ہیں۔ اس نے طارق سے طلاق کا مطالبہ کر دیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں وہ اگریمنٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسے تو مجھ سے ملنے کا بہانہ چاہیے۔ وہ فوراً اگریمنٹ لے کر میرے پاس آ گئی۔ میں نے اس کی فوٹو اسٹیٹ بنوالی تھی۔ وہ میں نے ایک بہت بڑے وکیل کو دکھائی۔ اس نے اگریمنٹ دیکھ کر کہا کہ یہ کسی بہت ہی تجربہ کار وکیل نے بنایا ہے۔ اگریمنٹ میں ایسا کوئی جھول نہیں کہ زینت مقدمہ ہار جائے۔ لیکن طارق اگر کوشش کرے گا تو مقدمہ بہت طول کھینچ سکتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ طول بھی نہیں کھینچے گا۔"
"سر! اگر صورت حال یہ بن گئی تو پھر فرزانہ ٹریڈرز آپ ہی سنبھالیے گا۔ نقصان کا کھیل تو میں نے کھیل لیا لیکن فائدہ حاصل کرنے کے گر مجھے نہیں آتے۔ اس کے لیے تجربے کی ضرورت ہے جو مجھے نہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ بچوں سے دور ہو جانے کے باعث مجھے کچھ بے چینی رہنے لگی ہے۔ بدستور آپ کی سیکریٹری بنے رہنا ہی میرے لیے بہتر ہے۔ بچے تو میرے سامنے رہیں گے۔ مجھے چھپ کر ان سے ملنے کے لیے رات کو یہاں نہیں آنا پڑے گا۔"
"سوچوں گا اس بارے میں...... اور ہاں، بچوں نے کیا تم سے کچھ نہیں کہا؟ وہ تمہارے ساتھ تمہارے گھر جانا چاہتے ہیں۔ تمہارے والدین سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم سے ان کی محبت بھی اتنی بڑھ گئی ہے کہ اب وہ تم سے متعلق افراد سے بھی ملنے کے خواہشمند ہیں۔"
"اچھا!" فرزانہ ہنسی۔ "ٹھیک ہے۔ میں ملوا دوں گی۔"
"ابھی تم ان سے ملو گی تو وہ خود ہی تم سے کہیں گے۔ خاص طور سے سائرہ!" سطوت مرزا نے کہا۔ "میں کل شام انہیں اپنے گارڈز کے ساتھ تمہارے گھر بھجوا دوں گا۔"

سطوت مرزا سے باتیں کرنے کے بعد وہ بچوں سے ملی۔ کچھ دن سے اس کا یہی معمول بن گیا تھا کہ پہلے وہ سطوت مرزا سے حالات کے بارے میں گفتگو کرتی تھی، اس کے بعد بچوں سے ملتی تھی۔
بچوں سے ملنے کے بعد جب فرزانہ گھر پہنچی تو اس نے اپنے والدین کو بھی اس بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ "خانساماں سے کہہ کر ان کے لیے اچھی اچھی چیزیں تیار کروائیے گا۔ میں دفتر سے آتے ہوئے بازار سے بھی کچھ لیتی آؤں گی۔"
اس رات وہ بے حد پرسکون نیند سوئی۔
دوسرے دن دفتر پہنچی۔ اپنے کمرے میں جانے کے لیے اسے اس کمرے سے گزرنا پڑتا تھا جہاں جمال بیٹھتا تھا۔ یہاں اس کے پی اے کو بیٹھنا چاہیے تھا لیکن فرزانہ نے اس سے کہا تھا کہ ابھی کچھ عرصے وہ وہاں بیٹھے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔
اس کے کمرے کے دروازے پر سیکیورٹی گارڈ کھڑا تھا۔ اس نے فرزانہ کو سلام کیا۔ فرزانہ اسے اشارے سے جواب دیتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ جو گارڈ آتا تھا، وہ باہر پہلے گارڈ کے پاس رک جاتا تھا۔
پندرہ منٹ بعد ہی انٹرکام پر جمال نے اس سے کہا۔ "ابھی ایک بزنس مین کا فون آیا تھا۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ آپ دفتر کس وقت آتی ہیں۔ دراصل ان کا چار آدمیوں کا ایک وفد آپ سے ملنا چاہتا ہے۔" پھر اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "میڈم! ابھی پریشان ہو گئے ہیں۔"
"ٹال جاؤ۔" فرزانہ نے کہا۔ "خود ہی سوچ کر کوئی بہانہ بنا دینا۔ میں ابھی ان لوگوں سے نہیں مل سکتی۔"
"بہتر ہے۔" جمال نے کہا۔ "میں سنبھال لوں گا۔"
فرزانہ ریسیور رکھ کر اخبار میں تجارتی خبریں پڑھنے لگی۔ پون گھنٹے کے بعد اس نے اخبار ایک طرف ڈالا پھر وہ کمپیوٹر کھولنا چاہتی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ اب فیس بک سے اپنا اکاؤنٹ ختم کر دے۔ اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔
اس نے کمپیوٹر کھولا ہی تھا کہ پے در پے تین گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ فرزانہ نہ صرف چونکی بلکہ بے اختیار کرسی سے کھڑی ہو گئی۔
پھر بڑی زوردار آواز کے ساتھ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور طارق تیزی سے اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ فرزانہ دم بخود رہ گئی۔
"تم......" طارق غراتے ہوئے بولا۔ "تم نے مجھے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اس قسم کی زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ میری عمر جیل میں کٹے یا مجھے پھانسی ہو لیکن میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"
پھر اس کے ریوالور سے پے در پے دو گولیاں چلیں۔ ایک فرزانہ کے سینے پر اور دوسری بازو میں لگی۔ اس کے بعد اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا پھر اس کے بعد پے در پے بہت سی گولیاں چلیں لیکن فرزانہ اس سے پہلے ہی زمین پر گر کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

شہر کے سب سے بڑے اسپتال کے ایک کمرے کے باہر فرزانہ کے والدین اور سطوت مرزا موجود تھے۔ سطوت مرزا کا گارڈ کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔
فرزانہ کو گولیاں لگے تین دن گزر چکے تھے۔ دفتر والوں نے فوراً پولیس اور اسپتال کو اطلاع دی تھی۔ ایمبولینس تیزی سے آئی تھی اور فرزانہ کو لے کر چلی گئی تھی۔ اسے فوراً اسپتال بھی پہنچا دیا گیا تھا اور اس کا اسٹریچر آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا تھا۔ آپریشن کئی گھنٹے جاری رہا تھا اور اس کے بعد فرزانہ کو آئی سی یو میں پہنچا دیا گیا۔
"آپ اب اطمینان رکھیے۔" سرجن نے خاص طور پر فرزانہ کی والدہ سے کہا۔ "آپریشن بہت اطمینان بخش ہوئے ہیں۔ کچھ نہیں ہو گا آپ کی بیٹی کو۔"
پھر اس نے جمیل خاں اور سطوت مرزا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہت خوش قسمت ہیں وہ۔ سینے پر لگنے والی گولی دل کے قریب جا لگی لیکن اطمینان بخش آپریشن ہونے کے باوجود انہیں ابھی کافی دن اسپتال ہی میں رہنا ہو گا۔"
تیسرے دن فرزانہ کو آئی سی یو سے ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا اور اب وہ کمرے کے باہر منتظر تھے کہ انہیں کمرے میں جانے کی اجازت ملے۔ آخر ڈاکٹر نے کمرے کے باہر آ کر انہیں کمرے میں جانے کی اجازت دے دی۔
عالیہ...... نے اشک آلود آنکھوں کے ساتھ بیٹی کی پیشانی چومی۔ جمیل خاں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ اس وقت فرزانہ کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئی تھیں۔
"تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی فرزانہ!" سطوت مرزا نے کہا۔
فرزانہ نے ان کی طرف دیکھا پھر دروازے کی طرف نظر دوڑائی [illegible]

سطوت مرزا نے اس کی آنکھوں کا سوال پڑھ لیا اور مسکرا کر بولے۔ ''انہیں میں نے کچھ نہیں بتایا ہے۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ تم اچانک کسی کاروباری سلسلے میں لاہور گئی ہو۔ دو تین دن بعد واپس آؤ گی۔ اب میں انہیں کل بتاؤں گا اور انہیں لے کر بھی آؤں گا۔''

شفاف ماسک کے اندر اس کے ہونٹ خفیف سا مسکرائے۔

''ہم نے چار بکرے صدقہ کیے ہیں۔'' جمیل خاں نے فرزانہ کو بتایا۔

فرزانہ کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اب ٹھیک ہو گئی تھیں۔ اس نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا تھا۔

جمیل خاں نے سطوت مرزا سے کہا۔ ''فرزانہ کو آپ کے بچوں سے بہت محبت ہے۔''

''انہیں بھی فرزانہ سے اتنی ہی محبت ہے۔'' سطوت مرزا نے جواب دیا۔

''فرزانہ نے بتایا تھا کہ اس دن دونوں بچے ہمارے گھر آنے والے تھے۔''

''جی ہاں...... لیکن......'' وہ فرزانہ کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

دو چار باتیں اور بھی ہوئیں پھر ایک نرس نے ان کے قریب آ کر کہا۔ ''سر! اب آپ لوگ......''

''ٹھیک ہے۔'' سطوت مرزا نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی اور جمیل خاں سے کہا۔ ''آئیے، اب چلیں۔ پندرہ منٹ ہو چکے ہیں۔''

فرزانہ کی نظریں اس وقت تک ان لوگوں کا پیچھا کرتی رہیں جب تک وہ دروازے سے باہر نہیں نکل گئے۔ اگلے دن فرزانہ کو علم ہو سکا کہ اس دن جمال اپنی جان کی بازی ہار گیا تھا۔

جب سطوت مرزا بچوں کے ساتھ ملنے آئے تھے۔

وہ سائرہ کی پیٹھ تھپکتی رہی۔ اس نے جمیل خاں اور عالیہ بیگم کی دو ایک باتوں کے جواب بھی دیے پھر سطوت مرزا کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''ابھی مجھے پولیس سے معلوم ہوا ہے۔ وہ...... جمال......'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''ہاں۔'' سطوت مرزا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اسپتال کے لوگ جب وہاں پہنچے تو جمال بھی دم توڑ چکا تھا اور تمہارا ایک گارڈ بھی۔ دوسرا گارڈ بچ گیا۔ وہ بھی اسی اسپتال میں ہے۔ وہ گولی کھا کر گر تو پڑا تھا لیکن پھر فرش پر سرکتا ہوا تمہارے کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے پورا برسٹ ہی طارق پر چلا دیا۔ اس نے فوراً ہی دم توڑ دیا تھا۔''

فرزانہ نے اثبات میں سر ہلایا جیسے پولیس نے اس کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہو۔ جمال کی موت نے اسے افسردہ کر دیا تھا۔

اس سے اگلے دن فرزانہ کی حالت کچھ اور سنبھلی نظر آئی۔ اس دن بھی سائرہ اور تنویر، سطوت مرزا کے ساتھ آئے تھے۔ سائرہ کے ہونٹوں پر اب مسکراہٹ تھی۔ اس نے فرزانہ کے منہ سے جمیل خاں کے لیے بابا کا لفظ سن لیا تھا اس لیے اس نے بھی جمیل خاں کو اسی طرح مخاطب کیا۔

''بابا! مجھے آپ سے ایک بات کہنا ہے...... آپ برا تو نہیں مانیں گے۔''

''کہو بیٹا!'' جمیل خاں نے محبت سے کہا۔ ''تم فرزانہ کو اتنی پیاری ہو تو کیا ہمیں پیاری نہ ہو گی؟''

''میں ذرا کینٹین سے جوس کے چند پیکٹ لے کر آتا ہوں۔'' سطوت مرزا نے کہا اور وہاں سے چلے گئے۔

''بابا!'' سائرہ بولی۔ ''اب ہم نا...... انہیں......'' اس نے فرزانہ کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں، ہاں بولو بیٹا!'' عالیہ بیگم نے اسے بات مکمل کرنے کے لیے اکسایا۔

''اب نا...... اب...... یہ...... اور آپ دونوں بھی...... ہمارے ساتھ ہی رہا کریں گے۔''

''ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں۔'' جمیل خاں نے اس کی دل بستگی کے لیے کہا۔

''اب ہم انہیں آنٹی بھی نہیں کہیں گے۔''

''پھر کیا کہو گی؟''

''ممی!'' سائرہ نے کہا۔

اس بات پر فرزانہ، جمیل خاں اور عالیہ بیگم تینوں ہی چونک پڑے تھے۔ سائرہ نے بات آگے بڑھائی۔ ''اور آپ دونوں کو...... نانا جان اور نانی جان!''

بات بالکل صاف تھی۔ جواب میں کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکا۔ تینوں دم بخود رہ گئے۔

سائرہ بولتی رہی۔ ''یہ بات تو...... بڑے کرتے ہیں نا لیکن...... ڈیڈی کا بڑا تو کوئی ہے ہی نہیں۔ ہم ہی ہیں نا بس!''

جمیل خاں اور عالیہ بیگم کی نظریں اب فرزانہ پر جمی ہوئی تھیں جس نے نظریں جھکا لی تھیں اور دو آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک گئے۔ وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ سطوت مرزا اس وقت وہاں سے کیوں ہٹ گئے تھے۔

سائرہ کی بات کا جواب وہی دے سکتی تھی جسے غالباً اس وقت اپنی قسمت پر ناز تھا۔

⌘⌘⌘